اٹھو! ورنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو! زمانہ چال قیامت کی چل گیا (ہمایوں)

بیادگار علامہ فضیلت مآب آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ
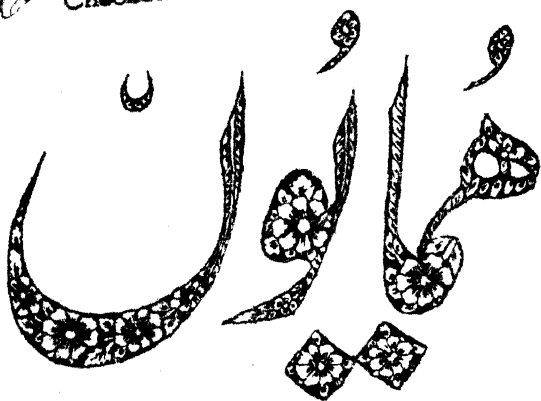
ایڈیٹر ۔ بشیر احمد ۔ بی ، اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا

جائنٹ ایڈیٹر ۔ حامد علی خاں بی ، اے

حمد

یارب تری حمد ہے زباں پر   حیرت دِل میں

خالق ارض و سما کا تُو ہے   مالک ہر دو سرا

جان و تن کا وجود تجھ سے   یعنی غیب و شہود

ہر سنگ میں تو شرار میں تو   ہر برگ میں تو ہے بار میں تو

ہر گل میں عیاں ہے شان تیری   ہر خار میں آن بان تیری

ہر کام کی ابتدا تو ہی ہے   ہر بات کی انتہا تو ہی ہے

ہر رنگ میں تُو ہے بُو میں تُو ہے   بہتے ہوئے آب جُو میں تُو ہے

چڑیاں جو سحر کو بولتی ہیں   رازِ توحید کھولتی ہیں

سُورج ادنیٰ ظہور تیرا   ذرّے ذرّے میں نور تیرا

پرتو ترا موجِ برقِ مضطر   سایۂ ترا ابرِ تیرہ و تر

کیا خاک ہے اور باد کیا ہے   کیا آتش و آب میں دھرا ہے

کیا راز ہے قوتِ کشش میں   سیّارے ہیں کیوں دوا دوش میں

مستور ہے سب میں ذات تیری   تُجھ سے ہے کائنات تیری

قدرت تیری دیکھ کر ہوں خاموش   حیرت سے ہُوا ہوں خود فراموش

جگر بریلوی

وفا

سراپا، اے یکسر اسرار! جس کی محبت سے ہے میری روحِ وفا سرشار

ے ہے قائم میرے دل کا قرار جسکے خیال میں سرگرداں ہے میری جانِ نزار

اے محبوب، اے رازِ سراپا، اے یکسر اسرار!

دھویا تیری محبت نے سب میرے دل کا زنگ اب ہوسِ دنیا باقی ہے نہ خواہشِ نام و ننگ

اور کسی سے مجھ کو محبت ہے نہ عداوت ہے صلح ہے تیرے خیال سے میری تیرے خیال سے جنگ

اے محبوب، اے رازِ سراپا، اے یکسر اسرار!

تُو ہے نورِ سراپا اور ہوں میں اک مُشتِ خاک تیری محبت دریا ہے ہوسِ دُنیا خاشاک

تُو ہے پاک اور تیرے شوق میں میری نگاہ بھی پاک پھر کیوں تجھکو سمجھنے سے عاجز ہے مرا ادراک؟

اے محبوب، اے رازِ سراپا، اے یکسر اسرار!

مہر میں تیرا جلوہ پنہاں، ماہ میں تیرا رنگ پھر بھی اُن میں پایا میں نے تیرا رنگ، نہ ڈھنگ

تیری حقیقت بے پایاں ہے تیری حقیقت کو کیا دیکھیگی کیا سمجھیگی میری نگاہِ تنگ!

اے محبوب، اے رازِ سراپا، اے یکسر اسرار!

وفا

فصلِ بہار میں، ہوتی ہے جب روحِ چمن پیدا
فصلِ بہار میں کرتی ہے جب بلبل گُل سے پیار
فصلِ بہار میں، چھن جاتا ہے جب دِل سے قرار
میرا دل بھی تیرے خیال سے ہوتا ہے سرشار

اے محبوب! اے رازِ سراپا، اے یکسر اسرار

آہ تمنا! میری تمنا! مجھ سے فریب ہُوا
مجھ کو میری محبت نے سو بار دیا دھوکا
تجھ کو نہ دیکھا تھا لیکن دیکھا، تجھ کو دیکھا
تجھ کو نہ پایا تھا لیکن پایا، تجھ کو پایا

اے محبوب! اے رازِ سراپا، اے یکسر اسرار!

تیری صدا ہو کاش مجھے پیغامِ برقِ فنا!
تیری نگاہ پڑے مجھ پر بن کر پیکانِ قضا!
تیرے ستم میں حلاوت ہے تیرا یہ سحر ہے کیا؟
تجھ پر روح نثار مری! شیریں ہے تیری جفا

اے محبوب! اے رازِ سراپا، اے یکسر اسرار!

صبحِ ازل سے روح مری ہے ابتک سرگرداں
شامِ ابد تک یونہی رہونگی تیرے لئے حیراں
گو نہ ملے تو، پھر بھی رکھیگی قائم میری وفا
تیرا میرا، ازل سے ابد تک رشتۂ جسم و جاں

اے محبوب، اے رازِ سراپا، اے یکسر اسرار!

حامد علی خاں

بزمِ ہمایوں

آج ہمایوں کی عمر پانچ سال ہوتی ہے جب میں پانچ سال کی اس مدت پر نگاہ دوڑاتا ہوں تو اگرچہ مجھے پختگی کے ساتھ خامیاں اور خوبیوں کے ساتھ نقائص بھی نظر آتے ہیں لیکن یہ دیکھ کر اک گونہ تسلی ہوتی ہے کہ ہمایوں نے ہمیشہ اور بالخصوص اِس گزشتہ سال میں آگے کی طرف قدم بڑھایا ہے۔

جب گزشتہ سال ہمایوں کے معیار کو بلند کرنیکی تجویز ہوئی تو مجھے بار بار یہی خیال آیا کہ معاونین کو کوئی ایسی اُمید نہ دلائی جائے جسے ہم پورا نہ کر سکیں اور کوئی ایسی خوبی پیدا نہ کی جائے جو محض عارضی ہو اور جسے ہم مستقل طور پر پیش نہ کرتے رہیں خدا کا شکر ہے کہ گزشتہ سال میں ہمایوں اک بلند تر سطحِ ادب پر آگیا ہے اسکی ایک بڑی وجہ جائنٹ ایڈیٹر کی توجہ اور قابلیت ہے۔

اشاعت میں وقت کی پابندی اب بھی بدستور قائم رہی رسالہ کا حجم بڑھایا گیا۔ بہ نسبت پہلے کے تصاویر میں اضافہ کیا گیا اور مضامین میں علمی اخلاقی سودمندی کے ساتھ ادبی و معاشرتی دلچسپی کا بھی لحاظ رکھا گیا۔ ہر نمبر میں لطیف و سبق آموز افسانوں کے عنصر کی موجودگی ضروری سمجھی گئی علاوہ بریں زبان و بیان کی شستگی اور کتابت و طباعت کی درستگی کی طرف خاص طور پر توجہ کی گئی۔

ناظرین ہمایوں یہ سُن کر خوش ہونگے کہ گزشتہ سال میں ہمایوں کی اشاعت پہلے سے پچاس فیصدی کے حساب سے بڑھ گئی ہے معاونین ہمایوں سے فرداً فرداً استدعا کیجاتی ہے کہ وہ سالِ رواں میں اپنے اپنے عزیزوں و دستوں میں ہمایوں کی اشاعت کی کوشش کریں اور ہمیں موقع دیں کہ ہم ہمایوں کو اور زیادہ بلند معیار پر لے آئیں۔

اہلِ قلم کی بیش بہا اعانت کا شکریہ واجب ہے۔ پروفیسر مرزا محمد سعید اور مولانا وحید الدین سلیم کے کار آمد ادبی و تنقیدی مضامین، میاں عبد العزیز کی فلک پیمائیاں، سید سلطان حیدر جوش کی خیال آفرینیاں، خواجہ حسن نظامی کی حقیقت نمائیاں اور سید سجاد حیدر اور مولانا راشد الخیری کی افسانہ طرازیاں باعث زیب و زینت ہوئیں، میاں عطا الرحمن کی افسانہ نگاری بدستور سابق پھول کھلاتی رہی جناب صادق ایوبی کی مغربی گلچینی سے ہمارا دامن نکہت بار رہا۔ پروفیسر محمد یوسف کی فلسفہ بیانی نے معلومات میں اضافہ کیا۔ نسوانی مضمون نگاروں میں ح۔ ب صاحبہ۔ ز۔ ب صاحبہ۔ تہذیب فاطمہ صاحبہ اور بیگم خالد صاحبہ کی خیال آرائیوں نے ہمایوں کو چار چاند لگائے۔ شعرائے شیریں بیان حضرات اثر صہبائی، آزاد انصاری، راز چاند پوری، امین حزیں سیلم اور قمر تلہ

وغیرہ نے اپنے کلامِ بلاغت نظام سے ہمارے حصۂ نظم کو پہلے سے بہت زیادہ دلکش بنا دیا +

نقاشی و مصوری میں "مصوری ہند" اور "ہندوستان کی پیکر نگاری" زمرزدہ محمد حامد صاحب اور "جدید فن مصوری" از عطاالرحمٰن صاحب مفید مضامین تھے۔ "شاعر اور آفتاب بہار" میں اکبر منیر صاحب نے نیم مردہ طبائع کو اک امید افزا اور حیات بخش پیغام دیا۔ اور مولوی حمید احمد خاں کے مضامین "حریت اور اسلام" اور بالخصوص "اسوۂ حسنہ" فی الحقیقت معرکتہ الآرا اور غایت درجہ ایمان پرور تھے، ہمیں اُمید ہے کہ موصوف بزم ہمایوں کو اپنی جادو بیانی سے مسحور کرتے رہینگے +

سید امتیاز علی تاج کا مُدت کے بعد ہماری محفل میں آنا ہمارے لئے باعثِ مسرت ہے، نئے سال میں ناظرین بعض نئے لکھنے والوں سے بھی روشناس ہونگے اور ہمیں امید ہے کہ ہمایوں پہلے سے زیادہ گوناگوں دلچسپیوں کا ایک مخزن بن جائیگا +

کچھ عرصے سے اگر ہمایوں نے ترقی کی ہے تو میدانِ ترقی میں وہ تنہا نہیں رہا۔ ہماری علمی ادبی زندگی نے ہماری قومی زندگی کے ساتھ ساتھ آگے کو قدم بڑھایا ہے اور ایسا کیوں نہ ہوتا کبتک نہ ہوتا؟ ہم بھی جاگے ہیں اور ہمارے ادب میں بھی زندگی کا خون گردش کرنے لگا ہے، خدا کرے کہ صالح خون پیدا ہو۔ معارف، اردو، نگار، علیگڈھ میگزین، سہیل، نیرنگِ خیال، شاب اُردو کے علاوہ بیسیوں اور رسالے اپنے اپنے حلقہ میں قوم و زبان کی مفید خدمت کر رہے ہیں، پہلے سے ظاہری صورت زیادہ دلکش اور باطنی خوبیاں زیادہ نمایاں ہو رہی ہیں علاوہ تہذیب نسواں کے تبلیغ نسواں، عصمت، سہیلی، نورجہاں وغیرہ نسوانی رسائل خالص نسوانی حلقوں کی اصلاح و ترقی کا کام کر رہے ہیں لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ بعض خدامِ قوم و ادب اپنے زعم میں ترقی کرتے کرتے اسقدر آگے بڑھ گئے ہیں کہ وہ اپنے "پسماندہ سُست خرام" بھائیوں پر ذاتی حملے کرنا اپنا قومی حق اور اک قومی خدمت بھی سمجھتے ہیں، اصلاح طعن و تشنیع سے نہیں ہوتی دوسروں کی اصلاح صرف خود اچھے کاموں میں مصروف رہنے سے ہو سکتی ہے، اور اگر طعن و تشنیع ہی پسند ہے تو ابھی اُن قوموں کے طعنے سنو جو کبھی ہم سے پیچھے تھیں لیکن آج جنکے پاؤں تلے کی گرد ہمیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے، قوم اگر تمہارے کام کی طرف متوجہ ہے تو تم کام کئے جاؤ۔ کیا کام کرنیوالوں سے نوک جھونک بھی اک ادبی شغلہ ہے اک علمی معرکہ ہے جس سے قوم میدانِ ترقی میں دوسری قوموں کو پچھاڑیگی؟

یہ باتیں فتنہ پردازیاں ہیں جن کی گرم بازاری کے باعث غیروں کی ترقیوں سے بے پروائی اور لاعلمی ہمتی ہے، ہم اپنے ہی تنگ حلقوں میں مشغول رہتے ہیں ہم صرف اپنی اردگرد کی چیزوں میں مصروف رہتے ہیں اور نہیں دیکھتے کہ دنیا میں دور و نزدیک کیا کچھ ہو رہا ہے؟

مانا کہ ہماری علمی زندگی میں ترقی ادب کی ضرورت ہے اسلئے اگر سرد مزاجی کے ساتھ تنقید کا حق ادا کیا جاسکے تو ایسا کرنا لازم ہے لیکن اس میں بھی شک و شبہ کی گنجایش نہیں کہ اخلاقی اصولوں پر عمل کئے بغیر ہم نہ علم میں نہ سیاست میں نہ معاشرت میں کچھ ترقی کرسکتے ہیں تنقید علمی ترقی کی جان ہے لیکن اسکو کیا کریں کہ ہم عموماً تنقید و تنقیص میں امتیاز نہیں کرتے اور ذاتیات کے عملیات میں گرفتار ہو جاتے ہیں

خیر خدا کا شکر ہے تنقید ہے تنقیص ہے مگر ترقی تو ہے نااتفاقی ہے بے اعتدالی ہے لیکن کام کی مشغولی بھی ہے کچھ کرنے نے ہمیں کچھ نہ کرسکنے والے بنا رکھا تھا اب کچھ نہ کچھ کرنے سے کچھ نہ کچھ ہوگیا ہے اور ہو رہیگا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا!

جہاں نما

۱۹۲۶ء گذر گیا۔ ۱۹۲۷ء کو اس نے کیا پیغام دیا؟ وہی جو ہر سال گذشتہ ہر سالِ رواں کو دیتا ہے کہ میں نے تین سو پینسٹھ دن اس آباد زمین کو گردش دی اور کئی کروڑ میل تک میں اسکے ساتھ گھوما کیا۔ اُبھرنے والوں کو میں نے اُبھارا گرتے ہوؤں کو میں نے گرایا کمال کو زوال اور زوال کو کمال کر دکھایا جس نے اپنا ساتھ نہ دیا میں نے بھی اُسکا ساتھ چھوڑا جس نے اپنی آپ مدد کی میں نے بھی اُسکی مدد سے دریغ نہ کیا۔ کوشش کا نتیجہ محنت کا پھل کام کا دام میں بنا۔ کاہلی کی سزا عشرت کا خمیازہ علم کا حاصل میں ہوا بس میں اپنا کام کر چکا ہوں میری مہلت ختم ہوئی۔ اب تو اپنا کام کر کہ اب دُنیا میں تیرے نام کا سکہ جاری ہوگا۔ میں دُنیا کو جس حال میں چھوڑ کے جاتا ہوں وہ دیکھ لے +

انسانیت بیدار ہو رہی ہے قومیں اُبھر رہی ہیں اور جو قومیں دب رہی ہیں وہ بھی دب دب کر اُبھرتی نظر آتی ہیں۔ جب آزادی کا نام آزادی ہے تو اُسکے پاؤں میں دیر تک غلامی کی بیڑیاں نہ پڑی رہینگی جب انسان کا نام انسان ہے تو وہ ہمیشہ کے لئے حیوان نہ بنا رہیگا کوئی دن جاتا ہے کہ بندشیں آزاد ہو جائینگی اور انسان فرشتہ بن جائیگا!

انگلستان ۔ ہمارا "مجازی حاکم" اپنی حکمرانی میں مگن ہے۔ اُسکا تسلط ابھی دُنیا کے بہت سے سرسبز مقامات پر قائم ہے، کاہل قومیں ابھی اُسکی غلامی کا طوق زیب گلو کئے ہوئے ہیں، مجلسِ اقوام میں اُسکی آواز کا رعب ہے سمندروں پر اُسکے جہازوں کا دبدبہ ہے اور اُسکے روپے کی جھنکار بدستور دُور دُور تک سُنائی دیتی ہے "قدامت پسند" محنت و سرمایہ کی جنگ کو کنکھیوں سے دیکھتے ہیں اور سرمایہ داروں کی فتح پر جی ہی جی میں خوش ہوتے ہیں + انگلستان جدت پسند نہیں اُس کے مقبوضات اسقدر وسیع اور اُسکا زر و دولت اتنا کثیر ہے کہ اُسکے لئے صرف موجودہ حالت کو برقرار رکھنا ہی معراجِ ترقی ہے، اور اسی لئے وہ جدید خیالات سے فقط اس حد تک متاثر ہونا چاہتا ہے، جہانتک وہ اُسکی فلاح و بہبود کے ضامن ہوں +

سو اگر کہا جائے کہ انگلستان کی حکمتِ عملی کو ایک لفظ میں بیان کر دو تو ہم بلا تامل کہینگے "برقراری" + یورپ میں انگلستان اپنے اقتدار کو برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ اُسکا منشا ہے کہ کوئی مغربی حکومت "براعظم" پر اتنی قوت حاصل نہ کرلے کہ دوسری سب حکومتیں اس سے خائف رہیں بلکہ مختلف دُول میں توازنِ قوت قائم رہے + یورپ کی سیاسی ترازو کو خود انگلستان ثالث بالخیر بن کر تھامے رہے، جہاں کوئی دولت یا مجموعۂ دول زیادہ طاقتور ہوتا نظر آئے، انگلستان کمزور پلڑے میں اپنا پاؤں رکھ دے اور سب کو مساوات کا سبق پھر از بر پڑھائے۔ ایشیا میں انگلستان برطانوی ہند پر اپنا قبضہ برقرار رکھنے کا خواہاں ہے۔ اسی لئے افغانستان اور تبت سے دوستی ضروری ہے اور رُوس سے دُشمنی۔ جاپان بھی حلیف رہے، تو بہتر ہے ترکی سے پرانی

عداوت ہے لیکن اب قطع نظر اس سے کہ وہ زیادہ طاقتور اور اس لئے ارتباط کے زیادہ شایاں ہو گیا ہے وہ اک مسلمان حکومت ہے اور انگلستان بھی اپنے تئیں دنیا کی ایک مسلمان حکومت بلکہ سب سے بڑی مسلمان حکومت سمجھتا ہے۔

دوآبہ دجلہ و فرات اور فلسطین پر قبضہ ہے اس لئے اگر عرب کے عرب اور ترکی کے ترک اس قبضے کی تائید کریں تو عرب میں عربوں کی حکومت اور ترکی میں ترکوں کی حکومت انگریزوں کو بسر و چشم منظور ہے۔ ایران و افغانستان کی آزادی اُس صورت میں مسلم ہے کہ روس بھی انکے خانگی معاملات میں دخل نہ دے نہ انکے گھر میں اختیار و اعتبار حاصل کرے۔ افریقہ میں انگلستان محکوم قوموں کی محکومی کو برقرار رکھنے کا تمنائی ہے اس لئے مراکش میں عبدالکریم کے خلاف وہ فرانس و ہسپانیہ کو فاتح دیکھنا چاہتا ہے اور طرابلس میں سنوسیوں کے مقابل میں اطالیہ کو ظفرمند ورنہ اگر ان دول یورپ کے بعض مقبوضات چھن جائیں تو برطانیہ کا کیا ہرج ہے بلکہ اُسے اِن کے اقتدار کی کمی سے شاید فائدہ ہی ہو لیکن اگر وہ انکے گھاٹے پر خوش ہو تو یہ کس طرح انکے سیاہ و سفید پر صاد کریں اگر انکے عرب و بربر آزاد ہو جائیں تو اُسکے ہندی و حبشی کیونکر غلامی پر قانع رہیں۔ امریکہ میں بھی انگلستان قائم شدہ حدود میں اپنی بہبود سمجھے ہوئے ہے کہ اُسکے لئے وہاں کینیڈا کی سرزمین از بس غنیمت ہے۔ غرض دنیا بھر میں انگلستان کا سیاسی نصب العین یہی ہے کہ نہ کسی کی مملکت زیادہ ہو نہ میری کم۔ کیوں نہ ہو ؎

جو قسمت سے زیادہ بھت ہے ۔۔۔ اور بہت کیا کرتا ہے

امریکہ - دنیا کا سب سے بڑا جمہوری سرمایہ دار ہے۔ جنگ و جدل میں یورپ سے دو قدم پیچھے رہتا ہے لیکن تمدن و زراندوزی میں اُس سے چار قدم آگے۔ جو کچھ دوسرے جھپٹ جھپٹ کر اکٹھا کرتے ہیں وہ لین دین سے سب سمیٹ لیتا ہے۔ اُسکے گھر میں عورت مرد برابر کے انسان ہیں اس کا نتیجہ صلح صفائی ہو یا لڑنا جھگڑنا۔ اس سے اُسے غرض نہیں۔ اُسکی درسگاہوں میں لڑکے لڑکیاں مل کر تعلیم پاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ کبھی کبھی شاب آرائی بھی ہو تو ہُوا کرے۔ اُسکی عیسائیت طلاق کو جائز شراب کو ممنوع اور تثلیث کو وحدانیت اور اخلاقیات میں تبدیل کر رہی ہے۔ سنتے ہیں کہ جس قدر ہم یورپ سے پیچھے ہیں اُسی قدر یورپ بعض باتوں میں امریکہ سے پیچھے ہے۔

فرانس - کی جمہوری حکومت نے عبدالکریم کی حریت کو جلاوطن کر کے تمدنی ثواب حاصل کیا ہے اور اقوام غالب کی دعائیں لیں۔ اُسکے بھولے بھٹکے ریسائی نے پھر قلمدان وزارت کو سنبھالا اور اپنی ریشہ دوانی سے کھوٹے سکوں کو کھرا کر دکھایا۔

اطالیہ - روما کی گئی گذری عظمت کو زندہ کرنا چاہتا ہے۔ قوت کے تعاقب میں اُس کا بطلِ اعظم

کمزوروں کو مسل ڈالنے پر آمادہ ہے اور موقع ڈھونڈ رہا ہے۔ مغربی نقطۂ نگاہ سے مسولینی اس وقت دنیا کی سب سے زبردست شخصیت ہے ۔

ملکوں میں بعض اوقات زور و قوت کا اک طوفان برپا ہُوا کرتا ہے قومیت جوش میں آتی ہے۔ رُوحِ عمل بیدار ہو جاتی ہے۔ اطالیہ میں آجکل یہ کیفیت ہے۔ اطالوی آزادی کی جنگ کے بعد اطالیہ نے دُولِ عظمیٰ میں جگہ پائی اور اس نعمت کو غنیمت جان کر اطمینان کی زندگی بسر کرنی شروع کی۔ دو چار دفعہ ہاتھ پاؤں ضرور مارے سمالی لینڈ کا ایک حصّہ ہضم کیا۔ طرابلس پر چھاپہ مارا۔ جنگِ عظیم میں غداری کی اور جرمنی کو فاتح نہ ہوتے دیکھ کر اتحادیوں کا ساتھ دیا لیکن ہر پیش قدمی میں ایسی بدنظمی اور بُزدلی کا ثبوت دیا کہ اطالوی بود اپن یورپ میں ضرب المثل ہو گیا۔ لڑائی کے بعد آسٹریا کا ایک حصّہ سمیٹ کر فرانس اور جرمنی کو ذرا کمزور پا کر بلقان کی ریاستوں کو خاموش دیکھ کر اب یہ گیدڑ بھی بھیڑیا بن گیا ہے اور شیر برطانیہ کی مخالفت سے بچ کر دوسرے درندوں کے ڈرانے کو اردگرد کی زمین اپنے پنجوں سے کریدتا ہے کہ ہوشیار رہو جاؤ۔ اطالیہ بحرِ روم کو "اطالوی جھیل" بنانے کا خواہشمند ہے۔ البانیا پر اپنی دوستداری ظاہر کرتا ہے جس سے اہلِ بلقان خائف ہو جاتے ہیں ترکی ساحل کی طرف نظر دوڑاتا ہے جس سے ترک جھٹ اپنے بیڑے کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ اپنے جہازوں کے کیل کانٹے درست کرتا ہے جس سے فرانس اپنی بحری قوت کا جائزہ لینے لگجاتا ہے یہ سب صرف ایک حیات بخش شخصیت کا اثر ہے جو اپنی مطلق العنانی میں ملک کے اندر باہر قوت و استبداد کی مظہر ہے ۔

جرمنی۔ مجلسِ اقوام کا رکن بن کر اُس کی رُکنیت کے فوائد کی تلاش میں مصروف ہے۔ کبھی انگلستان سے دوستی پیدا کرتا ہے کبھی فرانس سے کہتا ہے کہ آؤ بھئی وہ پُرانے قصّے بھول جائیں۔ لیکن فرانس ہے کہ "شکست خوردہ" غنیم کا ہراس اس کے جی میں گھر کر گیا ہے اور وہ اپنے مخصوص انداز میں بزور مصافحہ کر کے صرف جرمنی کو انگریزوں سے الگ رکھنے کا تمنائی نظر آتا ہے ۔

جرمنی نے جس طرح کبھی جبر و طاقت آزمائی کی رزمگاہ میں اک تہلکہ برپا کر دیا تھا اُسی طرح اب اپنی سرد مزاجی اور حکمتِ عملی سے سیاست کی بزم میں اُس نے یورپ کے مدبروں کا دل موہ لیا ہے۔ مجلسِ اقوام میں اُس کا آنا تھا کہ ہر طرف سے اُس کے سر پر پھول برسائے گئے اور تحسین کے نعرے بلند کئے گئے۔ کیونکہ یہ وہی جرمنی تھا جس نے دس برس پیشتر اک دُنیا کو اپنی طاقت کا لوہا منوا دیا تھا جس کی علمی و

جنگی قابلیت کی چارسُو دھاک بندھ گئی تھی۔ لیکن جب اتحادیوں کے جمگھٹے نے گھیر کر مار لیا تھا اور اُس کا حقہ پانی بند کرکے اُس سے ملنا جلنا اک گناہِ کبیرہ قرار دیدیا تھا۔ اس معاشرتی جلاوطنی سے دُنیا والوں میں اُس کے ساتھ ہمدردی پیدا ہوئی۔ فرانس اپنے نشۂ انتقام میں سرشار رہا۔ ہاں انگلستان کی مصلحت اندیشی نے تاڑ لیا کہ ہوا کا رُخ اِدر سے اُدر ہوگیا ہے۔ اُس نے آگے بڑھ کر پُرانے غنیم کا خیر مقدم کیا اور اَوروں سے پھر اُس کا تعارف کرادیا کہ آپ ہیں ہمارے پُرانے دوست!

جرمنی تبدیلِ رائے کا پُورا فائدہ اُٹھا رہا ہے۔ جنگی سازوسامان اور فوجی تیاریوں کی مناہی سہی نقل و حرکت کے لئے ہوائی سفر میں اُس نے بیسیوں سہولتیں پیدا کردی ہیں۔ اُس کے ادویات و پارچات ہمارے جسم و جان کی محافظت میں پہلے کی طرح ہمہ تن سرگرم نظر آتے ہیں۔ جو کچھ اُس نے غلط کار توت سے کھودیا تھا اُسے اب وہ شیریں گفتار حکمت سے واپس لینا چاہتا ہے۔

رُوس۔ مغربی نکتہ چینیوں کو دیکھ کر مشرقیوں سے اتحاد قائم کرنیکی فکر میں ہے۔ دُولِ عُظمیٰ میں سے کم ازکم نصف اُسکے خلاف ہیں اُسکی طرزِ حکومت سے خائف ہیں اور اپنی اشتہار بازی سے دُنیا کو یقین دلا رہی ہیں۔ کہ رُوسی اشتراکیت و جمہوریت عنقریب فنا ہونیوالی ہے فنا ہوچکی ہے لیکن برسوں گذر گئے ہیں اور رُوس کا بالشویانہ، نداز ہنوز اُستوار ہے۔ وہ دُنیا بھر کی مفلوک الحال جماعتوں کو بہانگِ دہل اپنی اشتراکی جنگ میں شرکت کی دعوت دیتا ہے اور کہتا ہے میں ہوں وہ جو زر و دولت اور موروثیت سے مظلوم لوگوں کو رہائی دینے کے لئے بروئے کار آیا ہوں۔

جاپان۔ ایشیا کا انگلستان ہے جو اُس وقت فتوحات کے میدان میں آیا جب مغرب کے زبردست خالی زمینوں پر قبضہ کرچکے اور مشرق کے کاہل بھی اپنی گہری نیند سے کچھ بیدار ہوئے۔ چین پر اُس کا جادو نہ چلا اور سفید قوموں کے حسد کی آگ بھڑک اُٹھی یعنی زرد ہمسائے اپنے افیم کے نشے سے جاگ پڑے اور سفید اجنبی بھاگ دوڑ کر جوڑ توڑ کرنے لگے۔

ترکی۔ جس نے چند سال ہوئے یورپ والوں کے خلاف اپنی شجاعت کے ہنر دکھائے تھے اب اُن کی مجلس میں اپنے تدبر و سیاست کا سکہ جما رہا ہے۔ وہ اُدھر رُوس سے اتحاد پیدا کررہا ہے۔ اِدھر انگلستان سے معاہدہ کرر ہا ہے اور سب سے کہے جاتا ہے بھائیو! میں کسی کا دشمن نہیں میں سبھی کا دوست ہوں۔ معاشرت میں ترکی کی مغربیت پسندی خطرناک طریقے سے بڑھ رہی ہے لیکن سیاست میں وہ اُسے اُن تمام خطروں سے بچا رہی

ہے۔ جو مغرب کی سمت سے اُس کی سرحد پر دھادے مارتے ہُوئے اُمنڈ آیا کرتے تھے۔ یورپ کا "مردِ بیمار" اب ایشیا کا "مرد ہشیار" بن گیا ہے۔

چین۔ وہ مُدتوں کا سویا ہُوا اژدہا جسے مُردہ سمجھ کر مغرب کے شکاری اُسکے ہیبتناک جسم پر برسوں تک اپنا چُولھا پھونکتے رہے اُس میں اب حس و حرکت کے آثار نمودار ہو رہے ہیں۔ اُسکے گھر میں کچھ پھوٹ پڑ گئی ہے وہ ابھی قومی تنظیم سے پوری طرح واقف نہیں لیکن قومیت کے انگارے اب اُسکے مُنہ میں دہک رہے ہیں اور "مراعات جُو" اجنبی اب اُسکی پھُنکار سے ڈر ڈر کر پرے ہٹتے جاتے ہیں۔ خودداری کی روح اُس میں بیدار ہو چکی ہے اور وہ تازہ ترین اکتشافات کی تلاش میں ہے کہ اُن سے پھر اپنے قوی ہیکل جُثے میں وہ حقیقی عظمت و سطوت پیدا کرے جسے سفید لوگ کبھی اک خیالی "زرد خطرے" کے نام سے پکارتے تھے۔

ایران۔ رضا شاہ اور افغانستان امان اللہ کے مشروط استبداد میں نردبانِ عروج پر صعود کر رہا ہے۔ ترکی کی طرح یہ دونوں بھی عالمگیر مصالحت اور عالمگیر منفعت کے اصول پر چل رہے ہیں۔ تقابل و تصادم کے اِس زمانے میں اسلامی قوموں کا یورپ کی جوع البقر سے بچ کر از سرِ نو زندہ ہو جانا دُنیائے سیاست کا سب سے حیرت انگیز معجزہ ہے۔

ہندوستان۔ چڑھ چڑھ کر گرتا اور بڑھ بڑھ کر پھر پیچھے کو ہٹتا معلوم ہوتا ہے، جہاں کبھی ہندو مسلم اتحاد پر اعتقاد تھا وہاں آج اتحاد کی صدا الحاد سے کم نہیں۔ ہندوؤں میں ہندویت کا زور اور مسلمانوں میں مسلمانیت کا شور ہے۔ ہندو سمجھتے ہیں کہ ملک ہمارا تھا غیر ملکی آئے ہم اُنکے دبلائے سے دب گئے، وہ جنہوں نے طوفان اُٹھایا تھا گرد کی طرح بیٹھ گئے ہیں۔ اب وقت ہے کہ ہم اُٹھیں اور اُنکو اُٹھنے سے روکے رہیں۔ مُسلمان کہتے ہیں ہم صدیوں جس گھر میں رہے وہ گھر ہمارا ابھی ہے، ہمارے پاس زر و دولت زیادہ نہیں تعلیم بھی کچھ کم ہے لیکن ہم میں کبھی زور تھا ہم کبھی علوم کے سرمایہ دار تھے سو ہمیں اپنے اندوختہ میں سے کچھ حصہ دو اور چھوٹے بھائی سے پیار کرو۔ غرض بھائی بھائی لڑتے ہیں اور غیر چین سے بیٹھے ہیں، جانتے ہیں کہ انکے باہمی پیار کا اعتبار نہیں دو دن منے رہینگے تو دو برس پھر لڑائی ٹھنی رہیگی اگر انکو یہی منظور ہے تو ہمارا اس میں کیا قصور ہے۔ دُنیا ترقی پر ہے۔ پھر ہندوستان کیوں مائل بہ تنزل ہے؟ کیا یہ قاعدۂ کلیہ کا وہ بیش بہا مستثنےٰ ہے جو قاعدے کی صحت کا محافظ ہے؟ ہم سمجھتے ہیں اس لڑنے جھگڑنے میں بالآخر ہمارا نقصان نہیں۔ ہم نے اک عارضی صلح اک مصنوعی محبت قائم کر لی تھی جس کا مسلسل قیام اگر ممکن ہوتا تو غایت درجہ مضرت رساں بھی ضرور ثابت ہوتا۔ ہمیں معلوم ہو گیا کہ ہماری محبت کی بناء باہمی محبت نہیں محض غیروں کی مخالفت ہے۔ پھر ایسی محبت کب تک قائم رہتی اور کس لئے؟ ہمارے اختلافات کیونکر مناقشات میں رُونما نہ ہو جاتے ہماری حسد آرائیاں کیونکر رنگ نہ لاتیں؟ اچھا ہُوا کہ ہم غیروں کے ہوتے لڑ لئے ایک ستم ظریف پنچ کے ہوتے جھگڑ لئے جس نے ہماری جان و مال کی محافظت پوری کی کہ ہمیں تیر و تفنگ کے بار سے سبکدوش کر دیا۔ اب بہتر یہی ہے

جذباتِ ہمایوں

(آنریبل جسٹس میاں محمد شاہدین صاحب ہمایوں مرحوم)

اتحادِ قوم سے ہر فرد یکتا ہو گیا
قطرہ دریا میں ملا تو خود بھی دریا ہو گیا

میرے آنیکی غرض خود مجھ سے پنہاں ہو گئی
بزمِ عالم میں جو مَیں محوِ تماشا ہو گیا

دار پر کھنچ کر فنا فی الحق ہُوا منصور جب
اِدّعا جو تھا انا الحق کا وہ سچّا ہو گیا

بیکلی سے پائی کل میں نے عجب تسکینِ دل
درد بڑھ کر خود مرے دل کا مداوا ہو گیا

یا وُہ شورِ محشر اَور یا یہ خموشی قبر کی
آ کر اُس کی بزم میں اے دل! تجھے کیا ہو گیا؟

جین بپٹائیز گرز جس کی ایک تصویر وفا کے عنوان سے ہمایوں کی موجودہ اشاعت کی زینت ہے ۱۷۲۵ء میں پیدا ہُوا وہ اٹھارھویں صدی کے فرانسیسی مصوروں میں سب سے زیادہ مشہور تھا۔ عام طور پر اُسکی مصوری کے نمونے بچوں اور نوجوان لڑکیوں کی تصاویر پر مشتمل ہیں ٭

بچپن ہی میں گرز کی طبیعت کا رجحان مصوری کی طرف تھا۔ اس کا باپ اُس کے اِس شغل کو بالکل بے مصرف اور بے سود سمجھتا تھا۔ اُس نے بہت کوشش کی کہ گرز یہ خیال چھوڑ کر کوئی مفید کام سیکھے لیکن گرز کی طبیعت میں قدرت نے جو جوہر ودیعت کر رکھا تھا اس کا چھُپا رہنا غیر ممکن تھا۔ جب اسکے باپ نے دیکھا کہ گرز کسی طرح اس خیال کو نہیں چھوڑتا تو وہ اُسے لیانز لے گیا اور وہاں جا کر اس نے گرز کو کام سیکھنے کے لئے ایک مصور گرانڈن کے سپرد کیا اس شخص نے بقول گرز کے "تصویروں کا کارخانہ" کھول رکھا تھا اور وہاں اپنے مددگاروں کے ذریعہ سے سیکڑوں تصویریں فروخت کے لئے پیدا کیا کرتا تھا۔ بعض اوقات گرانڈن شہر کے مضافات کا دورہ کیا کرتا۔ اور اس دَوران میں تاجروں اور اُن کی بیبیوں اور لڑکیوں کی تصویریں بنایا کرتا۔ ان موقعوں پر گرز بھی گرانڈن کے ساتھ جایا کرتا تھا۔ اور اس کا نوجوان دل جو حسن کی تلاش کے لئے بیقرار تھا اپنے گردوپیش اپنی تسکین کا سامان فراہم پاتا تھا۔ اس زمانے میں جو نقوش اسکے دل نے قبول کئے تمام عمر اسکے قلم اور اس کے خیالات سے ظاہر ہوتے رہے ٭

عنفوانِ شباب ہی سے عورت کا حُسن اور شباب اس کی دلچسپی کا مرکز رہا اور بالآخر اس کی اکثر تصاویر کا موضوع بھی یہی رہا ٭

محبت کا غالباً سب سے پہلا تجربہ اُسے اُسی زمانے میں ہُوا جب وہ گرانڈن کے گھر میں مصوری کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ وہاں اسکے دل میں اپنے استاد کی نوجوان اور خوبصورت بی بی کے متعلق احترام آمیز محبت کے جذبات کی پرورش ہوئی۔ اگر مادام گرانڈن کی بیٹی ایک خاص واقعہ نہ دیکھ لیتی تو کبھی کسی کو اس حقیقت کا علم بھی نہ ہوتا۔ ایک دن مادام گرانڈن کی بیٹی اچانک تصویر خانے میں داخل ہُوئی تو اس نے دیکھا کہ گرز فرش پر اس طرح جھکا ہُوا ہے جیسے کوئی کسی چیز کی تلاش کر رہا ہو اور گرز نے بھی اپنی اس حالت کی یہی توجیہ کی

لیکن مادام گرانڈن کی بیٹی نے دیکھ لیا کہ وہ اس کی ماں کے پاؤں کے ایک جوتے کو جو وہاں پڑا تھا چوم رہا ہے۔ اس واقعہ کے بیان سے محض گرز کی شاعرانہ طبیعت کا اظہار مقصود ہے ؛

گرانڈن سے فارغ التحصیل ہونیکے بعد گرز نے کام شروع کرنیکے لئے سیدھا پیرس کا رخ کیا۔ یہاں اسے ابتداء میں بہت ہی دقتوں کا سامنا ہُوا لیکن اس نے اپنے اعتمادِ نفس سے تمام مشکلات کا جم کر مقابلہ کیا اور آخر کار اسکے سر پر کامیابی کا سہرا باندھا گیا ؛

۱۷۵۵ء کے موسم خزاں میں گرز نے اٹلی کا سفر کیا اور وہاں ایک عرصہ تک مقیم رہا۔ اس دوران میں اس نوجوان خوبصورت مصوّر کو روم کے ایک ڈیوک نے اپنی بیٹی کی مصوری کی تعلیم کے لئے مامور کیا۔ لیکن نوجوان شہزادی لوٹیشیا کو اپنے اُستاد کے ساتھ محبت ہوگئی گرز نے آخری عمر میں اپنی شاگرد لڑکیوں کے سامنے بے غرض محبت کا تذکرہ کرتے ہوئے شہزادی لوٹیشیا کی داستان بیان کی ؛

اُس نے بتایا کہ وہ قرائن ہی سے سمجھ گیا تھا کہ اُس کی شہزادی کے دل میں اسکی محبت پیدا ہو رہی ہے اور چونکہ اسے پہلے ہی شہزادی سے محبت تھی اگر دونوں کے درمیان فرقِ مراتب کی خلیج حائل نہ ہوتی تو پھر کوئی اندیشہ نہ تھا۔ لیکن اپنی صورتِ حال کو مدِّ نظر رکھ کر گرز نے مصلحت کے تقاضے سے مناسب ہی سمجھا کہ شہزادی سے الگ ہو جائے۔ یہ بات خود اسکے لئے بہت دشوار تھی۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ اسے اپنے کام سے بھی مطلق دلچسپی نہ رہی۔ ادھر شہزادی لوٹیشیا غم سے بیمار ہوگئی اسکی بیماری کی خبریں گرز کے دل کو سخت رنج پہنچاتی تھیں۔ ایک دن ڈیوک جس کو اس واقعہ کا مطلق علم نہ تھا۔ گرز کو راستہ میں ملا۔ اس نے اُسے محل سے اس قدر عرصہ کے لئے غیر حاضر رہنے پر ملامت کی، وہ اُس سے اپنے کسی دوست کو تحفہ کے طور پر دینے کے لئے چند تصویریں بنوانا چاہتا تھا۔ آخر گرز کو مجبوراً محل میں جانا پڑا۔ یہاں لوٹیشیا کو اس سے ملاقات کا موقع ملا۔ اس نے گرز سے کہا کہ میں اپنی تمام جائداد جو مجھے اپنی ماں سے ترکہ میں ملی ہے تمہارے نام منتقل کر دونگی اور تمہارے ساتھ پیرس کو چلی جاؤنگی۔ گرز نے پہلے تو یہ بات مان لی، لیکن بعد میں یہ سوچ کر کہ اس فرار کی شادی سے شہزادی اپنے باپ اور دوسرے عزیزوں سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو جائیگی۔ اس نے اس صورت کو قابل عمل نہ سمجھا۔ مگر شہزادی کے سامنے انکار کرنا مشکل تھا۔ کبھی وہ یہ سوچتا کہ شہزادی سے کہدے کہ مجھے تم سے محبت نہیں، لیکن یہ بات اسکے لئے ممکن نہ تھی کیونکہ وہ خود نہ چاہتا تھا کہ شہزادی کے دل میں اس قسم کا خیال تک بھی پیدا ہو۔ وہ اسی کشمکش و پیچ میں تھا کہ شہزادی کے باپ نے اسکی شادی ایک کاؤنٹ

سے ٹھہرائی اور چونکہ گرز کی رضامندی کی کوئی صورت نہ نظر آتی تھی اسلئے لوٹیشیا نے بھی سر تسلیم خم کر دیا۔ شادی کے بعد گرز بھی اس کاؤنٹ سے ملا۔ اس نے گرز کی مصورانہ قابلیت کی تعریف کی اور اس سے لوٹیشیا کی ایک تصویر بنوائی۔ گرز نے خفیہ طور پر اپنے لئے بھی شہزادی کی ایک تصویر بنائی اور اسکے بعد فرانس کو روانہ ہو گیا ؛

اس بات کے آٹھ سال بعد گرز کو شہزادی کے متعلق معلوم ہوا کہ اب وہ پانچ بچوں کی ماں ہے انہیں دنوں گرز کو شہزادی کا ایک خط بھی ملا جس میں اس نے اسکی مہربانیوں کا شکریہ ادا کیا تھا۔ خط و کتابت کا یہ سلسلہ شہزادی کے مرنے تک قائم رہا۔ گرز کو شہزادی کی موت سے سخت رنج پہنچا ؛

گرز کی شادی ایک کتب فروش کی بیٹی این سے ہوئی۔ یہ لڑکی خوبصورت تھی اور گرز کی اس سے اکثر ملاقات ہوتی رہتی تھی لیکن اسے شادی کا خیال تک نہ تھا۔ این نے خود اسے شادی کا پیغام دیا اور مختلف طریقوں سے اسے شادی کرنے پر مجبور کر دیا۔ آخر گرز کی شادی اسی سے ہوئی اور وہ ہنسی خوشی رہنے لگے۔ گرز کی تصویروں میں این کے خد و خال اور اعضا کا عکس نظر آتا ہے۔ این نے گرز کی مصوری پر بہت نمایاں اثر کیا۔ لیکن وہ بہت اسراف پسند تھی اسکی اس قسم کی عادتوں کی وجہ سے گرز کی زندگی آخر تلخ ہو گئی اور ستر سال کی عمر میں اسے اس سے بالکل علیحدگی اختیار کرنی پڑی۔ اس زمانے میں گرز نہایت مفلوک الحال ہو گیا ؛

۱۸۰۵ء میں گرز کا انتقال ہوا جس وقت اس کا جنازہ گزر رہا تھا۔ ایک عورت جو سیاہ نقاب پہنے ہوئے تھی اس کے کفن پر "سدا بہار" پھولوں کا ایک ہار ڈال گئی۔ اسکے ساتھ کاغذ کے ایک پرزہ پر یہ الفاظ لکھے تھے:-

"یہ پھول اس کی عظمتِ شان کے لئے بطورِ نذر اس کی ایک شکر گزار شاگرد کا ہدیہ ہیں"۔

کہتے ہیں کہ جب نپولین کو گرز کی موت اور اس کی مالی پریشانیوں کی خبر ملی، تو اس نے کہا "گرز نے مجھے اطلاع کیوں نہ دی۔ اگر مجھے علم ہوتا تو میں زر و جواہر اسکے قدموں پر نثار کرتا ؛

حامد علی خاں

دُنیا کی معاشرتی و مذہبی تاریخ پر اک نظر

دُنیا میں ہر کمال کو زوال ہے ہر ترقی کے لئے تنزل ہے۔ بہت سے تمدن تھے کہ جنکا چراغ روشن ہُوا اور بُجھ گیا بہت سی قومیں تھیں کہ اُبھریں اور مٹ گئیں! بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ نشیب و فراز اک کھیل تماشا تھا جو کسی کے دل بہلانے کے لئے جاری ہوا لیکن ذرا غور سے دیکھو تو اس صدیوں کے اُلٹ پھیر میں قدرت کے اٹل قانون خاموشی سے اپنا کام کرتے نظر آتے ہیں اور یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوجاتی ہے کہ قوموں اور ملکوں کا عروج انحطاط میں تبدیل ہوجائے مگر دُنیا بلکہ تمام کائنات ہمیشہ ترقی پر ہے کمال زوال ہوتا ہے کہ اُس میں سے اک اور کامل تر کمال رُو نما ہوا اور ہر تنزل کے بعد کی ترقی پہلی ترقیوں سے سبقت لے جاتی ہے!

اس زمانے میں جسے زمانہ قبل تاریخ کہا جاتا ہے انسان کی زندگی فقط اُس کی حیوانی مصروفیتوں پر مشتمل تھی وہ کھوہوں اور غاروں میں رہتا اور جنگل کی پھل پھلاڑی سے اپنی خوراک مہیا کرتا۔ کچھ مدت بعد جب اُس نے پتھر سے آگ نکالنا اور جانوروں کو پالنا سیکھا تو اُسے صید و شکار کا شوق ہُوا اور وہ غاروں کو چھوڑ کر میدانوں میں پھرنے لگا۔ اُس نے بیج بونا اور غلّہ کاٹنا شروع کیا۔ وہ آوارہ گرد تھا اب آباد کار بن گیا۔ دھاتوں کے استعمال سے صنعت و حرفت کا آغاز ہُوا۔ اور دُنیا کے مختلف حصوں کی مختلف پیداواریں تجارت کا ذریعہ بن گئیں۔ بتدریج اُس نے گاؤں اور شہر بسائے اور جسم و جان کی حفاظت سے گذر کر وہ دل و دماغ کی قوتوں کو کام میں لایا۔ اُس نے علم و ہنر کو بڑھایا۔ اور تہذیب و تمدن کی بنیاد ڈالی اُس نے مذہب و فلسفہ کو چمکایا اور اُن کی روشنی سے عالم کو بقعۂ نور بنا دیا۔ صدیوں صدیاں گذرتی گئیں۔ چھوٹی بستیوں میں ریاستیں بنیں ریاستوں میں سلطنتیں قائم ہُوئیں اور بالآخر دنیا کی بعض سر سبز و زرخیز وادیوں میں اُن مشہور تہذیبوں کا نشو و نما ہُوا جن کے کارنامے تاریخ کے اولیں صفحات کی زیب و زینت ہیں، وادیٔ نیل میں مصری وادیٔ ہوانگ ہو میں چینی وادیٔ دجلہ و فرات میں بابلی و اشوری اور وادیٔ سندھ و گنگا میں ہندی تمدن کا بول بالا ہُوا +

ہم نے چند لفظوں میں تہذیب و انسانیت کے ارتقا کی تصویر کھینچ دی ہے گویا یہ ارتقا چند صدیوں میں تکمیل کو پہنچ گیا حقیقت یہ ہے کہ ہماری رفتار ترقی اس قدر ہلکی ہے کہ انسانیت کی چیونٹی کہیں ہزاروں سال میں جاکر چند قدم کا فاصلہ طے کرتی ہے۔ مغربی سائنس کے مشکوک اندازے کے مطابق تین ارب سال ہُوئے کہ

زمین سورج کے بطن سے پیدا ہوئی۔ اسی کروڑ سال ہوئے کہ یہاں زندگی کا ظہور ہؤا اور پانچ لاکھ سال ہُوئے کہ انسان ظاہر ہؤا +

زمانۂ حجریۂ قدیمہ کا آغاز ایک لاکھ سال ق م میں ہُوا۔ پچاس لاکھ سال ق م میں جب انسان چوتھے زمانۂ برف کی سردی سے بچنے کے لئے غاروں میں رہنے لگا تو اُس نے زیادہ نفیس سنگین اسلحہ بنانے شروع کئے اور غالباً بیس ہزار ق م میں اُس نے آگ جلانا سیکھا، دس ہزار سال ق م میں جدید **زمانۂ حجریہ** کا آغاز ہُوا۔ گرمی کا زمانہ آیا انسان نے غاروں کو چھوڑا اور بعض لوگ جنوب سے شمالی ملکوں کی طرف چلدیئے اس زمانے کے ختم ہونے سے پہلے انسان نے بعض نہایت مفید و اہم باتیں دریافت کیں۔ جانوروں کے شکار کے بجائے اب وہ مچھلیوں پر گذر اوقات کرنے لگا۔ اُس نے جانوروں کا پالنا اور کھیتی باڑی کرنا سیکھا۔ وہ جھونپڑوں میں رہنے لگا اور بعض مقامات میں اُس نے اپنے رہنے کے لئے جھیلوں میں مصنوعی جزیرے بھی بنا سئے + قدیم زمانۂ حجریہ میں اُس نے اک بولی کے ذریعے سے اپنے خیالات کا اظہار کرنا سیکھا تھا جدید زمانۂ حجریہ میں اُس نے اس بولی کے لفظوں کو لکھنے کا طریق ایجاد کیا + اس زمانے کے بعد مشرق میں (۵۰۰۰) پانچ ہزار سال ق م میں اور مغرب میں ۲۰۰۰ دو ہزار سال ق م میں **زمانۂ فلزات** کا آغاز ہؤا جب انسان نے پہلے تانبا پھر سیسہ اور پھر لوہا دریافت کیا + دھاتوں کی دریافت نے تمدن میں اک انقلاب پیدا کر دیا۔ گھر کے برتن کام کے اوزار اور جنگ کے آلات زیادہ عمدہ اور زیادہ کارآمد بننے لگے۔ سیسے کے اوزاروں سے مصریوں نے اہرام تعمیر کئے اور لوہے کے آلاتِ حرب سے اشوریوں نے وہ زبردست فوجیں تیار کیں جنہوں نے آس پاس کے مُلکوں میں بیدریغ خون کی ندیاں بہادیں +

ارسطو کا قول ہے کہ "انسان ایک معاشرتی جانور ہے"۔ دائرۂ معاشرت کے باہر وہ کبھی نہ زندہ رہا ہے نہ رہ سکتا ہے + اس **معاشرت** کی پہلی صورت شکاریوں کی ٹولیوں میں تھی + پالتو جانوروں کی اعانت اور کھیتی باڑی کی معاش سے انسان صید و شکار کے اتفاقات سے بالا بالا زندگی بسر کرنے لگا۔ جدید زمانۂ حجریہ میں ایک طرف تو صحراؤں اور میدانوں میں گلہ بانوں کی قومیں پھرنے لگیں دوسری طرف سرسبز و شاداب وادیوں میں زراعت کرنے والی قوموں نے بود و باش اختیار کی + گلہ بان صحرائے اعظم مُلکِ عرب اور وسط ایشیا کے لق و دق میدانوں میں گھومنے لگے مزارعین نیل وجلہ و فرات سندھ و گنگا ہوانگ ہو دیانگ تسی کیانگ کی وادیوں میں بس گئے + گلہ بانی بربریت کے درجے سے آگے نہ بڑھ سکی۔ چند ہزار گلہ بانوں کے لئے کئی لاکھ

مربع میل زمین درکار ہوتی اور جب وہاں بھی دانہ پانی کی کمی ہوتی تو گلہ بان بے تحاشہ مزارعین کے گھر بار پر جا پڑتے اور تباہی و بربادی پھیلاتے چلے جاتے + زراعت تمدن کا زینہ بن گئی۔ مرد کھیتوں اور باغوں کی نگہداشت کرتا عورت گھر بار اور بچوں کی دیکھ بھال کرتی + اس طرح ایک حد تک مرد عورت کا کام جدا جدا ہو گیا اور دونوں کو اپنے اپنے کام میں پہلے سے زیادہ مہارت حاصل ہوئی +

دُنیا کے مختلف حصّوں میں جو مختلف لوگ بس گئے تھے انہیں مختلف قوموں کی صورت میں ایک دوسرے سے واسطہ پڑا۔ اول اول تو اس تقسیم کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب کسی قوم کا خطّۂ زمین دانے چارے سے خالی ہو جاتا یا جب اُسے کسی اور زیادہ زرخیز قطعۂ زمین کا پتہ چلتا تو وہ اک دوسری قوم پر جا چھاپہ مارتی اس طرح برسوں بلکہ صدیوں جنگ ٹھنی رہتی۔ ان لڑائیوں میں سخت ترین وہ تھیں جو خانہ بدوشوں اور شہر آبادوں کے درمیان چھڑیں اور جن کے اثرات کی اہمیت کی تاریخ انسانی ہزاروں سال تک شاہد رہی + لیکن خوش قسمتی سے اس تقسیمِ قومی کے بعض اچھے نتائج بھی تھے۔ قوم کے اندر جنگ کی کامیابی اور نسل کی بقا کے لئے ایسی ایسی صفات پیدا ہوگئیں کہ مصیبت باعثِ رحمت اور جنگ باعثِ ترقی ثابت ہُوئی۔ لوگ ایک مشترک غرض کے لئے مل کر کوشاں ہُوئے اُنکے دلوں میں اتحاد کی رُوح پیدا ہُوئی انہوں نے حکم برداری کی عادت سیکھی اور وہ اپنے ذاتی آرام کو قوم کی بہتری پر قربان کرنے لگے + اس کے علاوہ باوجود جنگ کے آہستہ آہستہ قوموں میں تجارت اور تبادلۂ خیالات کی بنیاد پڑی جس سے ایک خطۂ زمین کا تمدن دوسرے خطّۂ زمین کے تمدّن سے غیر محسوس طور پر متاثر ہونا شروع ہوا + پھر ہر قوم کے اندر باہمی حفاظت امن و امان اور بقائے زندگی کے لئے جان و مال کے لحاظ دیا ہم شادی استواری عہد ادائیگی رسوم وغیرہ کی نشوونما ہُوئی۔ ان خیالات وعادات نے قوم کو بگڑنے اور فنا ہونے سے بچایا + مدتوں اخلاق کی قوت محض قومی دائرے تک محدود رہی۔ قوم کے دائرے کے باہر اخلاق برتنا انسان نے صدیوں کے بعد سیکھا اور آج اس شائستگی کے عہد میں بھی قدرت کا اُستاد اکثر اپنے ہٹ دھرم شاگرد کو یہی مشکل سبق پڑھاتا نظر آتا ہے۔ یہ **اخلاق کی اِبتدا تھی** +

جسم و جان کی حفاظت انسان کا پہلا کام تھا لیکن اسی میں ہزاروں اور کام مضمر تھے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ چقماق سے آگ نکالنا وحشی جانوروں کا سدِّباب کرنا پتھروں اور دھاتوں کی مدد سے مکانات اور اسلحہ تیار کرنا ان دریافتوں کے ساتھ ساتھ انسان نے ایک خاص زبان کا استعمال اور پھر اس زبان کے الفاظ

فقرات کا قلمبند کرنا ایجاد کیا۔ صرف اسی پر بس نہیں بلکہ قدیم زمانۂ حجریہ کے غاروں میں قدیم انسان کی تصویر کشی کے بعض حیرت انگیز نمونے پائے گئے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ خدائے ذوالجلال نے شروع ہی سے انسان کو دوسرے حیوانوں کی راہ سے الگ ایک راہ دکھادی تھی + یہ **علم وفن کی ابتدا** تھی + بعد میں وادیوں میں رہنے والی قوموں نے جب امن کی زندگی بسر کرنی شروع کی تو انہوں نے کھیتی باڑی کے نئے آلات ایجاد کئے۔ آبپاشی کے نئے طریقے نکالے۔ خشکی پر اینٹ پتھر کے مکان بنائے پانی پر کشتیاں اور جہاز چلائے۔ پھر مساحت اور نجوم کتابت اور نقاشی فلسفہ اور دینیات فنون و ادب صنعت وحرفت انسان کے چمن میں ہر رنگ کی کلیاں پھوٹیں اور ان کی بھینی بھینی خوشبوئیں چار دانگ عالم میں پھیل گئیں +

ابتدائے تمدن میں انسان کو بہت سی دقتوں کا سامنا ہوا۔ قدیم قوم کو مصیبتوں کے بھوت پریت پاؤں میں طرح طرح کے روڑے اٹکاتے معلوم ہوتے تھے۔ اکثر لوگ ان مخفی قوتوں کے آگے اپنے ہتھیار ڈال دیتے لیکن بعض جدت طراز منچلے آدمیوں نے اپنے ٹونے ٹوٹکے سے اُن پر قابو پایا اور بہت سی مشکلات کو آسان کردیا۔ یہ **جادو کا آغاز** تھا + دراصل اسی ابتدائی عہدِ بربریت میں قومی دل انسان نے بے جانے بوجھے اپنی طاقتِ آفرینش اور قوتِ ارادی کو ذاتی تجربے سے پالیا تھا۔ ان کارناموں کو اُس نے سحر آفرینی کی طرف منسوب کیا، وہ اپنے کم زور ہم نفسوں پر اپنی قلبی قوتوں کے ذریعے سے قابو پالینا اور پھر جس طرف چاہتا اُن کا مُنہ موڑ دیتا یہاں تک کہ انہیں قدرت کی بعض طاقتیں بھی طلسم سیاہ کے آگے سر جھکاتی نظر آئیں +

لیکن انسان نے دیکھا کہ عناصر کی تسخیر کچھ آسان کام نہیں اور پھر باوجود اس سحر انگیزی کے قدرت کی قوتیں نہایت زبردست اور خونخوار ہیں۔ اُس نے خیال کیا کہ جس طرح وہ اپنی مرضی سے اپنے اعضا کو ہلاتا جلاتا ہے اسی طرح قدرت کے کام اوروں کی مرضی کے تحت میں ہیں۔ وہ سمجھا کہ کائنات میں اُس کے مانند اور بہت سی ہستیاں ہیں بعض نرم دل اور مہربان بعض درشت اور ظلم شعار۔ وہ اُسے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں۔ شمس و قمر اور بادوباراں کی متلون مزاجی نے اُس کے دل میں خوف وخطر کے جذبات پیدا کردئے۔ زمین اپنے زلزلوں سے جنبش میں آئی تو وہ کانپ اٹھا۔ بجلی کڑکی تو اُس کا دل دہل گیا۔ ان نازک مزاج اور بددماغ قوتوں سے بچنے کی بجز اس کے اُسے اور کوئی راہ نہ سوجھی کہ اُن کے سامنے سرِ تسلیم جھکادے اور انہیں پُوجے۔ رات نے اپنا سائبان پھیلایا تو تاروں بھرے

آسمان کو دیکھ کر وہ سمجھا کہ یہ میرے بزرگوں کی رُوحیں ہیں یا اُنکے مسکن۔ ان ارواح کی خوشنودی کو اُس نے اپنی فلاح کا ذریعہ جانا اس لئے اُن کی پرستش ضروری قرار پائی۔ پھر ہر وقت اُن کی حضوری سے فیضیاب ہونے کے خیال سے اُنکے مجسمے بنائے اور انہیں خوش رکھنے کی غرض سے نذریں مانیں چڑھاوے چڑھائے اور قربانیاں کیں۔ دُنیا کی چیزوں میں سے اُس نے اکثر کے بُت بنائے اور اُن کی پُوجا پاٹ شروع کردی۔ یہ مذہب کی ابتدا تھی۔

قدیم انسان کا مذہب محض اک انفرادی معاملہ نہ تھا فقط اک ایسا تعلق نہ تھا جو انسان اور اُس کے خالق کے درمیان قائم ہُوا بلکہ دوسری قدیم مصروفیتوں کی طرح وہ زیادہ تر اک معاشرتی مصروفیت تھی۔ مذہب کا چشمہ انسان کے کُنجِ دل سے پھُوٹا تھا مگر اُس کی آبجو دُنیائے معاشرت میں سے ہو کر بہتی تھی۔ زندگی کی دُشوار گذار گھاٹیوں میں وہ مذہب ہی کا آسرا تھا جس نے قلبِ انسان کی تنہائی میں اُسکا ساتھ دیا۔ انسان موت سے سخت ڈرتا تھا مذہب نے بتایا کہ زندگی موت کے بعد بھی زندہ رہتی ہے۔ اس زمانے کے مذہب کی رسومات سب مِل جُل کر ادا کی جاتی تھیں اور اُن سب کا اک مفیدِ مطلب مقصد ہوتا تھا مثلاً سنِ بلوغ کی رسموں کا مدعا یہ تھا کہ بالغ شخص دائرہ معاشرت میں اپنی ذمہ داریوں کا احساس و اقرار کرے۔ اطوار و اخلاق کے قواعد سے سوسائٹی کی اصلاح منظور تھی اور آئندہ زندگی کے اعتقاد کا مدعا یہ تھا کہ خیالات و اعتقادات کا تسلسل قائم رہے۔ رسومات کو علانیہ اور مجمعوں میں ادا کرنے کی بڑی غرض یہ بھی تھی کہ لوگوں کے دلوں میں اُن کا رعب و جلال پیدا ہو اور ساتھ ہی نوعِ انسان کا اخلاقی نظام برقرار رہے۔ قدیم انسان کا مذہب زیادہ تر روزمرہ کی ضروریات سے متعلق تھا اُس کا کام عمل کی اعانت تھی خیالات کی اصلاح تھی۔

غرض انسان کے تین بڑے اوّلیں مددگار اُس کا علم اُس کا جادو اور اُس کا مذہب تھے علم مشاہدے اور تجربے پر مبنی تھا۔ جادو بعض افراد کی قوتِ ارادی پر منحصر تھا اور مذہب دلی احساسات اور عموماً معاشرتی ضروریات کا نتیجہ تھا۔ جوں جوں انسان نے ترقی کی علم کے انکشافات اور مذہب کے احساسات بھی ترقی پاتے گئے۔ جادو کچھ اُڑان چھُو ہو گیا اور باقی ماندہ کچھ علم اور کچھ مذہب میں جذب کر لیا گیا۔ صدیوں کی تگ و دو کے بعد میدانِ زندگی میں صرف علم اور مذہب رہ گئے کبھی کبھی اُن میں علانیہ مخالفت ہُوئی۔ جن سے عارضی طور پر دونوں کو نقصان ہُوا لیکن عموماً اُن میں اک مستور رقابت قائم رہی جو بظاہر ضرر رساں

لیکن دراصل دونوں کے لئے بالآخر ترقی کا باعث ہوئی +

علم وتمدن کا آغاز بھی اُسی سرزمین سے ہؤا جس میں برکتِ خداوندی سے پہلے پہل مذہب کے عَلمبردار اُٹھے۔ وہ سرزمین جو مصر و ایران کے درمیان واقع ہے دُنیا کے سب خطوں پر سبقت لے گئی۔ اہلِ چین و اہلِ ہند دعوے دار ہیں کہ ہمارا تمدن قدیم ترین ہے لیکن جہاں تک ہماری غیر مکمل تاریخی و اثری شہادت کام دیتی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصر ان دونوں سے زیادہ قدیم اور بابل اُس سے زیادہ اور ایلم اُس سے بھی زیادہ قدیم ہے + کہا جاتا ہے کہ ایلم کے تمدن کا زمانہ بارہ ہزار سال قبل مسیح ہے + قدامت میں کسی سرزمین کو سبقت ہو اغلب یہ ہے کہ مختلف قوموں اور مختلف ملکوں کے تمدن ایک دوسرے سے الگ الگ مختلف وادیوں میں نشوونما پاتے رہے + بابل کا تمدن چار ہزار سال ق م سے دو ہزار سال ق م تک قائم رہا۔ اخیر زمانے میں ان کا سب سے مشہور بادشاہ حمورابی تھا جسکے قوانین کا ایک کتبہ چند سال ہوئے سُوسہ میں دریافت ہؤا + اسکے بعد اشوری تمدن تقریباً ایک ہزار سال تک دوآبہ پر حاوی رہا یہاں تک کہ اہلِ میدیا اور اہلِ بابل نے مل کر ۶۰۶ ؁ ق م میں نینوا کے شہر کو منہدم کر دیا + بابل کو اپنے بادشاہ بنوشدنزار کے عہد میں دوبارہ فروغ حاصل ہؤا۔ اُدھر یہودیوں نے فلسطین میں اپنی حکومت قائم کی اور فنیقیوں نے بحرِ روم کے ساحل پر ایک بحری تمدن کی بنیاد ڈالی مغربی مورخین کے نزدیک چین اور ہندوستان کی تاریخ کا دو ہزار سال ق م سے پتہ چلتا ہے۔ ہمارے خیال میں اس اندازے میں بہت کچھ ترمیم کی ضرورت ہے۔ چند سال ہوئے پنجاب میں ہرپا کے نزدیک بعض اثری اکتشافات سے ایسی چیزیں ملی ہیں جن کا زمانہ کئی ہزار سال ق م کا ہے اور جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہند کا تمدن کس قدر قدیم تھا + مصر کا تمدن چار ہزار سال ق م کے قریب شروع ہو کر ہزاروں سال تک نشیب و فراز کے رنگ دیکھتا رہا + حطی حملہ آوروں نے ۱۹۲۵ ؁ ق م میں اناطولیا کے پہاڑوں سے اُتر کر جنوبی قوموں کو اپنی بربریت کا مزا چکھایا اور ادھر نینوا کی تسخیر کے بعد اہلِ میدیا نے اپنی قوت کا سکہ چلایا لیکن شمال میں اہلِ لیدیا نے اُنکی بڑھتی ہوئی طاقت کو روک دیا + ۵۵۳ ؁ ق م میں ایرانیوں نے اپنے بادشاہ سائرس کے تحت میں میدیا والوں کو نیچا دکھایا اور پھر بتدریج تمام اُن قوموں کو جو ان اطراف میں رہتی تھیں اپنے زیر نگیں کر لیا یہاں تک کہ دارا کے عہد میں ایران کی عظیم الشان سلطنت دُنیا میں اپنا جواب نہ رکھتی تھی + یونانی قوموں نے جب اپنی ہستی کو مٹتا دیکھا تو وہ متحد ہو کر ایرانی فوجوں کے خلاف صف آرا ہو گئیں اس

طرح یونان کی شجاعت نے مغرب کو ایران کی تلوار سے بچایا اور اپنے ملک میں وہ تمدن قائم کیا جس پر روما کی تہذیب نے اپنی بنیاد رکھی اور جس سے دُنیائے یورپ نے درسِ حکمت لیا۔ اسکندریہ نے مغرب کا سرا مشرق سے ملانا چاہا مگر ناکام رہا۔ روما نے ولادتِ مسیح سے پیشتر اور سنِ عیسوی کی پہلی صدیوں میں ایک وسیع منتظم سلطنت انگلستان سے لیکر عرب کے شمال تک قائم کی۔ پانچویں اور چھٹی صدی میں ہونی اور ستلانی توموں نے اس سلطنت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا البتہ قسطنطنیہ اور مغربی ایشیا میں مشرقی شاہنشاہوں نے مدت تک اپنا اقتدار قائم رکھا یہاں تک کہ اسلامی فوجوں نے جنوب کی طرف سے آکر اُن کے علاقے پر حملہ کیا۔

انسانی شائستگی میں مختلف مذاہب نے کیا حصّہ لیا؟

جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے قدیم انسان توہمات میں گرفتار تھا۔ ارواح پرستی اجسام پرستی۔ اصنام پرستی ستارہ پرستی آتش پرستی غرض خدا پرستی کے سوا ہر شئے پرستی کا دَور دورہ تھا۔ قرآن مجید میں حضرت ابراہیمؑ کے مذہبی ارتقا کا جو تدریجی خاکہ کھینچا گیا ہے اُس سے ظاہر ہے کہ اک پیغمبر کو بھی کن کن ذہنی مراحل میں سے ہو کر گذرنا پڑا۔ دراصل نوعِ انسان کا بہ ہیئت مجموعی انہیں مدارج میں سے گذرا ہوا اس مذہبی تاریخ کی صحیح کیفیت جاننے کے لئے ہم عام انسانی تاریخ پر اک غائر نظر ڈالتے ہیں۔

تاریخ کا زمانہ شروع ہونے پر کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دُنیا کے بعض مقامات میں انسانی آبادیاں جنبش میں ہیں۔ بعض تاریخی خورد بینیں پتہ دیتی ہیں کہ وسط ایشیا کے مرتفع میدانوں سے مختلف انسانی نسلیں نقل مکانی کر کے مشرق و مغرب میں نئے مُلکوں کی تلاش میں سرگرداں ہیں اور بعض پتہ بتاتی ہیں کہ عرب کے ریگستانوں میں اک ہلچل پیدا ہو رہی ہے اور حامی اور سامی نسلیں وہاں سے نکل کر مصر اور دو آبہ دجلہ و فرات میں بس رہی ہیں۔ نوعِ انسان کا مسکنِ اول کوئی سا قطعۂ زمین ہو اور ممکن ہے کہ کوئی خاص ایک قطعہ یہ شرف نہ رکھتا ہو بلکہ مختلف قطعات سے ایک ہی وقت میں یا مختلف اوقات میں مختلف نسلیں مختلف اطراف میں چل نکلی ہوں۔ لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ حامی نسل کے لوگ سب سے پہلے نکلے۔ انہیں حامیوں میں سے پانچ ہزار سال قبل مسیح کے قریب ایک حامی قوم عرب سے نکل کر مصر میں جا متمکن ہوئی اور اُس نے وہاں کے اصلی باشندوں کو جو غالباً حبشی نسل کے تھے وہاں سے نکال دیا یا غلام بنالیا۔ چند صدیوں کے بعد مصر میں ہم اک سلطنت دیکھتے ہیں جس نے علم و ہنر میں نمایاں ترقی کی۔ اُن کا فرعون مدتوں اُن کا خدا بنا رہا اور کسی نے سوائے حضرت موسیٰ کے اس زمین میں اُس خدائی کے خلاف حق کی آواز بلند نہ کی۔ موسیٰ اور اُن کی قوم کو فرعون نے مصر سے نکال دیا

اور کفر کی ظلمت پھر ملک پر پہلے کی طرح چھا گئی۔

حامیوں کے بعد وسط ایشیا سے یافثی نسل والے اُٹھے جن میں سے تورانی شمال مشرق کو گئے اور رفنی شمال مغرب کو اور ایک جزو نے بحرِ خزر کے جنوب کی طرف جا ڈیرے ڈالے۔ ان میں سے بعض نے میدیا کی بنیاد ڈالی اور بعض نے بابل کے سرسبز میدانوں میں اُتر کر حامی آبادکاروں کو غلام بنایا۔ اس بابلی تہذیب کا مذہب اک قسم کی فطرتی کثرت پرستی تھا جس میں چاند سورج کے دیوتاؤں کی پوجا کے ساتھ نفسانیت پروری اور ظلم آرائی کا بازار گرم رہتا تھا۔

یافثیوں کے بعد سامیوں نے اپنا وطن چھوڑا۔ وہ دجلہ فرات کے دوآبے میں آباد ہو گئے اور جب وہ تعداد میں بڑھے تو انہوں نے بابل والوں پر چھاپہ مارا اور اُن کی تہذیب کو تباہ کر کے ایک وسیع سلطنت کی بنیاد رکھی جس میں آس پاس کی سب مملکتیں شامل تھیں۔ اس اشوری تہذیب کا مذہب آخر کار وحدانیت کے درجے تک پہنچ گیا۔ ان لوگوں کی ایک قوم دُور اُر کے کلدانی علاقے میں جا بسی۔ حضرت ابراہیمؑ اسی قوم سے تھے۔

آخر میں یافثیوں کے وُہ گروہ جنبش میں آئے جو بعد میں ہندوستان میں آریا اور ایران میں ایرانی کہلائے۔ یہ دونوں وسط ایشیا میں بلخ و بدخشاں کے علاقوں میں مدتوں سے ایک دوسرے کے پاس پاس رہتے آئے تھے۔ پہلے یہ لوگ مظاہر قدرت کی پرستش کرتے تھے۔ جب بتدریج وحشیانہ حالت سے نکل کر بربریت میں داخل ہُوئے تو بجائے انکے چند ہمہ گیر تصوّرات کی عبادت کرنے لگے۔ بعض نے آفتاب کو منبعِ نور و زندگی سمجھ کر اپنی روحانی دنیا کو ظلمت و نور کے خداؤں کی آماجگاہ بنایا۔ بعض نے قدیم تصوّرات کو مجسّم جان کر اُن کی مختلف ہستیاں بنالیں۔ پھر ایک زمانہ آیا کہ بجائے قبیلوں اور قوموں کی گروہ بندی کے اُن میں بادشاہت نے اپنا سکّہ جمایا اور اُنکے مذہب میں ایک ذاتِ اعظم کے وجود کا خیال پیدا ہُوا۔ ان واقعات کے ساتھ آریائی خاندان کی دونوں شاخوں میں ایک زبردست مذہبی جنگ چھڑ گئی جس کا بڑا سبب وہ مذہبی انقلاب تھا جو مغربی آریاؤں میں زرتشت نے پیدا کیا۔ مشرقی مظاہر پرست تھے مغربی حقیقت پرست۔ جنگ کا نتیجہ مغربیوں کے حق میں ہُوا۔

مشرقی آریاؤں نے اپنا آبائی وطن چھوڑ کر جنوب مشرق کی طرف رُخ کیا اور وہ ہندوستان پر ایک نسلی طوفان کی صورت میں ٹوٹ پڑے۔ صدیوں کے دَوران میں انہوں نے ایک عظیم الشان تمدن قائم کیا جس میں بارہا مدّوجزر کی شان نظر آتی رہی۔ تمدن میں معاشرت میں مذہب میں انہوں نے نمایاں

ترقیاں کیں لیکن دستورِ فطرت کے مطابق امتدادِ زمانہ سے اُنکے کمالات پر زوال کا رنگ چھا گیا + آریا حملہ آور ہند کے اصلی باشندوں سے مطلق میل جول نہ رکھتے تھے کیونکہ اگرچہ یہ لوگ ذاتوں کے سلسلے میں شامل تھے لیکن شودروں کا درجہ حیوانوں سے بہتر نہ تھا بلکہ بعض حیوان تو قابلِ پرستش سمجھے گئے مگر یہ انسان کبھی لائق التفات نہ ہُوئے + بعض گھرانوں میں عورت بالخصوص جب وہ بچّوں کی ماں ہوتی تھی تو قابلِ تعظیم سمجھی جاتی تھی لیکن پھر بھی یہ خیال عام تھا کہ نہ صرف اس کی دنیوی زندگی خاوند کی خوشنودی کے لئے ہے بلکہ اُس کی آئندہ بہتری بھی فقط شوہر کے احکام کی بجا آوری پر منحصر ہے + لڑکیوں کے مار دینے کا جیسے عرب میں ویسے ہندوستان میں بھی کہیں کہیں رواج تھا اور ساتویں صدی عیسوی میں بیوہ عورتوں کا خاوند کی چتا پر جل مرنا عام ہو چکا تھا + ایک عورت کا بہت سے شوہروں کی زوجیت میں آنا یا جوئے میں جیتا ہارا جانا کچھ شاذ نہ تھا اور سب سے بڑے مقنن کا قول تھا کہ عورتوں کو دن رات بندش میں رکھنا لازم ہے۔ دونوں قسم کی کثرتِ ازدواج کا رواج تھا۔ یہاں تک کہ تاحال ایک ہندو جتنی عورتوں سے چاہے شادی کر سکتا ہے +

آریاؤں کا مذہب پہلے پہل تو اُئے فطرت کی پرستش تھا لیکن بتدریج اُس میں رُوحانیت کے اجزا شامل ہوئے یہانتک کہ اُپنشدوں کی اعلیٰ و پاکیزہ روحانیت جلوہ پاش ہُوئی + ان خیالات کے مطابق خدا نہ صرف ہر شئے میں موجود ہے بلکہ جملہ موجودات کا محافظ اور تمام مخلوقات کا حاکم ہے۔ وہ انسانوں کے دلوں میں رہتا ہے اور آخر کار رُوحوں کو کچھ اس طرح اپنے میں جذب کر لیتا ہے جس طرح سمندر دریاؤں کے پانیوں کو + لیکن یہ پاکیزہ و دلکش تصورات مرورِ زمانہ کے ساتھ مکدّر ہو گئے۔ اُپنشدوں کے بعد پرانوں کی ادنیٰ تعلیم اور پرانوں کے بعد تنتروں کے ادنیٰ ترین خیالات کا رواج ہُوا + یہ نظریہ کہ رُوحِ عالیہ مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتی ہے بڑھتے بڑھتے اس خیال میں تبدیل ہو گیا کہ خدا اوتار بن کر زمین پر اُتر آتا ہے + اہلِ [illegible] بالعموم ایک خدا کے بجائے بہت سے دیوتاؤں اور دیویوں کی عبادت کرتے تھے جن کی طرف بعض وقت نہایت کمینہ حرکات منسوب کی جاتی تھیں + ہندوستان میں مذہبی یکسانیت نہ تھی کیونکہ اک خاص طے شدہ مذہب نہ تھا جس کے احکام و قواعد پر کاربند ہو کر چھوٹے بڑے۔ ایک رُوحانی رشتے میں منسلک ہو جاتے + ایک طرف اُپنشدوں اور بھگوت گیتا کے فلسفی مُصنّفین کی فلک پیمائیاں تھیں دوسری طرف عوام میں کرشنا پوجا اور کالی ماتا کی پرستش رائج تھی۔ ہند کے اصلی باشندوں کی اشیاء پرستی کا اثر بھی ہُوا۔ پُرانی مظاہر پرستی چھوٹ کر سکتی پوجا اور بعض دیوتاؤں کی شہوت رانی کی کہانیاں عام ہُوئیں اور ویدک زمانے میں تو انسانی قربانی دپرش میدھ)

کا دستور بھی ہُوا + کامل دھرم نجات کا ذریعہ قرار پایا اور رہبانیت اپنی انتہائی صورتوں میں ظاہر ہُوئی + برسوں جنگل میں بیٹھے رہنا اور نظر جسم کے ایک خاص حصّے پر اور دل کرشنا کے تصوّر میں جمائے رکھنا یا برسوں ایک ہی ٹانگ پر کھڑے رہنا اس قسم کی ریاضت روحانیت کی سب سے اعلیٰ شکل مانی گئی + تناسخ کے مسئلے کا مفہوم یہ تھا کہ جس طرح اچھے کاموں سے انسان فرشتہ بن جاتا ہے اسی طرح بُرے کاموں سے وہ پھر حیوان بن سکتا ہے +

ہندوستان کی مشہور ترین رزمیہ نظموں راماین اور مہا بھارت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہندوؤں کا معیار معاشرت کس قدر بلند اور علم وفن میں اُن کی ترقیاں کیسی تھیں لیکن یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے میں اُنکے اخلاق کسی قدر پست ہو چکے تھے + عوام کا مذہب محض قربانیوں اور رسموں کا اُن طریقوں میں ادا کرنا تھا جن کے صحیح علم کے مالک صرف پنڈت تھے بلکہ ان پنڈتوں کی ہدایت و شرکت کے بغیر مذہبی فرائض ادا ہی نہ ہو سکتے تھے + مہاویرا اور گوتم بدھ نے اس حریت کُشی اور انسانیت سوزی کے خلاف اپنی زبردست آواز بلند کی اور عمل کی خوبی پر زور دے کر ہندوستان کو اک نئے اور سیدھے روحانی شاہراہ پر لگانا چاہا مگر برہمنیت کی قوت نے بہت جلد ان نئے مذاہب کا زور توڑ دیا + بدھ مت میں وہ باتیں نہ تھیں جن سے عوام پر اُس کا رعب پڑتا یا جن سے اُن کا دل بہلتا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ باوجودیکہ دنیاوی حالات نے اک عرصے تک بدھ مت کی مساعدت کی پھر بھی تھوڑی ہی مدت میں اُسے اپنے جنم بھوم سے دلیس نکالا ملا + وہ سیلون برما چین اور جاپان میں پھیل گیا لیکن اُس نے ایشیا کے اس حصّے سے باہر قدم نہ رکھا + بدھ مت میں تمام نوعِ انسان کے لئے اک عملی مذہب بننے کی قابلیت کم تھی البتہ اُس کے بعض صوفیانہ نظریات نے مغربی ایشیا اور مصر کے فلسفے پر بہت کچھ اثر ڈالا +

بدھ مت کے اخراج کے ساتھ مذہبی پیشواؤں نے پھر انسانی آزادی کا گلا گھونٹ دیا۔ اور تباہی و نفسانیت کے دیوتاؤں کی پھر سے پرستش ہونے لگی، ناپاک اور ذلیل حرکتیں دیوتاؤں اور نیک لوگوں کی طرف منسوب کی جاتی تھیں اور مندروں میں ناچنے والیاں اپنے رنگ دکھاتی تھیں + بلاشبہ فلسفۂ ویدانت کی وحدانیت پاکیزہ اور اس کی منطق آرائیاں دلکش و عقل پرور تھیں۔ ہندوؤں کے انکسار و راست گوئی کی یونانی حملہ آوروں نے بھی تعریف کی ہے لیکن مذہبی و معاشرتی حیثیت سے عوام بندشوں میں گرفتار اور آلائشوں میں منہمک تھے + اشیاء پرستی کا پہلے سے بڑھ کر دور دورہ ہُوا۔ پُرانے

دیوتاؤں اور بزرگوں کے ساتھ درختوں پتھروں اور دوسری بے جان چیزوں کی پرستش بھی ہونے لگی + بعض لوگوں نے فلسفۂ الوہیت کے راز کو سمجھا لیکن آریاؤں کا قدیم سادہ مذہب بالعموم پروہتوں کی حکومت اور ذات پات کی سنگین و سخت تفریق میں مبتلا ہو کر بے حس و حرکت ہو گیا + ہندو مت میں ہر قسم کے خیالات کی اشاعت تھی۔ خدارسیدہ فلسفیوں اور تارک الدنیا جوگیوں سے لیکر اجسام پرست اور معتقدات پرست لوگ بھی اُس میں شامل تھے۔ اس میں فلسفیانہ دقتیں اور عامیانہ اُلجھنیں پہلو بہ پہلو موجود تھیں۔ خواص میں اچھے خیالوں اور اچھی باتوں کی کمی نہ تھی لیکن وہ عوام کو بُرے خیالوں اور بُری باتوں سے روکنا ضروری نہ سمجھتے تھے بلکہ اُن میں سے اکثر کا خیال تھا کہ یہ لوگ انہیں باتوں کے اہل ہیں اور یہ باتیں انہیں لوگوں کے لئے بنی ہیں۔ اصولِ مذہب میں ہمہ گیری کی صفت ضروری نہ سمجھی گئی +

یہ تھے آریاؤں کے گذشتہ کارنامے اور یہ تھی ساتویں صدی عیسوی میں اُنکی حالت۔ اُدھر ایرانیوں کی تاریخ بھی کم دلچسپ نہیں + وسط ایشیا سے نکل کر وہ افغانستان و ایران میں پھیلے۔ بحر خزر کے جنوب میں پہنچ کر وہ تورانیوں سے برسرِ پیکار رہے کہ اشور والوں نے اُن کو آدبایا۔ ضحاک کے ان مظالم سے وہ لوگ مدتوں پیچ و تاب کھاتے رہے۔ آخر فریدوں کی تلوار نے نینوا کی سلطنت کو اُلٹ دیا + ایرانی گاہے گاہے اپنی تورانی رعایا سے لڑتے بھڑتے رہے لیکن تورانیوں کے خیالات نے اُنکے مذہب پر خاصا اثر ڈالا یہاں تک کہ ارمزد کے ساتھ اہرمن کی بھی عبادت ہونے لگی +

میدیا اور بابل والے مل کر اشوریوں پر جا پڑے اور اُنکی سلطنت پر قابض ہو گئے۔ اشوری تباہ ہو گئے لیکن انکے مذہب کا مجوسیوں کے مذہب پر یہ اثر ہُوا کہ خدائے ارمزد اب بہت سے مصاحبوں اور حواریوں کے حلقے میں نظر آنے لگا + بابل پھر ایشیائی تہذیب کا مامن بنا اور اُس کے مذہبی اعتقادات نے قدیم بے ربط مذاہب اور موجودہ منتظم مذاہب کے درمیان آکر اک کڑی کا کام دیا + بنوشدنزار کی سلطنت بڑھی۔ یہودیہ فتح ہُوا اور یہودیوں کی ساری قوم غلام بن کر بابل کی ندیوں کے کنارے اپنی گذشتہ عظمت کا رونا رونے لگی۔ آخر کار جب وہ آزاد ہو کر اپنے وطن کو واپس گئے تو اُن کے مذہبی اور سیاسی خیالات میں اک معتدبہ فرق پڑ گیا تھا + ایرانیوں نے بابل کو مسخر کیا اور یہودیوں کی دعائیں لیں + اب ثنویت کے مذہب نے ایشیا پر اپنی حکمرانی کا جال بچھایا۔ مجوسیت کا اثر یہودیت پر پڑا یہودیت کا مجوسیت پر۔ مجوسیوں نے یہودیوں سے ذات خدا کا

سبق پڑھا یہودیوں نے مجوسیوں سے آسمانی مصاحبوں (فرشتوں) کی موجودگی اور خیر و شر کے دوگانہ اصول (یہودا و شیطان) کی کیفیت معلوم کی +

جب دارا تخت نشین ہُوا تو اُس نے کوشش کی کہ مذہب کی اصلاح کرے لیکن ناکام رہا۔ مجوسیت روز بروز بد سے بدتر ہوگئی ایرانی مذہب پر سامی رعایا کے خداؤں کا اثر پڑا۔ پُرانی عناصر پرستی پھر تازہ ہُوئی اور عبادات میں شہوات کا رنگ جھلکنے لگا + عورت کا درجہ اس قدر ذلیل ہُوا کہ شاید انسانی تاریخ میں کبھی نہ ہُوا ہوگا مرد اپنی قریب ترین عزیزہ یہانتک کہ اپنی بہن تک سے شادی کر سکتا تھا اور جب چاہتا اُسے طلاق دے سکتا تھا عورتوں کو الگ حرم سراؤں میں رکھنے کا دستور تھا اور اُن پر خواجہ سرا متعین کئے جاتے تھے + اُنکے حقوق طے شدہ نہ تھے۔ کثرتِ ازدواج کے لئے کوئی حد مقرر نہ تھی + اسکندر کے حملے کے ساتھ یونانی ایران کے سب اطراف میں پھیل گئے۔ ایرانی تمدن فاتحین کے گھوڑوں کے سموں تلے روندا گیا اور مجوسیت کا اثر ملیا میٹ ہوگیا + اسکندر کی طبیعت خیر و شر کے اضداد کا مجموعہ تھی۔ اس کی فتوحات میں اُس کی فطرت کا عکس موجود تھا۔ اُس کا مدعا ایشیا کو یونان کے رنگ میں رنگنا تھا + لیکن ایشیا یونان کے علم و فضل سے بہرہ ور نہ ہُوا بلکہ یونانی و کلدانی تمدن کی اکثر بُرائیاں اس کے رگ و ریشہ میں سرایت کر گئیں سلوسیدی پارتھی اور باختری حکومتوں کے دوران میں مجوسیوں اور یہودیوں پر مذہبی تشدد روا رکھا گیا ساسانیوں کا عہد آیا تو مجوسیت نے ہوش سنبھالا۔ ایرانی صدیوں تک قوت و تمدن کے میدان میں روما کے مدِ مقابل بنے رہے لیکن دنیاوی ترقی کے ساتھ مجوسیت کو اخلاقی و مذہبی فروغ حاصل نہ ہُوا + "مجوسیت کی آگ یوں تو مندروں کی بلند قربان گاہوں پر فروزاں تھی لیکن لوگوں کے دلوں میں اُس کے شعلے سرد پڑ چکے تھے" + آخری ساسانیوں کے عہد میں مذہبی فرقوں کی جنگ آرائیاں بادشاہوں کی عشرتیں اُمرا کی ذلیل حرکتیں مذہبی پیشواؤں کی نخوت انتہا کو پہنچ گئی + بادشاہ خداوند تھے اور اپنی رعایا کے جان و مال کے مطلق العنان مالک۔ رعایا اپنی غلامی میں بے بس تھی اور اُسکی اخلاقی حالت اس کی مادی حالت سے کچھ بہتر نہ تھی + چھٹی صدی عیسوی میں مزدک نے اپنے اس عقیدے کی اشاعت کی کہ عورتوں کو اور مال و دولت کو مشترک طور پر استعمال کرنا چاہیئے۔ رہبانیت کے متعلق مجوسیوں کا خیال تھا۔ کہ کائنات میں نور و ظلمت کے خدا ایک دوسرے کے ساتھ مصروفِ پیکار ہیں اور یہ جنگ جاری رہیگی حتیٰ کہ نور ظلمت پر غالب آجائے + وہ نہ صرف ارمزد کی عبادت کرتے تھے بلکہ زمین و آسمان تارے درخت حیوان ان بے بس ہستیوں کی مدد کے محتاج بھی تھے + اُن کی نمازیں محض لفاظیاں تھیں بعض فقروں کو بارہ سو دفعہ دہرایا

جاتا تھا۔ عبادت میں وہ اپنے مذہبی پیشواؤں کے دست نگر تھے اور اُن کی عبادت دو طرح کی تھی ایک عام دوسری مخفی جس کا علم عوام کو نہ ہو سکتا تھا۔ مجوسی دوزخ بہشت کے علاوہ "چنواد" کے خوفناک پُل کے بھی قائل تھے۔ اُنکا ایمان تھا کہ نیک کام کرنے والے بہشت میں اور بُرے کام کرنے والے دوزخ میں جائینگے۔ آخری ساسانیوں کی اس اخلاقی و مذہبی تاریکی میں کسریٰ نوشیرواں کی روشنی تھوڑی دیر کے لئے چمکی مگر اُسکے جانے کے ساتھ سیاسی حالت بھی ایسی ہی پست و ذلیل ہوگئی جیسی کہ مذہبی زندگی۔

ظہورِ مسیح کے وقت **یہودیوں** کو بابل کی قید سے رہائی پائے گیارہ صدیاں گذر چکی تھیں۔ رومانے انکے معبد گرا دیئے تھے اور اُنکی قوم کو تباہ کرنے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا تھا مگر اُنہوں نے ان مصائب میں بھی اخلاقِ انسانیت کا سبق نہ سیکھا۔ اُن کا غرور اُن کے دل کی بدنیتی اُن کی فریب کاریاں کم نہ ہوئی تھیں نہ ہوئیں۔ وہ جو کبھی وحدانیت کے علم بردار تھے اُن پر شرک کا رنگ غالب آگیا۔ عوام "ترافم" کی پرستش کرتے تھے جو ایک نوع کے خانہ ساز خدا تھے۔ عرب کے یہودیوں نے کعبے میں موسیٰ کا بُت کھڑا کر رکھا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ کافر قوموں کے مذہب و فلسفہ نے اُنکے خیالات کو ناپاک کر دیا تھا۔ وہ اپنے کاہنوں اور ربیوں کے پنجے میں گرفتار تھے۔ صرف یہی لوگ قوانین و رسوم کے امین ہوتے تھے یہ خدا کے خاص بندے سمجھے جاتے تھے اور پیشین گوئی کی طاقت بھی انہیں کو عطا کی گئی تھی۔ حضرت موسیٰ کے قوانین میں طریقۂ نماز کا ذکر نہ تھا رواجاً جو طریقہ جاری ہوا اس سے یہودی فقط اک لمبی لمبی نمازیں پڑھنے والی قوم بن گئے۔ سزا و جزا کے مسائل انہوں نے مجوسیوں سے سیکھے اور دوزخ بہشت کی کہانیاں بھی انہوں نے زرتشت کے مذہب ہی سے نقل کیں اور اُن پر اپنی طرف سے طرح طرح کے حاشیے چڑھائے۔ کثرتِ ازدواج اور غلامی اُن میں عام طور پر رائج تھیں۔ یہودی غلام چھ سال کی غلامی کے بعد آزادی حاصل کر سکتا تھا لیکن غیر یہودی کی غلامی دائمی سمجھی جاتی تھی۔ عورت کا درجہ اُن کے ہاں پست تھا۔ ایک ایسے مسیح کی آمد آمد کا اُن میں چرچا تھا جو اُنکی قوم کو از سرِ نو زندہ و قوی بنا دیگا۔ لیکن جب حضرت عیسیٰ نے آکر اُنہیں ہدایت کی تو انہوں نے سابق پیغمبروں کی طرح اُلٹا انہیں جھٹلایا اور اُنکی جان کے پیچھے پڑ گئے۔

حضرت عیسیٰ خود غریب تھے اُنکی تعلیم و تلقین بھی غریبوں کے طبقے میں ہوئی۔ یہودیوں کی قوم غرور و تعصب کا شکار تھی سلطنتِ روما کی عام معاشرتی و اخلاقی حالت نہایت خستہ تھی۔ خدا نے ان لوگوں کے درمیان انکی اصلاحِ اخلاق کے لئے اک ایسے پیغمبر کو بھیجا جو ہمہ تن انکسار تھا لیکن امیروں نے اُسے حقارت سے دیکھا اور زبردستوں نے اُسے اپنے پاؤں کے نیچے کچل ڈالا۔ اُس کے پیروؤں نے اُسے ہمیشہ اپنے ہی جیسا اک جیتا جاگتا

چلتا پھرتا انسان سمجھا۔ البتہ پالؔ نے جو مسیح کی زندگی میں اُس سے منکر رہا اُس کی موت کے بعد اپنے ذاتی تصورات کی بنا پر اُسکے خاکی وجود کو اک آسمانی اور غیر محسوس ہستی بنا دیا۔ پالؔ کے دل پر بُدھ مت اور مجوسیت کی پیشگوئیوں کا اثر تھا۔ بالخصوص اہلِ مصر و شام کے فلسفیانہ و صوفیانہ نظریات سے وہ بیحد متاثر ہُوا اور اُس نے اک چنگے بھلے انسان کو ربانی جامہ پہنا کر دُنیا کے سامنے پیش کر دیا +

عیسائیت سلطنتِ روما میں پھیلی۔ اسکی اشاعت کے کئی اسباب تھے + مسیح پہلا شخص تھا جس نے دنیا میں علی الاعلان کہا کہ سب آدمی برابر ہیں اور اُسی نے غریبوں اور غمزدوں کو اک آسمانی بادشاہت کی بشارت دی + کُفریوں بھی کوئی منتظم مذہب نہ تھا۔ اُسکے کوئی پادری پنڈت نہ تھے جو اُسے برقرار رکھنا اپنے لئے ذریعہ معاش سمجھتے اور اُس کی رسومات لوگوں کے لئے تسکین دہ نہ تھیں + علاوہ بریں فلسفہ و حکمت کو بہت کچھ فروغ حاصل ہو رہا تھا۔ متمدن و تعلیم یافتہ لوگ دنیا و ما فیہا کی کُنہ دریافت کرنے کے درپے تھے اور اُنکے دلوں میں اک خاموش ہیجان برپا تھا جو کسی سکونِ روحانی کا متلاشی تھا۔ ان وجوہات کی بنا پر اور اُس مذہبی ناروا داری کے باعث بھی جو بعض حکمرانوں نے اسکے خلاف روا رکھی عیسائیت بہت جلد مغربی ایشیا اور یورپ میں پھیل گئی + پھر جب قسطنطین اور دیگر مغربی حکمرانوں نے اُسے اختیار کیا اور بعد میں جب شارلیمن اعظم کی تلوار نے جرمنی میں اشاعتِ مذہب کی خاطر خون کی ندیاں بہا دیں تو عیسائیت "الناس علیٰ دینِ ملوکہم" کی زندہ مثال بن گئی +

عیسائیت کے پھیلنے کے ساتھ **عیسائی** تھوڑے ہی عرصے میں **مختلف فرقوں اور گروہوں میں منقسم** ہو گئے + مسیح کی زندگی کے بہت کم حالات معلوم تھے لہذا اُن میں رنگ آمیزی کرنا نہایت آسان کام تھا۔ اور اُنکے متعلق اختلافات کا پیدا ہو جانا بھی اک قدرتی امر تھا +

پہلی صدی عیسوی میں سرنیتھس نے اُن نظریات کی تلقین کی جن کے مطابق آسمانی باپ اور مقدس بیٹے کی پرستش جاری ہوئی +

دوسری صدی کی فرقہ آرائیوں میں نہ صرف کلیسا کی جدتیں رُونما ہُوئیں بلکہ عیسائیت پر مجوسیت جدید نیثا غورثیت اور قدیم کلدانی صابئیت کے اثرات بھی ظاہر ہونے لگے + مارسینوں نے کہا کہ خیر و شر کے اصول کائنات میں برسر پیکار ہیں اور اصولِ عالیہ نے۔ اپنے تحت۔ جگر یسوع مسیح کو انسانی ارواح کی نجات کیلئے بھیجا ہے + وسنتیوں نے کہا کہ خدائے ذوالجلال کے بیٹے یسوع کا جسم اصلی نہ تھا بلکہ آسمانی اور ہوائی تھا اور وہ زمین پر تاریکی

کے شہزادے کو شکست دینے کے لئے آیا تھا + مصری آفیٹوں کا خیال تھا کہ خود مسیح ہی وہ سانپ تھا۔ جس نے بہشت میں آدم و حوا کو دھوکے میں ڈالا + یونانیوں نے کہا کہ باپ بیٹا اور رُوح القدس تینوں ایک ہیں اور اُن میں تمیز کرنا ناممکن ہے + ایک شخص منتانوس نامی نے دعوےٰ کیا کہ میں وہ فارقلیط ہوں جس کی مسیح نے خبر دی تھی + ایران میں مانی اُٹھا اور اُس کی نکتہ چینیوں نے مذاہب کے پرخچے اُڑا دیئے اُس نے کہا کہ گو مسیح کو بظاہر سولی پر چڑھایا گیا لیکن دراصل وہ رہا ہو کر آفتاب میں اپنے تخت کی طرف ہجرت کر گیا + مانی کے بعض نظریات مسیحیت کا جزو بن گئے اور اُس کی تعلیمات کا لوگوں کے عقاید پر معتد بہ اثر پڑا +

تیسری صدی کے وسط میں سبلیوں نے کہا کہ مسیح محض ایک آدمی تھا لیکن آسمانی باپ کا اک خاص جوہر اُس کی طبیعت میں شامل ہو گیا +

چوتھی صدی کے شروع میں اریجن نے ربّانی وجود میں تین ممیز شخصیتوں کے ملاپ پر زور دیا مگر آریئس نے صاف صاف کہہ دیا کہ مسیح کی شخصیت کا جوہر ربّانی جوہر سے قطعی الگ ہے اس صدق گوئی کا نتیجہ یہ ہوا کہ شمالی افریقہ و مصر میں اُس کے بہت سے معتقد پیدا ہو گئے اور مسیحیت میں ایک سخت مناقشہ برپا ہو گیا +

اہل کلیسا نے وقتاً فوقتاً مسیحی مذہبی مجالس میں تثلیث کے پیچیدہ مسئلے کی گتھیوں کو سلجھانا چاہا ۳۲۵ء میں مجلس نیس نے آرئیس کے نظریے کو کفر کہہ کر مسیح اور آسمانی باپ کو متحد قرار دیا + مجلس فیسس نے فیصلہ کیا کہ جو لوگ مسیح کی شخصیت کو ٹکڑے ٹکڑے کرتے ہیں خدا کرے اُنکے جسم تلوار سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جائیں + مجلس کلسیدان نے حکم صادر کیا کہ مسیح کی شخصیت ایک ہے مگر طبیعتیں دو ہیں + منفیسزیوں اور نسطوریوں نے اس نظریہ تجسّم کے خلاف آواز بلند کرنی چاہی مگر مذہبی تشدد نے اُن کے منہ خاک سے بھر دئے اور عیسائیت کے گرجاؤں میں خون کی ندیاں رواں ہو گئیں + ۶۳۰ء میں ہرقل نے منتھیلیوں کے فرقے کی بنیاد ڈالی مگر اس سے بجائے امن کے فتنہ و فساد کی آگ اور بھڑکی اور مسیحیت کی دُنیا پر بے اطمینانی کے بادل چھا گئے +

جس طرح مسیح کی زندگی کے بہت کم حالات معلوم تھے اور اُس کی ذات کے متعلق یہ اختلافات پیدا ہوئے اسی طرح مسیح نے مذہب و معاشرت کے بہت کم مسئلوں پر روشنی ڈالی تھی اور رشاد و نادر

ہی کوئی قواعد مقرر کئے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ عیسائیت کی کشتی بہت جلد دُنیا کے سمندر میں ڈانواں ڈول ہونے لگی۔ عیسائیت مسیح کی تعلیمات کے علاوہ جدید فیثا غورثیت افلاطونیت اور یہودی یونانی فلسفہ آمیزیوں کا مرکب بن گئی + حضرت عیسیٰ نے نماز کا صحیح مفہوم اپنے پیروؤں کو سمجھا دیا مگر چونکہ کوئی قواعد فروعات نہ چھوڑے عوام کے لئے بجز اس کے چارۂ کار نہ تھا کہ ان معاملات میں پادریوں اور مذہبی مجلسوں کی ہدایات پر چلیں اور یہ ہدایات کبھی کچھ ہوتیں کبھی کچھ۔ ادھر ابوکسلان راہب چوبیس گھنٹے اپنی تسبیحیں پھیرتے رہتے اُدھر عوام صرف ہفتے میں ایک دن گرجے جا کر مذہبی فرائض کی فرضی حجت پوری کر آتے +

کفر مٹ چکا تھا عیسائیت کا مغرب میں چاروں طرف بول بالا تھا لیکن مقامِ عبرت تھا کہ بجائے قرار امن کے مسیح کا مذہب مذہبی تنازعات اور فرقہ وارانہ جنگ آرائیوں کا موجب بن گیا + پادریوں کی زندگی عیش و تنعم کبر و نخوت اور نشاط پسندی کی زندگی تھی۔ راہب دُنیا کو چھوڑ کر دُنیاوی حظائظ میں منہمک تھے۔ عوام کے خیالات و اعتقادات حالتِ کفر سے کچھ زیادہ آگے نہ بڑھے تھے۔ مُردوں کی رُوحوں کی پرستش اور اُن کی مورتیوں کی پُوجا رائج تھی۔ اولیا پرستی اور تبرک پرستی کے معنی مسیحیت تھے + رواداری نام کو باقی نہ تھی۔ ذاتی اعتقادات اور ذاتی خیالات مذہبی جور و ظلم کے نیچے پس چکے تھے + شراب خواری۔ قمار بازی اور دیگر ناگفتہ بہ بدیاں اپنے زوروں پر تھیں۔ مشہور مصنف دوزی نے حضرت علی کا یہ فقرہ نقل کیا ہے کہ بنی تغلب نے عیسائیت سے سوائے شراب خواری کے اَور کچھ نہ سیکھا + علم و فضل کی نسبت گبن کہتا ہے کہ اگر جیسا کہ کہا جاتا ہے اسکندریہ کا کتب خانہ واقعی حضرت عمر ہی کے حکم سے جلایا گیا۔ اور اس کی آگ سے چھ ماہ تک حمام گرم کئے گئے تو ان لغو کتابوں کا اس سے بہتر مصرف اَور کوئی نہ ہو سکتا تھا۔" سر ولیم میور لکھتا ہے "ساتویں صدی کی عیسائیت خود خراب و خستہ اور گری ہوئی تھی۔ مختلف فرقوں کے مباحثات و مناقشات نے اُسے نکمّا بنا دیا تھا اور ابتدائی زمانے کے پاک و صاف اعتقادات کی جگہ توہمات کا دور دورہ تھا" +

قسطنطنیہ اسکندریہ اور روما کے گلی کوچے اکثر پادریوں کی سرکشیوں کے باعث قتل و غارت کا بازار بنے رہتے تھے + اسکندریہ میں حسین ہپاشیا کو دن دہاڑے سر بازار برہنہ کیا گیا اور اُسے ایک گرجا میں گھسیٹ کر اُس عیسائی نے قتل کیا جسے ساری مسیحیت نے بعد میں ولی کا لقب دیا + قسطنطنیہ

میں جسٹنطین کے عہدِ حکومت میں جسے آجتک یورپ فخر کے ساتھ یاد کرتا ہے ایسی ایسی شرمناک کارروائیاں ہوئیں کہ بیان سے باہر ہیں۔ تھیوڈورا ایک فاحشہ عورت قیصر کے ساتھ سریر آرائے سلطنت تھی۔ پیغمبرِ اسلام کے اوائل عمر کے زمانے میں قسطنطنیہ میں ایک شریف ترین قیصر بیرحمی کے ساتھ قتل کیا گیا اُسکے بعد اُسکے بیوی بچے تہ تیغ ہوئے اُسکے دوست مددگار پکڑے گئے اُنکی آنکھیں چھید دی گئیں زبانیں اکھاڑی گئیں اور ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالے گئے۔ گبن کہتا ہے کہ "جلدی سے مرسکنا اک ایسی نعمت تھی جو شاذ و نادر ہی اُن کے نصیب میں ہوتی"۔

معاشرت کی بہتری اور حقوقِ نسواں کی نگہداشت میں عیسائی دُنیا نے کوئی نمایاں بات کرکے نہ دکھائی تھی۔ کثرتِ ازدواج جسے خالص مشرقی رواج سمجھا جاتا ہے مغرب میں بھی پایا جاتا تھا۔ پرانے یونانیوں کے ہاں ایتھنز میں عورت ایک شئے مملوکہ تھی۔ مرد جب چاہے اُسے طلاق دے سکتا تھا اور جتنی عورتوں سے چاہے شادی کرسکتا تھا۔ اہلِ سپارٹا کے ہاں اُلٹی گنگا بہتی تھی وہاں ایک عورت جتنے مردوں سے جی میں آئے شادی کرسکتی تھی۔ مملکتِ روما میں گو واقعی کثرتِ ازدواج کی ممانعت تھی مگر جوں جوں عیش و تنعم بڑھتا گیا۔ شادی کی صورت مسخ ہوتی گئی۔ عورتوں کی آزادی حد سے بڑھ گئی اور لونڈیاں رکھنے اور بیویاں تبدیل کرنے کا دستور رائج ہوا۔ یا تو قدیم روما میں مردوں کو یہاں تک اختیار تھا کہ اپنی بیویوں کو قتل کردیں یا تمدن کی ترقی کے ساتھ اب یہ حالت ہوگئی کہ طرفین بے سوچے سمجھے ایک دوسرے کو طلاقیں دیدیتے۔ بتدریج کثرتِ ازدواج کی لت بھی پڑگئی۔ مسیحی شاہنشاہ جسٹنطین نے جس کا مُشیرِ اعظم ایک دہریہ کافر تھا اس رواج کو قانوناً بند کردیا لیکن دراصل یہ صدیوں بعد یورپ میں تھوڑا بہت قائم رہا۔ بیویوں کے حقوق مقرر نہ تھے۔ پہلی بیوی کے علاوہ باقیوں کے بچے ناجائز سمجھے جاتے تھے۔ امرا اور پادری مزید مخفی شادیوں سے بھی لُطف اُٹھاتے تھے۔ سنیٹ آگسٹائین اور جرمن مصلحین بھی کثرتِ ازدواج کو بند نہ کرسکے۔ شاہنشاہ قسطنطین اور اُسکے فرزند ارجمند نے متعدد شادیاں کیں۔ ویلن ٹنی ان نے اس رواج کو بند نہ کیا بعد کے کئی حکمران خود اس سے فائدہ اُٹھاتے رہے نتیجتہً عوام پر بھی مدتوں جسٹنطین کے قانون کا زیادہ اثر نہ ہُوا۔ مغربی یورپ کے بادشاہوں نے کئی کئی شادیاں کیں اور بیچاری رعایا نے عملاً اُن کی داد دی۔ ہاں غریب پادریوں کو اتنی روک ضرور تھی کہ وہ بغیر اپنے اسقف کے اجازت نامہ کے ناجائز شادی نہ کرسکتے تھے۔ غرض عام طور پر مسیحی دُنیا میں عورتوں کی حالت زبون تھی۔ اُن کی فطرت کی کجی اور اُنکے اخلاق کی بُرائی زبان زدِ خلائق تھی۔ فرقۂ پروٹسٹنٹ نے اپنی اصلاحات

پیش کیں لیکن اُن میں عورتوں کا حصہ نہ تھا۔ یورپ نے عورتوں کے ساتھ "بہادرانہ برتاؤ" کرنا کہاں سے سیکھا۔ اُنہیں عربوں سے جن کے پیغمبر نے انہیں حقوقِ نسواں کی پاسداری سکھائی تھی۔ "بہادرانہ برتاؤ" کا زمانہ آٹھویں سے چودھویں صدی تک وہی وقت تھا جب عرب ہسپانیہ پر مسلّط تھے۔

غُلامی جسے آج بعض متعصب غیر مُسلم اسلام کی طرف منسوب کرتے ہیں یورپ میں صدیوں تک رائج رہی۔ مزارعین اور "ارضی غلاموں" کے فرائض ہی فرائض تھے۔ حقوق کا نام لینا اُنکے لئے گناہ تھا۔ یہ لوگ اپنی زمینوں کے ساتھ وابستہ تھے جن کے متعلق انہیں مطلق اختیار نہ تھا۔ خود کلیسا غلاموں کی خدمت سے متمتع ہوتا تھا۔ شمالی امریکہ کی جنوبی ریاستوں میں صدیوں تک غلاموں پر وہ ظلم ہُوا کئے جن کے ذکر سے انسان کی روح کانپ اُٹھتی ہے۔

ایشیائے کوچک اور نواحی ملکوں کو ایرانیوں اور رومیوں نے بارہا یکے بعد دیگرے تباہ و برباد کیا یہاں تک کہ وہاں کی مذہبی اخلاقی حالت ناگفتہ بہ ہوگئی۔ مصر و شمالی افریقہ میں مسیحی فتوحات نے کسی قسم کی اخلاقی و معاشرتی زندگی کا نشان تک نہ چھوڑا۔ ہسپانیہ میں اُمرا اور پادری گلچھرے اُڑاتے تھے۔ یہودیوں کو وہاں مذہبی آزادی حاصل نہ تھی اور عوام الناس کا درجہ فی الواقع غلاموں سے بدتر تھا۔

پانچویں صدی میں ہُونی لوگوں نے سلطنت روما کا شمالی اور مشرقی حصہ بالکل پامال کر دیا اور "خاقانوں کی سلطنت" کے نام سے ایک زبردست حکومت قائم کر لی۔ چھٹی صدی میں سلافی قوم چھاپے مارتی ہُوئی قسطنطنیہ کے دروازوں تک آ پہنچی۔ ان لوگوں نے کسی قسم کے تمدن کی بنیاد نہ ڈالی بلکہ رہی سہی تہذیب کو بھی نیست و نابود کر دیا۔

عربوں کو جب قدرت نے طاقت عطا کی تو انہوں نے اُس زبردست تمدن کی بُنیاد قائم کی جس کے کھنڈروں میں آج موجودہ تہذیب کا قصرِ عالی شان کھڑا نظر آتا ہے۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ بانیٔ اسلام کے ظہور سے **پہلے** دُنیا کے تمدن میں **مختلف مذاہب** نے کیا حِصّہ لیا اور اشاعتِ اسلام کے وقت تاریک ملکِ عرب کے باہر اطرافِ عالم میں روحانی روشنیاں کیسی مدھم پڑ چکی تھیں۔

قدیم **بابل** میں کثرت پرستی اور نفسانیت کا دَور دورہ تھا۔ **اشور** والوں کے گھر میں تھوڑی سی وحدانیت کی شمع جھلملائی لیکن ابراہیمی دین کی جھلک کے ساتھ اشوری سفاکیاں بھی نظر آتی رہیں۔

اجسام پرست **مصری** جنہوں نے ہیئت اور مساحت نقاشی اور حکمت اور تجارت اور جہاز رانی میں حیرت انگیز ایجادیں کیں اُن کا فرعون خدائی کا دعوے دار تھا اور وہ ایک خدا کو تین خدا سمجھے ہوئے تھے۔ وہ پہلے لوگ تھے جو حیات بعد الموت میں اعتقاد رکھتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ مر اُٹھنے کے بعد انسان سورج کی معیت میں اک نئی زندگی بسر کرتا ہے۔ اُنکے جادوگروں نے موسیٰ کی پیغمبری کو طلسم باطل سے جھٹلانا چاہا اور آخر کار دینِ الٰہی کو وادئ نیل سے نکلنا ہی پڑا۔

ہندوستان میں آریاؤں نے اک شاندار تمدن قائم کیا۔ اُن کا فلسفہ معراج ترقی پر پہنچا اُنکے اخلاق پر انکسار و ایثار نے اپنا صیقل کیا کبھی کبھی اُنکے ہاں زبردست سلطنتیں بھی قائم ہوئیں لیکن اُن کا مذہب کچھ دیر ترقی پا کر بہت جلد برہمنوں کے احترام جانوروں کی پوجا اور بُتوں کی پرستش میں تبدیل ہو کر رہ گیا۔

چین۔ اپنے حملہ آوروں کا قبرستان تھا۔ مادی حیثیت سے اہلِ چین کی ترقی بارود کمپاس اور چھاپہ کی ایجاد سے ظاہر ہے لیکن اُن کی علمی مذہبی حالت نہایت کمزور تھی چنانچہ اُنکی عبادت کا اک اہم جزو بزرگ پرستی تھا۔ کنفیوشس کی تعلیم نیکی پر مبنی تھی مگر وہ حیات و ممات کی گتھی کو نہ سلجھا سکا اور نہ اُس نے کوئی ایسا راستہ بتایا جس سے بھولا بھٹکا انسان اپنے خدا تک پہنچنے کی کوشش کرتا۔

ایران۔ ہمیشہ آتش کا پرستار اور نُور و ظُلمت کے جھگڑوں میں گرفتار رہا۔

یونان۔ حکمت و فلسفہ کا گھر تھا لیکن مذہب میں دیوتا پرستی و بزرگ پرستی کے درجے سے آگے اگر بڑھا تو اتنا کہ تین خداؤں پر ایمان لے آیا۔ جس سرزمین نے افلاطون و ارسطو کو پیدا کیا اُسکے فرزند آریکل کی فریب کار پیشین گوئیوں کے معتقد تھے۔ اسکندر رنگین تخیل مشرق کو اسی لئے یونانیت کے رنگ میں نہ رنگ سکا کہ یونانی تمدن مذہب کے رنگ سے عاری ہونے کے باعث خود بے رنگ تھا۔

روما۔ جس کی تلوار نے انگلستان سے لیکر عراق اور ہسپانیہ سے لے کر جرمنی تک کی دُنیا کو تسخیر کر لیا تھا اور جس کے دماغ کی قانون آفرینی نے قدیم و موجودہ تہذیب کے انضباط میں بڑا کام کیا اُس نے نہ یونان کی طرح علم و حکمت میں کچھ جدت دکھائی نہ مذہب کی راہ میں کوئی قدم بڑھایا۔ اُس کا مذہب اگر کچھ تھا تو اک مختصر سا بے معنی کفر جو فقط بعض انسانی بہادروں کے قصّوں اور چند آسمانی دیوتاؤں کی کہانیوں پر مشتمل تھا۔

یہودی۔ جن کی طرف خدا نے داوٗد و سلیمانؑ جیسے پیغمبر بھیج کر اُن کو دُنیا کی اور قوموں سے ممتاز کیا۔ اس امتیاز کا شکر صرف اپنی سرکشی اور نافرمانی سے ادا کر سکے۔ وحدانیت کو جو کبھی خاص اُن کا حصہ تھی وہ تثلیث

شرک کے اثر سے نہ بچا سکے ۔

مسیح۔ جو امن و طمانیت اور ایثار و برکت کا پیغام لے کر آیا تھا اُس کا کیا حشر ہُوا ۔ پہلی صدی عیسوی ہی میں اُس کے پیرو اُس کی ذات کے متعلق لڑنے جھگڑنے لگے اور معبد کی ہر صدی میں وہی اُنکی فرقہ بندیوں اور خانہ جنگیوں کا بڑا سبب ٹھہری ۔ تین میں ایک ایک میں تین کی بحثوں میں عیسائی قوموں کی رُوحانی و اخلاقی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی اور رواداری تو اُنکے ہاں کُفر کے برابر تھی ۔

ظہورِ اسلام کے وقت دُنیا کے تمام بڑے مذاہب کی مقدس کتابیں اپنی پاکیزگی کھو چکی تھیں توہمات کا بھُوت نوعِ انسان کی رُوح پر سوار تھا اور آزادیٔ ضمیر کے پاؤں میں غلامی کی بیڑیاں پڑ چکی تھیں ، دُنیا کی معاشرتی و اخلاقی حالت ناگفتہ بہ تھی ۔ پروفیسر جے جے لین کہتا ہے کہ "(حضرت) محمدؐ کے وقت میں معلوم شدہ دُنیا بُت پرستانہ لغویات کا کارخانہ تھی اور جیسا کہ ہم کو بعد میں پتہ چلا ہے اُس وقت کی نامعلوم شدہ دنیا بھی اسی حالت میں تھی" ۔

عرب کی سرزمین مختلف مذاہب کا اکھاڑا اور بالخصوص بُت پرستی کی آماجگاہ بن چُکی تھی مشیتِ ایزدی نے ازل سے اس سرزمین کو تاکا تھا کہ یہیں سے جب ساری دُنیا پر ظلم و جہالت کی تاریکیاں مُسلّط ہونگی نُورِ ہدایت کا چشمہ پھوٹے گا !!

(باقی) د۔ ب

بچّے کی تعلیم

ایک ماں نے ایک مُعلّم سے کہا "میں اپنے بچّے کی تعلیم کب شروع کروں ۔ وہ اب چار برس کا ہونیکو ہے "

مُعلّم نے کہا "تم نے پہلے ہی اُس کی عمر کے تین سال کھو دئیے ہیں ۔ یہ کام تو اُس وقت سے تم کر سکتی تھیں جب مُسکراہٹ پہلے پہل اُس کے لبوں پر نمودار ہُوئی" ۔

(دگلچیں)
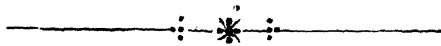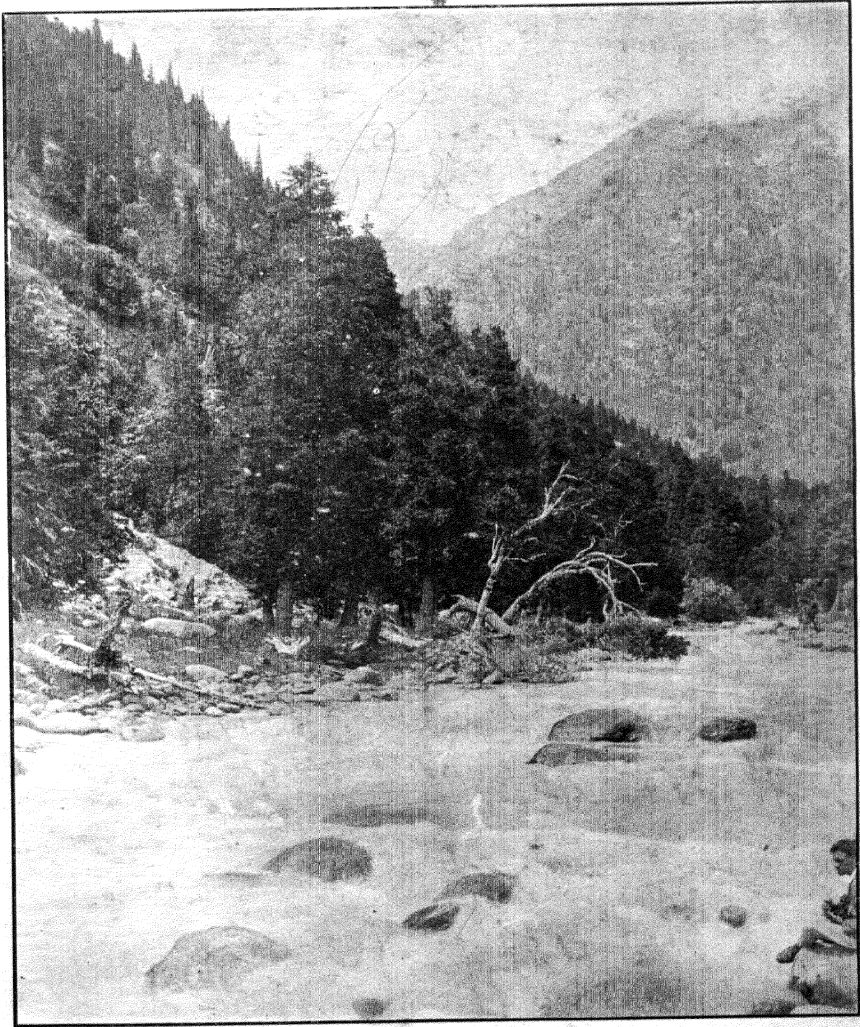
آبجو (لمرڈنی)

آبجو

اے صدائے کوہسار اے آبجوئے نغمہ خواں
اے بہارِ حسن اے آئینۂ صد گلستاں!

سینکڑوں گلشن ہیں تیرے ساحلوں پر جلوہ ریز
ساز لاکھوں تیرے بیکل پانیوں میں نغمہ ریز

کوہسار استادہ ہیں ہر سُو قطار اندر قطار
تیری عصمت کا امیں ہے جن کی عظمت کا وقار

جادہ سازِ زندگی ہے مستقل کاوش تری
اور پیامِ خرّمی یہ دائمی شورش تری

عرصۂ عالم میں اے عقدہ کشائے بندِ غم
گرم جولانی ہے تو تھامے ہوئے اپنا علَم

قطرے قطرے میں ترے پوشیدہ ہے اک سازِ برق
تیری ہر جنبش سے ہے گویا عیاں اندازِ برق

کس قدر پُر سوز و درد انگیز تیرا راگ ہے
بجھ نہیں سکتی جو پانی سے بھی یہ وہ آگ ہے

گلشنِ ہستی میں گو بہنے پہ تُو مجبور ہے
اپنی مجبوری پہ لیکن کس قدر مسرور ہے

یہ کے جب گاتی ہے تو۔ گاتی ہے تُو بہتی ہے تُو
"زندگی اک گیت ہے" زندوں سے یہ کہتی ہے تُو

جی میں آتا ہے کئے صحبت میں تیری زندگی
دُور کر دے میری ظلمت کو تری تابندگی

آبجو! میں تیری موسیقی پہ سر دھنتا رہوں
سنگریزے تیرے ساحل پر سدا چنتا رہوں

ہو کے آئینِ عمل کے راز سے آگاہ میں
دیکھ لوں آنکھوں سے اپنی زندگی کی راہ میں

یہ نظم پہل گام (کشمیر) کے قریب آبجوئے لودری کے کنارے لکھی گئی جس کی ایک تازہ تصویر میرے عزیز میاں محمد اسلم صاحب نے ہمایوں کے لئے عنایت فرمائی ہے۔

زندگی کیا ہے؟ فقط بیتابیوں کا نام ہے — روز و شب گردش میں جو رہتا ہو یہ وہ جام ہے

رُوح کے خوابِ تن آسانی سے بیداری ہے یہ — خود فروشی ہے مگر اس پر بھی خودداری ہے یہ

زندگی میں خود فراموشی ہے پیغامِ فنا — خود شناسی ہے چراغِ ظلمتِ شامِ فنا

دل کو اے غافل! شعاعِ نور سے تابندہ کر — اس چمن کو پھر نسیمِ آرزو سے زندہ کر

وقت ہے بیدار کر سوئی ہُوئی قسمت کو تُو — پالے اِس دُنیا میں پھر کھوئی ہُوئی جنّت کو تُو

خوبیٔ حُسنِ عمل آئینۂ قدرت میں دیکھ — جوشِ صہبائے مسرت شیشۂ کُلفت میں دیکھ

فکرِ مستقبل نہ کر ذکرِ مصائب چھوڑ دے — بندشِ حاضر کی زنجیروں کو یکسر توڑ دے

بہ نکل میدانِ ہستی میں مثالِ جُوئبار — سادہ پوش و سخت کوش و گرم جوش و بیقرار

شکلِ کُہسار اپنی خودداری پہ قائم رہ مدام — نُورِ حق کا آئینہ ہو نفس تیرا صبح و شام

جس طرح بُلبل کو پھُولوں سے چمن میں پیار ہو — اُلفتِ خلقِ خدا سے دل ترا سرشار ہو

طبعِ پاکیزہ تری چمکے ستارے کی طرح — نُور کا ٹکڑا بنے دل ماہ پارے کی طرح

نیک بن بیدار ہو احسان کر دلشاد رہ!

پاک بن بے باک ہو ایثار کر آزاد رہ!

د۔ب

سلام کی شاعری

مرثیہ گویوں نے جب سلام ایجاد کیا، تو اس سے پہلے غزل موجود تھی۔ غزل وارداتِ قلبی کے بیان کیلئے موضوع ہُوئی تھی۔ اس میں جو شاعری کی جاتی ہے اُسکا پہلو داخلی ہے۔ خارجی نہیں۔ اگر کبھی خارجی شاعری کی جائے، تو اس میں بھی داخلی انداز شریک ہونا چاہیئے۔ غزل انہیں شاعروں کی مقبول ہُوئی جنہوں نے قلبِ انسانی کی اندرونی لہروں کی تصویر کھینچ کر دکھائی۔ جن غزل گو شاعروں نے اس کا لحاظ نہیں رکھا۔ اُنکی غزلیں مرگئیں۔ اُنکے دیوان فنا ہوگئے اور گمنامی کے غبار میں چھپ گئے۔ غزل میں عشقِ مجازی کے سافل جذبات بھی بیان ہو سکتے ہیں اور عشقِ حقیقی کے لطیف جذبات کا چربہ بھی اُتارا جا سکتا ہے۔ حکیمانہ خیالات بھی اُس میں بے تکلف ظاہر ہو سکتے ہیں، حافظ نے غزل کی شاعری میں اخلاقی فلسفہ کو اس خوبی سے بیان کیا ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ بلند پایہ شاعروں نے غزل میں تصوف اخلاقیات۔ اور حکیمانہ خیالات کے دریا بہائے ہیں۔ غزل کا ہر شعر جداگانہ ہوتا ہے۔ اس میں ایک مستقل خیال یا جذبہ بیان کیا جاتا ہے یورپ کی شاعری سے غزل گوئی کا انداز الگ ہے۔ ہمارے شعرا کے دیوانوں میں بہت کم غزلیں ہیں جو اوّل سے آخر تک اپنے مضمون کے لحاظ سے مربوط اور مسلسل ہوں۔ البتہ قطعہ بند شعر بیچ میں آسکتے ہیں ؛

جس زمانے میں دبیر و انیس نے مرثیہ گوئی کے فن میں شہرت پائی، لکھنؤ میں غزل گوئی کا چرچا بھی حد سے زیادہ تھا۔ خود مرثیہ گو غزل کہنے کی اعلیٰ قابلیت رکھتے تھے۔ مگر اُنہوں نے مرثیہ گوئی کو اپنا فن بنا لیا تھا، علاوہ ظاہری تحسین و آفرین کے انکو اس قسم کی شاعری سے ثوابِ آخرت کی بھی توقع تھی۔ مرثیہ مسلسل واقعات کا مسلسل بیان ہوتا ہے۔ مگر شہادت کے متعلق جستہ جستہ خیالات بھی شاعر کے ذہن میں آ سکتے ہیں، ان خیالات کے اظہار کے لئے انہوں نے غزل کا پیرایہ اختیار کیا اور اس کا نام سلام رکھا۔ سلام کا ڈھانچا ایسا تیار کیا کہ غزل کے عاشقانہ مضامین کو چھوڑ کر دیگر وارداتِ قلبیہ اور حکیمانہ خیالات بھی اُس میں بے تکلف سما سکیں؛

غزل گوئی میں جولانیِ طبع کے مقابلہ کیلئے جو محفل مُرتب کی جاتی ہے۔ اُسکو مشاعرہ کہتے ہیں۔ سلام میں طبع آزمائی کا اظہار جس محفل میں کیا جاتا ہے، اُس کو مسالمہ کہنے لگے۔ سلام کی خصوصیات حسبِ ذیل ہیں:-

(۱) شاعر سلام کے شروع میں اپنے تئیں سلامی یا مجرئی کہکر مخاطب کرتا ہے ؛

(۲) ۔ سلام کی زمین غزل کی طرح عموماً شگفتہ ہوتی ہے جس میں آسانی سے سلام گو شاعر اپنے خیالات کا اظہار کر سکے ٭

(۳) ۔ شہادت کے متعلق مختلف وارداتِ قلبی اور منفرد خیالات کا اظہار سلام کا اصلی موضوع ہے ۔ اور اسی خاص مضمون پر اُس کی بنیاد رکھی گئی ہے ٭

(۴) سلام کے درمیان کسی کسی شعر میں سلام گو اپنا کوئی حکیمانہ خیال یا کوئی اخلاقی بات بھی بیان کر جاتا ہے ۔ اپنی تمنا، اپنی شخصی حالت اور حریفوں کے مقابلہ میں فخر کا اظہار بھی اسی ذیل میں شامل ہے ٭

غزل کی طرح قافیہ اور ردیف کا ایسا ربط جو مختلف محاوروں پر حاوی ہو جائے، سلام میں بھی ہوتا ہے اور اس غرض کے لئے کبھی کبھی ایسی زمینیں اختیار کی جاتی ہیں، جن سے محاورہ دانی کا اظہار ہو سکے ۔ غزل کی طرح سلام کے درمیان قطعہ بند اشعار بھی آجاتے ہیں ۔ غرضکہ جو مرثیہ گو غزل گوئی کا کمال بھی دکھانا چاہیں، وہ سلام کہہ کر اپنی اس تشنگی کو رفع کر سکتے ہیں ٭

انیس کے علاوہ دبیر ۔ مونس ۔ اُنس ۔ عروج ۔ نفیس ۔ اوج وغیرہ مرثیہ گو شاعروں نے اس صنعت میں طبع آزمائی کی ہے ۔ مگر ہم یہاں انیس کے سلاموں کو مثال کے طور پر پیش کرتے ہیں ۔

انیس کے سلام عموماً سات آٹھ شعر سے کم اور پچیس تیس اشعار سے زیادہ نہیں ہیں ۔ جو شگفتہ زمینیں انیس نے اختیار کی ہیں، اُنکی چند مثالیں حسب ذیل ہیں:۔

ٹپکتا ہے ۔ چھلکتا ہے ۔
کمال مجھے ۔ ہلال مجھے ۔
دُلھن کے پاس ۔ چمن کے پاس ۔
شباب رہتا ہے ۔ آفتاب رہتا ہے ۔
وطن سے جدا ۔ کفن سے جدا ۔
بیاں کر دیا ۔ آسماں کر دیا ۔
آفتاب مجھے ۔ شباب مجھے ۔
نہالوں کی ۔ مرنے والوں کی ۔
چمن ہے ۔ سخن ہے ۔
گلزار ہوں ۔ بیمار ہوں ۔

آسماں پیدا ہوئے ۔ بیزباں پیدا ہوئے ۔
دریا نہ چاہیئے ۔ تمنّا نہ چاہیئے ۔
رو سکتا نہیں ۔ ہو سکتا نہیں ۔
دنا ہو گئی ۔ ہوا ہو گئی ۔
جدا ہوتا ہے ۔ فنا ہوتا ہے ۔
ظاہر ہے ۔ نادر ہے ۔
کربلا کے سامنے ۔ خدا کے سامنے ۔
چرچا رہ گیا ۔ دریا رہ گیا ۔
زمینوں کو ۔ خوشہ چینوں کو ۔
بقا میرے ۔ شفا میرے لئے ۔

خدا نہیں رکھتے - وفا نہیں رکھتے -
اُٹھا کے چلے - دکھا کے چلے
قدم رکھتے نہیں - ہم رکھتے نہیں
سر و رچھوٹے - بستر چھوٹے
زباں کھینچتے ہیں - کماں کھینچتے ہیں

اخیر کی زمین وغیرہ ایسی ہے جس میں انیس نے اپنی محاورہ دانی کا ثبوت دیا ہے - چنانچہ اس ردیف میں اُس نے ذیل کے محاورے کھپائے ہیں :-

شبیہ کھینچنا - تصویر کھینچنا - زمین پر نشان کھینچنا - شکنجہ میں کھینچنا - لحد پر سائبان کھینچنا - اپنے آپ کو کھینچنا - سختیاں کھینچنا - بارِ گراں کھینچنا - سر کو آسمان تک کھینچنا - ہاتھ کھینچنا - آہ کھینچنا - ایذا کھینچنا - اُتری کمان کھینچنا - چلّہ کھینچنا - آپ اپنی زبان کھینچنا - اذیت کھینچنا - جفا کھینچنا - لنگر کھینچنا - گلاب کھینچنا - خفّت کھینچنا - معافی کا خط کھینچنا - رنج کھینچنا - سر سے چادر کھینچنا - رگ رگ سے جان کھینچنا - تلوار کھینچنا - رخت کھینچنا - دُکھ کھینچنا - قدم کھینچنا - کلیجے سے برچھی کھینچنا - گھوڑے کی باگ کھینچنا - کانوں سے بالیاں کھینچنا +

یہ بھی غزل کا ایک کمال خیال کیا جاتا ہے کہ ایسی زمینوں میں جن میں بہت سے محاوروں کی کھپت ہو سکتی ہو، قافیہ ردیف کا کوئی ایسا پہلو چھوٹنے نہ پائے، جس سے کسی محاورہ کا اظہار ہو سکتا ہو +

جس طرح غزل گو غزل میں طبیعت کی جولانی کا اظہار کئی کئی مطلعے لکھ کر کیا کرتے ہیں، یہی حال سلام کا ہے - اس میں بھی شاعر اپنے حُسنِ طبع کا ثبوت مطلع - حُسنِ مطلع - زیبِ مطلع لکھ کر دیتا ہے - مثلاً انیس نے "چھلکتا ہے" "چمکتا ہے" کی زمین میں ذیل کے دو نہایت لطیف مطلعے لکھے ہیں +

سلامی چشم سے رہ رہ کے خونِ دل ٹپکتا ہے	غمِ سجّادِ بیکس دل میں کانٹا سا کھٹکتا ہے
سلامی چشم میں آنسو ہیں یا دریا چھلکتا ہے	جگر میں داغ ہیں یا کھیت لالہ کا لہکتا ہے

ایک اور زمین کے دو مطلعے ملاحظہ ہوں :-

مثالِ بدر جو حاصل ہُوا کمال مجھے	گھٹا گھٹا کے فلک نے کیا ہلال مجھے
کمال شوقِ زیارت ہے اب کے سال مجھے	کریم ہند کی ظلمت سے اب نکال مجھے

"زمینوں کو" "حسینوں کو" انیس کے سلام کی مشہور زمین ہے۔ اُس کا مطلع، حسنِ مطلع اور زیبِ مطلع بھی ملاحظہ طلب ہے:۔

سدا ہے فکرِ ترقی بلند بینوں کو | ہم آسمان سے لائے ہیں ان زمینوں کو
پڑھیں درود نہ کیوں دیکھ کر حسینوں کو | خیالِ صنعتِ صانع ہے پاک بینوں کو
لحد میں سوئے ہیں چھوڑا ہے شہ نشینوں کو | قضا کہاں سے کہاں لے گئی مکینوں کو

انیس نے ایک سلام کے آٹھ مطلعے اور ایک کے چودہ مطلعے لکھے ہیں۔ شہادت کے جستہ جستہ مضامین جو سلام میں باندھے جاتے ہیں، اُن کا اندازہ کرنیکے لئے چند مثالیں ذیل میں پیش کی جاتی ہیں:۔

غمناک دن کا آغاز ہے، جس کا انجام پہلے سے پیش نظر ہے، اس وقت کا سماں اس سے زیادہ دردانگیز الفاظ میں ادا نہیں ہو سکتا ۔

حرم روئے۔ کہا جب آسماں کو دیکھکر شہ نے | علی اکبر اذاں دو۔ صبح کا تارا چمکتا ہے

حضرت سکینہ جو ناز پروردہ تھیں اُنکی حالت قید خانے میں کیا تھی اس کی جو تصویر ایک عالم تشبیہ اور سادہ زبان میں انیس نے کھینچی ہے، اُس کی تعریف نہیں ہو سکتی ۔

سکینہ ناز پرور قید کی آفت کو کیا جانے | یہ عالم ہے قفس میں جس طرح طائر پھڑکتا ہے

اسی بے نظیر سلام میں چار شعر کا ایک قطعہ لکھا ہے، جس میں حضرت اصغر کی پیاس کا عالم دکھایا ہے۔ جس کو سُن کر ہر شاعر سر دُھننے لگتا ہے۔ قطعہ ملاحظہ ہو:۔

کہا بانو نے شہ سے تیر چلتے ہیں کلیجے پر | مرا مُنہ جب یہ بچہ نرگسی آنکھوں سے تکتا ہے
یہ ننھے ننھے دونوں ہاتھ بل کھاتے ہیں تکیوں پر | مسوڑھے ہو گئے ہیں نیلگوں، تالو پپکتا ہے
بچالو واسطہ زہرا کا صاحب! میرے اصغر کو | نہ بچہ دُودھ پیتا ہے۔ نہ اب آنکھیں جھپکتا ہے
صُراحی دار یہ گردن ڈھلی جاتی ہے بن پانی | گلے میں سانس جب رُکتی ہے۔ سر دیدے پٹکتا ہے

انیس کا یہ سلام مرزا غالب کے زمانے میں دہلی پہنچ گیا تھا۔ مولانا حالی کا بیان ہے کہ مرزا اس قطعہ کے دوسرے شعر کو بار بار پڑھتے اور وجد کرتے تھے۔ خود مولانا حالی کو بھی ہم نے کئی بار یہ شعر پڑھتے اور سر دُھنتے دیکھا ہے ۔

انیس کا وہ سلام بھی بہت مشہور ہے، جس کی زمین ہے" نونہالوں کی، صاحب کمالوں کی "

اس سلام کے مندرجۂ ذیل دو شعر ملاحظہ ہوں، جن میں انیس نے دلیرانِ کربلا کی شجاعت اور معرکہ آرائی کی تعریف دلی جوش سے کی ہے :

جوانانِ حسینی نے پرے توڑے صفیں اُلٹیں ۔۔۔ نہ بھولیگی قیامت تک لڑائی مرنے والونکی
جوانانِ علی کو دیں اگر تشبیہ کس سے دیں ۔۔۔ کہاں سے ڈھونڈ کر لائیں مثالیں بیشہ والونکی

ایک سلام کے دو شعر ذیل میں پیش کئے جاتے ہیں، جن میں سے پہلے شعر میں حضرت حُر کا اور دُوسرے میں حضرت اصغر کا ذکر ہے۔

جان دی حُر نے تو حضرت نے دیا باغِ ارم ۔۔۔ میہماں ایسے۔ نہ ایسے میزباں پیدا ہوئے
بود و نابودِ علی اصغر کا کیا کیجے بیاں ۔۔۔ میز باں دُنیا سے اُٹھے۔ میز باں پیدا ہوئے

یہ سلام انیس نے حیدر آباد میں پڑھ کر سُنایا تھا اور اس پر بیحد تحسین و آفرین کے نعرے بلند ہوئے تھے ؛

ذرا حضرت قاسم کے نکاح کا دردناک انجام دیکھئے۔ اس سلام کی زمین ہے "چمن کے پاس"۔ "کفن کے پاس"

شہ پڑھ چکے جو عقد۔ تو آئے سلام کو ۔۔۔ دُولھا کے پاس موت۔ رنڈاپا دُلھن کے پاس

ذیل کا قطعہ ذوالفقار کی زبان سے ہے :-

کہتی تھی تیغِ علی یا شاہِ دیں! ۔۔۔ حُکم گر دیجے تو آتش بار ہوں
سب کو کر دیتی ہوں فرش اک آن میں ۔۔۔ عرش سے اُتری ہُوئی تلوار ہوں
میں نے کاٹے ہیں۔ پر رُوح الامیں ۔۔۔ میں علی کی تیغ جوہردار ہوں
چار آئینہ ہو بَر میں ۔ یا زرہ ۔۔۔ چار کر دوں اُس کو جس سے چار ہوں

ایک سلام ہے "اُٹھا کے چلے"۔ "دکھا کے چلے"۔ اُس میں بے بسی اور بیکسی کی یہ تصویریں بھی نظر کے سامنے لائیے۔

ملی نہ پھُولوں کی چادر تو اہلبیتِ رسُول ۔۔۔ مزارِ شاہ پہ لختِ جگر چڑھا کے چلے
چلے وطن کو جو عابد تو کہتے تھے رو کر ۔۔۔ علی کے چاند کو ہم خاک میں ملا کے چلے

اب ایک نظر اُن خیالات پر بھی ڈالنی چاہیئے، جو مضامینِ شہادت کے علاوہ سلام میں لائے

گئے ہیں اور جن کے اظہار کا موقع مرثیہ میں بجز آخری بند کے نہیں ملتا۔

انسانی ہستی کی ناپائداری۔

نمود و بود بشر کیا محیطِ عالم میں
ہوا کا جب کوئی جھوکا چلا۔ حباب نہ تھا

جوانی کا قلیل عرصہ۔

نہ جانے برق کی چشمک تھی، یا شرر کی لپک
ذرا جو آنکھ جھپک کر کھلی۔ شباب نہ تھا

دلوں کی شکستگی۔

کسی کو کیا ہو دلوں کی شکستگی کی خبر
کہ ٹوٹنے میں یہ شیشے صدا نہیں رکھتے

دولتمندوں کا عبرت انگیز انجام۔

نوبتِ جمشید و دارا و سکندر اب کہاں
خاک تک چھانی۔ نہ قبروں کے نشاں پیدا ہوئے

زندگی کی بے ثباتی۔

جو عدم سے آ گیا دنیا میں، بولی ہنس کے موت
اور لو دو چار دن کے میہماں پیدا ہوئے

دنیا کے بکھیڑے۔

کھانے کو رزق۔ رہنے کو گھر اور لحد کو جا
دنیا میں ایک جان کو کیا کیا نہ چاہیئے

اختلافِ حالات۔

ہر اک کے واسطے ہے ترقی بقدرِ حال
اسفل کو فکرِ منصبِ اعلےٰ نہ چاہیئے

ہر کوہ پر نہ ہوگی تجلّی مثالِ طور
ہر ہاتھ کے لئے یدِ بیضا نہ چاہیئے

شباب کی ایک نادر تشبیہ۔

شباب تھا کہ دمِ واپسیں کی آمد و شد
یہ مضطرب اِدھر آیا۔ اُدھر روانہ ہوا

شباب اور حیاتِ انسانی کی ناپائداری۔ دنیا کے بکھیڑے۔ اختلافِ حالات۔ دولتمندوں کا عبرت ناک انجام یہ مضامین جو سلام میں لائے گئے ہیں، بالکل وہی ہیں، جو اُس زمانے کی شاعری میں عام تھے اور جن کے بار بار شاعر کے ذہن میں آنے کا باعث وہ ماحول تھا، جس میں میر تقی میر اور دیگر شعرا نے زندگی بسر کی تھی۔ مگر وہ اشعار جن سے انیس کے حالات و خیالات پر اور اُس زمانے کے واقعات پر روشنی پڑتی ہے، خاصکر توجہ کے قابل ہیں۔ اس لئے ذیل میں ہم ایسے اشعار پیش کرتے ہیں۔

لوگوں کے ساتھ خاکساری اور تواضع سے پیش آنا انیس کی فطرت میں داخل تھا۔ اپنی اِسی عادت کی طرف اشارہ کرتے ہیں:۔

انیس عمر بسر کر دو خاکساری میں　　　کہیں نہ یہ کہ غلام ابو تراب نہ تھا

اسی خاکساری کو انیس نے اپنے لئے عزت اور عظمت کا باعث سمجھ رکھا تھا۔ کس جوش سے فرماتے ہیں:۔

خاکساری نے دکھائیں رفعتوں پر رفعتیں　　　اس زمیں سے واہ کیا کیا آسماں پیدا ہوئے

دوسروں کے لئے بھی وہ اسی نتیجے کے متوقع ہیں۔

ملا جنہیں اُنہیں اُفتادگی سے اوج ملا۔　　　اُنھیں نے کھائی ہے ٹھوکر جو سر اُٹھا کے چلے

جن لوگوں کی پاکیزہ زندگی انیس جیسی ہو، وہ کسی کی دل آزاری کب پسند کرتے ہیں۔ اُنکو ہر وقت اس بات کا خیال رہتا ہے کہ اُن کی کسی حرکت سے دوسروں کو آزار نہ پہنچے۔

خیالِ خاطرِ احباب چاہیئے ہر دم　　　انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

اپنی اسی مرنجان و مرنج زندگی کی طرف انیس نے ذیل کے شعر میں اشارہ کیا ہے:۔

مثلِ بوئے گُل سفر ہوگا مرا　　　وہ نہیں میں جو کسی پر بار ہوں

کسی کا دل نہ کیا ہم نے پائمال کبھی　　　چلے جو راہ تو چیونٹی کو بھی بچا کے چلے

انیس درباری شاعر نہ تھے۔ اُن کو دولت و جاہ کی طلب نہ تھی۔ خودداری اور توکل کی زندگی بسر کرتے تھے۔ ملاحظہ ہو:۔

اہلِ دولت سے نہیں مطلب انیس　　　یاں توکل ہے سدا اللہ پر

قناعت پر بسر کرنا اور اپنی عزت کو سوال کی ذلت سے نہ بدلنا۔ اہل کمال کی زندگی کا خاصہ ہے انیس اسی حالت میں مگن ہیں اور کہتے ہیں:۔

قناعت و گہرِ آبرو و دولتِ دیں　　　ہم اپنے کیسۂ خالی میں کیا نہیں رکھتے

کسی کے سامنے کیوں جاکے ہاتھ پھیلاؤں　　　مرا کریم تو دیتا ہے بے سوال مجھے

انیس کی دعا بھی اسی انداز کی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

کریم جو تجھے دینا ہو بے طلب دیدے　　　فقیر ہوں پہ نہیں عادتِ سوال مجھے

انیس اپنے کمال سے خود واقف تھے۔ اُنکو اپنے کمال پر ناز تھا۔ وہ جانتے تھے کہ مرثیہ گوئی سے اُنہوں نے فنِ شاعری کو کس بلندی پر پہنچا دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں اور بجا کہتے ہیں:۔

کسی نے تری طرح سے اے انیس ۔۔۔ عروسِ سخن کو سنوارا نہیں
سُبک ہو چلی تھی ترازوئے شعر ۔۔۔ مگر ہم نے پلّہ گراں کر دیا
مری قدر کر اے زمینِ سخن ۔۔۔ کہ میں نے تجھے آسماں کر دیا

خودداری اور کمال کے تیور ملاحظہ کیجئے۔

سر کس و ناکس سے جُھکنے کا نہیں ۔۔۔ ہمدموا! میں تیغِ جوہر دار ہوں
اے زمیں مجھ کو حقارت سے نہ دیکھ ۔۔۔ آسماں کا طُرّۂ دستار ہوں
جُز خدا جُھکتے نہیں ہم بادشا کے سامنے ۔۔۔ ہاتھ پھیلائے تونگر کیا گدا کے سامنے

احساس کمال کے ساتھ زمانے کے شکوہ کو فضول سمجھتے ہیں اور اپنے دل کو یوں سمجھاتے ہیں:۔

انیس اس قدر شورہ بختی کا شکوہ ۔۔۔ یہ دولت ہے تھوڑی کہ شیریں سخن ہے

اپنی جدّتِ فکر اور بلند پروازی پر انیس کو خود فخر و ناز ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ حریف گو اُنکے کمال کا اعتراف نہ کریں۔ مگر چُپ چاپ مستفید ہوتے ہیں؛

سدا ہے فکر ترقی بلند بینوں کو ۔۔۔ ہم آسماں سے لائے ہیں ان زمینوں کو
لگا رہا ہوں مضامینِ تازہ کے انبار ۔۔۔ خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

حریف جب اُن پر اعتراض کرتے ہیں اور حسد سے اُنکے برخلاف زہر اُگلتے ہیں تو وہ ضبط کرتے ہیں اور کہتے ہیں:۔

ضبط دیکھو سب کی سُن لی۔ پر نہ اپنی کُچھ کہی ۔۔۔ اس زباندانی پہ گویا بے زباں پیدا ہوئے

انیس چھریرے بدن کے تھے۔ دُہرا جسم نہ تھا۔ اس کی طرف بھی خود اپنے اشعار میں اشارہ کیا ہے۔

ابتدا سے ہم ضعیف و ناتواں پیدا ہوئے ۔۔۔ اُڑ گیا جب رنگ رُخ سے استخواں پیدا ہوئے

لکھنؤ کا انقلاب اُن کی آنکھوں کے سامنے ہوا۔ ایک سلام میں کس درد ناک انداز سے فرماتے ہیں:۔

امیر جس دیہ دولت پہ اک زمانہ ہوا ۔۔۔ وہ گھر اُجڑ گیا۔ غارت وہ کارخانہ ہوا

مکیں رہے۔ نہ مکاں۔ طرفہ کارخانہ ہُوا   زمیں اُلٹ گئی۔ کیا منقلب زمانہ ہُوا
یہ انقلاب غضب کا ہے یا علی فریاد   کہ مسجدیں تھیں جہاں واں شرابخانہ ہُوا

انیس کو وطن کی سرزمین سے بیحد اُنس تھا۔ مگر اودھ کے انقلاب نے اُنکو باہر جانے پر مجبور کیا۔ وہ پٹنہ۔ الہ آباد اور حیدر آباد پہنچے۔ یہ سفر اُنہوں نے بادلِ ناخواستہ کئے۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہیں:۔

کشاں کشاں مجھے جانا پڑا وہاں آخر   جہاں جہاں مری قسمت کا آب و دانہ ہُوا

ہندوستان کے انقلاب و ہنگامہ کو دیکھ کر اُن کے دل میں کربلا جانے کا خیال پیدا ہُوا۔ علاوہ مذہبی عقیدہ کے یہ حالت بھی خاصکر اس خیال کی محرک تھی۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔

جو خضرِ بخت مجھے کربلا میں پہنچا دے
نہ آئے خواب میں بھی ہند کا خیال مجھے

نوائے راز

کُنجِ عزلت سے زیادہ کہیں آرام نہیں   یہ وہ دُنیا ہے جہاں صبح نہیں، شام نہیں
پُوری ہوتی ہیں کبھی آرزوئے خام نہیں   ایک آغاز ہے لیکن کوئی انجام نہیں
میری تقدیر! اسیرِ غمِ ایام ہوں میں   اس میں کچھ شائبہ گردشِ ایام نہیں
آرزوؤں نے پریشاں بنا رکھا ہے   جسم آرام میں ہے، روح کو آرام نہیں
تیرے دیدار کی حسرت ترے ملنے کی امید   شکر صد شکر کہ دل میں ہوس خام نہیں
کیا حسیں اور زمانے میں نہیں ہے کوئی   لیکن اے دوست! مرا ذوقِ نظر عام نہیں

رازؔ کیا یاد نہیں تجھ کو وہ پیمانِ ازل
حیف! عشاق کے دفتر میں ترا نام نہیں

ابوالفاضل رازؔ چاندپوری

محبت کا دُوسرا دَور

وہ پھر تیرے جنونِ شوق کا حد سے گزر جانا　　　وہ پھر میرے سکونِ دل کا شیرازہ بکھر جانا

وہ پھر مجھکو ترا با طلعتِ قاتل نظر آنا　　　وہ پھر تیرا چھُری لیکر مرے دل میں اُتر جانا

وہ پھر تیرا کٹاری باندھکر سینے میں در آنا　　　وہ پھر تیرا سناں بن کر کلیجے سے گزر جانا

وہ پھر میرا تری پہلی نظر میں تلملا اُٹھنا　　　وہ پھر تیری نظر کا گھاؤ دل سے تا جگر جانا

وہ پھر میرے دلِ مظلوم سے شورِ بکا اُٹھنا　　　وہ پھر تیرا مجھے اُلٹی چھُری سے ذبح کر جانا

وہ پھر تیرا ستم کرنا۔ وہ پھر تیرا غضب ڈھانا　　　وہ پھر میرا دل و دیں چھین لینا اور مکر جانا

وہ پھر تیرے خمِ زلفِ دوتا کا داؤں چل جانا　　　وہ پھر میرے دلِ آزاد کی بازی کا ہر جانا

وہ پھر تیرا مری رگ رگ میں خون شوق دوڑانا
وہ پھر میری تمناؤں کا رنگ رخ نکھر جانا
وہ پھر تیرا مری ٹوٹی ہوئی اُمید بندھوانا
وہ پھر میرے دل خالی کا ارمانوں سے بھر جانا

وہ پھر تیرے تعشق کا مجھے دونا نشہ چڑھنا
وہ پھر میرے تعلق کا جنوں دونا اُبھر جانا
وہ پھر تیری محبت کا ہزاروں رنگ سے بڑھنا
وہ پھر تیری تمنا کا ہزاروں گُل کتر جانا

وہ پھر تیرا مجھے اپنے کرم سے ہوش میں لانا
وہ پھر میرا خمار بادۂ غفلت اُتر جانا
وہ پھر تیرا مرے جذبات الفت جوش میں لانا
وہ پھر تیرا مری مُردہ طبیعت زندہ کر جانا

وہ پھر تیرا مجھے اک خاص بیتابی عطا کرنا
وہ پھر میرے دل بےحِس کی حالت کا سُدھر جانا
وہ پھر تیرا مجھے مامون خوف ماسوا کرنا
وہ پھر میری طبیعت کا سکون پانا ٹھہر جانا

وہ پھر آزاد کو ہر قید سے آزادیاں ملنا
وہ پھر آزاد کے بگڑے نصیبوں کا سنور جانا

حکیم آزاد انصاری

بچّے کھیل رہے تھے

بچّے کھیل رہے تھے، ندی گا رہی تھی، ہوا ناچ رہی تھی۔ پھول اترا اترا کر جھوم رہے تھے، بچّے لڑ پڑے مگر ندی کے راگ میں، ہوا کے رقص میں، پھولوں کی مسکراہٹ میں ذرا فرق نہ آیا۔ بچّے لڑ لڑا کے ایک بڑے گروہ کی بجائے دو چھوٹی جماعتوں میں منتشر ہوتے نظر آئے۔ جو پٹے تھے۔ وہ روتے کڑھتے الگ ہٹ رہے تھے۔ پیٹنے والے تن تن کر کہہ رہے تھے "کہا نہ ماننے کا مزہ چکھا؟" پٹنے والے بڑبڑا رہے تھے "نہیں مانتے۔ سو دفعہ نہیں مانیں گے۔ کیوں مانیں؟" "ای ای ای"۔ یہ "ای ای ای" آخری دو چار چپتوں کا رسیدی جواب تھا۔ تھوڑی دیر بعد الگ الگ کھیل شروع ہو گیا۔ بڑے لڑکے دریا کھودنے لگے اور چھوٹے لڑکے قلعہ تعمیر کرنے میں مشغول ہو گئے۔

دریا کھد کر طیار ہوا تو چھوٹی چھوٹی اوکیں۔ اس میں پانی بہانے کی فکر میں لگیں۔ اوک میں کتنا پانی آتا؟ آخر ایک باتدبیر ہونہار نے ایک چھوٹے لڑکے کی ٹوپی کا ڈول بنایا۔ یہ بچارا اپنے مٹی کے قلعہ کی اٹھتی ہوئی بلندی میں اس قدر مصروف تھا کہ یہ تمام ماجرا اسے تب معلوم ہوا جب دریا کی لہروں نے اسکے قلعہ کی دیوار آ گرائی، دریا بھی رک گیا قلعہ بھی ڈھے گیا اور کھیل بھی بھول گیا۔ پھر وہی ٹکے۔ وہی لاتیں وہی اوں اوں۔ ابکی بڑے بچّوں میں خود تین جماعتیں ہو گئیں۔ کچھ تو اس بااصول کے حمایتی تھے جس نے پکار کر کہا: "جس کا سکا اس کی ٹوپی"۔ کچھ چاہتے تھے کہ ٹوپی میں پانی اجازت سے بھرنا چاہیئے تھا۔ اس جماعت کا اعتراض یہ نہ تھا کہ ٹوپی خراب ہوئی یا ٹوپی والے کا دل دکھا بلکہ صرف یہ کہ خودداری کا لازمی تقاضا ہے کہ اجازت طلبی کی رسم کو ضرور ادا کیا جائے۔ ان کا آخری قول فیصل یہ تھا کہ اگر اجازت خوشی سے نہ دی جاتی تو پھر زبردستی ٹوپی چھین لی جاتی تو چنداں مضائقہ نہ تھا۔ تیسری پارٹی کے احساسات کا اظہار یوں ہوا کہ اجازت کا سوال قطعاً فروعی ہے۔ ان کا اصرار اس بات پر تھا کہ دریا بنانیوالی جماعت کے کسی ایک ممبر کا باقی ممبروں کو اپنی تجویز سے بے خبر رکھنا غداری ہے اور بیخبر رکھتے ہوئے اس تجویز پر عمل کر دینا غیر آئینی ہے۔ "تم نے تجویز کو باقاعدہ پیش کر کے اسے منظور کیوں نہیں کرایا؟" یہ تھا اس تیسری جماعت کا سوال۔

گھر واپس جانے کا وقت ابھی نہ آیا تھا۔ شام دور تھی، باغ پُر فضا تھا اور کھیل کے شوق سے چہرے گلنار تھے۔ چنانچہ اب چار مختلف جگہ کھیل شروع ہوا۔ ہر جگہ کھیل تھوڑی دیر انہماک سے رہتا اور پھر ضرور کچھ نہ کچھ لڑائی ہو جاتی اور نئی نئی ٹولیاں طیار ہوتیں۔ تھے تو بچے مگر ایک لڑائی میں پوری شاعری کر گئے۔ کسی شوخ طباع کو سوجھی کہ لاؤ اس باغبان کا جو اصل مقصد ہے وہ پورا کر دیں یعنے پھول بن کر مسکرائیں۔ ندی بن کر گائیں اور ہوا کی اٹکھیلوں کو مات کریں۔ سب نے کوشش کی مگر باغبان کے نام پر جھگڑا ہو گیا۔ پھر وہی لگتے وہی لاتیں وہی اوں اوں۔ لڑتے لڑتے ایک بولا کہ باغبان کا قصہ چھوڑو وہ تو نہ آئے۔ نہ بولے ہوتا تو یا آتا یا بولتا۔ آؤ اس باغ کو اپنا بنالیں۔ اپنا بناتے بناتے باغ کی تقسیم پر پھر لڑائی ہو گئی۔

بچوں کا وقت کس قدر لمبا ہوتا ہے اور اس کے برعکس فرشتے جن کو اکثر غلط طور پر بچوں سے تشبیہ دی جاتی ہے کس قدر جلد باز ہوتے ہیں۔ ایک فرشتہ اس امر کے لئے تیار ہو رہا تھا کہ یہ چھوٹی سی فالتو شمع جس کا نام نظام شمسی ہے کچھ ٹھیک نہیں جلی اسے گل کر دوں۔

فلک پیما از لندن

گہر ہائے راز

کچھ بے سبب نہیں کہ سراپا زباں ہوں میں	عالم تمام راز ہے اور راز داں ہوں میں
صبح ازل سے ہوں تنِ گیتی میں مثلِ رُوح	مجھ کو نہیں ہراسِ فنا جاوداں ہوں میں
نہ پروا کر کہ ہوتے ہیں دو عالم سرگراں تجھ سے	یہ دیکھا کر کہ تو مجھ سے نہیں ہے شرمسار اے دل
کیا لب بستہ مجھ کو کس ادا فہم محبت نے	بیاں ہوتا نہیں میرے ہی مُنہ سے مدعا میرا
دلِ خورشید، داغِ مہ، رگِ گل، سینۂ بُلبل	شہیدِ جستجو ہوں ہر کوئی ہے آشنا میرا
اے دل بقدرِ ظرف کہاں ہے بہارِ خلد	شاید سراغ ہو یہ کسی جلوہ گاہ کا
جولب ہستیٔ مطلق پہ بن آئے نہ رہا	غم ہستی کا وہی نالۂ بیتاب ہوں میں
اب شکوہ ہائے درد کروں گا نہ میں کبھی	اب داستانِ ہجر سنے گا نہ تو مری
یا میں تھا اور صبح و مسا تیری آرزو	یا تو ہے اور شام و سحر جستجو مری

حامد

جادو کی ٹوپی

پوتھی کوتنک رتناولی کا قلمی نسخہ دستیاب ہونے تک مجھ میں اور کالی چرن میں عملیات کا ذکر کبھی کبھا محض تفریح کی غرض سے ہُوا کرتا تھا۔ زندگی میں اپنی آرزوئیں بر نہ آنے کا احساس جب طبیعت پر مسلط ہو جاتا اور افسردہ خاموشی کسی قدر دردناک صورت اختیار کرنا شروع کرتی۔ تو میں خود اسے لاحاصل سمجھ کر ایک مردہ تبسّم کے ساتھ تخیّل کی دنیا کا رخ کر لیتا "واہ یار کالی چرن! تجھ سے اتنا بھی نہ ہو سکا۔ کہ اپنے چاچا سے کوئی کاج سدھ کرنے کا منتر ہی سیکھ لیتا"

منتر کا نام زبان پر آتے ہی طبیعت میں ایک ہلکا سا ہیجان پیدا ہوتا۔ رفتہ رفتہ تصوّر کی باگیں ڈھیلی چھوٹ جاتیں، اور ذرا سی دیر میں اپنی اپنی ڈفلی اپنا اپنا راگ۔ ہم عجیب سے عجیب ارمان بیان کرنے شروع کر دیتے۔ اور بعض اوقات تو اظہارِ خیال میں آرزوؤں کی ندرت کے سوا اور کچھ مدنظر نہ رہتا۔

کبھی طبیعت پروازِ خیال پر مائل نہ ہوتی۔ تو میں کالی چرن کے چاچا کے شوقِ عملیات پر اس سے طالب علمانہ انداز میں سوالات شروع کر دیتا۔ اور یہ سُن کر اس کا مُنہ تکتے تکتے کھویا سا جاتا۔ کہ کئی مرتبہ اس کے چاچا اپنے کمرے سے نکلے بغیر اندر ہی اندر کسی طرح غائب ہو گئے۔ اور کچھ دیر بعد آپ سے آپ پھر وہیں آن موجود ہُوئے۔

جب کبھی اس جدوجہد کی دُنیا میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے مجھے اپنی انتہائی مساعی بھی بے بس اور معذور نظر آتیں اور مایوسیوں کی بدولت طبیعت پر ضعف کی وہ کیفیت طاری ہوتی جب اوہام ایمان پر حکمراں ہو جاتے ہیں۔ تو کوئی دیوانی طاقت مجھے عملیات کے پرستان کی طرف کھینچ لے جانا چاہتی۔ اور میں حریصانہ کالی چرن سے پوچھتا۔ "چاچا سے کچھ مل بھی سکتا ہے!"

وہ کہتا۔ جب سوال کیا ہے۔ انہوں نے جواب دیا۔ جو پردے قدرت نے دنیادار کی نظر پر ڈال دیئے ہیں۔ انکے اُٹھانے کی کوشش کرنا قدرت کے انتظام میں خلل ڈالنا اور خود اپنی تباہی کو بلانا ہے۔ ہاں دنیا کو چھوڑ دو۔ تپسیا سے دل کو پتھر بنالو۔ برداشت کرنے کے قابل بن جاؤ۔ پھر بادشاہتیں بھی نظروں میں ہیچ کر دونگا"

میں کہتا "بھوک ہی مٹ گئی۔ تو دسترخوان پر نعمتیں آنے سے حاصل؟"

کالی چرن بھی بے بسی کی ایک آہ بھر کر کہتا "نہ جانے کس چیز کو میری برداشت سے باہر سمجھتے ہیں"

اور واقعی کالی چرن کی برداشت اچھی خاصی ضرب المثل تھی۔ اسکے اعصاب لوہے کے تھے اور دل پتھر کا۔ طبعی ایذا اُس کے مُنہ سے اُف نہ نکلوا سکتی تھی۔ اور جذبات کی گرمی کبھی اس کو موم کرنے میں کامیاب نہ ہوئی تھی۔ وہ داروئے بیہوشی سونگھے بغیر مسکرا مسکرا کر اپنے اوپر خطرناک عمل جراحی کرا لینے کی جرأت رکھتا تھا اور اپنے ایک دم توڑتے ہوئے عزیز کے سرہانے اس کے دل سے موت کی ہیبت کم کرنیکو میرے روبرو قہقہے لگاتا رہا تھا۔

لیکن تھوڑے ہی عرصے میں چاچا کے انتقال کے ساتھ گویا ان دور از قیاس امیدوں کا بھی خاتمہ ہوگیا چاچا کے بیوی بچّے ایک ایک کر کے سب کے سب دُنیا سے اُٹھ چکے تھے۔ اور غالباً یہی صدمات انہیں دنیا سے دل برداشتہ کر کے عملیات کے پراسرار عالم میں لے گئے تھے۔ انکے انتقال کے بعد تنہا وارث ہونے کی حیثیت سے کالی چرن نے انکے اثاثے پر قبضہ کر لیا۔ اور جب انکے چھوٹے سے مکان کے مختصر سامان کو دیکھنا شروع کیا۔ تو ایک بڑے صندوق میں کئی ہڈیوں جڑی بوٹیوں اور ادویات کی پڑیوں میں دبا ہوا اسے سیاہ آبنوس کا ایک صندوقچہ ملا جس کے ڈھکنے پر ہاتھی دانت کا نہایت خوشنما کام بنا ہوا تھا۔ اور اندر سیاہ مخمل لگی تھی۔ اس صندوقچے کے ایک خانے میں کمخواب کے غلاف میں بند ایک کتاب رکھی تھی۔ جسے نکال کر کالی چرن نے دیکھا۔ تو پوتھی کوتک رتناولی کا قلمی نسخہ تھا۔

مجھے وہ رات اس طرح یاد ہے۔ جیسے کل کی بات ہو جب میں اور کالی چرن ایک مدھم روشنی کی لالٹین کے سامنے بیٹھ کر اس کتاب کی ورق گردانی کر رہے تھے۔ اور اس کے ہیجان انگیز عنوانات کو پڑھ کر تحیّر کے عالم میں ایک دوسرے کا منہ تکتے جاتے تھے۔

اس میں کیا نہ تھا؟ دماغ انسانی غور و فکر سے تپ اُٹھنے کے بعد قدرت و اختیار کے جن امکانات کو تصوّر میں نہیں لا سکتا۔ ابلیس کا تخیل کینہ و انتقام کی مبہم آرزؤں کے جن نقوش کو نمایاں کرنیکی جرأت نہیں کر سکتا۔ ان سے مستفید ہونے کی مفصل تراکیب اس کتاب کے صفحوں پر الفاظ میں لکھی تھیں۔ اور کتاب کے شروع میں ایک طویل مقدمہ درج تھا۔ جس میں عملیات کی تاثیر کے اسباب پر مدلل بحث کر رکھی تھی۔

مجھے یاد ہے اس میں ایک مقام پر لکھا تھا۔ تو منتروں کے بے تعلق الفاظ کو بے معنی سمجھتا ہے۔ لیکن کیا چین کے رہنے والوں کی بولی بھی تجھ کو بے معنی نہیں معلوم ہوتی؟ صرف یہی وہ الفاظ ہیں۔ جو فضا میں گھر سے اُتر کر غیر مرئی ہستیوں کے کان کے پردے چھو سکتے ہیں۔ اور اے عامل! جس طرح تیری زبان کے الفاظ میں ہنسی کا پیغام لوگوں کو ہنساتا اور دُکھ کا اثر لوگوں کو رُلا دیتا ہے۔ اسی طرح وہ تیرا خضوع و خشوع اور تیری آرزو کی شدت ہے۔ جو تیرے منتر کو کامیاب بنا سکتی ہے +

اور اس کتاب میں کس شے کا منتر نہ تھا؟ معمولی سے معمولی بیماری سے شفا پانے کا منتر تھا۔ اور اس بے پایاں فضا کے تمام کُروں کو ایک دوسرے سے ٹکرا کر پاش پاش کر دینے کا منتر تھا۔ اور ان منتروں کی امداد کیلئے عجیب و غریب عمل تھے۔ جن میں سے کسی میں پہاڑی کوّے کا گوشت۔ اور کسی میں سیاہ بلّی کی ہڈی کسی میں اونٹ کا ناخن اور کسی میں بھینگے انسان کی آنکھ کام میں آتی تھی + لیکن ان عجیب و غریب اشیا کے استعمال کے متعلق بھی دلیل سے کام لینے کی کوشش کی گئی تھی۔ مقدمہ میں ایک دوسرے مقام پر لکھا تھا۔ تو صرف بیج کو زمین میں بو کر ایک ہری بھری فصل کو لہلہاتا ہُوا نہیں دیکھتا؟ پتھر پر پتھر مار کر تجھے آگ کی چنگاری جھڑتی نظر نہیں آتی؟ پھر اے عامل۔ جب تو لکھا دیکھے۔ کہ سیار کی ناف تلاش کر کے اندھے کوئیں میں ڈال دے۔ تو تو اپنی محدود نظر کے ہوتے کس طرح اس عمل کو بے نتیجہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے؟

لیکن بیشتر عملیات میں ایسی عسیر الحصول چیزوں کی ضرورت پڑتی تھی۔ اور منتر پڑھنے کے لئے استھان اور آسن کے متعلق ایسی سخت شرائط درج تھیں۔ کہ ان کا مطالعہ کسی مبتدی کے لئے ارمان انگیز نہ ہو سکتا تھا۔ گو ہم مستفید ہونے کے ارادے سے اسے پڑھنے نہ بیٹھے تھے۔ تاہم جہاں کسی عمل میں کوئی بات ہمیں اپنے بس سے باہر کی معلوم ہوتی تو اُس کا باقی حصہ پڑھنا ہمارے لئے دشوار ہو جاتا تھا + اسی طرح ہم نصف سے زیادہ کتاب پر سرسری نظر ڈال چکے تھے کہ ایک صفحے پر عنوان کی دلکشی دیکھ کر اور عمل کے متعلق چند ہی سطریں پڑھنے کے بعد ہم دونوں خود بخود سنبھل کر بیٹھ گئے۔ اور زیادہ توجہ سے اس کو پڑھنے لگے +

یہ غیر مرئی دُنیا پر مسلّط ہونے کا منتر تھا۔ اس میں کامیابی حاصل کرنے سے تمام ارواحِ خبیثہ کو اپنا مطیع اور بندۂ بے دام بنایا جا سکتا تھا اور اس اطاعت کی حالت میں وہ عامل کے ہر حکم کی تعمیل پر مجبور ہو جاتی تھیں۔ اسی لئے اس منتر کو منتروں کے سرتاج کے نام سے یاد کیا گیا تھا +

گو اس قسم کی قدرت حاصل کرنیکے اور بھی کئی منتر کتاب میں درج تھے۔ لیکن اس عمل میں یہ خوبی تھی کہ اسکا طریقہ

بہت زیادہ دشوار اور صبر آزمانہ تھا۔ صرف ایک اندھیری رات میں مرگھٹ کو جانے اور پھر چالیس دن تک شہر سے باہر کسی ویران مقام میں روزانہ چند گھنٹے وظیفے اور مشاہدے میں صرف کرنیکی ضرورت تھی۔ اس کے بعد بآسانی جادو کی وہ ٹوپی ہاتھ آجاتی تھی جسے پہننے سے غیر مرئی دنیا کے دروازے کھل سکتے اور اتارتے ہی بند ہو جاتے ہیں ۰

ہم دونوں اسے پڑھ کر دنیائے خیال کی ایک سنہری کہر میں کھوئے گئے۔

لیکن ذرا سی دیر بعد ہم نے چونک کر زیادہ شوق سے اس کے متعلق مزید معلومات کا مطالعہ کرنا شروع کیا۔ نیچے لکھا تھا "اے عامل دنیا کو چھوڑ کر اس منتر کو آزما۔ اور پہلے تپسیا سے غیر مرئی دنیا پر نظر ڈالنے کی برداشت ــــــ"

کالی چرن بولا "لیجئے۔ برداشت یہاں بھی آگئی"

میں نے کہا "ہاں اس کے لئے حوصلے کی ضرورت تو ہے"

کالی چرن بولا "کمزور آدمی کے لئے نہ؟ اور جو پہلے ہی سنگدل مشہور ہو!"

میں نے پھر پڑھنا شروع کیا "تپسیا سے غیر مرئی دنیا پر نظر ڈالنے کی برداشت اور اپنی دنیا میں واپس آنے کے لئے پُر قوت عزم پیدا کر۔ ورنہ پشیمان ہونے کی مہلت بھی نہ پائیگا ۰

یہ سن کر کالی چرن کچھ دیر کسی خیال میں کھویا سا رہا۔ آخر بولا "یا تو یہ سب کچھ غلط ہے۔ اور پھر یا یہ سب جھوٹی دھمکیاں لوگوں کا حوصلہ پست کرنے کی غرض سے زیادہ کر دی گئی ہیں۔ ورنہ عملیات میں برداشت اور عزم ایسی اہم چیزیں معلوم نہیں ہوتیں ۰

میں بولا "یقین سے کیا کہا جا سکتا ہے!"

کئی راتیں اکٹھے بیٹھ کر ہم نے اس کتاب کو ایک ایک لفظ کر کے ختم کیا۔ لیکن غیر مرئی دنیا کا منتر اپنی سہولت اور اپنے بیش بہا فوائد کی وجہ سے ہمارے دل کو کچھ ایسا بھا گیا تھا۔ کہ پھر کوئی دوسرا منتر ہمیں زیادہ دلفریب نہ معلوم ہو سکا۔ چنانچہ ہم ہر روز مطالعہ ختم کر چکنے کے بعد ایک آدھ گھنٹہ اسی عمل کو شروع کرنے کے متعلق بحث بھی کرنے لگے ۰ میں کہتا "جو کچھ چاہا کیتے تھے۔ وہی کتاب میں لکھا ہے۔ ایسی حالت میں تپسیا کے بغیر اس کام میں ہاتھ ڈالنا خطرے سے خالی نہیں ۰

کالی چرن ہنس پڑتا۔ اور کہتا "منتر اور عمل تو غیر مرئی ہستیوں کو متاثر کرنے کی غرض سے ہیں۔ مانا اور

بھلا یہ تپسیا کیوں؟ صرف اپنے آپ کو مضبوط کرنے کے لئے نہ؟ اپنے آپ کو کس بات کے لئے مضبوط کیا جائے؟ صرف اس لئے کہ اگر منظر برداشت سے باہر ہو تو ہاتھ اُٹھا کر ٹوپی اتار دی جائے! کیا فضول ہے"

میں بہت زیادہ وہمی واقع ہُوا تھا۔ نامعلوم خدشوں سے گھبرا کر کوشش کرتا۔ کہ یہ خیال ارادہ کی صورت اختیار نہ کرے۔ کہنا چاہتا "دیکھو تو ———"

مگر کالی چرن بہت نڈر اور قوی طبیعت تھا۔ بات کاٹ دیتا" ارے بھئی بہت ڈرپوک ہو۔ یعنی یہ فرض کرکے کہ سب کچھ ہو جائیگا۔ خطروں سے ڈرتے بیٹھ گئے۔ اور اس بات کا خیال ہی نہیں۔ کہ نتیجہ بھی نکلتا ہے۔ یا یوں ہی سب باتیں ہیں +

عمل شروع کرنے کے متعلق ہمارا ارادہ ابھی ڈانواڈول حالت ہی میں تھا۔ کہ اتفاق سے دیوالی کا تہوار آن پہنچا۔ کتاب میں دیوالی کی رات کو عمل شروع کرنے کے لئے خاص طور پر ترجیح دے رکھی تھی چنانچہ اس موقع کو جو پھر سال بھر سے پہلے نہ آسکتا تھا۔ ہاتھ سے جانے دینا مناسب نہ معلوم ہُوا۔ اور یک لخت عمل شروع کر دینے کا تصفیہ کر لیا گیا +

دیوالی کی رات کو روشنیاں دم توڑ چکی تھیں۔ صرف کہیں کہیں کسی دیوار پر اِکا دُکا چراغ آخری سانس لے رہا تھا۔ اور چند گھنٹے پیشتر کی جگمگاہٹ اور گہما گہمی کی یاد دلا کر نظارے پر حزن و ملال برسا رہا تھا۔ کہ میں اور کالی چرن گھر سے نکل کر مرگھٹ کو روانہ ہوئے +

مرگھٹ ویران پڑا تھا۔ اندھیرے میں چند بجھتی ہوئی چتائیں کسی راکشس کی پتھرائی ہوئی آنکھوں کی طرح گھورتی نظر آرہی تھیں۔ کاجل سی تاریکی میں طرح طرح کے پراسرار دھبے آوارہ تھے۔ جو ذرا ذرا سی دیر میں چکر لگا کر شیطانی ارواح کی صورتیں اختیار کر لیتے۔ دانت نکال دیتے اور وحشیانہ انداز میں ناچنے لگتے تھے۔ اور بلا کی خاموشی اور سناٹا تھا۔ مرجھائے ہُوئے پتے ہمارے قدموں میں چڑ چڑ بول رہے تھے۔ لیکن اس عظیم سکوت میں ان کی آوازاتنی بلند معلوم ہوتی تھی جیسے تناور درختوں کے ٹہنے بوجھ کے مارے ٹوٹے جارہے ہوں۔ رہ رہ کر گیدڑوں کی چیخیں بین کی آوازیں بن کر کہیں دور سے آرہی تھیں۔ یا کبھی کبھی بھاری بھاری پروں کے پرندے درختوں کی تاریکی میں بے چین ہو کر پھڑ پھڑاتے اور اپنی جگہ بدل لیتے تھے +

میں ذرا دور سے ساکت و جامد کھڑا تھا۔ اور کالی چرن چتا کی مدھم سرخ روشنی میں مٹی کے کسی ٹوٹے ہوئے گھڑے کا ثابت گلا تلاش کر رہا تھا۔ اِدھر اُدھر بیشمار ٹھیکرے پڑے تھے۔ اور ان کے رگڑ کھانے اور آپس میں

ٹکرانے سے ایسی آواز پیدا ہورہی تھی۔ جیسے غیر مرئی دُنیا میں کسی جلترنگ پر موت کا راگ بجایا جارہا ہو۔

بہت دیر کی تلاش کے بعد ٹھیکروں کے ڈھیر ہی سے ایک گھڑے کا ثابت گلا دستیاب ہوگیا اور اسے لیکر کالی چرن میرے پاس آیا۔ ہم جلد جلد قدم اُٹھاکر گھر روانہ ہوئے۔ مگر مجھے آبادی میں پہنچنے پر بھی یہی دھڑکا لگا رہا۔ کہ اس گھڑے کا گلا چھین لینے کو کوئی ہمارے پیچھے بھاگا چلا آرہا ہے۔

پہلا مرحلہ طے ہوگیا تھا۔ اب چالیس دن تک شام کو منتر جپنے اور ایک عمل میں مصروف رہنے کا کام باقی رہا تھا۔

جب شام کی دھند میں کائنات افسردگی کی تصویر نظر آنے لگتی تو میں اور کالی چرن گھڑے کا گلا ساتھ لے کر شہر سے باہر نکل جاتے۔ اور پیپل کے درخت پر چڑھ کر کسی مضبوط ٹہنے پر بیٹھ جاتے۔ منتر پڑھنے کے لئے کتاب میں ایسا ہی مقام تجویز کیا گیا تھا۔ اور ہدایت تھی۔ کہ منتر پڑھنے کے دوران میں اس گھڑے کے گلے میں سے راستوں پر مویشیوں کو گھر لوٹتے ہوئے دیکھا جائے۔

کالی چرن ہلکے ہلکے منتر جپا کرتا۔ اور میں دم بخود بیٹھ کر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر اُدھر تکتا رہتا۔ کالی چرن کی گمبھیر آواز سے منتر کے الفاظ میں ایک عجیب وزن سا پیدا ہوجاتا۔ اور یہ معلوم ہوتا۔ جیسے ان ہی الفاظ کی ضرب سے رفتہ رفتہ رنگین دنیا پر رات کی تاریکی کا بوجھل نقاب اُترا آرہا ہے۔

کالی چرن یہاں بیٹھ کر اپنے آپ کو بھول جاتا۔ اور منتر کے ساتھ قوتِ ارادی اور توجہ سے اس قدر کام لیتا۔ کہ اسکے ماتھے پر پسینے کی بوندیں پھوٹ نکلتیں۔ منتر پڑھنے کے دوران میں وہ آنکھیں بند کرلیتا لیکن ذرا اور اسی دیر کے بعد کھولتا۔ اور مویشیوں کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظر ڈالتا۔ منتر کی محنت سے اسکی آنکھیں سُرخ ہوتیں اور جب وہ ایک پل کیلئے اِدھر اُدھر دیکھتا۔ تو یہ معلوم ہوتا۔ جیسے دو انگارے اس جستجو میں ہیں کہ کسی چیز پر گر کر اُسے جھُلس ڈالیں۔

کسان اپنے مویشیوں کو لے کر فراغت اور اطمینان کی تانیں اڑاتے ہوئے گھروں کو لوٹتے۔ کالی چرن ان کا گیت سُنتے ہی گھڑے کا گلا اُٹھاتا۔ اور اس میں سے مویشیوں کو دیکھنے لگتا۔ یک لخت مویشیوں میں سے ایک بلند اور بے ترتیب شور و غوغا کی صدا بلند ہوتی۔ اور پھر وہ بیتاب ہو کر سر اور دُمیں ہلانے لگتے۔ کسانوں کے گیت رُک جاتے۔ اور ایک مختصر سا سکوت طاری ہوجاتا۔ جس میں ہزاروں نامعلوم خطرات لرز رہے ہوتے۔

کالی چرن حسب ہدایت عمل ختم کر چکنے کے بعد جے مہابیر کا ایک نعرہ لگاتا۔ اور اسکے بعد ذراسی دیر کو خاموش اور بےحس و حرکت بیٹھ جاتا۔ کانپتی ہوئی تاریکی میں کسان اور مویشی چُپ چاپ اس طرح چل کھڑے ہوتے جیسے کسی جنازے کے ساتھ جا رہے ہوں۔ بہت دُور مکانوں میں سے دھوئیں کے کثیف اور سیدھے اور لمبے بادل اُٹھتے ہوئے یوں معلوم ہوتے جیسے کسی دیو نے حیرت کے مارے اپنی زبان باہر نکال رکھی ہے۔ مندروں کے گھنٹوں کی آوازیں بےبس اور ناتواں فریادوں کی طرح کانوں میں پہنچتیں۔

جوں جوں چلہ ختم ہونیکے دن قریب آ رہے تھے۔ بیتابیاں اور خدشے میرے دل کو پانی پانی کئے دیتے تھے۔ دن کی روشنی مجھے ایسی مصنوعی سی نظر آتی۔ جیسے سوگواروں کو دکھائی دیتی ہے۔ رات کی تاریکی بیشمار ہیبتناک شکلوں سے پٹی ہوتی۔ بالوں والے لمبے لمبے ہاتھ مجھے نیند سے جھنجھوڑ کر جگا دیتے۔ لال لال پھٹی ہوئی آنکھیں تاریک گوشوں میں سے مجھ کو گھورتیں بڑے بڑے سفید دانت مجھ پر ہنستے۔ اور بھاری بھاری اور مدقوق انسانوں کے سے قہقہے میرے کانوں میں گونجتے رہتے۔

اور اسی حالت میں جب زندگی کا تار گھِستے گھِستے بیحد کمزور پڑ گیا تھا۔ چالیسواں دن آن پہنچا۔ میں شام کے وقت مہینوں کے بیمار کی طرح سکڑا سکڑایا منہ سر لپیٹے پڑا تھا۔ اور آنکھیں کھولے اپنے دل کی بلند دھڑکن کو فکر سے سُن رہا تھا۔ کہ کالی چرن آن پہنچا۔ وہ خاموش اور بےحد متین نظر آ رہا تھا لیکن اسکی آنکھوں میں ایک قسم کا عزم آہنیں تھا۔ کہ اسے دیکھتے ہی کسی طاقت نے مجھے بٹھا کر میرے پاؤں زمین سے لگا دئے۔ میں سنبھل کر کچھ کہنا چاہتا تھا کہ اس نے حاکمانہ انداز میں مجھ سے چلنے کو کہا۔ اور میں اٹھ کھڑا ہوا۔

میں کالی چرن کے ساتھ ساتھ جا رہا تھا۔ مگر ایسا معلوم ہوتا تھا۔ میں قوت صرف نہیں کر رہا۔ زمین خود بخود میرے قدموں کے نیچے سے سرکتی جا رہی ہے۔ ایک شدید سنسناہٹ نے میری گوں کو محشرستان بنا رکھا تھا۔ اور ایک عجیب شور کی گونج میں میرے حواس کھوئے گئے تھے۔

پیپل کے نیچے پہنچ کر مجھ پر موت کی سی بےبسی طاری ہوگئی۔ اور اگرچہ ایک ناتواں تمنا مجھے اوپر چڑھنے پر اکسا رہی تھی۔ لیکن مجھ سے قدم نہ اُٹھایا گیا۔ اور میں جیسے ہوش اور موت کی آخری حد پر پہنچ کر ڈھیر ہوگیا۔

کالی چرن بےباکانہ انداز میں درخت پر چڑھ گیا۔ اور ذراسی دیر میں اسکے منتروں کی دھیمی دھیمی

آوازیں میرے کانوں میں پہنچنے لگی۔ جیسے موت کے اُس پار سے آرہی ہو۔

کچھ دیر بعد ایک کسان کا گیت دُور سے لرزتا ہوا آیا۔ جس سے میری ہڈیوں کا مغز تک جم کر رہ گیا۔ اور مجھ پر نزع کے انتہائی کرب کی حالت طاری ہو گئی۔ اسی وقت شاید کالی چرن نے گھڑے کے گلے میں سے مویشیوں کو دیکھا ہو گا۔ اور کتاب کی تحریر کے بموجب اسے کسی مویشی کے سینگوں پر ایک بونا جادو کی ٹوپی پہنے نظر آیا ہو گا، مویشیوں کی فلک شگاف فریاد کے درمیان مجھے کالی چرن کا جے مہابیر کا نعرہ سُنائی دیا۔ وہ درخت سے کودا اور بونے کے سر پر سے ٹوپی اُتارنے کو مویشیوں کی طرف سرپٹ بھاگا۔ ذراسی دیر میں ایک زہرہ گداز کڑک طبقات زمین میں سے نکل کر جیسے آسمان کو پارہ پارہ کرنے کے لئے چلی، اس کے بعد مجھے کچھ معلوم نہیں۔ کہ کیا ہُوا۔

جب میں ہوش میں آیا۔ تو اپنے گھر میں تھا۔ اور کالی چرن میرے سرہانے بیٹھا میرے سر پر ہاتھ پھیر رہا تھا، نہ جانے اس چالیس دن کی ریاضت سے اس میں کیا اثر پیدا ہو گیا تھا۔ کہ اس سے نظریں چار ہوتے ہی مجھے اپنے بدن میں قوت کی لہریں دوڑتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ میری نظروں میں سوال دیکھ کر اس نے خود ہی کہا "مل گئی"

اگرچہ میرا دل بہت زور زور سے دھڑکنے لگا۔ مگر اعصاب پر سے ایک بوجھ سا اُٹھ گیا۔ میں نے پوچھا "کیا کچھ ہُوا تھا؟"

اس نے بتایا۔ میں نے گھڑے کے گلے میں سے جب مویشیوں کو دیکھنا شروع کیا تو مجھے انکے درمیان ایک جسیم اور خوفناک بیل دکھائی دیا۔ جس کے بڑے بڑے سینگوں پر چار برس کے بچے کے قد کا ایک بڈھا بیٹھا ہُوا تھا۔ اس کا چہرہ ایسا تھا۔ جیسے مجوّف آئینے میں انسان کی شکل لمبوتری سی نظر آتی ہے۔ نقش و نگار بندر کے سے تھے۔ صرف آنکھیں بلّی سے مشابہ معلوم ہوتی تھیں۔ ڈاڑھی یوں کھڑی تھی۔ جیسے خارپشت کے بال۔ اور اس نے اپنے دُبلے پتلے ہاتھوں سے ٹوپی کو اپنے سر پر دبا رکھا تھا۔ اور گھبرائی گھبرائی نظروں سے اِدھر اُدھر تک رہا تھا۔ میں اسے دیکھتے ہی درخت پر سے کُودا۔ اور اس کی طرف بھاگا۔

بونے نے اپنی بلّی سی آنکھیں چمکا چمکا کر اور اپنے سُوکھے ہُوئے ہاتھ ہلا ہلا کر مجھے ڈرانا چاہا۔ مگر میں درّانا بڑھتا چلا گیا۔ اور جاتے ہی ٹوپی اسکے سر پر سے اتار لی۔ اسکے اُترتے ہی وہ نظروں سے غائب ہو گیا۔

یہ کہہ کر کالی چرن نے اپنی کوٹ کے اندر کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اور اس میں سے ایک بڑا رومال نکال لیا۔ اسے کھولا تو اس کے اندر ایک چھوٹی سی مخروطی وضع کی ٹوپی رکھی تھی۔ یہ ٹوپی انوکھی شکل کے موتیوں سے بنی ہوئی تھی۔ جو اس قدر صاف و شفاف تھے۔ کہ ابھی دکھائی دے رہے ہیں اور پلک جھپکنے میں نظر سے اوجھل ہو گئے۔ غور سے دیکھنے پر ان موتیوں میں عجیب و غریب شکل کے ننھے ننھے ذرے برقی رو کی تیزی سے گھومتے ہوئے نظر آتے تھے۔

ٹوپی کو سامنے دیکھ کر میں اسے تکنے کا تکتا رہ گیا۔ کالی چرن خاموش تھا۔ اور بے معنی خیالات کا ایک محشرستان میرے دماغ کی دیواریں توڑ کر پھوٹ بہنا چاہتا تھا۔

ذرا سی دیر کے بعد کالی چرن نے آہستہ سے کہا "اور اب اسے پہننے سے تمام ارواح خبیثہ میرے ہر حکم کی تعمیل پر کمر بستہ ہو جائیں گی۔

میں نے چونک کر کہا "نہیں نہیں!

کالی چرن مسکرا کر پوچھنے لگا "کیوں؟"

اس کے موجودہ اطمینان اور گزشتہ عمل کے درمیان اس کی جرأت کا خیال کر کے میں کوئی دلیل نہ دے سکا "نہیں نہیں۔ اس کو پہننا نہیں!"

کالی چرن بولا "تو میں نے یہ تمام محنت کسی عجائب خانے کو زینت دینے کی غرض سے کی تھی؟ اب کہ میری زبان کے الفاظ زمین کے اندر کی عجائبات اور آسمان کے اس پار کے نظارے تک میری آنکھوں کے سامنے کھول کر رکھ سکتے ہیں۔ ابتدا اور انتہا صرف میرے اشاروں کا نام بن سکتا ہے۔ میں اسکو استعمال میں نہ لاؤں؟"

میں نے کہا "کالی چرن! مگر تپسیا برداشت، عزم ؟"

ٹوپی حاصل کر لینے کی کامیابی ایک نشہ بن کر اس کے دماغ پر چھا رہی تھی۔ اس نے ایک قہقہہ لگایا۔ ٹوپی پہن لینے اور اتار دینے میں تپسیا کیا فائدہ پہنچا سکتی ہے؟ دوست خوابوں کا زمانہ گزر چکا۔ تعبیر کا وقت آ گیا ہے۔ اپنے تخیل کو ہوا کی طرح آزاد چھوڑ دو۔ آرزو کرو۔ تمنائیں بتاؤ۔ اپنے فائدے کے لئے نہیں محض لطف کے لئے۔ تفریح کے لئے۔ مقناطیس لوہے پر ایسی جلدی اثر نہیں کرتا۔ جیسی سرعت سے تمہاری زبان کے الفاظ تمہارے ارمانوں کا سامان بہم پہنچا دینگے۔"

وہ خلافِ عادت بہت دیر تک بولتا اور کامرانی کی مسرت کو پر تکلف الفاظ میں بیان کرتا رہا۔ کوئی میرے دل میں کہہ رہا تھا۔ کہ اس کی برداشت کی حد آگئی؟ یا یہ اپنی اسی جرأت سے غیر مرئی دُنیا کو بھی مسخر کر ڈالیگا۔ لیکن میں ابھی کچھ کہنے نہ پایا تھا۔ کہ وہ سبک انداز سے اُٹھ کھڑا ہُوا۔ بولا "میں جاتا ہوں۔ اپنے اور تمہارے لئے عیش جاودانی کا سامان مہیا کرنے کو۔ اور خواہ وہ غیر مرئی دُنیا کے مہیب ترین شیطانوں کے پنجے میں کیوں نہ ہو۔ میں ان سے چھین کر ابھی لاتا ہوں"۔

یہ کہہ کر اس نے ہنستے ہنستے ٹوپی اٹھائی اور بانکپن کی ایک ادا کے ساتھ اپنے سر پر رکھ لی۔

میرے دل کی دھڑکن تھم گئی۔ اور امید و بیم کی ایک دُنیا سمٹ کر اس ایک پل میں سما گئی۔

لمحے بھر میں اسکے چہرے پر دہشت کے آثار نمایاں ہونے شروع ہُوئے۔ اور اس نے ایک زور کی چیخ ماری۔ کسی پوشیدہ طبعی جدوجہد سے اس کا چہرہ انگارہ اور تمام جسم پسینے سے شرابور ہونے لگا۔ آنکھوں کے ڈھیلے ابل کر باہر نکل آئے۔ زبان جیسے تالو سے چپک کر رہ گئی۔ اور بھرآئے ہُوئے گلے میں سے ایک کانپتی ہُوئی حیوانی فریاد نکلی۔ اپنے ہاتھ اُٹھانے کے لئے اس نے دیوانہ وار جدوجہد کی۔ مگر وہ جیسے فالج سے ناکارہ ہو گئے تھے۔ اور اس انتہائی کرب کے عالم میں وہ مٹ رہا تھا۔ کرب سے مسخ نیلے چہرے۔ پھٹی پھٹی بے نور آنکھوں اور مدہم گلوگیر چیخوں کے ساتھ ایک مرجھائی ہوئی تصویر بن کر فضا میں تحلیل ہُوا جا رہا تھا!

میں پتھر کا بت بن کر اس ہولناک اور روح فرسا نظارے کو دیکھ رہا تھا۔ اور جو کچھ ہو رہا تھا۔ اسے پوری طرح سمجھنے بھی نہ پایا تھا۔ کہ کالی چرن غیر مرئی دنیا میں جذب ہو کر رہ گیا۔

یک لخت کسی طاقت نے بے شمار مرتبہ میرے مُنہ سے کالی چرن۔ کالی چرن۔ کالی چرن نکلوا دیا۔ لیکن بے سود۔ میں ہمہ تن چشم تھا۔ کہ اب اس نے غیر مرئی دُنیا میں اپنی ٹوپی اتاری۔ اور وہ نظر آیا۔ اس مقام کو گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔ جہاں وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ مگر وہاں کچھ نہ تھا۔ صرف یہ معلوم ہوتا تھا۔ کہ کرب و نزع کی چند دبی ہوئی چیخیں۔ فضا کا لرزاں نقاب پھاڑ کر باہر نکل پڑنا چاہتی ہیں۔

سید امتیاز علی تاج

نوائے آدم

نُور ہوں نُور کا سیلاب اُگلنا ہے مجھے
صُورتِ چشمۂ خورشید اُبلنا ہے مجھے

نہ سمائے گا یہ طوفانِ تمنّا دل میں
بادۂ تُند ہوں شیشہ سے اُچھلنا ہے مجھے

پھیل کر دونوں جہانوں پہ میں چھا جاؤنگا
شاخِ نورس ہوں ابھی پُھولنا پھلنا ہے مجھے

وضعِ عالم سے دبا ہوں نہ دبوں گا میں کبھی
کیونکہ آئینِ دو عالم کو بدلنا ہے مجھے

منفعل کیوں ہو مری ہمّتِ عالی مجھ سے
مجھ کو معلوم ہے گر گر کے سنبھلنا ہے مجھے

نہ تڑپ اس قفسِ تنگ سے آخر اے دل!
چیر کر پہلوئے گیتی کو نکلنا ہے مجھے

مضطرب میرے لئے برقِ تجلّی کیوں ہے
حاصلِ عشق ہوں ہر حال میں جلنا ہے مجھے

حامد علی خاں
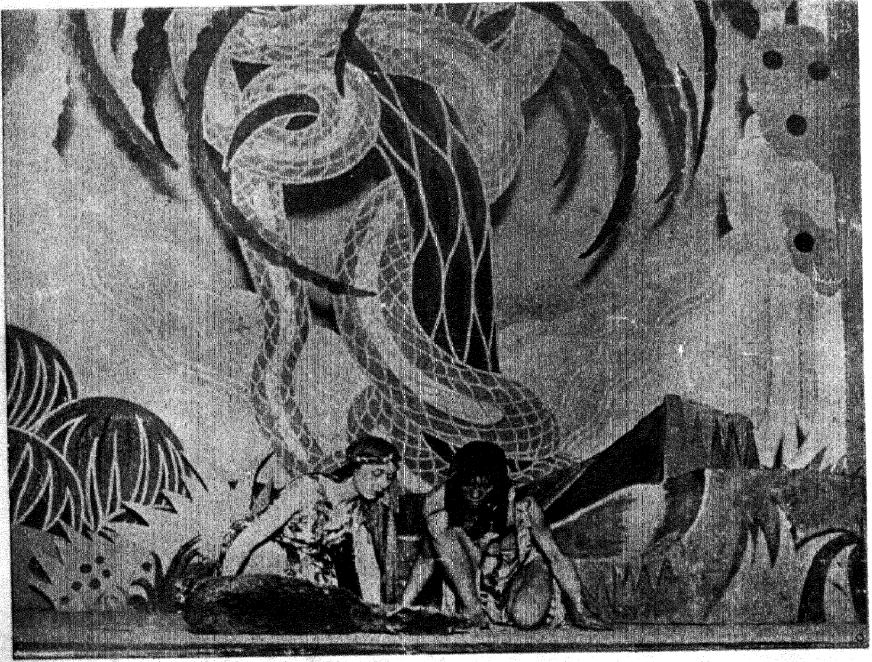
آدم وحوا کا مغربی تصور

پہلا قدم

پہلا قدم

آ اے مرے پیارے آ　　اے راج دُلارے آ
آ پاس مرے چل کر
اے نُور کے پارے آ　　اے حق کے شرارے آ
اے آنکھ کے تارے آ　　اے جاں کے سہارے آ
اے چاند ہمارے آ　　اے راج دُلارے آ
آ پاس مرے چل کر

کچھ تجھ کو بتاؤں میں؟　　کچھ تجھ کو سُناؤں میں؟
اب مجھ کو ہُوا معلوم
پھولوں میں مہک کیوں ہے؟　　بلبل میں چہک کیوں ہے؟
شیریں ہیں ہوائیں کیوں؟　　دلکش ہیں صدائیں کیوں؟
سورج میں چمک کیوں ہے؟　　تاروں میں دمک کیوں ہے؟
اب مجھ کو ہُوا معلوم

اب مجھ کو ہُوا معلوم
تُو پھول ہے عصمت کا　　بلبل ہے تُو راحت کا
جنت کی ہوا ہے تُو　　خالق کی صدا ہے تُو
سورج ہے صداقت کا　　تارا ہے محبت کا
آ اے مرے تارے آ
آ آ مرے پیارے آ

د۔ ب

اقوال و افعال

حیاتِ انسانی کا تجزیہ سُکھ سنچارک کارخانہ میں کیا جائے۔ یا یونانی و ویدک دواخانہ میں، اُس میں سے اقوال و افعال کے سوائے کوئی تیسری چیز برآمد نہ ہوگی۔ خواب کی مدت جو فارغ البالی کے ساتھ عمرِ محدود کے دو تہائی حصہ تک اکثر پہنچ جاتی ہے۔ یا تو تعریفِ حیات سے یکقلم خارج کر دینے کے قابل ہوگی۔ یا یہ دلائل و براہین افعال کی تحت میں لائی جائیگی۔ بہرحال حیاتِ انسانی محض قول و فعل کے مفردات سے بننے والی معجونِ مرکب قرار پاتی ہے، ممکن ہے کہ انسان کے دو پایہ ہونیکی اصلی وجہ یہی ہو +

حیوان کی زندگی، ازابتدا تا انتہا، سلسلۂ افعال نظر آتی ہے جس میں قول کا عنصر تقریباً مفقود ہوتا ہے۔ انسان کی زندگی الف سے ی یک محض اقوال کی داستاں ہونی چاہیئے جس میں فعل کا عنصر حتی الامکان عنقا ہو، قول کو فعل پر غلبہ و کثرت حاصل ہونا حیاتِ انسانی کی شانِ امتیاز ہے +

واقعات کی بُنیاد افعال پر ہوتی ہے اور افعال حیوانیت کا عنصرِ غالب ہیں۔ اس لئے انسانی اقوال کا واقعات سے کوسوں دور ہونا عینِ انسانیت ہے، مقولہ کی پہلی خوبی یہ ہے کہ وہ واقعیت سے دُور ہو۔ اسی کو نزاکتِ قول کہتے ہیں +

شکر کا مقام ہے کہ تہذیب یافتہ انسان اکثر و بیشتر "زنگی" کو "کافور" کے لقب سے پکار تا رہا ہے آپکو اگر اس میں کلام ہو تو کسی یک چشم کو "کانا" کہہ کر پکار لیجئے۔ یا پھر کسی دل لبھانے والی شکل کو "نازنین" کہہ دیکھئے۔ حقیقت یہ ہے کہ نکٹے کو ناک والا، کالے کو گورا، اور رات کو دن کہنا عین تہذیب ہے +

سب سے پہلا قول جو حیاتِ انسانی کے ساتھ، نیلام شدہ اشیاء کے لیبل کی طرح، نتھی کیا جاتا ہے اُسکا نام ہوتا ہے، جو عموماً نزاکتِ قول۔ یا تہذیب انسانی کی بدولت، نو وارد ہستی کی ظاہری شکل و صورت کے متضاد ہوتا ہے۔ یا یوں سمجھئے کہ اسم کو مسمیٰ سے بظاہر دو چار بالشت کے فاصلہ کا بھی تعلق نہیں ہوتا۔ مگر اس گریز واقعیت سے نزاکتِ نام پر کوئی حرف نہیں آسکتا +

منشی لال کے نام سے موسوم ہونے والی ہستی اکثر شرمندۂ حروف شناسی بھی نہیں ہوتی اور علیم الدین کی ذات بابرکات بیشتر غرقِ جہالت ہی رہتی ہے۔ تاہم اسم و مسمیٰ میں صنعتِ تضاد کا لطف باقی رہتا ہے

کلکٹر سنگھ اکثر تحصیل کے چپراسیوں کے ہاتھ سے بیگار کے خوشگوار موسم میں خوب خوب درست ہوتے رہتے ہیں اور پہلوان خاں دمہ کے عارضہ کی بدولت تمام رات محلہ والوں کو اپنی کھر کھر سے جگایا کرتے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ اسم و مسمیٰ میں واقعیت کا تعلّق ہونا قطعی ضروری نہیں ؎

اسی سلسلہ میں مجھے ایک واقعہ یاد آجاتا ہے جس کو میں کئی برس کی کوشش کے بعد بھی آجتک اپنے حافظہ سے مٹا نہیں سکا ہوں۔ ایک بے تکلّف صحبت میں، ایک نووارد شخصیت نے دریافت کئے جانے پر اپنا نام حیدر کرّار بتایا۔ اس غیر معمولی نام کے علم پر خواہ مخواہ تجسّس کو تحریک ہوئی اور آدھی درجن متعلق و غیر متعلق سوالات کے بعد حیدر کرّار نے بتایا کہ اُنکے ایک اور بھائی بھی ہیں جن کا نام جعفر طیاّر ہے۔ اس دوسرے نام نے تمام حاضرین کی قوتِ تلاش کو ایک ناقابلِ برداشت مہمیز لگایا پوچھا گیا کہ اُنکے والدِ ماجد کا نام نامی کیا ہے؟ جواب ملا کہ "احمدِ مختار"۔ یہ جواب توسنِ تجسّس کے لئے ایک اور تازیانہ تھا۔ فوراً سوال کیا گیا کہ "جناب کے جدِ امجد کا اسمِ گرامی کیا ہے؟" جواب ملا کہ "عاشقِ عباسؓ" اس آخری بے جوڑ نام نے تمام متلاشی دماغوں کو مایوس کر دیا۔ کیونکہ اس میں نہ تو نسبتِ تاریخ اسلام باقی رہتی تھی اور نہ شانِ قافیہ۔ اسی مایوسی کے لمحہ میں ایک زندہ دل نہایت متانت و ادب کے ساتھ حیدرِ کرّار سے مخاطب ہوئے:۔ "جناب! غالباً اپنے جدِّ امجد کے اسمِ گرامی کے متعلق آپکے حافظہ سے غلطی سرزد ہوتی ہے۔ میرے خیال میں اُنکا نام نامی پاک پروردگار ہوگا" یقین مانئیے! تمام صحبت اس بیساختہ و برمحل جملہ سے گرما گئی۔ حیدرِ کرّار صاحب نے کسی طرح اپنے حافظہ کے نقص کا اقبال نہیں کیا اور برابر بضد رہے کہ انکے حافظہ کو ابوالفضل کے دماغ سے نسبت پوشیدہ حاصل ہے۔ مگر مجھے آجتک یقین ہے کہ "اُنکے جدِّ امجد کا نامِ نامی یا تو نفی الحقیقت "پاک پروردگار" ہی ہوگا۔ اور یا۔ بفرضِ محال، کسی آفتِ ارضی سماوی کی وجہ سے اُنکے والدین سے، عجلت میں، یہ نام نہ رکھ سکنے کی غلطی سرزد ہوئی ہو۔ تو بھی اُن کے جدِّ امجد کی روح نے اُس روز سے ضرور اپنا نام تبدیل کر لیا ہوگا ؎

نام کے متعلق یہ حیلۂ شرعی پیدا کیا جا سکتا ہے کہ نام رکھے جانے والی ہستی کی رائے کو اُس میں دخل نہ تھا۔ گویا انسان کا نام بھی تقدیرِ مُبرم کی طرح اختیاری نہیں بلکہ جبری معاملہ ہے جو ہمیشہ والدین کے اختیارِ قطعی کے زیرِ اثر وجود میں آتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ جبری ناموں کے علاوہ اختیاری ناموں میں بھی یہی شان نظر آتی ہے۔ اختیاری نام سے میرا مطلب اُس خود ساختہ لقب سے ہے جو انسان اپنے سنِ شعور سے

متجاوز ہوجانیکے بعد خود اختیار کرلیتا ہو۔ ایسے خود ساختہ نام، لقب سے لیکر تتمۂ نام تک ہر تعریف میں آسکتے ہیں۔ جو کچھ بھی ہوں، اسم بامسمیٰ ہونا اُن میں بھی مفقود ہوتا ہے، مثال کے طور پر ایسے اضافی دُم چھلے پیش کئے جاسکتے ہیں جو اکثر و بیشتر کسی ذات یا قبیلہ کی بناء پر وجود میں نہیں آتے میرے ایک عنایت فرما اپنے نام کے ساتھ شمسی لکھتے ہیں، حالانکہ نہ تو وہ شمس تبریز کی اولاد میں ہیں اور نہ سورج بنسی خاندان سے اُنکا کوئی تعلق ہے، ممکن ہے کہ نظامِ شمسی کو اُنکے وجود میں آنے سے کوئی غیر معمولی تعلق ہو۔ ایک اور صاحب اپنے نام نامی کو "سُریانی" پر ختم کرتے ہیں، بظاہر اُنکو عبرانی و سُریانی سے موجودہ جنم میں کوئی تعلق نظر نہیں آتا ممکن ہے کہ اُنکی پیدایش کے وقت سب سے پہلا نالہ جو اُنکی زبان سے نکلا ہو، بہ لحاظ موسیقی، بھیرویں۔ یا سوہنی کے سُروں میں ہو اور یہی اُنکے لقب کی خاص وجہ ہو، ان اسمائے اختیاری کے تحت میں وہ تمام القاب آجاتے ہیں جو آئے دن مُصنّفین و شعراء اپنے لئے وضع فرماتے رہتے ہیں۔ یا دیدہ و دانستہ اپنے مداحین سے وضع کراتے رہتے ہیں۔ یہ فعل خلافِ وضعِ فطری نہ ہونیکی وجہ سے کچھ زیادہ معیوب بھی نہیں سمجھا جاتا۔ اس قسم کے اختیاری۔ یا اشتہاری ناموں کیلئے چند الفاظ۔ بہ اضافۂ موزوں۔ اکثر و بیشتر مستعمل ہونیکی صلاحیت رکھتے ہیں، مثال کے طور پر "مصوّر" "مُلّا" اور "سیوک" کو لیجئے، مصوّر کی ذریات اسقدر غیر محدود ہے کہ آپ "مصوّرِ کائنات" "مصوّرِ مصنوعات" "مصوّرِ احساسات" "مصوّرِ شادی و بارات" حتیٰ کہ "مصوّرِ خرافات" جو چاہیں حسب مرضی پسند فرما سکتے ہیں، مُلّا میں یہ خوبی ہے کہ بلا کسی اضافہ کے پیدائشی نام کے کسی جزو کے ساتھ مستعمل ہو کر بھی وقار پیدا کرسکتا ہے اور مناسب اضافہ کے ساتھ مل کر بھی مثلاً آپ کا اسم مبارک احمد حسین ہو تو آپ مُلّا احمدی بن سکتے ہیں۔ یا اگر یہ پسند خاطر نہ ہو تو اپنے شعور تحریر کے لحاظ سے مُلّا شعوری کا جامہ پہن سکتے ہیں۔ "سیوک" کی فہرست مشتقات بھی کافی سے زیادہ طویل نظر آتی ہے "دیش سیوک" "دھرم سیوک" "سنگھٹن سیوک" "یہ سیوک" "وہ سیوک" جو چاہیئے حسب استطاعت اختیار کرلیجئے۔ ان اقسام کے علاوہ، عربی نژاد ترکیب یہ بھی ہے کہ آپ خود ساختہ کُنیت استعمال فرمائیں اور "ابو البشر" یا "ابو اللسان" سے لیکر "ابن الجمال" یا "ابن الوقت" تک جو چاہیں بن جائیں۔ ان اختیاری القاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انکے ساتھ نامزد ہونیکے لئے نہ عقیقہ کی حاجت ہے نہ رجسٹری کی ضرورت۔ آپ جاڑے، گرمی، برسات۔ ہر موسم میں یکساں آسانی کے ساتھ بلاشرکت غیرے، بہ رضا و رغبت اختیار کرسکتے اور شہرت دے سکتے ہیں۔ ایسے

اختیاری ناموں کا بھی اسم بامسمیٰ نہ ہونا قول و فعل کے اختلاف کی ایک اور زندہ مثال سمجھنی چاہیئے +

واقعہ یہ ہے کہ تہذیب انسانی کا دارومدار اسی پر ہے کہ قول کو فعل پر غلبہ و کثرت حاصل ہو اور دونوں کے درمیان خلیج بنگالہ سے زیادہ تفاوت ہو۔ انسان کے قول و فعل کی یکسانی، یا ان دونوں میں لازم و ملزوم کی نسبت۔ اُس کے نیم وحشی ہونیکی علامت ہے +

مشاہدہ بتاتا ہے کہ حیوان اپنے مختلف احساساتِ جسمانی کے اوقات میں خاص قسم کی آواز نکالتا ہے اور وہ ہمیشہ ایک سی ہوتی ہے۔ یہ آسانی کے ساتھ پہچانا جا سکتا ہے کہ چیخنے والا حیوان تکلیف میں مبتلا ہے، بھوکا ہے یا غصہ میں ہے۔ انسان اسکے بالکل برعکس غصہ کے وقت تمسخر کے چشم و ابرو بناتا ہے اور رقیب کی تذلیل سے پیدا ہونے والی مسرت کے عالم میں تاسف و ہمدردی کا اظہار کرتا ہے +

انسانیت متقاضی ہے کہ مصیبت کے وقت آہ و بکا نہ کرو۔ یا خوشی کے عالم میں جامہ سے باہر نہ ہو جاؤ۔ تہذیب اسی راستہ پر چند قدم آگے بڑھ جاتی ہے اور ارشاد فرماتی ہے کہ رونے کے وقت ہنسو، ہنسنے کے وقت رو، سیاہ کو سفید کہو اور رات کو دن بتاؤ +

اس ارشادِ تہذیب کے متعلق مخالفتِ فطرت کا الزام ایک نیم وحشی دل دماغ ہی لگا سکتا ہے، مہذب انسان سے یہ حماقت سرزد نہیں ہوگی۔ آپکو اگر اس میں پس و پیش ہو تو سمجھا دیجئے کہ انسان کا اپنے کسی حصۂ جسم کے بال مونڈ ڈالنا کس طرح مخالفتِ فطرت نہ سمجھا جائے ؟

جس طرح تہذیب کے زیر اثر آپ اپنے ہاتھ کو قلم استعمال کرنیکا عادی بناتے ہیں۔ جو ایک وحشی کے نقطۂ نگاہ سے خلافِ فطرت سمجھا جا سکتا ہے۔ اسی طرح کوئی وجہ نہیں کہ آپ اپنی زبان کو بھی اُسی تہذیب کے زیر سایۂ سیاہ کو سفید بنانیکا عادی نہ بنائیں۔ اور اِن مہذب عادات کے اجراء و قیام کے ساتھ اُن کا فطرتِ ثانیہ بن جانا یقینی ہے پھر اس فطرتِ ثانیہ کے ساتھ آپکا زاویۂ نظر بھی جادہ سے منفرجہ ہو کر رہیگا۔

وحشی دنیا سمجھتی ہے کہ مینخواری افلاس کا پیش خیمہ ہے۔ مہذب دنیا کہتی ہے کہ افلاس مینخواری کی تمہید ہے۔ فرقِ معتقدات محض تنگی و کشادگیٔ زاویۂ نظر پر مبنی ہے۔ ورنہ واقعیت سے دونوں مقولے کوسوں دور ہیں۔ واقعیت صرف اسی قدر ہے کہ افلاس و مینخواری دونوں یکساں طور پر فطری

ہیں! وحشی دماغ کا شعار "دست خود دہانِ خود" پر مبنی نظر آتا ہے۔ اور مہذب کھوپری کا وطیرہ "دستِ خود دکلۂ مدعی" ثابت ہوتا ہے۔ ایک کو دوسرے پر فوقیت دینا کسی قدر مشکل ہے ✦

بہرحال قول و فعل میں ٹمبکٹو اور ٹوٹی کورن کا بُعد ہونا درحقیقت انسانیت کی شانِ امتیاز ہے۔ مہذب ترین انسان وہ ہے جس کی زندگی فعل کے عنصر سے حتی المقدور خالی ہو۔ تہذیب انسانی کا منشا ء ہے کہ کہا جائے اور صرف کہا جائے ✦

اس اصول پر، عقلِ سلیم کی امداد کے ساتھ کاربند ہو کر آپ بفضلہ انجمن بین الاقوام کے ممبر سے لیکر نیشنل پارٹی کے ممبر تک، یا لائیڈ جارج سے لیکر فرمانروائے حجاز تک سب کچھ بن سکتے ہیں، نامساعدتِ آب و ہوا کی صورت میں، اور کچھ نہیں تو سنگھٹن کی کرسی تو یقیناً لے سکتے ہیں ✦

اس تمام عقلی و نقلی دلیل کا منشاء صرف اس قدر ہے کہ آپ اچھی طرح ذہن نشین کر لیں کہ "انسان کا مابہ الامتیاز صرف نطق ہے، اُس کا مقصدِ حیات محض بکواس ہونا چاہیئے" ✦

سلطان حیدر جوشؔ

مجھ سے یہ نہ پوچھ

مجھ سے یہ نہ پُوچھ کہ میں تجھ سے کس لئے محبت کرتا ہوں؟ مجھے صرف یہ بتا کہ تجھے میری محبت کا علم ہے؟

یہ میں جانتا ہوں کہ مجھ میں بہت سی کمیاں ہیں لیکن اگر مجھ میں کوئی خوبی ہے تو مجھے بتا دے ۔۔ کہ میری بہت سی کمیاں فقط میرے لئے ہیں لیکن میری کوئی سی خوبی محض تیرے لئے !

میری کمیوں کو تُو اپنی محبت سے پُورا کر اس لئے بھی کہ پھر شاید تو مجھے اپنی محبت کے قابل سمجھنے لگے ✦

"باغباں"

پادشاہ مرگیا، پادشاہ زندہ باد

اُس کمرہ میں جہاں بادشاہ اپنے بستر مرگ پر پڑا دم توڑ رہا تھا، کچھ زیادہ خاموشی نہ تھی لوگوں کی آمدورفت کا سلسلہ جاری تھا۔ وہ مضطربانہ انداز سے ایک دوسرے کے کانوں میں باتیں کرتے ہُوئے دبے پاؤں اِدھر اُدھر پھر رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ جہاں لوگوں کا ایک ہجوم اس کوشش میں مصروف ہو کہ زیادہ شور نہ ہونے پائے، وہاں ایک قسم کی گھبراہٹ پیدا ہوجاتی ہے، جس کی تاب بیمار آدمی نہیں لاسکتا +

لیکن اب اس میں کیا مضائقہ تھا۔ ڈاکٹر نے کہہ دیا تھا کہ اب اسکی قوتِ سماعت بالکل سلب ہوچکی ہے۔ اور اس نے بھی اپنی سماعت کا کوئی ثبوت نہ دیا تھا، ورنہ اسکی نوجوان خوبصورت بی بی کی سسکیاں جو اُسکے بستر کے قریب بیٹھی ہوئی تھی ضرور اُسے متاثر کرتیں +

کئی دن تک اس بات کا خاص اہتمام رہا کہ کمرہ زیادہ روشنی سے محفوظ رکھا جائے۔ لیکن اب اس پریشانی اور اضطراب میں کسی کو دروازوں کے پردے کھینچنے کا خیال بھی نہ آیا کہ اس کی کمزور آنکھیں تیز روشنی کے تکلیف دہ اثر سے محفوظ رہیں، لیکن اب اس میں کیا مضائقہ تھا۔ ڈاکٹر نے کہہ دیا تھا کہ اب اس کی قوتِ بصارت بالکل سلب ہوچکی ہے +

کئی دن تک اس بات کا خاص التزام رہا کہ بجز اسکے تیمارداروں کے دوسرا کوئی شخص اسکے کمرہ میں داخل نہ ہونے پائے۔ آج ہر شخص کے لئے دروازہ کھلا تھا، لیکن اب اس میں کیا مضائقہ تھا۔ ڈاکٹر نے کہہ دیا تھا کہ اب اس کی قوتِ شناخت بالکل سلب ہوچکی ہے +

وہ بہت دیر تک بستر پر اپنا ہاتھ پھیلائے اس طرح پڑا رہا گویا اسے کسی چیز کی تلاش ہے۔ ملکہ نے محبت سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا، لیکن اس کی طرف سے جواب میں کوئی گرمجوشی ظاہر نہ ہوئی آخر اس کا منہ اور اس کی آنکھیں بند ہوگئیں اور اس کی قلب کی حرکت رُک گئی +

لوگ دھیمی آوازیں ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے۔ دیکھو وہ کتنا حسین معلوم ہوتا ہے اسکے چہرہ پر نور برس رہا ہے +

رفتہ رفتہ بادشاہ پر ایک خاص حالت طاری ہوئی، ہر طرف خاموشی چھا رہی تھی اس نے دل میں کہا کتنا دلفریب اور خوشگوار سکوت ہے۔ کس قدر دلفریب اور خوشگوار تاریکی ہے، اس کی طبیعت میں ایک عجیب سکون پیدا ہوگیا جس کی کیفیت معرض بیان میں نہیں آسکتی اس کو یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ بہشت میں پہنچ گیا ہے۔ اس کا کمرہ پھولوں کی خوشبو سے مہک رہا تھا، اور رات کی سرد اور خوشگوار ہوا ایک کھلی ہوئی کھڑکی میں سے اندر داخل ہو رہی تھی کمرے میں مومی بتیوں کی ہلکی ہلکی روشنی پھیل رہی تھی بادشاہ کا جسم مخمل کی ایک چادر سے ڈھکا ہوا تھا، صرف اسکا سر اور چہرہ نظر آتا تھا، چار یا پانچ آدمی اس کی حفاظت پر متعین تھے، لیکن وہ سب گہری نیند سو رہے تھے *

اطمینان کی یہ کیفیت جس کا اُسے تجربہ ہوا اس قدر عمیق تھی کہ وہ خود اس میں خلل انداز ہونے سے ہچکچاتا تھا۔ ایک عرصہ تک اُسکے لئے ذراسی جنبش بھی حرام رہی۔ آخر محل کے بڑے گھڑیال نے گیارہ بجائے۔ اس وقت وہ اٹھ بیٹھا۔ ایک خفیف سی مسکراہٹ کے آثار اس کے چہرہ سے نمایاں ہو رہے تھے *

اسے وہ وقت یاد آیا جب اُسکے حواس رفتہ رفتہ اُسے جواب دے رہے تھے۔ اور اُس نے قضا کے اس ظلم عظیم کے خلاف جو اسے ایک ایسی ساعت میں دنیا سے علیحدہ کر رہا تھا جب کہ دنیا کو اس کی شدید ترین ضرورت تھی، اپنی تمام قوتیں جمع کرکے دادطلبی کے لئے ایک آخری کوشش کی تھی۔ اس وقت اس کے کانوں میں یہ آواز آئی تھی کہ "موت کے بعد تجھے ایک گھنٹہ کی مہلت ملیگی۔ اگر اس مہلت کے اندر تو تین ایسے نفوس پیش کردے جن کو تیری زندگی کی خواہش ہو، تو پھر تو زندہ رہیگا *

یہ وہی گھنٹہ تھا جسکی مہلت وہ بدقت تمام موت سے حاصل کرسکا تھا۔ وہ ایک نیک نہاد حکمراں تھا، وہ اپنی رعایا کی فلاح و بہبود کے لئے شب و روز کام کرتا رہا تھا۔ اب اسے کسی قسم کا خدشہ نہ تھا۔ اُسے زندگی کی مسرتوں کا احساس تھا، اور اس وقت یہ احساس اور بھی زیادہ عمیق ہوگیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کی زندگی کی خواہش خودغرضی پر مبنی نہ تھی۔ وہ اپنی رعایا کی بہتری کے لئے جو کام شروع کرچکا تھا وہ ابھی پایۂ تکمیل کو نہ پہنچا تھا۔ اس وجہ سے اُسے ملال تھا۔ لیکن جب وہ سوئے ہوئے دربانوں کے پاس سے گذر کر باہر نکلا، دنیا کا رنگ اسے کچھ متغیر نظر آتا تھا۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس نے دنیا کے لئے کچھ بھی کام نہیں کیا۔ بلاشبہ اس نے دوسروں کی بہتری کے لئے اپنی تمام کوششیں صرف کردی تھیں۔ لیکن اس تمام جدوجہد کا نتیجہ اب اسے خود حقیر نظر آتا تھا اسے یوں معلوم ہوتا تھا کہ دنیا میں کئی دوسرے لوگ ایسے موجود ہیں جو اس کام کو اس سے کہیں زیادہ اچھی طرح سے انجام دے سکتے ہیں۔ اسے دنیا اب بہت زیادہ عظیم الشان معلوم ہوتی تھی۔ اور دنیا کی ہر چیز پہلے سے

زیادہ عظیم الشان ہوگئی تھی۔ اسے اب بھی اپنے گھر اور اپنے ملک سے ویسی ہی محبت تھی۔ لیکن سرِشام اُسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ یہ چیزیں اُسکے ساتھ ہی فنا ہو جائینگی۔ اب اس نے دیکھا کہ ان میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوا

دروازہ سے نکلنے پر اسے تذبذب ہوا کہ پہلے کدھر کا رُخ کرے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ملکہ کے پاس نہ جائیگا۔ ملکہ کے اندوہ وغم کے خیال ہی سے اُس کی رُوح کانپ گئی۔ وہ اس وقت تک ملکہ کا چہرہ نہ دیکھنا چاہتا تھا جب تک کہ وہ اس سے ہم آغوش ہو کر اس سے یہ نہ کہہ سکے کہ اب خوشی کے آنسو روؤ کیونکہ میں واپس آ گیا ہوں۔ بادشاہ نے اس خیال سے اپنے دل کو تسلی دی کہ اُسے صرف ایک گھنٹہ انتظار کرنا ہے۔ جس کے بعد وہ واپس دنیا میں ہوگا اور یہ تمام باتیں خواب و خیال ہو جائینگی۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی +

جب اسے اپنی آخری ساعتوں کا خیال آیا تو اس نے دل میں سوچا کہ ایک دفعہ پھر مجھے اسی منزل سے گزرنا ہوگا +

وہ اپنے بسترِ مرگ کا رُخ کرتے کرتے رہ گیا جس سے وہ ابھی اُٹھا تھا +

اس نے دل میں کہا میں آج تک کسی بات میں خوف سے مغلوب نہیں ہوا۔

وہ اس خاص شرط کے خیال سے متبسم ہوا جو اس کو زندگی کے لئے پیش کی گئی تھی۔ اس کا شہر اُس کی آنکھوں کے سامنے چاند کی روشنی میں پھیلتا چلا گیا تھا +

اس نے دل میں خیال کیا کہ میں اپنی رعایا میں سے تین کیا تین ہزار آدمی آسانی سے مہیا کر سکتا ہوں کیا وہ سب میرے نہایت وفادار دوست نہیں ؟

محل کے بڑے دروازے کی سیڑھیوں پر اس نے ایک بچی کو دیکھا وہ رو رہی تھی۔ سنتری نے جو پہرہ پر متعین تھا ادھر سے گزرتے ہوئے اس سے سوال کیا "کیوں ؟ کیا بات ہے ؟ کیوں رو رہی ہو ؟

بچی نے جواب دیا کہ "بادشاہ مر گیا ہے، اس لئے اماں اور ابا محل میں گئے تھے، لیکن اب تک وہ واپس نہیں آئے۔ اب میں بہت تھک گئی ہوں اور مجھے سخت بھوک لگ رہی ہے۔ رات سے مجھے کھانا نہیں ملا، اور میری گڑیا بھی ٹوٹ گئی ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ بادشاہ کسی طرح پھر زندہ ہو جائے یہ کہہ کر اس نے پھر رونا شروع کر دیا۔ بادشاہ کو یہ دیکھ کر مسرت ہوئی +

اس نے اپنے دل میں کہا کہ یہ بچی میری رعایا میں سے وہ پہلا فرد ہے جس کو میری زندگی کی آرزو ہے"
بادشاہ کا اپنا کوئی بچہ نہ تھا۔ وہ اس بچی کو تسلی دینے کے لئے ضرور ٹھہرتا لیکن اُس وقت اسے بہت
سے اور ضروری امور درپیش تھے۔

وہ اپنے عزیز ترین دوست کے مکان کی طرف جارہا تھا۔ جس پر اُسے سب سے زیادہ اعتماد تھا۔
وہ اس کی انتہائی ناامیدی اور افسردگی کا نقشہ اپنی آنکھوں کے سامنے لاکر ایک شریر بچے کی طرح مسکرایا۔
اس نے دل میں کہا "مجھے غریب فیروز پر رحم آتا ہے، مجھے اسکی حالت کا اندازہ ہے، آہ اگر وہ
دنیا سے اُٹھ جاتا تو مجھے کس قدر صدمہ ہوتا۔ میں یہ رنج برداشت نہ کرسکتا۔

جب وہ اپنے دوست کے شاندار مکان کے صحن میں داخل ہُوا۔ لوگ چراغ اُٹھائے اِدھر اُدھر پھر
رہے تھے، گھوڑے سازوسامان سے آراستہ کئے جارہے تھے اور تمام گھر میں کچھ ہیجان سا پھیل رہا تھا
مگر ان لوگوں میں کہیں اسے اپنا دوست نظر نہ آیا۔ وہ اس کی تلاش کے لئے ایک ایک کمرہ میں پھرا
لیکن سب کمرے خالی تھے۔ یہ دیکھ کر وہ خوف وہراس سے لرز گیا کہ کہیں اُس کے دوست نے شدتِ غم
سے جان نہ دے دی ہو۔

آخر وہ ایک چھوٹے سے کمرہ میں داخل ہُوا۔ یہاں وہ اور اس کا دوست دونوں باہم مل کر مصروفیت
کی کئی خوشگوار ساعتیں گزار چکے تھے۔ وہ اسے یہاں بھی نہ ملا لیکن آثار کہے دیتے تھے کہ اُسے یہاں سے گئے
زیادہ دیر نہیں گزری۔ کچھ کتابیں اور کچھ کاغذ کے پُرزے بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے اور ٹوٹے ہوئے
شیشے کے ٹکڑے فرش پر پھیلے ہوئے تھے۔ اسے زمین پر ایک چھوٹی سی تصویر گری ہوئی نظر آئی۔
بادشاہ نے اسے اُٹھا کر دیکھا تو یہ اس کی اپنی تصویر تھی۔ گرنے سے اس کا چوکھٹا ٹوٹ چکا تھا۔ تصویر
دیکھ کر اس نے پھر اس طرح زمین پر پھینک دی گویا اس نے کوئی جلا دینے والی چیز اُٹھالی تھی، آتشدان
میں آگ خوب دہک رہی تھی جس میں ایک خط کے پُرزے جلنے کے لئے ڈال دئے گئے تھے بعض پُرزے
ابھی تک نہ جلے تھے۔ بادشاہ نے ایک پُرزہ اُٹھا کر دیکھا اور اپنی تحریر پہچان لی۔ یہ اس کا آخری خط تھا،
جو اس نے اپنی ایک خاص تجویز کے متعلق جس سے اس کو بے انتہا دلچسپی تھی اپنے دوست کو لکھا تھا۔
اس نے اپنے خط کا یہ پرزہ دوبارہ شعلوں کی نذر کیا ہی تھا کہ دو شخص کمرے میں داخل ہوئے۔ ان میں سے
ایک مرد تھا اور دوسری ایک عورت۔ مرد نے سواروں کا سا لباس پہن رکھا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ

وہ کسی طویل سفر کے بعد واپس آیا ہے +

مرد نے پوچھا۔ فیروز کہاں ہے ؟

عورت نے جواب دیا۔ "وہ نئے بادشاہ کی خدمت میں باریاب ہونے کے لئے گیا ہے، بات یہ ہے کہ آجکل ہم لوگ بہت پریشانی میں مبتلا ہیں۔ پرانے بادشاہ کے بیہودہ اور مضحکہ خیز خیالات وعقاید سے نیا بادشاہ کوسوں دُور ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ طبیعت کے اس اختلاف کی وجہ سے وہ اس سے متنفر بھی تھا۔ فیروز کو شاہی دربار میں اب تک جو رسوخ حاصل رہا ہے وہی اب اس کے راستہ میں حائل ہو رہا ہے لیکن مجھے امید ہے کہ وہ عین وقت پر اپنی طرف سے صفائی پیش کر سکیگا۔ اور اتنا تو وہ سچے دل سے کہہ سکتا ہے کہ سابق بادشاہ جو لغو اصلاحات نافذ کرنا چاہتا تھا۔ وہ دراصل اُن سے قطعاً متفق نہ تھا۔ اس میں شک نہیں کہ فیروز کو سابق فرمانروا سے ایک طرح کی دلبستگی بھی تھی لیکن پھر ہمارے لئے اپنا خیال مقدم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم لوگوں کو اس قسم کے رقیق جذبات سے متاثر ہونیکی فرصت ہی نہیں ہوتی۔ بادشاہ کی موت کے بعد فوراً ہی وہ یہاں سے روانہ ہو گیا تھا۔ اب میں ساز وسامان کے ساتھ اس کے خدام وغیرہ کو بھیج رہی ہوں"

مرد نے جس کو اب بادشاہ نے پہچان لیا تھا اور جو اُسی کا ایک سفیر تھا، جواب دیا۔ بالکل بجا ہے بات کہنے کی نہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ ہُوا ہے اسی میں ملک کا فایدہ ہے۔ وہ بے چارہ تو سیاسیات سے قطعاً نابلد تھا۔ اس نے مجھے ایک ایسے وقت میں صلح کا معاہدہ کرنے پر مجبور کیا جس وقت صلح ہمارے مفاد کے لئے تباہی کا پیغام تھی۔ خیر اب جنگ ہو کر رہیگی۔ اگر اس کی بات پر عمل ہوتا تو فوج میں عہدوں کی ترقی کا سلسلہ رُک جاتا"

بادشاہ اس سے زیادہ سننے کی تاب نہ لاسکا +

اس نے دل میں کہا، میں اپنی عام رعایا کے پاس جاتا ہوں میرے جانشین سے کم از کم انکی تو کوئی غرض وابستہ نہیں بلکہ جو مراعات میں نے اپنی رعایا کو دی ہیں وہ اسکے عہد میں چھن جائینگی +

جس وقت وہ وہاں سے رخصت ہُوا گھڑیال نے سوا گیارہ بجائے۔ یہ بادشاہ درحقیقت نہایت غیر معمولی انسان تھا۔ وہ اپنی رعایا کے سب سے زیادہ مفلس اور قلاش طبقہ کے گھروں سے واقف تھا، وہ اس سے قبل بھیس بدل کر بارہا اُنکے گھروں میں جا چکا تھا۔ اس نے اپنی آنکھوں سے اپنی فلاکت زدہ

رعایا کی دردناک حالت دیکھ کر وہ سب کچھ کیا، جو اس سے قبل کبھی نہ کیا گیا تھا +

محل میں کوئی شخص اس راز سے واقف نہ تھا کہ وُہ متعدی بخار جو اسکی جان لئے بغیر نہ رہا، اُسے کہاں سے چمٹا۔ لیکن اسکے متعلق خود اس کا شبہ نہایت قوی تھا۔ چنانچہ اس نے سیدھا اُدھر ہی کا رُخ کیا۔ اس نے مُسکرا کر دل میں کہا اب مجھ پر کوئی بخار اثر نہیں کر سکتا۔ اُن کے گھر اب بھی ویسے ہی تباہ و خستہ تھے۔ اور وہ لوگ اب بھی ویسے ہی بیمار اور غلیظ تھے۔ اگرچہ وقت زیادہ گزر چکا تھا لیکن بازار میں لوگوں کے چھوٹے چھوٹے گروہ کھڑے ہو کر اُسی کے متعلق باتیں کر رہے تھے، سب لوگوں کی زبان پر اُسی کا نام تھا۔ عام طور پر لوگوں کو اس بات سے دلچسپی معلوم ہوتی تھی کہ دیکھئے بادشاہ کے جنازہ کی رسوم کب عمل میں آتی ہیں۔ ایک ادنے درجہ کے شراب خانے میں پانچ یا چھ آدمی ایک میز کے گرد بیٹھ کر شراب پی رہے تھے بادشاہ انکی باتیں سننے کے لئے کھڑا ہو گیا +

ایک شخص جس سے وہ پہلے بھی روشناس تھا بولا "چلو خوب چھٹکارا ہُوا۔ ارے میاں وہ بادشاہ کا ہے کا تھا کہ ایک ادھنی بھی کبھی اس نے کھُلے دل سے صرف نہ کی تھی۔ تم کیا جانو میاں اس سے تجارت کو نقصان پہنچتا ہے۔ یہ نیا لونڈا اچھا ہے۔ امید ہے اب خوب چہل پہل اور رونق رہیگی"+

ایک دوسرا شخص جو زباں دانی کا بہت بڑا دعوےدار معلوم ہوتا تھا۔ بول اُٹھا۔ ارے یار اس پر خدا کی مار اس کے کلّب (قلب) میں تو یہ خیالات سمایا تھا کہ بس ہیچو ما دیگرے نیست ہر وقت گھروں کی صفائی کی تاقید اور اس قسم کی بے فضول باتوں سے اس نے تو ناک میں دم کر رکھا تھا۔ کوئی پوچھے کہ بھلے مانس یہ دخلدر مقولات کا حقوق تجھے باوا نے دیا تھا؟ اور بھئی قسم خدا کی جو مجھ سے کوئی پوچھے تو یہ بادشاہ وادشاہ سب جہندم واسِل ہونے چاہئیں۔ ہاں بھئی البتہ اگر کوئی کہے کہ نہیں بادشاہ بلفرور ہی ہونا چاہیئے تو پھر میں تو کوئی ایسا بانکا ترچھا جوان پسند کروں جو اپنی جورو سے خائف زدہ نہ ہوتا ہو اور بھنگ۔ چرس، گانجے، چانڈو، تاڑی، مدک، افیون، شراب وغیرہ میں تو ممتیاز (امتیاز) کر سکتا ہو"۔ یہ کہ کر اس نے ایک روز کا قہقہہ لگایا +

"لو اور سُنو! پھانسی کی سزا بھی موکف (موقوف) ہونے لگی تھی۔ بڑا آیا شُرفہ (شریف) کہیں کا دراصل میں مجھے تو اُس کا یہ خیالات مالم ہوتا تھا کہ قیدیوں کو پھانسی دے کر اپنے ہاتھ سے ان کو اتلاف (تلف) نہیں کرنا چاہیئے بلکہ اُن ستم زادوں (ستم زدوں) سے حتّٰی مکان خوب کام لینا چاہیئے

یارلوگو! تمہارے سر کی قسم میرا یہ خیالات بتلان (باطل) نہیں۔ رعیت کی فلاحت ولاحت (فلاح) کا خیالات سب ڈھکوسلا تھا۔ فی الحقیقت میں تو اس کا مطالب ہی کچھ اور تھا۔ یہ مرموز (رموز) ہم سے پوچھو" سب لوگوں نے ایک بلند وحشیانہ قہقہہ سے اس کی باتوں کی تائید کی۔

بادشاہ کے دل کی یہ حالت تھی کہ اس وقت اگر اس کا کمینہ ترین دشمن بھی اُس پر گالیوں کی بوچھاڑ کرتا تو وہ ان دل آزار کلمات کے مقابلہ میں اس کے زخمی دل پر مرہم کا کام دیتیں۔ جب وہ وہاں سے رخصت ہُوا۔ اس وقت گھڑیال نے ساڑھے گیارہ بجائے۔ بادشاہ یہاں سے سیدھا بڑے محبس میں پہنچا۔ اس نے ان کمروں کا رُخ کیا جہاں وہ مجرم جن کے متعلق سزائے موت کا فیصلہ صادر ہو چکا ہو۔ بند کئے جاتے تھے۔ موت کی سزا ابھی موقوف نہ ہُوئی تھی اور موجودہ صورت میں یہ بات بادشاہ کے لئے باعثِ اطمینان ثابت ہوئی۔

یہاں صرف ایک پست قد آدمی قید تھا۔ جو نہایت تباہ حال معلوم ہوتا تھا۔ یہ شخص اپنے گھٹنے پر کاغذ رکھ کر کچھ لکھ رہا تھا۔ بادشاہ اس کو ایک دفعہ پہلے بھی دیکھ چکا تھا اور اب حیرت سے اس کی طرف دیکھ ہی رہا تھا کہ اتنے میں محبس کا داروغہ اور اس کے ساتھ ہی مجلسِ وزرا کا صدر جس کے ساتھ بادشاہ نہایت محبت اور مروت کا برتاؤ کیا کرتا تھا۔ دونوں اندر داخل ہُوئے۔ قیدی نے جلدی سے نظر اوپر اُٹھا کر دیکھا اور داروغہ سے کہا "میرا خیال ہے میرے لئے کل کا دن مقرر تھا" لیکن پھر اس خیال سے کہ مبادا اس پر بزدلی کا الزام آئے اس نے ساتھ ہی یہ بھی کہا "بہر حال میں ہر وقت تیار ہوں اگر آپ یہ رقعہ میری بیوی تک پہنچا دیں تو میں شکرگزار ہونگا"

مجلسِ وزرا کے صدر نے متانت آمیز لہجہ میں کہا "بادشاہ مر گیا ہے۔ تمہاری سزا اب معاف ہوگئی ہے اعلیحضرت شہریارِ جواں بخت کے خیالات وعقائد مختلف ہیں۔ گمان غالب ہے کہ کل تک تم بالکل آزاد کر دیئے جاؤ گے"

قیدی ہکا بکا رہ گیا اُس نے حیرت سے یہ الفاظ دُہرائے "بادشاہ مر گیا ہے؟" صدر نے ایک پُر وقار انداز میں جواب دیا "ہاں مر گیا" وہ شخص ماتھے کو ہاتھ سے پکڑ کر کھڑا ہو گیا اور رقت آمیز لہجہ میں بولا "آہ! میرے دل میں اس کا احترام تھا کچھ بھی ہو آخر وہ بادشاہ تھا۔ اس کا سلوک مجھ سے شریفانہ رہا۔ اس کی بھی بی بی نوجوان ہے مجھے وہ غریب قابلِ رحم معلوم ہوتا ہے۔ کاش وہ پھر زندہ ہو جائے۔

وہ شخص یہ باتیں کر رہا تھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

جب بادشاہ محبس سے نکلا اس وقت گھڑیال نے پونے بارہ بجائے۔ اُسے یوں معلوم ہوتا تھا

کہ اس کی سخت ذلت ہوئی ہے۔ دوستوں کی نفرت سے زیادہ دشمن کا رحم ناقابلِ برداشت تھا۔ ایسے شخص کے توسط سے زندگی حاصل کرنا اسکے لئے ہزار موت مرنے سے بدتر تھا۔ بااین ہمہ چونکہ وہ خود شریف تھا، ایک دوسرے شخص میں شریفانہ خیالات کے اس اظہار سے وہ مسرور ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

اس وقت بادشاہ نے اپنی حالت پر ایک نظر دوڑائی اس نے دل میں کہا کہ میری جدوجہد محض بیکار ثابت ہوئی محبت اور وفاداری کا وہ خیال جس پر مجھے اس قدر اعتماد تھا۔ آخر ایک پریشاں خواب نکلا۔ جن لوگوں کے لئے کام کرنیکی آرزو مجھے تھی وہ خود ابھی کسی قسم کی اصلاح قبول کرنیکے قابل نہیں ہوئے۔ ایک بیوقوف ننھی بچّی اور ایک فیاض دشمن، دنیا میں صرف یہ دو میرے دوست ہیں۔ ایسی حالت میں زندگی کی تمنا بیکار ہے۔ میرے لئے اب یہی مناسب ہے کہ خاموشی سے واپس چلا جاؤں اور قضا کے فیصلہ کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دوں۔ مجھے اب سبق مل گیا ہے میں اب خاموشی کی نیند سونے کے لئے تیار ہوں۔ تقدیر نے اپنے فیصلہ کی صحت ثابت کر دی۔

وہ پہلی تلخی اب باقی نہ تھی اور وہ اب زیادہ ٹھنڈے دل سے حالات پر غور کر سکتا تھا۔ چاند بادلوں میں چھپ رہا تھا اور سردی کی شدت بڑھ رہی تھی، ناگہاں اسے اپنی تنہائی اور بے چارگی کا شدید احساس ہوا۔ اور اس کا دل بیٹھ گیا۔ اس نے جی میں کہا، کیا واقعی کسی کو میری پروا نہیں اور کسی کو مجھ سے محبت نہیں اُس وقت وہ ہمدردی کی ایک نگاہ پر دنیا بھر کی نعمتیں نثار کرنیکو تیار تھا۔ اس کے بیمار دل کے لئے محبت آبِ حیات سے بڑھ کر تھی۔

ابھی ایک گھنٹہ کی مہلت ختم نہ ہوئی تھی چند لمحے ابھی باقی تھے اسے دفعتہً اپنی بی بی کا خیال آیا۔ وہ تمام دنیا کو بھول گیا، اس خیال سے اُسے تسلی ہوئی کہ کم ازکم دنیا میں ایک جگہ تو ایسی ہے جہاں وہ پورے اعتماد کے ساتھ داخل ہو سکتا ہے۔ لیکن موجودہ تجربہ نے اسکے دل کو اس قدر پستی میں گرا دیا تھا کہ وہ اپنی بی بی کے کمرے میں داخل ہونے سے ہچکچاتا تھا۔ وہ دروازہ پر کھڑا تھا اور دل میں کہہ رہا تھا "آہ اگر یہ بھی فریب ثابت ہوا؟" میرے لئے اچھا یہی ہے۔ کہ اس بات کے علم سے قبل واپس چلا جاؤں۔

لیکن پھر اس نے دل میں کہا میں آج تک کبھی کسی بات میں خوف سے مغلوب نہیں ہوا۔

اسکی بی بی تابدان کے قریب کمرہ میں تنہا بیٹھی تھی اس کے لمبے لمبے بالوں میں اس کا چہرہ چھپا ہوا تھا۔ اسکو دیکھ کر بادشاہ نے اپنے دل کو سخت ملامت کی کہ اُسے ملکہ پر کیوں ذرا سا شبہ بھی پیدا ہوا۔

ملکہ نے بادشاہ کی دی ہوئی انگشتری پہن رکھی تھی۔ یہ انگشتری وہ ہمیشہ پہنے رہتی تھی انگشتری

کے بیش بہا نگینہ سے روشنی کی شعاعیں نکل رہی تھیں اس ماتم خانے میں صرف یہی ایک چیز روشن تھی ؎

بادشاہ کا دل ملکہ کو تسلی دینے کے لئے بے قرار تھا وہ حیران تھا کہ اس کی تمام سہیلیوں نے اُسے کیوں تنہا چھوڑ دیا ہے۔ کم از کم اسکے ماتم کی پہلی رات میں تو کسی کو اسکے پاس رہنا چاہیئے تھا۔ ملکہ خیالات کے ہجوم میں گم معلوم ہوتی تھی۔ بادشاہ نے دل میں کہا کاش وہ کوئی بات کرے یا خود اُسی کا نام اُس کی زبان سے ادا ہو۔

ایک ہلکی سی آواز نے بادشاہ کو چونکا دیا۔ دیوار میں سے ایک خفیہ دروازہ جس کا علم بجز بادشاہ اور ملکہ کے کسی اور کو نہ تھا کھُلا۔ اور ایک شخص آکر ملکہ کے سامنے کھڑا ہو گیا ؎

ملکہ نے اپنی اُنگلی اپنے لبوں پر رکھی گویا اُسے خاموش رہنے کی ہدایت کر رہی تھی ...."

پھر ملکہ نے کہا غنیمت ہے کہ تم آ گئے، مرتے وقت مجھے اس کا ہاتھ تھامنا پڑا تھا۔ اور اب میں یہاں اکیلی بیٹھی ہوئی ڈر رہی تھی مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ بھوت بن کر اس کی روح مجھ پر سوار ہو جائیگی لیکن خیر اب وہ ہمیشہ کیلئے گیا۔ اب وہ کبھی واپس نہیں آئیگا۔ یہ کہتے ہوئے۔ اس نے اپنی انگشتری اُتار کر اس شخص کو پہنادی ....

................"

جس وقت گھڑیال نے بارہ بجائے بادشاہ کے کمرہ کے محافظ ایک دھماکے کی آواز سے بیدار ہو گئے، بادشاہ کی لاش اسی طرح پڑی تھی لیکن اسکے چہرے کی کیفیت بالکل متغیر ہو گئی تھی ؛

انہوں نے ایک دوسرے سے کہا "اب ملکہ کو اس کا چہرہ نہیں دکھانا چاہیئے ؎

(ماخوذ) حامد علی خاں

صدائے دل

سکوتِ شب میں اُٹھتا ہوں حدیثِ سوز کہتا ہوں
کہ میں ٹوٹے ہوئے تاروں کی گردِ رہ میں رہتا ہوں

ابھی جنبش تمنّاؤں کے اِس خونیں کفن کو ہے
ستم مرنے کے اور پھر بھی نہ مر سکنے کے سہتا ہوں

عبث روتا ہوں میں کیا ہو گیا کیا ہونیوالا تھا
اور اپنا قصۂ غم رات کے تاروں سے کہتا ہوں

تڑپ اُٹھتا ہوں اور اس نیلگوں پہنائے ظلمت میں
اُبل کر اپنے دل سے مثلِ اشکِ یاس بہتا ہوں

مقدّر ہے نوائے غم مجھے، اس کے سوا کچھ بھی
جو کہتا ہوں غلط کہتا ہوں بالکل جھوٹ کہتا ہوں

"بیگانہ"

ترانۂ رُوح

یہ کیا ہے شورشِ دُنیا، یہ فتنۂ گردوں!
یہ انقلاب! یہ گردش! یہ طالعِ واژوں!

عنانِ اشہبِ تقدیر میرے ہاتھ میں ہے!
بھلا قضا بھی کوئی چیز ہے کہ اس سے ڈروں!

ستارہ دارِ فلک پر مجھے چمکنا ہے
ہنوز زیرِ افق خوابگاہِ نور میں ہوں

مری سرشت وفا اور مرا خمیر نیاز
مگر محال کہ اپنے وقار کو بھولوں

غرورِ اوج جبینِ نیاز کو جو دکھائے
تڑپ کے اُٹھوں اور اُس آستاں کو ٹھکرا دوں

کہا فلک نے مجھے ہنس کر "تو کچھ بھی نہیں"
پکار کر یہ مری رُوح نے کہا "میں ہوں"!

کہا فلک نے "تو اٹھیگا خاک سے کیونکر؟"
تو میں نے خوں شدہ سر کو کیا بلند کہ یوں!

میں خود جو ہوں نہیں ہمدم اگر کوئی نہ سہی
خود آشنا ہوں خود آرا ہوں اور خود بیں ہوں

وہ تلخ نوش ہوں ہر جام واژگوں پہ ابھی
پکارتا ہوں کہ لا اور ساقیٔ گردوں!

ابھی کچھ اور مجھے، میری حسرتو، تڑپاؤ
کچھ اور، ہاں ابھی کچھ اور خاک پر لوٹوں

میں حرفِ راز ہوں مجھ کو بہ رنگِ نامۂ شوق
دکھاؤ آگ، کہ میرا کہیں کھلے مضمون

"بیگانہ"

ہمایوں کا مقبرہ

رسالہ ہمایوں میں شہنشاہ ہمایوں کے مقبرہ کی کیفیت یقیناً دلچسپ معلوم ہوگی ۔

بابر بادشاہ کا بیٹا نصیرالدین ہمایوں ہندوستان کا مشہور بادشاہ گزرا ہے ۔ اس کا مقبرہ پرانی دلی میں جمنا دریا کے کنارے واقع ہے ۔

ہمایوں اپنی قبر سے ایک میل کے فاصلہ پر قلعہ کہنہ میں شیر منزل کی چھت سے گر کر مرا تھا ۔ اسی لئے تاریخ ہوئی تھی " ہمایوں بادشاہ از بام اُفتاد "

یہ مقبرہ دہلی کی عمارات میں سب سے بڑی اور سب سے زیادہ شاندار خوبصورت عمارت ہے ۔ دہلی کی جامع مسجد کی خوبصورتی اس سے زیادہ ہے مگر وہ اتنی بڑی نہیں ہے ۔

جب ہمایوں یہاں دفن ہُوا تو ہمایوں کی بیوی نے عرب سے قرآن مجید کے حافظ بلائے تاکہ وہ اسکے محبوب شوہر کی قبر پر رات دن قرآن خوانی کیا کریں ۔ ان عربوں کے لئے مقبرہ کے قریب ایک آبادی قائم کی گئی جس کا نام عرب سرائے رکھا گیا ۔ مگر اب یہ آبادی ویران ہے صرف شاندار دروازے اور فصیل باقی ہے ورنہ غدر سے پہلے یہاں سینکڑوں گھر عربوں کے موجود تھے ۔

ہمایوں کے مقبرہ کے آس پاس اور بھی کئی مقبرے ہیں ۔ جن میں نواب عبدالرحیم خان خاناں کا مقبرہ بہت شاندار تھا جو آجکل اُجاڑ پڑا ہُوا ہے ۔ کیونکہ اس کے اوپر کا پتھر راجہ سورج مل بھرت پور کے راجہ اُکھاڑ کر لے گئے تھے ۔

مقبرہ ہمایوں کے شرق میں چینی کا ایک گنبد ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس میں ہمایوں کے حجام کی قبر ہے ۔ لارڈ کرزن نے جب اس مقبرہ کو دیکھا تو اپنے ایک مصاحب سے ہنس کر کہا تھا کہ میرے حجام کو بھی پندرہ روپے ماہوار تنخواہ ملتی ہے ۔

ہمایوں کے مقبرہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہندوستان کے دس بارہ بادشاہ اور بھی مدفون ہیں ۔ اور انہی میں اورنگ زیب کے بھائی دارا شکوہ کی قبر بھی ہے غالباً اور کسی بادشاہ کے مقبرہ میں اتنے بادشاہ دفن نہ ہونگے ۔

اس مقبرہ کی ایک تاریخی خصوصیت یہ ہے کہ مغل شہنشاہی کا خاتمہ بھی اسی مقبرہ میں ہوا۔ یعنے مغلوں کے بادشاہ بہادر شاہ انگریزوں کے ہاتھ اسی مقبرہ میں گرفتار ہوئے تھے ؛

جس وقت انگریز انکو گرفتار کرنے آئے وہ ہمایوں بادشاہ کی قبر سے تکیہ لگائے قالین بچھائے بیٹھے تھے۔ میجر ہڈسن نے انکی طرف پکڑنے کو ہاتھ بڑھایا تو بہادر شاہ کے پوتے میرزا سہراب نے تلوار سے میجر ہڈسن پر حملہ کیا۔ اور میجر ہڈسن کے ایک ساتھی نے سہراب میرزا کے گولی ماری اور سہراب میرزا بہادر شاہ کے سامنے سنگ مرمر کے فرش پر اپنے خون میں لوٹ لوٹ کر مر گئے ؛

ہُمایوں کا مقبرہ دہلی کی تفریح گاہوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ مقبرہ کے چاروں طرف بکثرت حوض ہیں اور بہت اچھا چمن ہے اور ہزاروں سیاح محض تفریح کے لئے یہاں آتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مغل لوگ مرنے کے بعد بھی اپنی قبروں سے لوگوں کو ڈراتے نہیں بلکہ خوش اور مسرور کرتے ہیں

ہمایوں کی نیک مزاجی تاریخوں میں مشہور ہے مگر اسکا مقبرہ بھی اسکی نیک مزاجی کو نمایاں کرتا ہے۔ کہ اسکے اندر جاکر انسان کو عجب طرح کا سکون اور اطمینان میسر آجاتا ہے جو بہت کم مقبروں میں دیکھا گیا ہے ؛

راقم حسن نظامی ۱۰ دسمبر ۱۹۲۶ء

بچّے

بچّہ ایک عظیم الشان انجام کا نازک آغاز ہے۔

جیسی مائیں ویسے بچے۔

بچپن عقل کی نیند ہے۔

بچّہ باپ ہے آدمی کا!

ننھے بچّے خدا کے زیادہ نزدیک ہوتے ہیں جیسے سیّارے سورج کے زیادہ قریب ؛

بچے خدا کے قاصد ہیں جو ہر روز ہمارے پاس محبت اور اُمید اور امن وامان کا پیغام لاتے ہیں ؛

"گلچیں"

پیکانِ محبت

فرشتے محبت کے دیکھو فضا میں ـــــ کرشمے محبت کے دیکھو ہوا میں
فضا میں فرشتوں کی گلبازیاں ہیں ـــــ ہوا میں حسینوں کی طنازیاں ہیں
فضا گُل کی نکہت سے معمور یکسر ـــــ ہوا حُسن کی مے سے مخمور یکسر
فضا ننھے پھُولوں کا گُلشن بنی ہے ـــــ ہوا پیارے رنگوں کا مسکن بنی ہے
فرشتے فضا میں جو منڈلا رہے ہیں ـــــ محبت کی اک راگنی گا رہے ہیں
مرا دل اُڑائے لئے جا رہے ہیں ـــــ وہ بے تاب مجھکو کئے جا رہے ہیں
مرے دل پہ وہ تیر برسا رہے ہیں ـــــ محبت کے مارے کو ترسا رہے ہیں
ملی تیر کھانے میں لیکن وہ لذت ـــــ کہ رحمت نظر آئی مجھکو یہ زحمت
برابر ہے سُود و زیانِ محبت ـــــ مسرت میں غم ہے تو غم میں مسرت
نظر حُسن ہی حُسن آتا ہے مجھُ کو ـــــ وہ ہر شے میں جلوہ دکھاتا ہے مجھکو

شگوفہ محبت کا دِل میں کھِلا ہے۔
مرا گُم شدہ لعل مجھ کو مِلا ہے

ج ب

پیکان محبت

سفر زندگی کا کرایہ

بڈھا یا قوت اپنی چارپائی سے بندھا ہوا تھا۔ کلائیاں بدن اور ٹانگیں پائنتی کی رسی سے اس طرح جکڑ دی گئی تھیں کہ حرکت کرنا ناممکن تھا۔ اوپر کو اٹھی ہوئی آنکھیں دو بیرحم چہروں کی طرف دیکھ رہی تھیں جنمیں بے دردی اور ظلم کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا ؛

وہ سادہ کار تھا۔ معمر اور ضعیف۔ بال مدت ہوئی سفید ہو چکے تھے لیکن عینک کی مدد سے آنکھوں میں، اور سالہا سال کی مشق سے ہاتھوں میں۔ دیرینہ کمال کا اثر موجود تھا جس کی بنا پر اپنی دیانتدارانہ روش کے طفیل اسے کام کی کمی نہ تھی۔ اور نہ موجودہ زمانے کے ظاہری چمک دمک سے روز ایک نیا الّو پھانسنے والے کاریگروں کی طرح تمام دن راستے پر آنکھیں لگائے بیٹھے رہنے کی ضرورت۔ وہ ایک ٹوٹے پھوٹے سے جھونپڑے میں الگ اور اکیلا رہتا تھا۔

یہ دو بدمعاش موقع پا کر رات کے وقت زبردستی اندر آ گھسے تھے اور اسکو پکڑ کر انہوں نے چارپائی کے ساتھ باندھ دیا تھا۔ اس وقت انکی طرف دیکھتے ہوئے اسکی نگاہ میں خوف و ہراس کی بجائے ایک قسم کی رحم آمیز بے بسی کی جھلک تھی جس طرح کوئی شخص کسی کو کوئیں میں گرتا ہوا دیکھے اور بچا نہ سکے ——— وہ کہہ رہا تھا :-

" لے لو! جو کچھ ملے لے لو! تم چوری کرنے آئے ہو لیکن یاد رکھو کہ جو تنکا بھی لوگے اس کی قیمت ادا کرنا ہو گی ——— "

دونوں میں سے بڑا اور نامی چور قادر ازور سے ہنس کر کہنے لگا "ہماری کھال بیچ کر وصول کرو گے کیا؟ ہا۔ ہا۔ ہا۔ ہا ——— "

بڈھے نے جواب دیا " اس کی ضرورت نہ ہو گی ——— "

دوسرے چور نے جسے اسکے جاننے والے طوطا کہہ کر پکارتے تھے نفرت آمیز انداز سے کہا "بڈھا سٹھیا گیا ہے۔ گویا اس کا باپ ہمیں پکڑنے کے لئے دروازے پر بیٹھا ہے "

بڈھے نے پُر اطمینان طریقے سے پھر کہا " دیکھ لینا! میری اتنی عمر دنیا میں گذری ہے اور میں

اسکے اطوار سے واقف ہوں۔ میں نے بہت سے لوگوں کو دیکھا ہے جو تمہاری طرح بغیر قیمت ادا کئے۔ مفت دُنیا میں رہنا چاہتے تھے لیکن نہ رہ سکے۔ تمہیں بھی اگر زندگی کا سفر کرنا ہے تو کرایہ ادا کرنا ہوگا۔ پورا کرایہ اور ضرور ———"

قادرا درشتی سے بولا "بک بک نہ کر بے! ہم تیرا وعظ سننے نہیں آئے۔ جلدی بتا وہ سونے کی تھیلی کہاں چھپا رکھی ہے؟"

یاقوت نے اپنی تمام عمر کی کمائی سونے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں اور ذرات کی شکل میں ایک تھیلی میں جمع کر رکھی تھی جس کا ان بدمعاشوں کو کہیں سے پتہ چل گیا تھا۔

طوطا نے اپنے شریک کی تائید کی "ہاں بتا وہ کہاں ہے۔ نہیں تو ابھی تیرے اس جھریوں والے گلے کو مروڑے دیتا ہوں۔ پھر ہم سے کرایہ وصول کرتا رہیو۔"

بڈھے کی آنکھوں میں خوف کا اظہار نہ تھا۔ اس نے کہا "یہ نہ سمجھو کہ میں تمہیں نہیں بتاؤنگا۔ بڑی خوشی سے لے جاؤ۔ لیکن میرے الفاظ یاد رکھنا۔ معاوضہ ادا کرنا ہوگا۔ تھیلی اُس رضائی کے نیچے دیوار کے کونے میں جو سوراخ سا ہے وہاں رکھی ہے۔ خس کم جہاں پاک"

دونوں چور کونے کی طرف شوق سے لپکے اور رضائی اُٹھانے کے بعد قادرا نے تھیلی کو نکال لیا۔ اس نے طوطا سے کہا "ارے بھاری ہے!" طوطا نے اس سے لیکر اپنے ہاتھ میں وزن کر کے دیکھا لیکن قادرا نے جلدی سے چھین لی۔

طوطا ذرا ترشی سے بولا "ہائیں! تجھے کیا ہوگیا ہے! میرے تھیلی کو ہاتھ ہی لگانے پر بدگمان ہُوا جاتا ہے؟"

قادرا متکبرانہ انداز میں بولا "تو تھیلی میری ہے۔ تجھے اس سے کیا؟"

"تجھے کیوں نہیں؟ اس میں سے نصف میرا حصّہ ہے!"

"اچھا تو بل جائیگا۔ گھبراتا کیوں ہے!" اور وہ پھر بڈھے کی طرف مخاطب ہُوا "اور بھی کچھ ہے تو بتادے۔ قبر میں لے جاکر کیا کریگا!"

یاقوت نے اپنا سفید بالوں والا سر ہلایا "نہیں اور کچھ نہیں۔ اگر ہوتا تو مجھے دیدینے میں کوئی عذر نہ تھا مجھے اب کیا کرنا ہے سے لے جاؤ لیکن اسکی قیمت دینا ہوگی ———"

قادرا نفرت سے بولا "کیا بکتا ہے! کیسے قیمت دینی ہو گی؟"

"دیکھ لینا ضرور دینا ہو گی۔ وہ لوگ جو دیانتداری سے دنیا میں محنت کرتے ہیں گویا زندگی کا معاوضہ ادا کرتے ہیں۔ تم بغیر محنت کئے لطف حاصل کرنا چاہتے ہو۔ آج نہیں کل۔ کل نہیں تو پرسوں۔ جتنی دیر ہو گی سود بڑھتا جائیگا۔ اور آخر کار تم بھی ادا کرو گے۔ بچاؤ کی کوئی صورت نہیں ——"

طوطا اپنے ساتھی سے کہنے لگا "بڈھے کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ جانے بھی دو۔ آؤ چلیں"۔

دونوں دروازے کی طرف چلے اور قادرا نے مڑ کر کہا "گھبراؤ نہیں۔ کوئی کھولنے کو نہ آیا تو صبح تک تمہارا حساب بھی صاف ہو جائے گا"۔

کچھ دیر کے بعد گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز نے یاقوت کو بتا دیا کہ اب وہ واپس نہیں آئینگے۔ اس نے آہستہ آہستہ رسی کے پھندوں سے آزاد ہونے کی کوشش کی۔ تھوڑے عرصے میں ایک ہاتھ کھسک کر گرہ میں سے نکل آیا اور اس سے باقی بند کھل گئے۔

وہ اُٹھا اور ایک پُرانے چیتھڑے کو دیا سلائی دکھا کر حقّہ بھرنے لگا۔ دل میں کہہ رہا تھا "میں ان کا تعاقب کروں! چور چور کہہ کر چلاؤں! کیوں؟ کس لئے؟ گناہ کیا ہے اسکی سزا پائینگے۔ ابھی ریت کا بیابان عبور کرنا ہے وہی ان سے معاوضہ وصول کریگا۔ اور خدا نے چاہا تو جلدی۔ دیر نہیں لگیگی"۔

قادرا اور طوطا گھوڑوں کو سرپٹ دوڑاتے ہوئے آبادی سے باہر نکل گئے۔ گو کچھ عرصے سے دونوں ایک دوسرے کے شریک تھے تاہم دونوں میں سے کسی ایک کو بھی اپنے شریک پر پورا اعتبار نہ تھا۔ دونوں جانتے تھے کہ جس طرح دوسرا مال و زر کی ہوس میں انسان کی زندگی کی کچھ حقیقت نہیں سمجھتا اسی طرح موقع پا کر اپنے ساتھی کے گلے پر چھری چلا دینے میں بھی تامل نہ کریگا۔ چوروں کے آپس میں وضعداری کے قوانین یہاں نہ چل سکتے تھے۔ اس لئے طوطا کو یہ فکر لاحق تھی کہ قادرا تھیلی لیکر بھاگ نہ جائے اور قادرا کو اس بات کا خوف کہ اسکی توجہ دوسری جانب ہوئی تو طوطا چھری یا چاقو سے اس کا خاتمہ کر دیگا۔ اس لئے دونوں اپنی اپنی جگہ چوکنے اور ہوشیار چلے جا رہے تھے۔

تقریباً دو گھنٹے چلے ہونگے۔ چاروں طرف ریت کا چٹیل میدان پڑا تھا اور آدم زاد تو کیا کسی جانور کا بھی کوسوں تک پتہ نہ تھا۔ صرف آسمان کی طرف قدرت کی لاتعداد آنکھیں اہل بصیرت کو بتا رہی تھیں

کہ دنیا والوں کا مخفی سے مخفی راز انکی نگاہ سے مخفی نہیں ہے۔

طوطا بولا "لو آؤ اب اس سونے کو تقسیم کرلیں"

قادرا نے کہا "کر لینگے۔ ابھی جلدی کیا ہے؟" اور اپنے گھوڑے کے مُنہ کو زور سے جھٹکا دیا۔ بیچارہ جانور گھبرا کر خوفزدہ سا ہوگیا۔ اس پر سوار نے دس بیس گالیاں سُنائیں اور دو چار ایڑیاں رسید کردیں۔

طوطا پھر بولا "تو ابھی کیوں نہیں بانٹ لیتے؟"

قادرا نے ترشی سے جواب دیا "میں کیا اسے لیکر بھاگ جاؤنگا؟ حالانکہ اس کی نیت واقعی یہی تھی"

طوطا نے تیوری چڑھا کر ذرا درشتی سے کہا "نصف میرا ہے وہ مجھے دیدو اور پھر جو چاہو کرو۔ میں انتظار نہیں کرسکتا۔

قادرا نے بھی دیکھا کہ طوطا غصّے میں ہے ایسا نہ ہو معاملہ بگڑ جائے۔ اور گو زیادہ طاقتور تھا۔ لیکن سُست اور بُزدل تھا۔ اس لئے راضی ہوگیا۔ دونوں گھوڑوں سے اُتر لئے اور تھیلی کو کھولا۔ طوطا نے ایک چھوٹی سی لالٹین روشن کرلی۔ جس وقت سونے کے ذرات کی دھار رومال پر پڑی تو قادرا کی آنکھوں میں پھر لالچ کی چمک پیدا ہوگئی اور اس نے ٹھان لیا کہ جس طرح بھی ہو اس تمام مال کو اکیلے ہضم کرنا چاہیئے۔

اس نے جیب سے شکاری چاقو نکال کر سونے کے چھوٹے سے ڈھیر کو درمیان سے کاٹ دیا اور جب غور سے دیکھ کر دونوں کو تسلی ہوگئی کہ تقسیم برابر ہے تو اپنا حصہ سمیٹنے لگے۔

قادرا کا گھوڑا جس کا مزاج اس کی بے وجہ درشتی سے ابھی تک بگڑا ہوا تھا اُچھلا اور اس کا کھر سونے کے ڈھیر کے بالکل قریب آکر پڑا اس پر قادرا نے آگ بگولا ہوکر کھلا ہوا شکاری چاقو زور سے گھوڑے کی ران میں دے مارا۔ کئی انچ چمڑہ کٹ کر خون بہنے لگا اور وہ بیچارہ سخت درد سے ہنہنایا۔ قادرا نے گالی دیکر کہا "آیا مزا؟ اب بھی صبر آئیگا یا نہیں؟"

اپنا اپنا حصہ سمیٹ لینے کے بعد دونوں پھر سوار ہوکر چلدیئے۔ قادرا کا گھوڑا درد کے مارے بیچین ہوا جاتا تھا۔ اس لئے کبھی کبھی ٹھہر جاتا یا ضد اور بغاوت کی ٹھان لیتا لیکن سخت سزا سے اسکے تمام منصوبے خاک میں مل جاتے اور وہ پھر سر جھکا کر چلنے لگتا۔ چند میل اور سفر کرنے کے بعد انہیں چند درخت نظر آئے جنکے نیچے پہنچ کر قادرا نے کہا "اب تو کافی دُور آگئے ہیں۔ باقی رات یہیں بسر کرلیں" اسکے ساتھی نے بھی اتفاق کیا اور وہ گھوڑوں سے اُتر کر سونے کا سامان کرنے لگے۔ ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر

زین اُتار کر انہیں تکیوں کی جگہ رکھا۔ گھوڑوں کو ایک درخت کے ساتھ باندھ دیا اور کپڑے بچھا کر لیٹ گئے۔

طوطا کے دل میں اپنے ساتھی کی طرف سے بدگمانی پھر بڑھنے لگی اور باوجود اسکے کہ آنکھیں نیند سے بند ہوئی جا رہی تھیں وہ انہیں کھلا رکھنے کے لئے پوری کوشش کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں اُٹھ کر اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ تاکہ کسی طرح نیند سے نجات مل جائے۔

قادرا کے سانس لینے کی آواز اس طرح آ رہی تھی جیسے کوئی سو رہا ہو۔ تاہم وہ سو نہیں رہا تھا۔ اسے علم تھا کہ طوطا اُٹھ کر اِدھر اُدھر پھر رہا ہے لیکن اندھیرے میں کچھ نظر نہ آتا تھا۔ آخرکار طوطا پھر لیٹ گیا اور کچھ عرصہ انتظار کرنے کے بعد قادرا نے سمجھا کہ اب سو گیا ہوگا۔

وہ آہستہ سے اُٹھا۔ اسکی آنکھیں اندھیرے میں بھی چمک رہی تھیں۔ وہ جیب میں سے شکاری چاقو نکال کر ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل طوطا کی طرف بڑھا۔ چُپ چاپ اسکے قریب پہنچا اور ہاتھ اُٹھا کر ایک ہی وار میں چاقو کی تمام دھار اُسکے سینے میں بھونک دی۔

"اب تو میرے ساتھ حصّہ نہیں بٹائیگا؟"

اس نے طوطا کے کپڑوں کو ٹٹولا۔ رضائی کو الٹ پلٹ کر دیکھا لیکن تھیلی نہ ملی۔ "بہت اچھا صبح کو دیکھا جائیگا" یہ کہہ کر وہ اپنے بستر پر جا لیٹا اور خراٹے لینے لگا۔

صبح اُٹھ کر اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ طوطا اُسی جگہ پڑا تھا۔ دل کے اوپر رضائی چاقو سے کٹی ہوئی تھی۔ قادرا نے انگڑائی لی۔ اُٹھا۔ اور تلاش کرنے لگا۔ طوطا کی تمام جیبیں ٹٹولیں۔ رضائی کا کونہ کونہ چھان مارا زین کے اوپر نیچے سب جگہ ڈھونڈا لیکن سونا نہ ملا۔ اس نے گالی دیکر کہا ۔۔۔ بدمعاش نے کہیں چھپا دیا ہے" لیکن کہاں؟ اسے یاد تھا کہ طوطا رات میں ایک دفعہ اُٹھا تھا اور ٹہلتا رہا تھا۔ اس وقت چھُپا یا ہوگا۔ دُور تو نہیں گیا تھا۔ اس نے دو چار جگہ سے زمین کھودی۔ درختوں کی شاخوں کو دیکھا کہ کوئی نشان ہو تو پتہ لگے۔ لیکن تھیلی غائب تھی۔ آخر مایوس ہو کر روانہ ہو جانیکا ارادہ کیا تاکہ اگر کوئی تعاقب کر رہا ہو تو اسکے پنجے میں نہ پھنس جائے۔

اپنے گھوڑے کے قریب گیا تو وہ ڈر کر پیچھے ہٹنے لگا کیونکہ زخم رات میں اکڑ کر زیادہ تکلیف دہ ہو گیا تھا لیکن آخرکار اسے پکڑ کر اس پر زین رکھ دیا اور پانی کی چھاگل کو لٹکانے لگا۔ دُور تک

بیابان ہے پانی کی ضرورت ہوگی" یہ کہہ کر چھاگل کو منہ سے لگایا اور خالی کر کے اِدھر اُدھر دیکھا۔ لیکن کوئی چشمہ وغیرہ نہ تھا۔ طوطا کے زین کے قریب گیا اور اسکی چھاگل کو اُٹھا کر دیکھا۔ وہ بھاری تھی "اسمیں کافی پانی ہے"

خالی چھاگل پھینک کر اس نے طوطا کی چھاگل زین کے ساتھ لٹکا لی۔ ایک دفعہ پھر اسکی رضائی کو اُلٹ پلٹ کے دیکھا اور سوار ہونا چاہتا تھا کہ گھوڑا درد کے مارے اُچھل کر کچھ دُور جا کھڑا ہُوا۔ اسکے پیچھے بھاگا تو وہ اور دُور چلا گیا۔ ناچار دوسرے گھوڑے پر زین ڈال کر اپنے گھوڑے کا تعاقب کرنا شروع کیا کیونکہ پانی کی چھاگل کا حاصل کرنا ضروری تھا۔ لیکن وہ چونکہ درد سے بیتاب تھا اور مالک کے غصّے سے خائف جس وقت یہ قریب آتا وہ بھاگ جاتا۔ اسی طرح دوڑتے دوڑتے بہت دن نکل آیا اور قادرا کو بھوک اور پیاس نے ستانا شروع کیا۔

اس نے ایک اور تجویز سوچی۔ گھوڑے سے اُتر کر اس کی باگیں ہاتھ میں لیں اور آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ اب دوسرا گھوڑا اسے اپنے قریب تک آجانے دیتا۔ پھر بھاگ کر تھوڑی دُور چلا جاتا۔ ایک مرتبہ جب بہت ہی قریب آگیا تو قادرا نے اپنے گھوڑے کو چھوڑ کر ایک چھلانگ ماری تاکہ دوسرے کو پکڑ لے لیکن اس کا ہاتھ باگوں پر پڑتا تھا کہ وہ اُچھلا اور گھبرا کے ایک طرف کو ہو گیا اُچھلنے میں دوسرے گھوڑے سے ٹکرایا اور دونوں بھاگ کھڑے ہُوئے۔ قادرا دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا

گرمی ناقابلِ برداشت تھی۔ ایک قسم کی سیال سی شے ریت کے تودوں پر سے اُٹھ کر ہوائیں لہریں لیتی ہُوئی معلوم ہوتی تھی اور حلق میں اور ناک میں جا کر تنفس کو بند کئے دیتی تھی۔ روشنی کی تیزی قادرا کی آنکھوں کو خیرہ کئے دیتی تھی اور ان میں ریت کے گرم گرم ذرّات پڑنے سے درد ہونا شروع ہو گیا تھا۔ نصف سے زیادہ دن گھوڑے کے پیچھے بھاگتے بھاگتے گذر گیا۔ اور ابھی وہ ہاتھ نہیں آیا تھا۔

وہ ہمت کر کے پھر چلا۔ قدم لڑکھڑاتے ہُوئے پڑتے تھے لیکن گھوڑا چند فٹ کے فاصلے تک قریب آتا اور پھر اطمینان سے دُلکی چل کر تھوڑی دُور جا کھڑا ہوتا۔ چھاگل آنکھوں کے سامنے زین سے لٹک رہی تھی۔ ہر مرتبہ امید ہوتی کہ اب ہاتھ آجائیگی اور حلق کو جو خشکی سے

بند ہوا جاتا تھا تسکین ہوگی۔ لیکن بیکار ــــــــ "

تکلیف کی شدت سے اس کو اپنے آس پاس کا ہوش بھی نہ رہا تھا۔ اگر خیال تھا تو صرف پیاس بجھانے کا۔ جی کڑا کر کے ایک دفعہ پھر وہ گھوڑے کے پیچھے چلا لیکن ٹھوکر کھا کر ریت میں گر گیا۔ اُٹھنے کی کوشش کی۔ اُٹھا۔ لیکن لڑکھڑا کر پھر گرا اور اب اُٹھ بھی نہ سکتا تھا۔

گھوڑے نے اِدھر اُدھر مُنہ پھرایا اور مالک کو زمین پر پڑا ہُوا دیکھ کر اس طرف چلا۔ قریب آ کر منہ سے ٹٹولا گویا حال دریافت کرنے لگا۔ اسکی باگیں قادر کے مُنہ سے رگڑ کھانے لگیں۔ اُس نے آخری کوشش کی اور کسی نابینا کی طرح دیوانہ وار ہاتھ مارا۔ باگیں ہاتھ میں آگئیں۔ چھوٹے ہُوئے گلے میں سے خوشی کا نعرہ نکلا۔ گو اسکی حیثیت ایک آہ سے زیادہ نہ تھی۔ باگوں کے سہارے اُٹھا اور چھاگل کو پکڑ کر پھر زمین پر گر گیا۔ . . . . . . اب کیا تھا! پانی . . . . اسکی زندگی اسکے ہاتھ میں آگئی تھی . . . . "

کانپتے ہاتھوں سے ڈھکن کھولا اور چھاگل کو منہ سے لگا کر اُلٹ دیا تاکہ آبِ حیات گلے میں اُتر کر رُوح کو تازہ کر دے . . . . "۔

غصّے اور ناامیدی کے جوش نے چھاگل کو دُور پھنکوا دیا۔ کھانسی آتی تھی لیکن اتنی طاقت نہ تھی۔ کہ کھانستا۔ گلا بند ہُوا جاتا تھا۔ لیکن اتنی ہمت نہ تھی کہ اسے صاف کرتا۔ چھاگل میں پانی نہ تھا۔ وہ بھاری ضرور تھی۔ باریک دہکتے ہُوئے کوئلوں کی طرح گرم سونے کے ذرّات سے قادر کا مُنہ بھرا ہُوا تھا۔ لیکن اتنی سکت نہ تھی کہ اُنہیں اُگل دیتا۔ کوشش کی۔ ہاتھ پاؤں مارے۔ تڑپا۔ لیکن اوندھا ہو کر گرا اور پھر نہ اُٹھ سکا۔
سفرِ زندگی کا کرایہ ادا ہو چکا تھا۔

عطاء الرحمٰن

غزلِ گرامی

ناصر علی سرہندی کے جواب میں ایک غزل لکھی ہے حامد پسند یا بشیر پسند ہو تو ہمایوں میں درج کر کے گرامی کو اور بالغ نظرانِ ہند کو رہینِ منت فرمائیں۔

(گرامی)

بلا در ہر شکن پیچیدہ زلفِ نیمتابش را — اجل در یک گریبانست چشمِ نیمخوابش را
تمنا بر نیاید ز امتحانِ فتنہ عنوانش — تماشا بر نتابد جلوہ ہائے سینہ تابش را
زمیں بوسم اسیرم نو نیازم حلقہ در گوشم — تکلم را تبسم را تغافل را عتابش را
گریبان شکیبم خود بخود تا دامنست امشب — نمیدانم کہ وا کردست آں بندِ نقابش را
گرامی را بمجلس آں پری دزدیدہ دید امشب — بلا گرداں روم پنہاں نگاہِ انتخابش را
بگیرم دامنِ آں سید لولاک در محشر — کہ محشر بر نتابد تابِ حسن بیحجابش را
شبے در خانۂ زیں آں امام انبیا آمد — قضا گیرد عنانش را قدر گیرد رکابش را
قضا گیرد قدر گیرد - ازل گیرد ابد گیرد — رکابش را عنانش را. عنانش را رکابش را
گرامی در قیامت آں نگاہِ مغفرت خواہد — کہ در آغوش گیرد جرمہائے بیحسابش را
سوار برق شد ماہے فلک آمد عناں گیرش — رکابش بوسہ پیما زد ملک بوسد رکابش را
بخواہد آتشے ملائے روم اے شمس تبریزی — زن آتش پنبہ زارش را باب افگن کتابش را
غزل گفت آتشیں مضمون گرامی عقل کل گوید — دہد ناصر علی خطے جواب لاجوابش را

ناصر علی سرہندی

بایں شوخی غزل گفتن علی از کس نمی آید — بایران می فرستم تا کہ میگوید جوابش را
بشوخی پائے ادبوسیدن قالب تہی کردن — کدامیں بے ادب تعلیم فرما شد رکابش را
بمحشر حرف بے صوت ست فریاد شہیدانش — نمیدانم کہ داد ایں سرمہ چشم نیمخوابش را

ادب و زندگی

ادب اور زندگی بظاہر دو غیر متجانس الفاظ معلوم ہوتے ہیں، جن میں کسی قسم کے ظاہری یا باطنی رابطے کا امکان نظر نہیں آتا، کیونکہ سطحی نظر سے دیکھا جائے تو مظاہر کائنات مناظر قدرت، اور انکی گوناگوں کیفیات جو زندگی کا خارجی پہلو ہیں اور انسان کے انفرادی و اجتماعی حالات کے تغیرات اور انکی رنگارنگ پیچیدگیاں جو زندگی کی داخلی تصویریں، اور وہی شے ہیں اور تاریخ فلسفہ اور شعر کے دفاتر سے جنہیں ہم ادب کا نام دیتے ہیں بالکل مختلف معلوم ہوتی ہیں، ایک چیز عملی ہے۔ دوسری نظری، ایک قول ہے دوسری فعل، ایک جنگ ہے دوسری جنگ کا نظارہ، ایک کشتی ہے اور دوسری دریا، لیکن اگر تھوڑی دیر کیلئے ہم ٹھنڈے دل سے غور کریں اور عملی و نظری، قول و فعل، جنگ و نظارہ جنگ اور کشتی و دریا ہی کے تعلق کو معلوم کریں تو یقیناً ہم اس نتیجہ پر پہنچ جائینگے کہ ادب اور زندگی میں بھی ایک ایسا ہی نہیں بلکہ اس سے بھی بڑھ کر رابطہ موجود ہے، یقیناً ادب اور زندگی میں بہت گہرا تعلق ہے، یہ سچ ہے کہ زندگی مقدم ہے اور زندگی ہی سب کچھ ہے، اور ادب اسکی حقیقت اور اسکے اسرار کو سمجھنے کی ایک کوشش ہے، لیکن اگر سلطان زندگی کی باسطوت و جبروت بارگاہ میں ایک یہی غلام نہ ہو تو نہ کوئی اسکے جمال جہاں آرا کا مشاہدہ کر سکے، نہ اسکے دربار کی حشمت و شوکت برقرار رہ سکے، اور نہ اسکے احکام و اوامر نافذ ہو سکیں، ہاں، ادب زندگی کا آئینہ دار ہے، ادب زندگی کا نگاہدار ہے، اور ادب زندگی کا پروردگار ہے۔

کائنات کے آسمانی و زمینی مظاہر کے تغیرات دنیا کے مختلف مقامات میں مختلف صورتیں پیدا کرتے ہیں اور ان اختلافات کے باعث اقوام و ملل کا تمدن مختلف شکلیں اختیار کرتا ہے، قوموں کی زندگی کے ان تغیرات سے آگاہی ہمیں تاریخ کے ذریعے سے حاصل ہوتی ہے، لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو ان ظاہری واقعات کا منبع کوئی اور ہی چیز ہے، ہاں یہ نتیجہ ہیں ان واقعات کا جو قوموں کی معنوی زندگی میں ظہور پذیر ہوتے ہیں اور جنکی جولانگاہ افراد قوم کے دل و دماغ ہیں، یہی تو موں کی حقیقی تاریخ ہے اور اسی کے لئے ہم ادیب کے جادو نگار قلم کے ممنون ہیں جو دلوں کی مملکت کے تغیرات کی نقاشی کر کے قوم کی حقیقی زندگی کو ہمارے سامنے پیش کرتا ہے، ہندوستان کی زندگی کو مختلف ادوار میں معلوم کرنیکے لئے ہمیں ہندوستان کے ادب کا مطالعہ کرنا ہوگا، ایرانی زندگی کیلئے ایرانی ادب کی طرف رجوع کرنا ہوگا، یونان کی زندگی کے لئے یونانی ادیب کا محتاج ہونا پڑیگا، اور پھر اگر ہم انسانی زندگی کو بالعموم سمجھنا چاہیں تو ایک ایسے ادیب کے سامنے زانوے نیاز تہ کرینگے جو قومی و ملی امتیازات سے بالاتر ہو کر انسان کے شخصی و اجتماعی احوال کے تغیرات اور اسکی فطرت کے اسرار کی نقاشی کرتا ہے، پس ادب کے

ذریعے ہی سے ہم زندگی کے خط و خال کا مشاہدہ کرسکتے ہیں، ہاں، ادب زندگی کا آئینہ دار ہے۔

حیاتِ انسانی نہایت پیچیدہ شے ہے، سینکڑوں ولولے، ہزاروں امنگیں، اور لاکھوں امیدیں ہیں جن کی کشاکش کے باعث رنگا رنگ کیفیتیں صورت پذیر ہوتی ہیں، پھر انسان میں خدائی اور شیطانی طاقتیں ودیعت رکھی گئی ہیں، فطرت کا تقاضا ہے کہ خدائی طاقت یعنی نیکی اپنا کام کئے جائے لیکن شیطانی طاقت یعنی بدی راستے میں حائل ہوجاتی ہے اور اعمالِ انسانی کی رَو کو بدل دیتی ہے، اس صورت میں نہایت ضروری ہے کہ فطرت کے حقیقی توازن کو قائم رکھنے کیلئے ایک ایسی چیز ہو جو حقیقت کو پیشِ نظر کرسکے، یہ فلسفہ ہے، لیکن اس سے ہماری مراد خشک مشکّک فلسفیانہ اصطلاحات نہیں بلکہ حقائق اشیاء و امور سے کماحقہٗ آگاہی ہے، ہر قوم جو زندہ ہے یا جس میں زندہ رہنے کی صلاحیت ہے، اُس میں وقتاً فوقتاً ایسے اشخاص پیدا ہوتے رہتے ہیں جنکو ہم پیغمبر، شاعر، حکیم، خطیب، وغیرہ کے نام سے یاد کرتے ہیں، یہ حیاتِ انسانی کی پیچیدگیوں کا احساس اور اندازہ کرنیکے بعد ایک دستور العمل چھوڑ جاتے ہیں جو حقیقت کے لئے معیار اور زندگی کے لئے ایک نصب العین کا کام دیتا ہے، انکے حیات آموز الہامات، حیات آفریں نغمات، حکمت آمیز مواعظ اور زندگی بخش خطبات قوم کا قیمتی سرمایہ ہیں، اس تمام ذخیرے کو ہم ادب کے نام سے موسوم کرتے ہیں، جسکے ذریعے سے اس قوم کے افراد منازلِ حیات کو آسانی سے طے کرسکتے ہیں اور اپنی صحیح زندگی کو برقرار رکھ سکتے ہیں، ہاں، ادب زندگی کا نگاہدار ہے +

لیکن ادب کا یہ قیمتی سرمایہ ہمیشہ کسی قوم کی زندگی کی نگاہداری نہیں کرسکتا، زمانے کی روش بدلتی رہتی ہے، ہولناک انقلابات رُونما ہوتے ہیں، طوفانی حوادث بادِ صرصر کی طرح متاعِ حیات کو اُڑالے جاتے ہیں، پیہم صدمات سے قوائے عملی مضمحل ہوجاتے ہیں، زندگی کا نصب العین آنکھوں سے اوجھل ہوجاتا ہے، قومی خصائص مٹ جاتے ہیں، حیاتِ حقیقی کا خوبصورت چہرہ تاریکی کے پردوں میں رُو پوش ہوجاتا ہے، غلامی تمام اطراف سے احاطہ کرلیتی ہے، اُمنگیں اور ولولے دب کر رہ جاتے ہیں، اخلاق فاسد ہوجاتے ہیں، نیکیوں پر بدیاں چھا جاتی ہیں، ادب کے وہ تمام قیمتی دفاتر طاق میں پڑے رہ جاتے ہیں۔ اور قوم مرگ کی گہرائیوں میں غرق ہوجاتی ہے، ایسے آڑے وقت میں تاریخ اور فلسفہ کام نہیں دیتے، وہ ادب جو فقط زندگی کی نگاہداری کرسکتا ہے۔ اب تقویم پارینہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ اس موقع پر تو وہ ادب چاہیئے جو زندگی بخشے اور رہنمائی میں حرکت پیدا کردے، ہاں، اب اُس ادب کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو حقیقی تاریخ اور حقیقی فلسفہ ہونیکے علاوہ حیات آفریں اور حیات بخش بھی ہو، اس مقام پر ایسا شخص درکار ہے۔ جو نہایت حساس ہو جس کا تخیل بہت وسیع و بلند ہو اور جس کا بیان دلربا موسیقی سے لبریز ہو، تاکہ وہ دولتِ گم گشتہ کا احساس کرسکے، زندگی کے روشن چہرے کو دیکھ سکے، اور پھر اپنی آتش زبانی و جادو بیانی سے افرادِ قوم کے دلوں

میں امید و ولولہ کا شعلہ بلند کرکے انہیں اُس نصب العین کی طرف اپنی موسیقی کی رَو میں بہالے جائے اور حیاتِ حقیقی سے ہم آغوش کردے، قومی زندگی میں یہ ایک محض تبدیلی نہیں بلکہ ایک زبردست انقلاب ہے جو کبھی سیاسی ہوتا ہے اور کبھی اجتماعی لیکن یہ سیاسی اور اجتماعی انقلابات ہرگز واقع نہیں ہو سکتے جبتک ایک ذہنی انقلاب کا دَور دَورہ نہ ہوجائے، اعمال ہمیشہ افکار کے ماتحت ہیں اس لئے نہایت ضروری ہے کہ سیاسی یا اجتماعی انقلاب کے ظہور پذیر ہونے سے پیشتر اُس قوم کے افراد کے دلوں میں ایک زبردست انقلاب ہو، اور یہ اُس شخص کی آتش بیانی کا نتیجہ ہوتا ہے جسے دُنیا کو پیغمبر یا حکیم یا خطیب کا لقب دینا پسند کرے لیکن ہم شاعر کے نام سے یاد کرنا موزوں سمجھتے ہیں، کیونکہ اسکے معنی ہیں صاحبِ حسن و شعور۔ اسکے افکار، اقوال، بیانات، نغمات سب شعر ہیں اور حسن و شعور سے لبریز، یہی وہ ادب ہے جس میں خلاقیت ہے۔ جو زندگی کا پیدا کرنے والا اور اُسکی پرورش کرنیوالا ہے! ہاں، ادب زندگی کا پروردگار ہے۔

ادب اور زندگی کا تعلق اب واضح ہے، ادب تو یقیناً زندگی ہی کا دودھ پی کر پلا ہے اور اس کا مقصد زندگی کی خدمت کے سوا کچھ نہیں لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ زندگی ادب ہی کے سائے میں پل کر جوان ہوئی ہے اور اسی کے وجود سے اسکی شاندار ہستی کا قیام وابستہ ہے، ابتدا میں انسانی زندگی کا مفہوم کھانے پینے اور سونے تک محدود تھا لیکن ادب کے باعث ذہنِ انسانی ترقی کرتا گیا اور زندگی کا نصب العین ارفع و اعلیٰ ہوتا گیا! یہی وجہ ہے کہ ہم نے ادب کو زندگی کا خلاق اور پروردگار قرار دیا ہے، زندگی ادب کا سرمایہ ہے اور ادب زندگی کا سرمایہ، زندگی کی خوبی خود ادب کی خوبی ہے، ادب کے لئے لازم ہے کہ زندگی کا آئینہ دار ہو، زندگی کا نگاہدار ہو، اور زندگی کا پروردگار ہو۔ ہاں، حقیقی ادب وہ ہے جس کا موضوع زندگی ہو ــ کثیف مادی زندگی نہیں بلکہ پاک روحانی زندگی، کذب و دروغگوئی کی زندگی نہیں بلکہ صداقت، راستبازی کی زندگی، تملق و چاپلوسی کی زندگی نہیں بلکہ غیرت و حمیت کی زندگی، جُبن و ہراس کی زندگی نہیں بلکہ شجاعت و جوانمردی کی زندگی، غلامانہ زندگی نہیں بلکہ آزاد زندگی ــــ اور حقیقی ادیب وہی ہے جو زندگی کا ایک ایسا شاندار نصب العین قائم کرے جس میں پتھر کی سختی ہو، پھول کی خوبصورتی ہو، شبنم کی پاکیزگی ہو، آفتاب کی درخشانی ہو، دریا کی روانی ہو، پہاڑوں کا وقار ہو اور مینہ کا ایثار ہو، اور جسے حاصل کرنے کے بعد انسان کے جسمانی و روحانی قوئے میں کم ازکم اتنی قدرت تو پیدا ہو جائے کہ وہ حسنِ حقیقت کے جلوے سے آنکھ کو روشن کرسکے اور اپنے خالق سے براہِ راست ہمکلام ہو سکے۔

(محمد اکبر منیر)

نوجوانوں کے لئے

دُنیا میں ایک المناک حقیقت ہے۔ جس کے متعلق شاید ہی کبھی کسی نے قلم اُٹھایا ہوگا اور جس کو غالباً بہت ہی کم لوگوں نے محسوس کیا ہوگا۔ بلکہ خود وہ لوگ جو اس المناک حقیقت کا شکار ہو چکے ہیں۔ اور جن کے حصہ میں بیکسی اور تنہائی کی مُصیبت آچکی ہے اس بیکسی اور تنہائی کی مُصیبت کا اصل سبب معلوم کئے بغیر اسکو برداشت کئے چلے جارہے ہیں۔ اس المناک حقیقت سے میرا مطلب نوجوانوں کی وہ حالت ہے جس کی وجہ سے وہ ہمیشہ اپنے ہم عمروں کی صحبت سے محروم رہتے ہیں، وہ زندگی کی ہر منزل پر اپنے ہم عمروں سے ایک قدم آگے یا ایک قدم پیچھے رہنا چاہتے ہیں۔ جوانی کے دنوں میں وہ عام طور پر ان لوگوں میں اُٹھنا بیٹھنا پسند کرتے ہیں جو بلحاظ عمر کے انکے والدین کے برابر ہوتے ہیں اور اس طرح وہ اپنے بے پرواشباب کی معصوم اور بیفکر مسرتوں کی توہین کرتے ہیں۔ وہ اپنے تمام خیالات کو عمر رسیدہ لوگوں کے خیالات سے ہم آہنگ کر لیتے ہیں، یہانتک کہ آخر کار انکے خیالات اُن لوگوں کے خیالات کی محض ایک صدائے بازگشت معلوم ہونے لگتے ہیں۔ جن کے نقطۂ نظر کا انہیں درحقیقت کچھ مزید تجربہ کے بعد احساس ہونا چاہئیے تھا۔ بڑے بوڑھے لوگوں کی خشک حقیقت پرستی کے شوق میں وہ جوانی کی بے فکریوں اور غیر ذمہ داریوں کی اس مسرت کو کھو بیٹھتے ہیں جو یقیناً اُنکا حصہ تھی۔ یہ بھی ایک قسم کی اکابر پرستی ہے۔ جس کا انجام آخر کار افسوسناک ہوتا ہے۔ اکابر پرست ہر چیز کو اکابر ہی کی آنکھوں سے دیکھنا شروع کر دیتا ہے۔ یہ عادت اُسے اُس کھلکھلاتی ہوئی ہنسی سے جس کا مقصد صرف ہنسنا ہی ہوتا ہے اور جو جوانی کا مسلمہ حق ہے محروم کر دیتی ہے۔ اور ابھی یہ انکے المناک انجام کی ابتدا ہوتی ہے۔ کیا یہ المناک انجام نہیں ہے، اس کا احساس ان کو بعد میں جاکر ہوتا ہے لیکن یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے اور ہر شخص جس کو خواہش ہو اس کا مشاہدہ کر سکتا ہے کہ وہ لوگ جو فطرت کے منشاء کے خلاف قبل از وقت اپنے دماغوں کو پختہ عمری کی طرف دھکیلتے ہوئے لیجاتے ہیں۔ عمر میں جتنا بڑھتے ہیں ذہنی حیثیت سے اُتنا ہی گھٹتے چلے جاتے ہیں۔ یہانتک کہ آخر کار اس وقت جبکہ ان کو ادھیڑ عمر کے لوگوں کے ساتھ میل جول رکھنا چاہئیے تھا۔ انکی خفیف حرکات جوانوں کو بھی شرماتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا فطرت جو ہر شخص کی زندگی میں ایک خاص منزل پر پہنچ کر بیفکر اور غیر ذمہ دار ہو جانا چاہتی ہے۔

اس طرح اس مزاحمت کا انتقام لے رہی ہے جو صحیح وقت پر اسکے راستے میں ڈالدی گئی تھی ۔
شائد تم اس المناک انجام پر ہنس دو گے۔ لیکن ہنس دینا، آہ! صرف ہنس دینا تو اس انجام کی الم انگیز کیفیات کو کم نہیں کر دیتا۔ لوگوں کو میں نے دیکھا ہے کہ وہ ہمیشہ زندگی کے ان انجاموں کو جو صحیح طور پر المناک کہلانے چاہئیں۔ ہنسی میں ٹال دیتے ہیں۔ یہ وہ حقائق ہیں جن کی الم انگیز کیفیات روز بروز بڑھتی چلی جاتی ہیں لیکن جن کو زخم خوردہ لوگ اپنے تبسّم کے پردے میں چھپائے رکھتے ہیں بایں ہمہ اگر کوئی عورت یا کوئی مرد اپنے ہم عمروں کے طبقہ میں اپنے لئے دوست نہیں پاتا۔ تو اس کی زندگی بڑی بیکسی اور تنہائی کی زندگی ہے۔ بلکہ اس سے بھی بدتر۔ کیونکہ تنہا ہونے کے علاوہ وہ زندگی بیہودہ اور بےمعنی بھی ہے ۔
ایسے شخص کو اپنی آئندہ زندگی میں خواہ کتنی ہی شان و شوکت حاصل ہو جائے۔ لیکن پھر بھی وہ زندگی کی مسرتوں کے اس گنج گرانمایہ سے ضرور محروم رہ جاتا ہے جو اس کے دل میں پوشیدہ تھا۔ مگر یا تو اُسے اُس کی آنکھوں نے نہ دیکھا اور یا جان بوجھ کر اس نے اس سے بے اعتنائی کی بہرحال اس نقصان کی تلافی دنیا کی کوئی دولت بھی نہیں کر سکتی۔ بہت سے نوجوان صرف اس مہلک فریب کا شکار ہو کر اپنے ہم عمروں سے بے اعتنائی کرتے ہیں کہ گفتگو کے قابل وہی لوگ ہیں جو اس دنیا میں کچھ منازل طے کر چکے ہیں لیکن عموماً وقت گزرنے پر معلوم ہو جاتا ہے۔ کہ جن باتوں کو سُن سُن کر وہ کبھی جھوما کرتے تھے، درحقیقت وہ اس قابل بھی نہ تھیں کہ انہیں سُنا ہی جائے۔ لیکن جب انہیں ہوش آتا ہے تو وقت گزر چکا ہوتا ہے۔ اس وقت انہیں اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ نوجوان لوگ دنیاوی افکار سے آزاد رہنے میں کس قدر دانا واقع ہوئے تھے۔ اٹھارہ بیس سال کے نوجوانوں میں سے بہت اس انتظار میں رہتے ہیں کہ ان کی عمر چالیس سال کی ہو جائے۔ لیکن جب وہ چالیس سال کے ہوتے ہیں۔ تو یہ دیکھ کر اُن پر مایوسی چھا جاتی ہے کہ اٹھارہ بیس سال کی عمر میں انہوں نے اپنی زندگی کے اس دور کو ضائع کر دیا ہے۔ جس میں مسرت و انبساط کے خزانے پوشیدہ تھے، پس دنیا میں انسانی زندگی کے یہ دو حسرتناک انجام تمہیں نظر آئینگے۔ ایک اس وقت جب نوجوان بیس اکیس سال کی عمر میں متانت سنجیدگی اور ہمہ دانی کا مجسّمہ بنا ہوتا ہے۔ اور ایک اس وقت جبکہ وہی شخص پچاس برس کی عمر میں جوانی کا زعم باطل لئے ہوئے بے وقت کا راگ الاپتا ہے۔ اگر زندگی میں تمہیں مسرت اور سکون کی تلاش ہے۔ تو تمہارے لئے یہی افضل ہے۔ کہ اپنے ہم عمروں سے مِل جُل جاؤ۔ خواہ تمہیں وہ لوگ نامعقولوں کا مجمع کیوں نہ نظر آئیں۔ اور اگر یہ نہیں تو بےکسی اور تنہائی کا بھیانک بادل تمہارے جادۂ حیات کو تاریک کر دیگا۔ جوانی میں لوگوں کو بڈھا بننے کا شوق ہوتا ہے

کیونکہ ان کی نظروں میں بڑوں کی رائے کے ساتھ اتفاق ہی عقل و دانش کا مترادف ہوتا ہے۔ لیکن آہ! جب وہ سچ مچ بوڑھے ہو جاتے ہیں، تو انہیں بہت ہی کم ایسے لوگ ملتے ہیں جن سے مل کر وہ گزری ہوئی باتوں کا تذکرہ کر سکیں۔ کہ بڑھاپے کے غم کی تسکین گزرے ہوئے زمانہ کی یاد ہی سے ہوتی ہے۔ وہ پلٹ کر شباب کے پیچھے جاتے ہیں اس کی خوشیوں سے اپنا حصہ لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اپنے دل میں خیال کرتے ہیں کہ ابھی ہم شباب کا مفہوم سمجھنے سے قاصر نہیں ہوئے۔ لیکن انہیں یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ شباب انہیں قبول کریگا۔ ان کا وجود شباب کے لئے ایک ناخواستہ بار ہوگا۔ کیونکہ انسان صرف اپنے ہم عمروں ہی کے سامنے بے تکلفانہ طور پر اپنے اصلی رنگ میں ظاہر ہو سکتا ہے۔

بعض لوگ اس بات سے بہت ہچکچاتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو ان لوگوں میں شامل کر دیں۔ جو ہر روز بلکہ دن کے ہر لمحہ میں زندگی کے حیات افروز نور سے محروم ہوتے چلے جا رہے ہیں لیکن جلد یا بدیر آخر انہیں یہ کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ اس میں اُنکے سکونِ قلب کا سرمایہ پوشیدہ ہوتا ہے۔ دنیا میں بہت کم نظارے ایسے ہیں، جن کو دیکھ کر ہمیں اتنا رنج ہو جتنا ہمیں عمر رسیدہ لوگوں کو دوسرے بڈھوں سے محض اس لئے نفرت کرتے ہوئے دیکھ کر ہوتا ہے کہ وہ خود بھی بڈھے ہیں۔ شاید تم کہو گے کہ تمہیں کبھی ایسی صورتِ حالات سے سابقہ نہیں پڑا لیکن میری بات پر یقین کرو یہ ایک نہایت ہی عام نظارہ ہے۔ یہ صحیح ہے کہ لوگ اس کا تذکرہ نہیں کرتے۔ مگر اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہم خود اپنے نفس کے سامنے بھی شاذ و نادر ہی دیانت سے کام لیتے ہیں۔

بڑھاپا بہت سریع الاحساس واقع ہوا ہے۔ اور یہی حالت شباب کی بھی ہے۔ لیکن شباب کی یہ حالت بڑھاپے کی طرح قابلِ رحم اور رنج دہ نہیں۔ شباب کے پاس قوت و ہمت کو حاصل کرنے کے لئے کافی وقت ہوتا ہے۔ عمر رسیدہ لوگ اس کی جرأت و قوت کو دبانے کی خواہ کتنی ہی کوشش کریں۔ اور اس حیلہ سے اپنے زندہ رہنے کے حق کو کتنا ہی مامون و مصئون بنائیں۔ لیکن پھر بھی بازی شباب ہی کے ہاتھ میں رہیگی۔

رچرڈ کنگ   منصور احمد

کسی روز

دُنیا کی گرد آلود کہکشاں نے میری اور تیری محبت کے تاروں کو مُدت سے جُدا کر رکھا ہے!

ہم دُور ہی دُور ٹمٹماتے اے جان! ہم دُور ہی دُور آنسو بہاتے ہیں!

تُو مشرق میں تاروں کے ایک جھرمٹ سے الگ کھڑی ہے اور میں مغرب میں مہ زرد رد سے کچھ دُور پڑا ہوں!

وہ جھلملاتے تارے اور یہ زرد سا کمھلایا ہُوا چاند تیری آرزوئے اُلفت اور میری تمنّائے محبت کی پیاری آرامگاہیں ہیں ـــــ لیکن ہم خود تو دُور ہی دُور ٹمٹماتے ہیں اے جان! ہم دُور ہی دُور آنسو بہاتے ہیں! ـــــ کیونکہ دُنیا کی گرد آلود کہکشاں نے میری اور تیری محبت کے تاروں کو مُدت سے جُدا کر رکھا ہے!

آہ اے میری دُور اُفتادہ رفیقِ زندگی! محبت کی وفا پرستی کیا فرقت کی ستم کیشی کے لئے تھی؟ محبت کیا اس لئے ضیا ریز ہوتی ہے کہ اُسکی اچھوتی روشنیاں جدائی کی تاریکیوں میں یوں بھولی بھٹکی پھرتی رہیں؟ ـــــ ہائے! محبت تو اس لئے سینوں میں چمکتی ہے کہ دلوں کی نرم و نازک تریں کرنیں مِل جُل کر اپنے پاکیزہ نُور سے چند روز کی اس محفل کو اک جگمگاتی ہُوئی بزمِ چراغاں کر دیں!

ہم کیوں دُور ہی دُور ٹمٹمائیں۔ اے جانِ من! ہم کیوں دُور ہی دُور آنسو بہائیں؟ ـــــ اگر دُنیا کی کہکشاں نے میری اور تیری الفت کے معصوم تاروں کو جُدا کر دیا ہے تو کیا ڈر ہے کہ جبتک تیری معصومیت میں رعنائی اور میری محبت میں بے پروائی کی قوت ہے جبتک تیرے سراپا کو عفت اور میرے نفس کو رقت سے پیار ہے اس وقت تک اے جانِ جاں! اس جدائی میں کچھ بُرائی نہیں یہ فراق کچھ ایسا شاق نہیں اس وقت تک ہمارے دل اس زبردست اُمید سے معمور ہیں کہ کسی روز حُسن و محبت کی مُتحدہ قوتیں قسمت کے میدان میں دُنیا جہان کی پُر فریب زحمتوں کو فاش شکست دے کر ہمارے لئے زندگی کی راہ صاف کر دینگی!

"باغباں"

سب سے زیادہ دُنیا کو کس شے کی ضرورت ہے؟

اگر مجھے دُنیا میں ہر قسم کے اختیارات دے دئے جائیں اور میں چاہوں کہ کوئی ایسی بات کروں جو نوعِ انسان کے لئے سب سے زیادہ مفید ثابت ہو تو بہت سی باتیں ایسی ہیں جو میں قطعی طور پر نہ کروں +

میں ہر شخص کو زر و دولت نہ دوں کیونکہ ہم میں سے ہر ایک کو اگر دس دس لاکھ روپیہ بھی مل جائے تو اب کی بہ نسبت اوروں کے مقابل میں ہماری حالت کسی طرح بہتر نہ ہو +

میں دُنیا میں بہترین نظامِ حکومت رائج نہ کروں کیونکہ اچھے سے اچھے قوانین بھی برے لوگوں کو بھلا نہیں بنا سکتے

میں علالت اور موت کو موقوف نہ کروں کیونکہ زندگی کے اعلیٰ ترین حقائق کا پتہ ہمیں جس قدر ان دو چیزوں سے ملتا ہے کسی چیز سے نہیں مل سکتا +

میں علمِ طبیعیات کے سب اسرار کا جواب شاید صدیوں میں جا کر دریافت ہوں ایک دم انکشاف نہ کروں کیونکہ علم کا بہترین حصّہ اُس کی تلاش ہے +

میں ابھی سے آئندہ ہزار سال کی ایجادوں کا بھید ظاہر نہ کروں کیونکہ ایجادیں اُسی وقت ہوتی ہیں جب انسانیت اُنکے لئے تیار ہو +

میں جو بات کروں وہ یہ ہے۔ دُنیا میں میں ایک عدیم النظیر عقلمند ایک شیریں بیباک انسان بھیجوں اور اُسے بس اتنی مُدت تک دُنیا میں رہنے دوں کہ کچھ لوگ اُس سے انتہا درجہ محبت کرنے لگیں اور اُسکی سیرت کا اک گہرا نقش اُنکے دلوں پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ثبت ہو جائے۔ اُس کی شہرت کئی نسلوں تک جاری رہے ہم سب اُسکے عشق کا دم بھریں ہم اُس پر اپنی جانیں نثار کرنیکو تیار ہو جائیں اور پھر رفتہ رفتہ اُسکے سانچے میں ڈھل کر ہو بہو اُس کی تصویر بن جائیں +

مجھے کامل یقین ہے کہ ایسا کرنے سے میں نوعِ انسان کو سب سے زیادہ فائدہ اور سب سے کم نقصان پہنچاؤں +

گلُچیں

راگنیاں

تُو اک لمحے کے لئے میرے پہلو میں آئی اور عورت کی اُس زبردست ادا کے ساتھ جو قلبِ آفرینش میں مستور ہے تُو نے مجھے چھُو دیا! وہ جو ہمیشہ خدا کو اُس کی اپنی ہی شیرینی کا دَور واپس بھیجتی رہتی ہے وہ قدرت کا نت نیا حسُن اور نت نئی جوانی ہے۔ وہ لہریں لیتی ہُوئی ندیوں میں رقص کرتی اور صبح کی روشنیوں میں نغمہ زن ہوتی ہے۔ وہ تشنہ زمین کو اپنی اُبھرتی ہُوئی موجوں کے ساتھ سیراب کرتی ہے۔ اُس کے نفس میں وہ دائمی جود اک ایسی مسرت سے جو اپنے تئیں ضبط نہیں کرسکتی دو نیم ہو جاتا ہے اور بے اختیار دردِ محبت میں بہہ نکلتا ہے!

اے عورت! پھر میری خستہ زندگی میں وہ خوبصورتی اور ترتیب پیدا کردے جو تو میرے گھر جیتے جی لائی تھی۔ اِن گھڑیوں کے خس و خاشاک کو صاف کردے اس خالی برتن کو لبریز کر اور ہر شئے کو جسکی دیکھ بھال نہیں ہُوئی درست کردے۔ حرم کا اندرونی دروازہ کھول کر شمع کو روشن کر اور پھر آ کہ وہاں خاموشی میں اپنے خدا کے سامنے میں اور تُو دونوں مل جائیں!

وہ وقت گذر چکا ہے جب میں اس کی تمام عنایات کا صلہ اُسے دے سکتا تھا۔ اُس کی رات اپنی صبح کو پا چکی ہے اور تُو نے اُسے اپنی آغوش میں لے لیا ہے اور اب تیرے پاس میں اپنی شکر گذاری اور اپنے اُن تحائف کو لیکر آیا ہوں جو اُس کے لئے تھے۔ اُس سارے دُکھ درد کے لئے جو میں نے اُسے پہنچایا میں تیرے حضور معافی کا خواستگار ہوں اور اب تیری خدمت کے لئے میں اپنی محبت کے اِن تمام پھُولوں کو نذر کرتا ہوں جو ابھی بند کلیاں تھیں جب وہ اُن کے کھِلنے کا انتظار کیا کرتی تھی۔

گلچیں

میرا ترانہ ہندی میری نوا حجازی

لائی سحر فلک سے پیغامِ پاکبازی
اللہ کی بارگہ میں حاضر ہوئے نمازی

اُٹھ مستِ خوابِ غفلت! اللہ کا نام لیکر
ہے وقتِ چارہ جوئی ہے وقتِ چارہ سازی

خالق سے لَو لگانا، خلقت سے پیار کرنا
یہ عشق ہے حقیقی، وہ عشق ہے مجازی

میں تیری جستجو میں، تُو بزمِ ہاؤ ہُو میں
وہ میری بیقراری، یہ تیری بے نیازی

حُسن اَور عشق دونوں ہیں نُورِ آسمانی
اِک نُور جاں نوازی، اِک نُور جانگدازی

میں آبشارِ کوہی، میں رود بارِ صحرا
میرا ترانہ ہندی، میری نوا حجازی

آئی ہے آسماں سے، جائیگی آسماں پر
میری سخن سرائی، میری سخن طرازی

(شاعر گمنام)

محفلِ ادب

انگریزی زبان میں تاریخ گوئی

فنِ تاریخ گوئی ادبی حیثیت اور تقویم زبان کے لحاظ سے کوئی اہمیت نہیں رکھتا لیکن دلچسپ و عجیب ضرور ہے اور السنۂ سہ گانہ (عربی۔ فارسی۔ اُردو) کی ایک نادر خصوصیت ہے۔ مجھے ایک عرصہ سے جستجو ہے کہ تاریخ گوئی کی ابتداء ایجاد و موجد کا حال معلوم ہو لیکن نہ ہو سکا۔ علامہ شبلی مرحوم سے بھی میں نے دریافت کیا تھا وہ بھی نہ بتا سکے السنۂ مذکورہ کے علاوہ اور زبانوں میں یہ صنعت نہیں پائی جاتی۔ انگریزی حروف تہجی میں سے صرف سات حرفوں کے اعداد مقرر ہیں (I=۱-V=۵-X=۱۰-L=۵۰-C=۱۰۰-D=۵۰۰-M=۱۰۰۰)

یہ حروف تاریخ گوئی کے لئے ناکافی ہیں لیکن اس پر بھی بعضوں نے طبع آزمائی کی ہے اور کھینچ تان کر، تعمیہ تجزیہ کر کے تاریخ پیدا کی ہے۔ میں دو تاریخیں پروفیسر ای۔ جی براؤن کی کتاب "تاریخ ادبیات ایران" سے پیش کرتا ہوں جو کم سے کم مستشرقین یورپ کی فن تاریخ گوئی سے دلچسپی کا تو ثبوت ہیں۔

۱۔ مسٹر ہرمین بکنل (HERMAN BICKNELL) نے حافظ شیرازی کی تاریخ وفات ان کی مشہور تاریخ وفات "خاک مصلیٰ" (۷۹۱ھ) سے اس طرح نکالی ہے۔

Thrice take thou from MUSALLAS EARTH
ITS RICHEST GRAIN.

اس کا ترجمہ یہ ہے کہ "خاک مصلیٰ سے اس کا سب سے قیمتی دانہ تین بار نکالو" تاریخ اس طرح نکلتی ہے کہ پہلے مصرع کے جلی لکھے ہوئے الفاظ میں جتنے قابل اعداد حروف ہیں ان کے اعداد میں سے دوسرے مصرع کے قابل اعداد حروف کے عدد تین بار نکال لئے جائیں مصرع اول میں صرف تین حروفِ اعداد ہیں MLL جن کے عدد (۱۱۰۰) ہوئے دوسرے مصرع میں یہ چار حرف ہیں (I C I I = ۱۰۳) ان کے تگنے اعداد یعنی ۳۰۹ کو ۱۱۰۰ میں سے نکال لئے تو ۷۹۱ باقی رہتے ہیں۔

یہ زبردستی کی تاریخ ہے تاہم کوشش و تلاش اور شوق و دلچسپی قابل تحسین ہے لیکن ہماری زبانوں میں اس طرح کا تخرجہ بعض موقعوں پر عجیب لطف پیدا کر دیتا ہے مثلاً کسی کی تاریخ ہے (از حوضِ لطیف آب بردار)

کہ مضمون بھی لطیف اور "حوض لطیف" میں سے "آب" کے عدد نکال کر تاریخ بھی بے نظیر +

۲۔ دوسری تاریخ براؤن نے ملکہ الزبتھ کے انتقال کی درج کی ہے۔ وہ یہ ہے۔

MY DAY IS CLOSED IN IMMORTALITY

یعنی میری زندگی غیر فانی ہوکر ختم ہوتی ہے" اس میں ایک اور صنعت کی گئی ہے۔ یعنی تمام الفاظ کے صرف پہلے حروف سے تاریخ نکلتی ہے (MDCIII = ۱۶۰۳)

(زمانہ)

جامِ صہبائی

جناب اثر صہبائی بی اے ایل ایل بی

۱

گھیرے ہوئے ہے شب کی سیاہی مجھ کو — رہ رہ کے ڈراتی ہے تباہی مجھ کو
تابانیِ آفتابِ امید مگر — دیتی ہے پیامِ صبحگاہی مجھ کو

۲

گو بحرِ حوادث کا تلاطم نہ گیا — بربط سے مرے لطفِ ترنّم نہ گیا
وہ زندہ دلِ دہر ہوں اے "صہبائی" — تا زیست مرے لب سے تبسّم نہ گیا

۳

ہنگامِ شباب غرقِ عصیاں ہوں میں — پیری میں رہینِ ذکرِ یزداں ہوں میں
ہیں سلسلۂ زیست کی یہی دو کڑیاں — سرکش ہوں کبھی، کبھی پشیماں ہوں میں

(معارف)

افسانہ کی تخلیق ۔ قصہ گوئی انسان کا قدیم ترین اور نہایت دلچسپ مشغلہ رہا ہے، انسان میں تقلید اور نقل اتارنے کا مادہ فطرتاً ودیعت کیا گیا ہے۔ چنانچہ مسٹر ماردن کا خیال ہے کہ آنکھ کھلتے ہی انسان نے

جن اشیاء کو اپنے گرد و پیش دیکھا، ان کی نقلیں اتارنی شروع کیں۔ پہلے پہل یہ کام پتھروں اور درختوں کے تنوں پر نقوش اور تصاویر اتارنے تک محدود تھا، جو کندہ وں کی شکل میں ہم تک پہنچتے ہیں، یہ جذبہ حیات انسانی کے ابتدائی دور میں جس شدت کا تھا۔ اُس کا پتہ متذکرۂ بالا پتھروں پر کے کندہ نقوش اور تصاویر سے بخوبی چل سکتا ہے، جو اس دور کے قوی ترین آثار ہیں، قدیم مصر کے خط تصویر کی پیدائش اسی احساس کی مرہون منت ہے۔ جس کے کتبے وادئ رود نیل میں بکھرے ہُوئے دستیاب ہوتے ہیں۔ انسان کی اختراع اور تنوع پسند طبیعت جب اس مشغلہ سے اُکتا گئی اور قوتِ گویائی بھی بڑھ گئی تو اُس نے قصہ گوئی کی طرف توجہ کی، زبان ترقی کے جس قدر مراحل طے کرتی چلی آرہی ہے، قصہ گوئی نے بھی کئی پہلو بدلے ہیں، چنانچہ قصہ، کہانی، حکایت، افسانہ، ڈراما اور موجودہ فنی ناول اسی کی مختلف صورتیں ہیں +

رچرڈ برٹن اپنی کتاب "ماسٹرس آف دی انگلش ناول" کا آغاز اس طرح کرتا ہے کہ:۔

"کہانیاں ساری دُنیا کی پیاری ہیں، اس لئے کوئی تعجب نہیں کہ قصہ گوئی کا آغاز اسی وقت سے ہُوا ہو، جس وقت سے کہ انسان نے کھڑا ہونا سیکھا"

ماٹر لکھتا ہے کہ:۔

"فنی قصہ گوئی، افراد انسانی کا قدیم ترین مشغلہ ہے۔ یہ وہ جذبہ ہے جو قلب انسانی میں مستحکم طور پر جاگزیں ہے سب سے پہلے مورت ساز کے ہاتھ پتھر کی چٹانوں سے ابھی بھدی شکلیں پیدا کرنے کے قابل بھی نہیں ہوئے تھے کہ اس قابلیت کا نشو و نما ہو چکا تھا، قدیم نظمیں درحقیقت قصہ کے لباس میں دنیا کے سامنے پیش ہُوئی ہیں"

غرض افسانہ کی تخلیق کا خیال اور اسکے جد اعلیٰ کی جستجو ہمکو اس قدیم زمانہ تک لیجاتی ہے جس میں زبان کے ابتدائی قواعد مدون تک بھی نہ ہوتے تھے، مگر قصے اور کہانیاں بڑے بوڑھوں کی نوک زبان اور بچوں کے صفحۂ دل پر نقش تھے مقدس ہستیوں کے حالات اور بہادروں کے کارنامے روایتوں کی شکل میں سینہ بسینہ چلے آتے تھے، لیکن قصہ کی وہ شکل موجودہ شکل سے بالکل مختلف اور غیر منتظم تھی اُن میں جانوروں اور بے جان چیزوں سے انسان کا کام لیا جا سکتا تھا، اور اُن میں انسانی لوازمات فرض کر لئے جاتے تھے فوق العادت واقعات اسکے روح رواں بنے ہوتے تھے۔ اس کا ہیرو "رستم" یا "حاتم" سا برائے نام انسان، مگر سیرت میں فرشتہ، دیو یا شیطان ہوتا، اور اسی طرح ہیروین بھی ہوتی یا تو وہ اِندر کے اکھاڑے کی کوئی

خوبصورت پری، یا بھوت، چڑیل ہوتی تھی، اسکے پلاٹ کے لئے کسی خاص سرزمین کا ہونا ضروری نہ تھا۔
بہرحال جو چیز ان قصّوں میں نمایاں ہے وہ مصنفین کی ذہنیت اور اُن کا تخیّل ہے اور بس، گویا قدیم
افسانے اس سوسائٹی کے خیالات کی ناموزوں یادگار تھیں جس میں انکی تخلیق ہوئی +

(نگار)

ادب لطیف - آج کل اُردو ادب کا ایک زبردست رجحان لطیف نگاری کی طرف ہے۔ یہ رجحان مولانا ابو الکلام کی طرزِ انشا پردازی اور سر رابندر ناتھ ٹیگور کی نظموں کے اُردو اسلوب کے عناصر سے مرکب ہے اگرچہ ہر ترقی یافتہ زبان میں اس قسم کی طرزِ تحریر کا کبھی نہ کبھی پیدا ہونا لازمی ہے لیکن ابھی اُردو پوری طرح اس قابل نہیں ہوئی تھی کہ اس میں اس قسم کی انشا کثرت کے ساتھ رواج پاتی۔ اُردو کو سنجیدہ نگاری اور علمی مضامین میں ابھی بہت کچھ ترقی کرنی ہے اور افسوس ہے کہ بہت پہلے ہی اس میں اس نوع کا اضافہ اور وہ بھی حدِ اعتدال سے زیادہ ہونا شروع ہوگیا۔ اس کی کثرتِ استعمال کے اسباب ہم نے اس مضمون کے گزشتہ باب میں بیان کردئیے ہیں۔ جناب اصغر (گونڈہ) نے اس کا ایک نفیس نقشہ اپنے ایک مضمون میں جو (انجمن اُردوئے معلّیٰ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے استفسارات کے جواب میں لکھا گیا ہے) پیش کیا ہے۔ ہم یہاں اسکے بعض جملے بطور اقتباس نقل کرتے ہیں جن سے اس رُجحان کے متعلق کافی معلومات حاصل ہو سکتے ہیں:-

"ادب لطیف کا اصلی مفہوم اس لطیف طرزِ انشا سے ہے جو وسعتِ علم، احساسِ شعریت و حکیمانہ نزاکت خیال کے باہمی امتزاج سے پیدا ہوتا ہے۔ جس طرح پانی کے تلاطم و روانی سے خود بخود موجیں نمایاں ہوجاتی ہیں۔ اسی طرح علم و فن کے نشر و ترقی سے "ادب لطیف" بھی آپ سے آپ عالم وجود میں آتا ہے، اُردو زبان کی موجودہ وسعتوں کو دیکھتے ہوئے یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ ادب لطیف کا وجود کچھ قبل از وقت ہوگیا لیکن اسکی بہتات و فراوانی سے یہ اندیشہ ضرور ہے کہ کہیں یہ بھی اُردو کی تکمیل میں سدِ راہ نہ ہو۔ اس لئے کہ زبان کا اصلی وقار اسکے سنجیدہ سرمایہ علمی سے ہے نہ کہ صرف خوبصورت و لطیف طرزِ انشا سے لطیف طرز ادا کا شمار اعراض میں ہے اور ظاہر ہے کہ اصل و اعراض میں حق مرجح کس کا ہے۔ لیکن یہ بحث تو ایک طرف میں تو بہ استثنائے چند حضرات کے یہ سمجھتا ہوں کہ اُردو "ادب لطیف" کا مفہوم ہی ابھی عام طور سے نہیں سمجھا گیا +

(سہیل)

میر۔ غالب۔ اقبال

میں نے انگلستان کے مشہور شاعر ڈرائڈن کی تقلید میں تین شعر لکھے ہیں۔ جو گویا اسی کے تین شعروں کا ترجمہ ہیں۔ ڈرائڈن کے اشعار سننے کے قابل ہیں۔ ملٹن کی تحسین کا جدید پیرایہ اختیار کیا ہے۔

Three poets, in three distant ages born,
Greece, Italy, and England did adorn
The first in loftyness of thought Surpassed
The next in majesty; in both the last
The force of nature could no further go
To make a third, she joined the former tw

یہ اندازِ مدح مجھے بہت پسند آیا اور میں نے ہندوستان ہی کے تین اُردو شاعروں کا انتخاب کیا ہے۔ معلوم نہیں عرب و ایران میں بھی اس طرح کا خیال ظاہر کیا گیا ہے یا نہیں۔ فارسی کا ایک یہ قطعہ مشہور ہے ؎

در شعر سہ تن پیمبرانند ۔۔۔ ہر چند کہ "لانبی بعدی"
ابیات و قصیدہ و غزل را ۔۔۔ فردوسی و انوری و سعدی

لیکن یہ تحسین اصنافِ شاعری میں ہے۔ خصائص شاعری میں نہیں۔ بہر حال میرے اشعار یہ ہیں میں نے محاسنِ شاعری کے حصر میں ڈرائڈن سے اختلاف کیا ہے ؎

تین شاعر مختلف اوقات میں پیدا ہوئے ۔۔۔ جن کی فیضِ طبع نے اردو کو گنجِ زر دیا
ایک اثر میں بڑھ گیا، اک رفعتِ تخئیل میں ۔۔۔ تیسرے کی ذات میں دونوں کو حق نے بھر دیا
کائناتِ شاعری ہیں بس یہی دونوں کمال ۔۔۔ تیسرے میں اس لئے دونوں کو یکجا کر دیا

علیگڈھ میگزین

تبصرہ

اقبال - از مولوی احمد الدین صاحب بی۔ اے ایڈووکیٹ لاہور مؤلف سرگزشتِ الفاظ۔

یہ قابل قدر کتاب جو علامۂ اقبال کی اردو شاعری کی ایک دلچسپ تاریخ کہلا سکتی ہے حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ اقبال کے خیالات کے تدریجی نشوونما پر ایک دلکش پیرایہ میں روشنی ڈالی گئی ہے اور ان کی شاعری کے ابتدائی زمانہ کے حالات اور مختلف اشعار کے متعلق واقعات جس محنت اور کاوش سے جمع کئے گئے ہیں۔ اس کے لئے بے اختیار داد دینی پڑتی ہے۔ یہ کتاب اس قدر دلچسپ اور مفید ہے کہ ایک دفعہ شروع کر کے ختم کئے بغیر آدمی اُٹھ نہیں سکتا۔ حجم ۲۸۴ صفحہ کاغذ لکھائی چھپائی عمدہ۔ قیمت بلا محصول ۲؎ مؤلف کتاب سے طلب فرمائیے۔

مذاکرات سالِ اوّل - یہ کتاب مجلسِ مذاکرۂ علمیہ حیدر آباد (دکن) نے شائع کی ہے۔ مجلس مذکور میں سال بھر کے اندر جس قدر مفید اور عالمانہ مضامین پڑھے گئے اس کتاب میں جمع کر دیئے گئے ہیں ذیل کی تفصیل سے مضامین کی نوعیت پر روشنی پڑیگی:۔

(۱)۔ **تاج المآثر** (تبصرہ) از سید ہاشمی صاحب رکن دار الترجمہ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد (دکن)

(۲)۔ **جاویدانِ خرد** (تبصرہ) از نواب صدر یار جنگ بہادر شروانی۔

(۳)۔ **جغرافیۂ اندلس** - از جناب محمد عنایت اللہ صاحب ناظم دار الترجمہ

(۴)۔ **غزل** - از نواب صدر یار جنگ بہادر شروانی۔

(۵) **نظریۂ اضافیت** - از ڈاکٹر مظفر الدین قریشی پی۔ ایچ۔ ڈی۔

(۶) **تحفۂ سامی** - از نواب صدر یار جنگ بہادر شروانی۔

(۷) **جاپان** - از نواب مسعود جنگ بہادر۔

(۸) **کیفیت مجلس مذاکرہ علمیہ** - از معتمدِ مجلس جناب سید ہاشمی صاحب۔

یہ کتاب ہر اُردو کی لائبریری میں موجود ہونی چاہیئے۔ باطنی محاسن کے علاوہ اس کی ظاہری صورت

بھی نہایت دلکش ہے اور کتابت طباعت اور کاغذ میں جو اہتمام ملحوظ رکھا گیا ہے وہ اردو کی مطبوعات کے لئے باعث فخر اور قابلِ تقلید ہے۔ حجم ۹۴ صفحہ کے قریب ہے جلد نہایت عمدہ قیمت سرورق پر درج نہیں مہتمم صاحب دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد (دکن) سے طلب فرمائیے۔

بدھ اور اس کا مت۔ (حصۂ اوّل و دوم) اس کتاب کا حصہ اول بدھ مذہب کے ایک امریکن پیرو مسٹر سٹراس کی تصنیف ہے جس کا ترجمہ پنڈت شیو نرائن صاحب شمیم نے کیا ہے حصہ دوم خود پنڈت صاحب کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ ہمارے پیشِ نظر اسوقت اس کتاب کا دوسرا اڈیشن ہے۔ اس کتاب کا پہلا اڈیشن مفت تقسیم کیا گیا تھا اور غالباً اب بھی یہ کتاب بلا قیمت ہی تقسیم ہو رہی ہے۔ کیوں کہ سرورق پر قیمت درج نہیں طبع ثانی کو مولوی امیر احمد صاحب علوی اور پنڈت برجموہن کیفی نے ادبی نقطۂ خیال سے دیکھ لیا ہے۔ بدھ مت کے متعلق اس کتاب میں نہایت مفید اور ضروری معلومات درج ہیں اور ہر شخص جس کو مذاہب عالم سے بالعموم اور بدھ مت سے بالخصوص دلچسپی ہو۔ اس کتاب سے معتدبہ فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔ کاغذ۔ لکھائی چھپائی عمدہ۔ حجم ۲۲۴ صفحے۔ پنڈت شیو نرائن صاحب شمیم ایڈووکیٹ لاہور سے طلب فرمائیے۔

سرمایۂ تسکین۔ محمد یٰسین صاحب تسکین کا مجموعہ کلام اس نام سے شائع ہوا ہے اس مجموعہ میں انکی بہت سی دلکش نظمیں ہیں بعض انگریزی نظموں کے تراجم بھی شامل ہیں۔ محمد یٰسین صاحب ایک بامذاق شاعر ہیں امید ہے کہ اُنکا کلام ملک میں بہت مقبول ہوگا۔ کتاب مجلد ہے کاغذ لکھائی چھپائی عمدہ حجم ۱۹۰ صفحے۔ قیمت عہ۔ محمد یٰسین صاحب تسکین متصل جامع مسجد بلند شہر سے طلب فرمائیے۔

رسالہ ادبستان۔ ادبستان انجمن معین الادب بمبئی کا ماہوار مصور رسالہ ہے جو حال میں جاری ہوا ہے اسکے مضامین نظمیں اور افسانے دلکش ہیں یہ احاطۂ بمبئی کا غالباً واحد رسالہ ہے جو اردو کی خدمت کیلئے وقف ہے اردو زبان کے حامیوں پر اسکی حوصلہ افزائی فرض ہے۔ کاغذ لکھائی چھپائی اچھی ہوتی ہے حجم ۶۴ صفحے قیمت سالانہ للعہ ششماہی علعہ مینیجر صاحب ادبستان داور مین روڈ بمبئی نمبر ۱۴ سے طلب فرمائیے۔

رسالہ ہمایوں لاہور

ہمایوں پنجاب کا سب سے زیادہ موقر اور غالباً سب سے کثیر الاشاعت رسالہ ہے جو پانچ سال سے ملک کی شاندار علمی و ادبی خدمات انجام دے رہا ہے۔ ہمایوں کی عنانِ ادارت نہایت قابل ہاتھوں میں ہے۔ اسکے بلند پایۂ علمی ادبی اور تاریخی مضامین دلچسپ اور دلکش افسانے اور گراں پایہ نظمیں بے نظیر ہوتی ہیں۔ ہمایوں میں آپ بیک وقت ملک کے تمام نئے اور پرانے انشا پردازوں کی تحریروں سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ یہ رسالہ آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں سابق چیف جج پنجاب ہائی کورٹ کی یادگار ہے۔ ہمایوں ایک مستقل سرمایۂ سے جاری کیا گیا ہے اور بفضلہ تعالیٰ جاری رہیگا۔ یہ رسالہ وقتِ اشاعت کی پابندی میں ضرب المثل ہے۔ اس کے ظاہری و باطنی محاسن پر دل کھول کر روپیہ صرف کیا جاتا ہے۔ ہمایوں کے ہر پرچے میں دلکش اور نایاب تصاویر شائع ہوتی ہیں اس کا کاغذ۔ لکھائی اور چھپائی نہایت نفیس۔ ہے چندہ سالانہ ۵؎ ششماہی ۳؎ علاوہ محصول

المشتہر

منیجر رسالہ ہمایوں کوٹھی میاں بشیر احمد صاحب بی اے آکسن بیرسٹر ایٹ لا ۳ مزنگ روڈ

لاہور

فہرستِ مضامین

جلد ۱۱	بابت ماہ فروری سنہ ۱۹۲۷ء	نمبر ۲

جہاں نما

مولانا عبدالحلیم شرر مرحوم - ہندوستان کے مایۂ ناز ادیب اور افسانہ نگار مولانا عبدالحلیم صاحب شرر کا انتقال اس دور کا ایک عظیم الشان ادبی نقصان ہے جس کی تلافی ممکن نہیں نظر آتی - انتقال کے وقت مولانائے مرحوم اپنی عمر کی ستر منزلیں طے کر چکے تھے - اب سے کچھ عرصہ قبل جب اُن کی موت کی غلط خبر نے مُلک بھر کو مضطرب کر دیا تھا بعض خوش عقیدہ لوگوں نے اس غلط خبر کو مولانا کی درازئ عمر کے لئے ایک مبارک فال سمجھا تھا - افسوس کہ یہ غلط خبر عام عقیدہ کے خلاف بہت جلد صحیح ثابت ہو گئی - مولانا بے شمار تصنیفات اپنی یادگار چھوڑ گئے ہیں - ان کے دلچسپ اور دلکش ناول ہمیشہ اُن کے نام کو زندہ رکھیں گے - بعض بعض حلقوں میں یہ تحریک ہو رہی ہے کہ مولانائے مرحوم کے اعزاز میں اُن کی کوئی یادگار قائم کی جائے - اس خیال کو جامۂ عمل پہنانے میں خود مُلک کی عزت ہے - ایک مہذب قوم کے لئے اپنے علم و ادب کی قدر و منزلت اور اپنے ادبا و علماء کی عظمت کا اعتراف یقیناً لازم ہے -

دُعا ہے کہ خدا مرحوم و مغفور کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے -

ترکی میں تعدّدِ ازواج کی رسم تنسیخ - موجودہ معاشرتی انقلاب کی وجہ سے ٹرکی کے اندر شادی بیاہ کی رسموں میں بھی بہت کچھ تغیّر و تبدّل واقع ہوا ہے - اس سے قبل نکاح کی رسم کی بجاآوری کے لئے امام یا مذہبی پیشوا کی موجودگی لازم سمجھی جاتی تھی - اور دُولہا دُلہن کو اپنی اپنی طرف سے دو گواہ پیش کرنے ضروری ہوتے تھے - چونکہ دُلہن کو پردہ میں رہنا ہوتا تھا اس لئے بالعموم اس کی طرف سے کوئی دوسرا شخص جو اُس کا وکیل کہلاتا تھا پیش ہوا کرتا تھا - اور امام نکاح کے وقت تین دفعہ یہ سوال کیا کرتا تھا کہ "کیا تم فلاں شخص کو اپنا شوہر قبول کرتی ہو"؟ اس کے بعد شادی ہو جاتی تھی - شادی کے نئے قانون کے نفاذ سے پہلے ۹ سال کی لڑکی اپنے والدین کی رضامندی حاصل کرنے کے بعد شادی کر سکتی تھی - لیکن اب یہ پابندی ہے کہ لڑکے کی عمر کم از کم اٹھارہ سال اور لڑکی کی عمر کم از کم سترہ سال کی ہو -

نئے قانون کی رو سے امام کا مجلس شادی میں ہونا لازم نہیں - بلکہ مجلس بلدیہ میں ایک افسر اس کام کے لئے مخصوص ہوا ہے - ہر بلدیہ کے دفتر میں شادی کے لئے ایک کمرہ علیحدہ رکھا گیا ہے - صرف دولہا یا اس کا وکیل افسر شادی کے سامنے پیش ہوا کرے گا اور وہ ذیل کے الفاظ میں شادی کی درخواست کیا کریں گے -

"ہم دو نوں فی جن کی منگنی یکم اکتوبر کو ہوئی تھی شادی کرنے کا فیصلہ کیا ہے براہِ نوازش ضروری رسوم کو عمل میں لیئے" +
اس کے نیچے دولہا دلہن کے دستخط ہوا کرینگے۔ جو نکاح بلدیہ کے دفتر میں ہوا کریں گے۔ ان کے لئے کسی قسم کی فیس ادا نہ کرنی پڑے گی۔ جو باہر ہوں اُن کے لئے پانچ ترکی پاؤنڈ (۱۱ شلنگ) ادا کرنے ہونگے۔ دفتر کے اوقات کے بعد جو نکاح ہو، اس کے لئے اس سے نصف رقم ادا کرنی ہوگی۔ موجودہ ترکی حکومت نے تعدّدِ ازواج کی رسم بھی منسوخ کر دی ہے اور اب وہاں کوئی شخص ایک سے زیادہ شادیاں نہ کر سکے گا +

ترکی میں فنِ رقص کی خانہ براندازیاں ترکوں میں مغربیوں کی تقلید کا روز افزوں شوق رنگ لائے بغیر نہ رہا۔ اس تقلید سے جہاں ترکی معاشرت میں بعض اصلاحیں ہوئی ہیں۔ وہاں ایسی ضرر رساں باتیں بھی رائج ہوگئی ہیں جن سے خود یورپ کا سلیم العقل طبقہ نالاں ہے۔ نوجوان مردوں اور عورتوں کے مخلوط رقص کی قابلِ اعتراض رسم بھی ٹرکی میں بہت مقبول ہوئی اور قسطنطنیہ میں رقص کے لئے تعلیم گاہیں اور رقص خانے کھُل گئے نتیجہ یہ ہُوا کہ گزشتہ چند ہفتوں کے دوران میں معزز گھرانوں کی بیسیوں لڑکیاں مفقود الخبر ہوگئیں۔ اور اکثر کے متعلق معلوم ہُوا ہے کہ اُنہوں نے گناہ کی زندگی اختیار کرلی ہے +

آخر اب ترکوں کی آنکھیں کھُلی ہیں۔ انگورہ سے باقاعدہ اجازت نامے حاصل کرکے جو ناچ گھر کھولے گئے تھے۔ پولیس اُن کو بند کر رہی ہے۔ رقص کی تعلیم گاہوں پر بھی پولیس نے سختی سے احتساب قائم کیا ہے۔ اِن تعلیم گاہوں کے طلبہ کے لئے آئندہ یہ لازم ہوگا کہ وہ رقص کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے اپنے والدین کے تحریری اجازت نامے پیش کریں +

ایک حیرت انگیز طبّی معائنہ عثمانیہ ہسپتال حیدر آباد (دکن) میں ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔ ایک دھوبی کا سترہ سالہ لڑکا جس کے گھٹنے میں تکلیف تھی علاج کے لئے ہسپتال میں داخل ہُوا۔ ڈاکٹر نے حسبِ معمول اس کا طبّی معائنہ کیا۔ تو عجیب و غریب انکشافات ہوئے۔ ڈاکٹر نے اس کی چھاتی کے بائیں طرف آلہ لگا کر دیکھا۔ تو دل کی حرکت کا کوئی سراغ نہ ملا۔ حالانکہ بہ ظاہر ہے۔ اس لڑکے میں اور عام انسانوں میں کوئی فرق نظر نہ آتا تھا۔ آخر ایکس ریز کی مدد سے یہ حیرت انگیز انکشاف ہُوا کہ اس کے سینہ و شکم کے اندر تمام اعضا الٹی طرف واقع ہوئے ہیں۔ جگر بائیں طرف اور دل دائیں طرف واقع ہیں۔ تلّی بھی اُلٹی طرف واقع ہوئی ہے۔ معدہ معمول کے خلاف اُلٹی طرف کو جھکا ہُوا ہے۔ اسی طرح بعض دوسرے اعضاء کا حال ہے +

ڈاکٹروں کی رائے ہے کہ ابتدائی چند ہفتوں کے دوران میں ماں کے پیٹ کے کسی اندرونی دباؤ سے اس قسم کی تقلیب پیدا ہوگئی۔ بلاشبہ یہ لڑکا قدرت کی پُراسرار طاقتوں کی ایک کھلی ہوئی نشانی ہے۔ ٹائمز آف انڈیا میں اس کی تصویر شائع ہوئی ہے +

قوائے انسانی کا ہمہ گیر انحطاط۔ ایک طبی مجلس میں تقریر کرتے ہوئے پادری لانگ نے تاسف سے اس حقیقت کا ذکر کیا کہ دُنیا کے بڑے بڑے لوگوں کی اولاد میں بہت کمی واقع ہو رہی ہے۔ "اسماء الرجال" کی کتاب میں جن لوگوں کے نام ہیں ان کے بچوں کی تعداد بہ لحاظ اوسط فی کس صرف دو ہے۔ مقرر نے یہ بھی کہا۔ کہ مشینوں کے استعمال کی کثرت سے انسانی اعضا معطل ہو رہے ہیں۔ پانی کے اندر رہنے کی وجہ سے جس طرح ویل مچھلی کی ٹانگیں نابود ہو گئیں اسی طرح موٹر کار کے اس بڑھتے ہوئے رواج کے طفیل ممکن ہے کہ کسی وقت ہمارے چلنے پھرنے کی طاقت بھی سلب ہو جائے۔ اسی طرح ٹائپ رائٹر کے استعمال سے ممکن ہے کہ رفتہ رفتہ ہمارے ہاتھ لکھنے کی قابلیت سے محروم ہو جائیں۔ ہمارے دانت چھوٹے ہو رہے ہیں اور ہمارے جبڑے اس قدر چھوٹے ہو گئے ہیں کہ ہمارے دانتوں کے لئے موزوں نہیں رہے۔ ہماری بصارت ضعیف ہو رہی ہے۔ ہمارے معدے درست نہیں رہے اور سب سے زیادہ افسوسناک حقیقت یہ ہے کہ گزشتہ ایک ہزار سال کے دوران میں ہماری ذہنی نشو و نما بھی مطلق نہیں ہوئی +

الحمرا

یہ عظیم الشان محل اور قلعہ یورپ میں عربوں کی حکومت کی جیتی جاگتی یادگار ہے۔ یہ عمارت فن تعمیر کے عجائبات میں سے شمار کی جاتی ہے۔ اور یورپ کے فن تعمیر میں اب تک وہ اثرات نمایاں ہیں جو اس عمارت کو دیکھ کر یورپ کے صناعوں نے اخذ کئے۔ یہ شاندار محل ایک پہاڑی پر واقع ہے۔ جس کے دامن میں

غرناطہ کا شہر پھیلتا چلا گیا ہے۔ اس کی تعمیر ۱۲۱۳ء میں شروع ہوئی اور ۱۳۴۸ء میں یہ مکمل الحمرا اپنے لاتعداد لمبے لمبے خوبصورت اور نازک ستونوں، اپنی شاندار محرابوں اور اپنی نفیس پچی کاری کے لئے عدیم النظیر ہے ✦

اعلان

ہمایوں مفت

ہمیں "ہمایوں" مفت تقسیم کرنے کے لئے کچھ پرچوں کا چندہ وصول ہوا ہے۔ یہ پرچے نادار طلبہ کے نام جاری کئے جائیں گے۔ جنہیں جلد ان کے لئے دفتر میں درخواستیں بھیج دینی چاہئیں۔ درخواست کے ساتھ سکول یا کالج کے پرنسپل یا ہیڈ ماسٹر کا تصدیق نامہ ہونا ضروری ہے ✦

جنوری نمبر

ہمایوں کا سالگرہ نمبر اس قدر مقبول ہوا ہے کہ باوجود زیادہ تعداد میں چھپوانے کے دفتر میں اس کے بہت کم پرچے رہ گئے ہیں۔ اب کوئی صاحب صرف جنوری نمبر منگوانے کے لئے فرمائش نہ بھیجیں۔ جنوری نمبر کے چند پرچے صرف اُن لوگوں کو بھیجے جائیں گے جو سال بھر کے لئے ہمایوں کے خریدار بنیں۔ ششماہی کے خریداروں کو بھی یہ رعایت دینے سے ہم معذور ہیں ✦

منیجر ہمایوں لاہور

غزل

رُک رُک کے اُٹھتے ہیں قدم چلنا ہے دشوار اس قدر
بیزار آزادی سے ہے تیرا گرفتار اس قدر

حیراں ہوں میں کیوں ہو گیا میرا دل بے مدعا
سارے جہاں کو چھوڑ کر تیرا طلبگار اس قدر

چشمے ترے ہی فیض کے جاری ہیں ہر سو ہر طرف
یوں ورنہ دریا دل نہ تھا ابرِ گہر بار اس قدر

یہ دو جہاں طے کر گیا وہ ایک چکر میں رہی
عقل اور اتنی خیرہ سر عشق اور ہشیار اس قدر

مٹ جائیں نام و ننگ کے جھگڑے ہمیشہ کیلئے
کاش اس قدر رسوا ہوں میں ہوں کاش میں خوار اس قدر

کیا تو جفا پیشہ نہیں ؟ کیا تو ستم آرا نہیں ؟
پھر زخم کھا جاتا ہے کیوں دل تجھ سے ہر بار اس قدر

مرجھا رہی ہیں کونپلیں کمھلا رہی ہیں پتیاں
ترسا نہ میرے باغ کو اے ابر آزار اس قدر

اک دورِ چشمِ مست میں چکرا گئے دونوں جہاں
حیراں ہوں ساقی کی نظر اور اس پہ ہشیار اس قدر

یہ کیا ستم کرتا ہے تو اے کج ادا بیگانہ خو
میں اس قدر شیدا ترا تو مجھ سے بیزار اس قدر

خاطر میں حامدؔ آج تک شاہوں کو بھی لایا نہیں
بے برگ و بے ساماں گدا اور اس پہ خود دار اس قدر

حامد علی خاں

کلام گرامی

رباعی

فرمود سحر بگوشِ ما ہادی ما — مضمر در بندگی ست آزادی ما
در چشمِ وفا عاشق و معشوق یکیست — مجنون لیلیٰ سرشت در وادی ما

غزل

سر بر زد از الست بلا جستجو نبود — صورت گرفت معنی جان آرزو نبود
بودیم جلوہ افگن ایوانِ لامکان — نہ آسمان و ہفت خط و چار سو نبود
تسبیح و خرقہ بود باینہا مرا چہ کار — پیمانہ و صراحی و جام و سبو نبود
رفتم بمدرسہ کہ مگر پے باد برم — شور ترانۂ من و تو بود او نبود
سودائیانِ حلقۂ زلف سیاہ را — دستار سر نبود کہ طوق گلو نبود
یک شہر گل بجیب ز نظارہ اش ولے — دامانِ چاک چاک نگاہم رفو نبود

در بزم نیست غیر گرامی رقیبِ من
او بود من نبودم و من بودم او نبود

گرامی

دنیا کی مذہبی و معاشرتی تاریخ پر اک نظر

آریائی و منگولی مذاہب

مذہب انسان کی تمام زندگی اور زندگی کے تمام احساسات و واقعات پر حاوی ہے۔ مذہب جو علم و فن اور اخلاق و تمدن سے الگ رہے مذہب نہیں مجموعہ اوہام ہے اور علم و عقل اور تہذیب و شائستگی جو مذہب سے محبت نہ رکھیں انسانی ترقی کے آئینے نہیں فقط جہل و ذلت کی تصویریں ہیں!

ہم مذہب سے عام انسانی تاریخ کو الگ نہیں کر سکتے ورنہ وہ تاریخ نامکمل رہیگی ہم عام انسانی تاریخ سے مذہب کو جُدا نہیں کر سکتے ورنہ مذہب بے معنی ہو جائیگا۔ اسی لئے مذہب و معاشرت کے سلسلے میں ہم عام انسانی تاریخ پر اک نگاہ ڈالنے پر مجبور ہوئے ہیں گویا ہم نے تاریخ کا مذہبی عینک لگا کر مطالعہ کیا ہے اور مذہب کا تاریخی عینک سے مشاہدہ کیا ہے۔ ہم نے دونوں کو خلط ملط نہیں کیا وہ خود بخود خلط ملط ہیں ایک کے دیکھنے کے لئے دوسرے کا نظارہ کرنا لازم ہے۔

غرض دنیا کی سیاسی تاریخ انسان کی مذہبی تاریخ سے اس قدر وابستہ ہے کہ ایک کا ذکر کرتے کرتے ہم بے جانے بُوجھے دوسرے کی بحث میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ ہم دیکھ چُکے ہیں کہ مختلف مذاہب کب اور کیونکر پیدا ہُوئے اور انہوں نے یا اُنکے پیروؤں نے دُنیا کی سیاسیات میں کیا حصّہ لیا؟ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ دُنیا کے موجودہ مذاہب کونسے ہیں اور انسانیت کے لئے اُنکا پیغام کیا ہے؟ وہ کیا تھے اور کیا ہو گئے۔ اب وہ کیا ہو رہے ہیں اور کیا کچھ ہو جانا چاہتے ہیں؟ اس سے ہمیں اندازہ ہو سکیگا کہ دنیا کی مذہبی حالت کیا ہے اور اس کا مذہبی و معاشرتی مستقبل غالباً کیا ہوگا؟

موجودہ مذاہب میں **ہندومت** ۔ دُنیا کا قدیم ترین مذہب ہے۔ ہندومت کے بارے میں اکثر کہا جاتا ہے کہ وہ کوئی مذہب نہیں محض ایک طرز معاشرت ہے۔ اگر یہ صحیح ہے بھی تو ہم اس بیان کو زیادہ وقعت نہیں دے سکتے کیونکہ دنیا کے کم و بیش ساڑھے اکیس کروڑ نفوس اس وقت ہندو ہیں اور وہ ہندویت کو اپنا مذہب جانتے اور مانتے ہیں۔ وہ یہ نہیں کہتے کہ ہندویت ایک مذہب ہے لیکن وہ باصرار کہتے ہیں

کہ ہم ہندوستان کے رہنے والے ہیں۔ اور ہندویت ہمارا مذہب ہے۔ بلکہ اب تو شاید تاریخ میں پہلی دفعہ وہ غیر ہندوؤں کو ہندویت کے دائرے میں داخل ہونے کی نہ صرف اجازت بلکہ ترغیب وتحریص بھی دے رہے ہیں *

قدیم آریا جب وہ ہندوستان میں داخل ہوئے قوائے فطرت کے پرستار تھے۔ وہ آگ، سورج، آسمان، صبح وغیرہ کی پرستش کرتے تھے۔ یہ ان کے فطرتی دیوتا تھے۔ رگ وید میں آگ کے دیوتا کو اس طرح خطاب کیا ہے:۔

اے عظیم الشان اگنی! اگرچہ تیری فطرت ایک ہی ہے تیری صورتیں تین ہیں۔ آگ بن کر تو یہاں دہکتا ہے بجلی بن کر تو فضا میں چمکتا ہے۔ سنہری سورج بن کر تو آسمان پر شعلہ زن ہے + تو وہ رشتہ ہے۔ جس کا پھیلاؤ آسمان تک ہے۔ تو وہ پل ہے۔ جو اس وسیع غار پر محیط ہے۔ جو کہ زمین و آسمان کے درمیان واقع ہے۔ وہ پل جس پہ چلتے ہوئے نیک لوگ بالآخر بہشت میں داخل ہوں گے *

صبح کو یوں خطاب کیا ہے:۔

آ اے اوشا! اے دختر آسمان! جس کی درخشاں گاڑی کو سرخ رہوار دور دراز دنیاؤں سے کشاں کشاں لئے آتے ہیں۔ جو ہر دم بڑھتی ہوئی ہر دم زیادہ چمکتی آتی ہے!

مرور زمانہ کے ساتھ یہ سینکڑوں دیوتا ایک ہمہ گیر ہستی برہما میں جذب ہو جاتے ہیں۔ یہ آریاؤں کی وحدانیت کا زمانہ تھا۔ جس کے بعد یہ خدائے واحد تین خداؤں برہما، وشنو اور شو پر مشتمل ہو گیا۔ برہما پیدا کرنے والا وشنو زندہ رکھنے والا اور شو ہلاک کرنے والا قرار پایا۔ کسی نے ان تینوں کو ایک ہی خدا کے مظاہر سمجھا۔ کسی نے تینوں کو جدا جدا تصور کیا۔ یہاں تک کہ بعض لوگ ایک کی بعض دوسرے اور بعض تیسرے کی پوجا کرنے لگے۔ مندروں میں اُن کے جدا جدا بت بن گئے۔ اور ہر ایک نے اپنا اپنا محبوب خدا انتخاب کر لیا۔ برہما کی پرستش رفتہ رفتہ کم ہو گئی۔ اور ہندوؤں میں ان تین خداؤں میں سے زیادہ تر دو کی یعنی وشنو اور شو کی پوجا عام ہوئی۔ چنانچہ آج بھی ہندوستان میں زیادہ تر انہیں دو خداؤں کی عبادت ہوتی ہے + لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے۔ کہ صرف انہیں دو خداؤں کے بت مندروں میں موجود تھے یا ہیں بتدریج یہ خدا انسان بن کر زمین پر وارد ہوئے یعنی ان کی روح مجسم ہو کر دنیا میں جلوہ گر ہوئی۔ چنانچہ رام کرشن وغیرہ وشنو کے اوتار قرار پائے۔ اور ان کی زندگی کے بعد ساتھ ہی ان کی پوجا بھی ہونے لگی۔ آریاؤں نے ہند کے اصلی باشندوں کو مغلوب کر لیا تھا۔ مگر اب وہ اُن کی خدمت سے متمتع ہونے کی تمنائی تھے اور وہ بھی اس طرح کہ آریا ہمیشہ جسمانی اور روحانی طور پر ان لوگوں پر فائق رہیں معاشرت کے حلقے میں ذاتوں میں وہ نسلی امتیاز جس پر آریاؤں کو فخر تھا شدت کے ساتھ قائم رہا۔ برہمن، چھتری اور ویش کی خدمت کے لئے دراوڑیوں کو شودر بنا لیا گیا۔ اور مذہب کے دائرے میں ہندو دیوتاؤں کے ساتھ فطرت پرست شودروں کے مقامی کمزور دیوتاؤں کو بھی کم پایہ دے کر شامل کر لیا گیا۔

اس طرح ہندوستان میں لاکھوں کروڑوں دیوتا شامل ہوگئے۔ جو بالعموم اپنے پیرووں کی طرح آپس میں امن و مصالحت کے ساتھ رہنے سہنے لگے ۔ ہر قوم ہر قبیلہ اپنے اپنے دیوتا کی پرستش کرتا مندر میں گھر میں جنگل میں ان بے شمار خداؤں کی عبادت ہونے لگی اور ایک حیرت انگیز رواداری عمل میں آئی ۔ کسی کو کسی کے معبود سے عناد نہ تھا۔ ایک ہی مندر میں مختلف لوگ مختلف بتوں کی پرستش کرتے اور گھر میں انکی مورتیاں بنا کر اپنی روحانی تسکین کر لیتے ۔ چنانچہ آج تک ہندوؤں کی عبادت اسی طور پر چلی آتی ہے ۔ کہ کوئی ایک کوئی تین کوئی بیسیوں کوئی لاکھوں کروڑوں دیوتاؤں پر ایمان رکھتا ہے ۔ کوئی وحدانیت کا دلدادہ ہے ۔ کوئی تثلیث کا شیدائی ہے ۔ اور اکثر ہندو اب بھی بت پرست ہیں ۔

ہندوؤں کی اولین مقدس کتابیں انکے چار وید ہیں جن میں سب سے زیادہ قدیم سب سے زیادہ مشہور رگ وید ہے ۔ ان کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندو کیونکر فطرت پرستی سے کثرت پرستی اور کثرت پرستی سے وحدت پرستی کے درجے پر پہنچے اور کیونکر قربانیوں اور دعاؤں اور منتروں کے درست طور پر ادا کرنے کے لئے برہمنوں کا زور روز بروز بڑھتا گیا ۔ چنانچہ ان کی روحانی طاقت کا اندازہ "برہمنہ" کتابوں سے ہوتا ہے ۔ وحدت پرستی بگڑ کر پھر کثرت اور فطرت پرستی ہوگئی ۔ دیوتاؤں نے ایک دوسرے کی جگہ لی اور ان کی دیویاں بھی ظہور میں آئیں سنسکرت کا استعمال کم ہوگیا ۔ اور صرف برہمن مقدس کتابوں کے محافظ اور شارح بن بیٹھے ۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ سبھی ہندو جاہل بت پرست تھے ۔ "اپنشد وں" میں ہندی فلسفے کی وہ چھ شاخیں بار آور نظر آتی ہیں جن کی چمن آرائی آج بھی ہندوؤں کے لئے مایۂ ناز ہے ۔ **میمانسا** شاستر ویدوں کے تقدس کا محافظ ہے ۔ **ویدانت** کا مسئلہ ہے کہ سب کو خدا سے پیدا ہونا اور بالآخر خدا ہی میں جذب ہو جاتا ہے ۔ **سانکھیا** مادیت پرستی ہے ۔ جس کے مطابق علت اولی مادی ہے ۔ **یوگ** اک ایسی روح عظیم کا قائل ہے جس میں صفات موجود نہیں (اس کے پیرو نفس کشی پر زور دیتے ہیں) **نیایا** ہندوؤں کی منطق ہے اور **ویشیشک** کا عقیدہ ہے کہ کائنات اجزائے لاتجزی کا مجموعہ ہے ۔ اور ہر جزو اک جداگانہ حیثیت رکھتا ہے ۔

ان کے علاوہ رامائن اور مہابھارت میں ہندوؤں کے تمدن سیاست اور مذہب کے خاکے ہیں ۔ **رامائن** عام ہندو مت اور فلسفہ کے درمیان کی اک کڑی ہے ۔ جس میں رام کی کہانی بیان کی گئی ہے ۔ **مہابھارت** کورو پانڈو کی شہرہ آفاق جنگ کا رزم نامہ ہے ۔ اس میں وہ پاکیزہ کتاب **بھگوت گیتا** شامل ہے جو گویا ہندوؤں کی انجیل ہے ۔ اس میں کرشن اور ارجن کا اک زبردست مکالمہ ہے جس میں فلسفہ الوہیت کے راز (نغمۂ ربانی) پر روشنی ڈالی گئی ہے ۔ کرشن خدا ہے اور اپنے بندے ارجن سے کہتا ہے کہ میں ہی ہستی ہوں میں ہی ہوں ہر شئے کی اصل اور اس کا جوہر ساری کائنات کی تخلیق و ہلاکت کی علت میں ہوں ۔ مجھ سے بڑھ کر کوئی شئے نہیں میں ہی ہوں تمام خداؤں کا سرچشمہ ۔ میں ہوں خدائے عظیم دنیا کا جس کی ابتدا نہیں ۔ اپنے ایک جزو سے میں نے کائنات کو قائم کیا اور یونہی اسے برقرار رکھتا ہوں ۔ تمام چیزوں کی ہستی خدا میں ہے ۔ مادہ مایا ہے اک دھوکا اور فریب ۔ انسان کی

رُوح مختلف جسموں اور شکلوں میں سے ہو کر گذرتی ہے۔ اور اُسے جسم سے نجات صرف فکر و ریاضت سے ملتی ہے۔ اچھے بُرے سب کاموں کا منبع خدا ہے لیکن انسان کو چاہیئے کہ وہ اپنی نفسانی خواہشات کو دبائے رکھے اور اُدھر اپنے کام میں مصروف ہے۔ اِدھر فکر و ریاضت میں منہمک کیونکہ اگرچہ (بھگوت گیتا کے نزدیک) دُنیا کو جہاں تک ہو سکے ترک کرنا چاہیئے مگر عمل کے بغیر انسان کی زندگی محال ہے سوا اُسے ترک عمل سے نجات حاصل کرنے کی بے سود کوشش نہ کرنی چاہیئے + بھگوت گیتا میں کثرت پرستی کی تعلیم صریح طور پر موجود نہیں۔ گو اُس سے ظاہر ہے کہ انسان جس شے کی پرستش بھی کرے وہ حقیقت میں اُس شے میں خدا (کرشن) ہی کی پرستش کرتا ہے +

غرض وید ہندوؤں کی کتب مقدس ہیں اور باقی ماندہ کتابیں گویا ویدوں کی شرحیں اور ضمیمے ہیں سمرتی یعنی مقدس کتب کے علاوہ سمرتی یعنی رسم و رواج اور قانون و اصولِ معاشرت کے متعلق بعض مستند کتابیں ہیں جن سے ہندوؤں کی روزمرّہ کی زندگی منتظم ہے۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور و اہم منو کا دھرم شاستر ہے بدھمت کی تباہی کے لئے اور اس کے بعد شنکر آچاریہ (نویں صدی عیسوی) کی طرح کے بعض مصلح ہندوؤں میں پیدا ہوئے جنہوں نے ہندومت کو اپنی اصل سے بدل کر موجودہ لباس پہنایا + مذہبی تخیلات سے زیادہ ہندوؤں کے قدیم رسم و رواج ان کے لئے اک قومی جائے اتصال کا کام دیتے آئے ہیں + اگر پوچھا جائے کہ ہندومت کیا ہے تو ہم ذرا تامّل کے بعد یوں جواب دیں گے کہ ہندومت ایک معاشرتی نظام ہے جس کی بنیاد ویدوں پر قائم ہے اور اس کے کم و بیش ضروری اجزا حسب ذیل ہیں:۔ برہمنوں کا احترام ذات پات کی تفریق (اس وقت ہندوستان میں دو ہزار کے قریب بڑی ذاتیں اور بے شمار چھوٹی ذاتیں ہیں) کرم اور تناسخ کے مسائل گنگا اور گائے کا تقدس۔ اس کے علاوہ اکثر ہندو بُت پرست ہیں۔ تناسخ کے مسئلے کے قائل ہونے کے باعث اپنے بزرگوں کی ارواح کے لئے وہ قربانیاں چڑھاتے ہیں۔ اُن کا گھرانا مشترک ہوتا ہے اور عموماً جائداد بھی مشترک ہوتی ہے قبیلے کا قیام مرد کی ذات پر منحصر ہے لہذا لڑکے جننے کے لئے عورت کو بچپن ہی میں بیاہ دیا جاتا ہے بیوہ عورتوں کو پھر شادی کر سکنے کی تسکین سے عموماً محروم رکھا جاتا ہے +

لیکن تمام ہندو ان بندشوں میں گرفتار نہیں ہیں اور اگر ہیں تو آج کل وہ یقینی طور پر ان میں سے بعض اُلجھنوں سے رہائی پانے اور اپنی زندگی کو آزادی کا سبق دینے میں مصروف و منہمک نظر آتے ہیں + اُن کے ہاں علاوہ معاشرتی اصلاح کے مذہبی اصلاح کا دروازہ بھی کھُل گیا ہے اور وہ حال کے علوم و فنون اور فلسفہ و طبیعیات سے غایت درجہ متاثر ہو رہے ہیں +

اگرچہ اکثر مغربی اور مشرقی نکتہ بینوں کا خیال ہے کہ یہ اصلاحی تحریک فقط اک چھوٹی سی لہر ہے جو ہندومت کے عظیم الشان قدامت مآب سمندر میں بہت جلد گم ہو جائے گی لیکن ہمارے خیال میں زمانۂ حال کے عدیم النظیر انقلابات

ہندوستان کو پھر ساکن و منجمد ہونے سے بچالیں گے اور اس کی معاشرت و سیاست کے ساتھ اس کے مذہب کو بھی بتدریج تغیر کی حرارت سے گرمائے بغیر نہ رہیں گے +

ہندوؤں کا بیشتر حصہ ہنوز فرقہ سناتن دھرم سے متعلق ہے۔ یہ لوگ زیادہ تر بت پرست ہیں۔ اگرچہ ان میں سے بہت سے تعلیم یافتہ شخص اپنے بتوں میں فقط وشنو یا شو کی جھلک دیکھتے ہیں + وشنو کے پوجنے والے اس کے اوتار کرشن، رام وغیرہ کے پرستار ہیں + شو کے پجاری اس کی بیویوں کالی ماتا، درگا وغیرہ کے فداکار ہیں۔ کلکتہ میں کالی ماتا کے مندر میں اس خونخوار دیوی کے سامنے جانور بھینٹ چڑھائے جاتے ہیں۔ اور برہمنوں کے ذریعے سے قربانیاں کی جاتی ہیں طبقۂ اسفل کا اک بڑا حصہ جن کی آبادی ایک کروڑ کے قریب ہے ابھی تک پرانی فطرت پرستی میں مبتلا ہے۔ دیہاتوں میں ان کے مقامی دیوتا استوار ہیں وہ مٹی، پتھر اور ہوا اور پانی وغیرہ کو پوجتے ہیں۔ اور ابھی تک بے معنی ٹونوں ٹوٹکوں میں الجھے ہوئے ہیں + لیکن ان بت پرستوں کے ساتھ ہندوؤں کے ہاں ایسے فرقے بھی نمودار ہوئے ہیں جنہوں نے اکثر ہندو توہمات کو چھوڑ کر قدیم سادہ آریائی مذہب کی طرف رجوع کرنے کا تہیہ کر لیا ہے + اس کی اک بڑی وجہ اسلام اور عیسائیت کا خاموش اثر اور ان کے پرجوش پیرووں میں اشاعت مذہب کا خیال ہے۔ آریہ سماج خالص وحدانیت کے قائل ہیں۔ وہ ویدوں کے ترقی یافتہ مذہبی خیالات سے متاثر ہیں۔ وہ بتوں کو نہیں پوجتے تیرتھوں کے جاتری نہیں وہ مقدس دریاؤں میں غسل نہیں کرتے وہ چھوت چھات میں گرفتار نہیں ہیں اگرچہ دوسرے ہندوؤں کی طرح وہ بھی ذات پات اور تناسخ کے قائل ہیں + عجیب ماجرا ہے کہ یہ لوگ جو مذہبی عقائد میں مسلمانوں سے قریب تر ہیں۔ معاشرتی و سیاسی تعلقات میں اُن سے بہت دور جا پڑے ہیں۔ قدیم قومی جوش سے سرشار اور ہندوؤں کے ترقی و اصلاح کے نام لیوا ہیں + اور غیر ہندوؤں کو ہندو دھرم میں شامل کرنے کی مذہبی و سیاسی تحریک کے بھی یہی لوگ بانی مبانی ہیں ان کی تعداد پونے پانچ لاکھ کے قریب ہے + ایک اور فرقہ برہمو سماج کا ہے جو وحدت پرست ہونے کے علاوہ نہایت صلح کل اور فراخ دل ہے ان لوگوں کی تعداد صرف چھ ہزار کے قریب ہے +

غرض ہندوؤں میں اصلاح کے لئے اک جوش اور ترقی کے لئے اک عام بیکلی ہے جن سے ان کی معاشرت ان کی سیاست اور ان کے مذہب میں اک انقلاب پیدا ہو رہا ہے۔ دنیا کے مستقبل کے لئے اس انقلاب کے کیا معنی ہیں مختلف شخص اس کی مختلف شرح کر رہے ہیں +

جینی جن کی تعداد بارہ لاکھ کے قریب ہے ویدوں کے آسمانی کتب ہونے کے قائل نہیں لیکن ذاتوں کا نظام اُن کے ہاں بھی موجود ہے اور وہ بعض چھوٹے ہندو دیوتاؤں کے ماننے والے ہیں۔ وہ جانداروں یہاں تک کہ ان دیکھے ہوائی

جراثیم کی بے جانے بوجھے جان لینا بھی اک گناہ سمجھتے ہیں۔ نروان کا عقیدہ اہلِ بُدھ کی طرح اُن کے ایمان کا اک اہم جزو ہے۔ جین مت کے بانی مہادیرا کا زمانہ بُدھ سے پہلے کا ہے۔ اگر ہم ہندو مہاسبھا کی اس منظور شدہ تجویز کو مان لیں۔ کہ جو لوگ بھی ہندی الاصل مذاہب کے پیرو ہیں۔ وہ سب ہندو ہیں تو جینی بھی ہندو قرار پائیں گے لیکن مشکل یہ ہے کہ اس خیال سے کچھ سیاسی تنازعات کی بُو آتی ہے۔

سکھ مت کو اگرچہ ایک معنی میں ہندو مت کی ایک شاخ ہی سمجھنا چاہئے لیکن آریہ سماج اور برہمو سماج وغیرہ سے اُس کی حیثیت اس لئے بھی مختلف ہے۔ کہ اس کے بانی گرو بابا نانک کا نصب العین فی الحقیقت ایک جُدا مذہب کی بُنیاد ڈالنا تھا۔ نانک ہندوستان میں اسلامی حکومت کے عہد کے وسط میں آیا اور اس کا مقصد ہندو مُسلمانوں دونوں کے درمیان اک ثالث بالخیر بن کر انہیں مذہبی اصلاح و امتزاج کا سبق دینا تھا۔ وہ ۱۴۶۹ء میں پیدا ہوا اُس سے پہلے رامانند اور کبیر ملک میں وحدت کی آواز بلند کر چکے تھے۔ لیکن نانک نے اس پیغام کو اور زیادہ صاف کر دیا۔ ادھر اسلام کی وحدانیت، حقیقت کے شیدائیوں کے دل میں گھر کر رہی تھی۔ اُدھر مسلمانوں کی فتوحات نے ہندوؤں کا جی گھٹا اور ان کے حوصلے پست کر دئے تھے۔ نانک نے اپنے سیدھے سادے پیغام سے اس افسوس ناک حالت کو سدھارنا چاہا۔ اُس کا پیغام فقط خدائے واحد کی سادہ عبادت اور نوعِ انسان کی خدمت و محبت تھی۔ نانک کا قول ہے کہ ہزاروں محمدؐ لاکھوں رام اور کروڑوں برہما اور وشنو پروردگار کے تخت کے سامنے ایستادہ ہوتے ہیں اور مر جاتے ہیں کہ صرف خدا ہی غیر فانی ہے۔ وہی اچھا ہندو ہے جو عادل ہو۔ اور وہی اچھا مُسلمان ہے جس کی زندگی پاکیزہ ہو۔ نانک کو معجزات کا دعوےٰ نہ تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ "ایک رُوحانی رہنما کے پاس سوائے اس کے عقائد کی پاکیزگی کے اور کوئی ثبوت نہیں"۔ اُس کے نزدیک نہ کوئی ہندو تھا نہ مُسلمان، وہ دونوں کو ایک نظر سے دیکھتا تھا۔ خدا کی وحدت اور ذات پات کی بے بضاعتی پر اُس نے بارہا اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ سکھوں کی مقدس کتاب گرنتھ صاحب کا آغاز یوں ہوتا ہے۔ "خدا صرف ایک ہی ہے جس کا نام سچا خالق ہے"۔ اس مذہب میں نہ کوئی پروہت ہیں نہ قربانیاں نہ نذریں۔ نہ ترکِ دُنیا کی تعلیم ہے نہ حرص وطمع کی تربیت۔ سکھوں کے دس گرو ہو گزرے ہیں جن میں نانک پہلا اور سب سے بڑا گرو تھا۔ پانچویں گرو ارجن نے ان کے لئے کچھ قوانین مرتب کئے۔ اور نانک کے اقوال کو "آدی گرنتھ" میں جمع کیا۔ اور اس وقت سے سکھوں کا مذہب گویا ہندو اور مُسلمان دونوں کے مسلک سے الگ ہو گیا۔ بعض مُسلمان بادشاہوں نے سکھوں کے ساتھ ناروا داری برتی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ایک جداگانہ جنگجو فرقے میں منتظم ہو گئے۔ ان سب سے زبردست شخصیت اُن کے آخری گورو گوبند سنگھ کی تھی جو تقریباً عمر بھر مغلیہ فوجوں سے لڑتا رہا۔ اور جس نے اپنے سیاسی اور معاشرتی نظم و نسق سے

سکھوں کو فی الحقیقت ایک قوم بنا دیا + اُس نے ذاتوں کی تفریق مٹا دی اور ایک مذہبی جماعت "اکالی" (غیر فانی) قائم کی جس کا بڑا مقصد اپنے مذہب کی نشر و اشاعت تھی + وہ ایک بہادر جنگجو اور ایک عاقبت اندیش مقنن تھا۔ اُس نے سکھوں کی معاشرت میں ایک عظیم الشان تبدیلی کر دی۔ بال رکھنا اور بڑھانا نیا لباس پہننا، کرپان زیب تن کرنا، سکھوں نے اُسی سے سیکھا + دسویں بادشاہ کی گرنتھ" اُس کی تصنیف اور یادگار ہے۔ ۱۷۰۸ء میں جب اُس کی وفات کا وقت قریب آیا تو اُس نے سکھوں کو ہدایت کی کہ میرے بعد تمہارے گرو گرنتھ صاحب ہونگے۔ سکھوں نے اِس ہدایت پر اس سختی سے عمل کیا ہے کہ اُنکے معبد میں اگرچہ کوئی بُت نظر نہیں آتا۔ مگر وہ داخل ہو کر سب سے پہلے گرنتھ صاحب کے آگے اپنا سر جھکاتے ہیں + اُس کے آخری الفاظ یہ تھے "میں مِلّت کو خدا کے سپرد کرتا ہوں جسے کبھی فنا نہیں" + حکمرانوں کی سختیوں سے بھاگ کر سکھوں نے پہاڑوں میں پناہ لی۔ یہاں تک کہ مغلیہ سلطنت کمزور ہو گئی۔ نادر شاہ کے حملے کے بعد وہ اپنے کوہستانی مرکز سے پھر اُتر آئے اور انہوں نے پنجاب میں بہت سی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کر لیں۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ اُن کا سب سے مشہور حکمران گزرا ہے +

انگریزوں کے عہد میں وہ مدت تک اپنی فوجی وفاداری کے لئے مشہور رہے ہیں۔ اب اُن میں تعلیم کا چرچا ہو رہا ہے اور گردواروں کی اصلاح اور جداگانہ نیابت کے سلسلے میں وہ ہندوؤں سے مذہبی اور سیاسی طور پر الگ ہونے پر آمادہ نظر آتے ہیں۔ ورنہ اس سے پہلے وہ محض ہندوؤں کا ایک فرقہ بن چکے تھے۔ نہیں معلوم موجودہ جدائی عارضی ہوگی یا مستقل مگر اغلب یہ ہے کہ وہ کسی وقت میں ہندوؤں سے اُسی طرح جُدا اور ممتاز نہ ہوں گے جس طرح مسلمان یا عیسائی یا پارسی + اُن کی آبادی بتیس ۳۲ لاکھ ہے اور وہ زیادہ تر پنجاب میں محدود ہیں +

بُدھ مت جو شاید دُنیا کا سب سے کثیر الاشاعت مذہب ہے اور جو سوائے برما اور سیلون کے صدیوں سے ہندوستان میں ناپید ہو چکا ہے اُس نے پچیس صدیاں ہوئیں اِسی ملک ہندوستان ہی میں جنم لیا + ہندو معاشرت ذاتوں کی اُلجھنوں میں گرفتار تھی۔ برہمنوں نے عوام الناس کی ارواح کو اپنی دماغی و روحانی برتری سے مقید کر رکھا تھا خداؤں اور دیوتاؤں کا نظام نہایت پیچیدہ ہو چکا تھا مذہبی و علمی تصنیفات میں بجائے اعلیٰ طبعزاد خیالات کے صرف تفسیروں اور نقلوں کا دَور دورہ تھا غرض زندگی کی فضا میں اِک حوصلہ شکن اور حیات کش تاریکی چھائی ہوئی تھی - کہ شمالی ہندوستان کے ایک شاہی گھرانے میں گوتم بُدھ پیدا ہوا + اِنسانی جماعتوں کی کشمکش اور ظلم و ستم کو دیکھ کر وہ بہت متاثر ہُوا۔ اور انسانی دُکھ درد کے نظارے سے اس کا دل پاش پاش ہو گیا۔ عوام الناس کی رُوحانی گمراہی اور جہالت کو دُور کرنے کے لئے اُس نے مشاہدات اور تجربات کا سلسلہ شروع کیا جس سے اس کا تاریک دل آخر صداقت

کی روشنی سے جگمگا اُٹھا۔ ترکِ دُنیا اور نفس کُشی کے سینکڑوں مرحلوں کے بعد اُس نے دریافت کیا کہ زندگی دُکھ ہے۔ دُکھ کا سبب زیست کی ہوس ہے۔ دُکھ زائل کرنے کے لئے زیست کی ہوسوں کو نیست و نابود کرنا چاہئے۔ اور زندگی کو اُس سیدھے رستے پر گام زن ہونا چاہئے جسے بودھی لوگ ہشت گانہ مسلکِ گرامی کہتے ہیں یعنی صحیح رائے صحیح تمنّا، صحیح کلام صحیح اعمال صحیح معاش صحیح سعی صحیح فکر اور صحیح توجہ اس اصول پر عمل کرنے سے انسان پیدائشوں کے اُس چکّر سے نجات پا جاتا ہے جس میں ہندوؤں کے نزدیک کہہ ومہ پابہ زنجیر ہے۔ پھر اُسے نروان یعنی نجات حاصل ہو جاتی ہے اور وہ نیست و نابود ہو کر کائنات کی عظیم ترین مسرّت حاصل کر لیتا ہے + بُدھ نے عوام کے لئے الگ اور بھکوؤں یعنی راہبوں کے لئے اک الگ جادۂ زندگی دکھا دیا۔ لیکن سب کو یہ بتا دیا۔ کہ زندگی میں رُوحانی ترقّی محض انسان کی اپنی کوشش سے ہوتی ہے نہ کہ کسی دُوسرے کی شفاعت یا اعانت سے اور یہ ترقی ایسی ہے جسے کوئی دوسرا روک نہیں سکتا۔ انسان جیسا کرے گا ویسا بھرے گا جیسا بنے گا ویسا ہو جائے گا + اُس نے خودی اور خدائی کے مسائل کی گتھی کو نہ سلجھایا بلکہ اس کے سلجھانے سے صاف انکار کیا گویا جتا دیا کہ میں نہیں جانتا نہ کوئی جانتا ہے کہ کائنات کی علّتِ اُولیٰ کیا ہے۔ پھر اس سر مغزن سے فائدہ۔ پھر اس غیر منتنا ہی بحث سے حاصل؟ بس انسان کو چاہئے کہ اچھے کام کرے نتیجہ یقیناً اچھا ہوگا + بُدھ نے ہندوؤں کے فلسفے کو سادگی کا لباس پہنایا اور اُن کے اخلاق کو جلا دی۔ اس نے اصولِ عدل و انصاف کو اک منطقی نتیجے پر پہنچایا۔ اُس نے اُن پاؤں تلے روندی ہوئی انسانی جماعتوں کی طرف سے آوازِ احتجاج بلند کی جن کی حالت تمدنِ ہند کے لئے باعثِ صد ننگ و عار تھی۔

وہ راست باز تھا۔ صاف گو تھا، دلیر تھا اور عقل پسند تھا + حیات کے آغاز و تبدّل کے متعلق اُس کا خیال تھا کہ عالم پیدا نہیں کیا گیا نہ ہمیشہ سے اس طرح تھا۔ بلکہ بتدریج موجودہ صورت پر پہنچا ہے اور موجودہ مخلوق بے شمار افعالِ سابقہ کا نتیجہ ہیں + ہر شے کی زندگی زندہ رہنے کی اک حالت ہے جو کہیں کم ہے کہیں زیادہ۔ ہر شخص یا چیز اک مجموعۂ مرکب ہے اس مجموعے اور اس ترکیب کے منتشر اور منفرد ہونے کا نام موت یا فنا ہے + شروع شروع میں بُدھ کے پیغام پر بہت کم لوگوں نے کان دھرا اور جن چند شخصوں نے اُسے سُنا انہوں نے اس پر بہت کم توجّہ کی لیکن بُدھ کے دل میں وہ شمعِ حقیقت فروزاں ہو چکی تھی جس کی روشنی ایک روز بہت دور دور پھیلنے والی تھی +

اُس نے ریاضت کی روزے رکھے اور اپنے مذہب کا پرچار کیا۔ کچھ عرصے میں اُس کے ساٹھ پیرو ہو گئے۔ جن کو ہدایات دے کر اُس نے مختلف سمتوں میں بھیج دیا۔ کہ "جاؤ اور پاک اور اعلےٰ اور کامل زندگی بسر کرنا سکھاؤ" + بدھ کی عقل و دانش زبردست تھی لیکن اُس کی پاکیزگی اور نیک خصالی اُس سے بھی بڑھ کر تھی۔ اُس کا قول تھا کہ "علم بڑی

چیز ہے لیکن نیکی اُس سے بڑی ہے"۔ بُدھ مت بُدھ کی زندگی ہی میں ہندوستان میں اور اس کے باہر بھی پھیل گیا
اس کی وفات کے بعد شاہنشاہ اشوک نے ۲۷۲ق م میں مشرق و مغرب کے دُور دراز ملکوں میں بودھی مبلغ بھیجے۔
اور بُدھ مت کے اصولوں کی تدوین کی غرض سے اُس نے مجلسیں منعقد کیں اور بودھی متقدس کتب کو "تری پتا کا"
(تین ٹوکریوں) میں مرتب کیا۔ چٹانوں اور مناروں پر اُس کے مشہور و پاکیزہ قوانین کے کتبے آج تک ہندوستان
میں بُدھ مت کی یاد تازہ کرتے ہیں:۔ اشوک کہتا ہے کہ

"ایک معمولی آدمی بھی اگر وہ خوب کوشش کرے تو آسمانی نعمتیں حاصل کرسکتا ہے"۔ پھر قانونِ پرہیزگاری کو اس
طرح بیان کرتا ہے کہ "ماں باپ کا کہا مانو۔ عزیزوں دوستوں اور برہمنوں سادھوؤں سے فیاضانہ سلوک کرو۔
جانداروں کی جان مارنے سے باز رہو۔ کچھ خرچ کرو اور کچھ جمع کرتے رہو۔ ایک اور چٹان پر لکھتا ہے کہ

"سچی فتح صرف پرہیزگاری کی فتح ہے کہ اُس سے دُنیا میں بھی فائدہ ہے اور عقبیٰ میں بھی"۔ پھر کہتا ہے کہ

"صرف جدوجہد ہی میں خوشی حاصل کرو کیونکہ اس خوشی سے دُنیا و عقبیٰ دونوں میں بہتری کی صورت ہے"۔

بُدھ مت نے ہندوستان میں اک ہمہ گیر دلعزیزی حاصل کرلی اور جہاں اُس نے ہندومت کو نہ پچھاڑا۔ وہاں کم از کم
برہمنوں کا زور کم ہوگیا اور بُدھ کے خیالات نے عوام و خواص سب پر اپنا اثر کیا۔ نالندہ یونیورسٹی خاص بودھی علم جوئی اور
فن آفرینی کا اک نمونہ تھی۔ اس میں آٹھ بڑے اور تین سو چھوٹے کمرے تھے۔ یہاں علاوہ دیگر علوم و فنون کے موسیقی کا
درس بھی دیا جاتا تھا۔ اس میں تین ہزار کے قریب طالب علم تعلیم پاتے تھے اور دو سو گاؤں کی آمدنی اس کے مصارف کے
لئے وقف تھی۔

لیکن جمہوریت پسند بُدھ مت دیر تک اپنی پاکیزہ حالت میں قائم نہ رہا۔ اس لئے حکومت پسند برہمنیت بھی دیر تک
دبی نہ رہی۔ بیکار، کاہل بھکوؤں کی تعداد بڑھ گئی۔ اشاعتِ مذہب کا کام سُست پڑگیا۔ اور تعلیم بھی برائے نام رہ گئی۔
ایک بدھی ہندو لکھتا ہے کہ "برہمنی مذہب نے پھر عود کیا پھر چھوت چھات ذاتوں کی فضیلت رسمیات پوجا پاٹ
عقیدہ پرستی کا دَور ہوا"۔ سونے پر سہاگا یہ کہ خود ہندوؤں نے بُدھ کو وشنو کا اوتار مان لیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ
ہندومت میں انجذاب و مصالحت کی کیسی کیسی عجیب و غریب طاقتیں موجود ہیں۔ بُدھ مت ہندوستان سے اٹھا تھا۔
ایک ہزار سال کے بعد سیلون اور برما کے سوا اُس کا اپنے جنم بھوم میں سوائے دُور افتادہ کتبوں کے کہیں نشان تک نہ رہا۔

بُدھ کے بعد بُدھ مت نے عجیب عجیب شکلیں اختیار کیں۔ بودھیوں کے دو بڑے فرقے ہوگئے مہایانہ جس میں
ویدانت کا رنگ چڑھا اور جو آتما کی شخصیت کو کہ بار بار جنم لیتی ہے مستقل مانتا ہے اور دوسرا ہنایانہ جو کسی ایسی ہستی کو

تسلیم نہیں کرتا + مہایانہ سب کی نروان چاہتا ہے اس کا مولد شمالی ہند تھا۔ ہنایانہ صرف اپنی نجات چاہتا ہے اس کا مسکن جنوبی ہند بنا +

بُدھ مت ہندوستان سے نکل کر تبت، چین، تاتار، جاپان بلکہ بعض بدھ پسندوں کے خیال کے مطابق اِدھر ایران، عراق، مصر، ایلی سینیا، بلقان اور اُدھر امریکہ تک میں پھیل گیا + چنانچہ وسط ایشیا اور دیگر دُور دراز مقامات سے بودھی کتابیں اور مجسمے اور بودھی فنِ مصوری اور سنگ تراشی کے نمونے دستیاب ہوئے ہیں + بُدھ مت چین میں پہلی صدی عیسوی میں پہنچا اور وہاں سے کوریا سے ہوتا ہوا ۵۵۲ء میں جاپان پہنچ گیا +

لیکن بُدھ مت جوں جوں دُنیا میں پھیلتا رہا اور جو اس وقت بھی انسانی آبادی کے ایک بڑے حصے پر حاوی ہے وہ بُدھ مت نہ تھا اور نہ ہے جس کا بُدھ نے پرچار کیا تھا + ہندوستان ہی میں اس پر جلد برہمنی رنگ چڑھ گیا تبت میں پہنچ کر اس میں بھوت پریت کی پرستش مل گئی + ہندوؤں کی طرح بودھیوں کے ہاں بھی مختلف چیزوں کی پرستش ہونے لگی۔ بدھ کے ہزار سال بعد پشاور میں ہم اُس کے پیروؤں کو جادو ٹونے میں گرفتار پاتے ہیں +

اس وقت علاوہ برما اور سیلون کے بودھ مت چین اور جاپان میں رائج ہے + چین جو اب تاریخ میں پہلی مرتبہ باہر کی دنیا سے کچھ رابطہ پیدا کر رہا ہے ہمیشہ سے اپنی سیاسی اور معاشرتی زندگی کی طرح اپنی اخلاقی اور مذہبی زندگی میں بھی دیگر ممالک اور دیگر مذاہب سے الگ تھلگ رہتا اگر پہلے بدھ مت اور چھ صدیوں کے بعد کسی قدر اسلام کا اثر اُس کے باشندوں میں سرایت نہ کرتا + پھر بھی گو بدھ مت ایک ہندی الاصل مذہب ہے لیکن چینیوں اور جاپانیوں کے مذہبی جذبات ہندوؤں سے مختلف واقع ہوئے ہیں جسکی ایک وجہ یہ ہے کہ بُدھ کے علاوہ دیگر مذہبی و اخلاقی مصلحین کی تعلیم و تلقین بھی ان مشرق اقصے کے ممالک میں صدیوں سے رائج رہی ہے + چین کی مذہبی و اخلاقی زندگی پر تین بڑے مصلحین کا اثر ہوا ہے کنفیوشس۔ لاؤتسی اور بدھ + یہ اتفاق امر نہایت دلچسپ اور قابل غور ہے کہ یہ تینوں عظیم الشان شخصیتیں ایک ہی وقت میں نمودار ہوئیں۔ جب بدھ ہندوستان میں اپنے اخلاقی فلسفے کی اشاعت میں مصروف تھا عین اُسی وقت میں کنفیوشس اور لاؤتسی چین میں تہذیبِ اخلاق و تزکیۂ نفس کا کام سرانجام دے رہے تھے +

کنفیوشس نے کسی نئے مذہب کی بنا نہیں ڈالی تاہم کنفیوشیت ایک اخلاقی اور نیم مذہبی نظام ہے + بدھ کی طرح کنفیوشس نے بھی حقیقت اور ربانیت کے مسائل پر غور کرنے سے صریح طور پر انکار کیا اگرچہ اس نے ذاتِ خدا کا کبھی مضحکہ نہیں اُڑایا۔ اس نے کہا کہ آدمی نیک پیدا ہوتا ہے اور بُرائی کے اثر سے بُرا بن جاتا ہے + ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ بادشاہِ وقت کا حکم بجالائے اپنے والدین کا کہا مانے اور اپنے ہمسائے سے اچھا سلوک کرے نیکی نیکی کی خاطر کرے نہ کسی اور غرض کے لئے لیکن ساتھ ہی نیکی کے بدلے نیکی کرے اور بُرائی کے بدلے انصاف + اُس کا

قول ہے کہ "انسان اپنی نیکی کو بڑھاتا ہے نیکی انسان کو نہیں بڑھاتی۔ انسان کا فرض ہے کہ وہ اپنی خود داری اور دوسرے کے ساتھ وفاداری کو قائم رکھے + کنفیوشنیت اگرچہ ایک مذہب کا درجہ نہیں رکھتی لیکن اس کا اخلاق زبردست اور سودمند ہے اور سچ یہ ہے کہ کنفیوشس ڈھائی ہزار برس سے اہلِ چین کا حقیقی بادشاہ بنا رہا ہے اور زیادہ تر اسی کی تعلیم نے چینیوں کو دیانت داری، محنت اور استقلال کا رستہ دکھایا ہے + کنفیوشس چین کے ایک صوبے کا گورنر تھا اور اس لئے وہ ایک عملی شخص تھا۔ اُس نے اپنے عہدِ حکومت میں اپنی رعایا کے چلن کو سدھارا اور اس کے ذریعے سے سارے مُلک کو راہِ راست پر لگا دیا + اُس کے اقوال کے کئی مجموعے اُس کی وفات کے بعد مرتب کئے گئے اور ہزارہا سال تک اسی کے خیالات چین اور جاپان والوں کے رگ و پے میں خونِ زندگی بن کر دوڑے ہیں + اُس کے پیرو منشی اس نے جس نے ۲۸۹ ق م میں وفات پائی اور جس کا فلسفہ انسانی فطرت کی جبلّی نیکی پر مبنی تھا اُس کے خیالات کی تائید کی اور اُن کی نشر و اشاعت میں خاصہ حصّہ لیا +

لاؤتسی کا مسلک جسے ٹاویت پکارا جاتا ہے یہ تھا کہ انسان کو زندگی کا سیدھا رستہ تلاش کرنا چاہئے + وہ کسی حکومتِ وقت کا مؤیّد نہ تھا اور چاہتا تھا کہ علم و عمل میں زیادہ جد و جہد سے کام نہ لیا جائے بلکہ لوگوں کو اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے کہ اس طرح وہ خود بخود سیدھے رستے پر لگ جائیں گے۔ خدا کے متعلق اُس نے زیادہ بحث نہیں کی۔ صرف یہی کہا ہے کہ کائنات کی ایک علّتِ اولی ہے اور ہم جسمانی و قلبی پاکیزگی کے ذریعے سے اُس کے زیادہ قریب پہنچ سکتے ہیں + وہ اطمینانِ قلب پر بہت زور دیتا ہے اور کہتا ہے کہ "کچھ نہ کرتے رہنے کے کام میں مصروف رہو" + انسانی سلوک و تعلقات کے متعلق اُس کی ہدایت ہے کہ "بُرائی کے بدلے نیکی اور نیکی کے بدلے میں زیادہ نیکی کرو" + بُدھ مت کے آنے کے بعد ٹاویت کچھ پھیکی پڑ گئی۔ سو ٹاویوں نے کئی امور میں بودھیوں کے رسم و رواج کو اختیار کر لیا تاکہ وہ اپنے مذہب کو محفوظ رکھ سکیں۔ اُنہوں نے بھی مندر بنائے اور اپنے مذہبی پیشواؤں کی پیروی شروع کی + ٹاویت میں بعض توہمات نے جگہ پالی چنانچہ تاحال کیمیائیت اور اکسیر اس مذہب کا جزو ہیں اور بعض ٹاوی لوگ گہری سانسوں اور ورزشوں اور دیگر ذرائع سے اب بھی طبعی عمر تک جینے کی کوشش میں مصروف رہتے ہیں + چوآنگ ٹسو تیسری صدی کا ایک ٹاوی فلاسفر کہتا ہے "نیک آدمی کون ہے؟ اگلے زمانے کے نیک آدمی ہر بات میں کوئی نتیجہ حاصل کرنے کے لئے حساب کتاب نہ کرتے رہتے تھے۔ وہ تجویزیں نہ کرتے تھے۔ لہذا جب وہ ناکام رہتے تو انہیں افسوس نہ ہوتا اور کامیاب ہوتے تو آپے سے باہر نہ ہو جاتے اور اسی لئے وہ دشوار گذار مرحلوں کو بسہولت طے کر لیتے تھے پانی میں بغیر تر ہونے کے اور آگ میں بغیر گرمی محسوس کرنے کے وہ بآسانی چل پھر سکتے تھے۔ اگلے زمانے کے نیک آدمی سوتے تھے تو انہیں رات بھر خواب ستاتے

تھے اور جاگتے تھے تو اُنہیں افکار دامنگیر نہ رہتے تھے + وہ بے تکلف کھاتے پیتے تھے اور خوب گہری سانسیں لیتے تھے۔ کیونکہ نیک اور پاکیزہ آدمی اپنی ایڑیوں سے سانس کھینچتے ہیں اور صرف جاہل اور گنوار ہی اپنے گلے سے سانس لیتے ہیں" +

ٹاویت اور بُدھ مت عرصے تک چینی شاہنشاہ کے دربار میں ایک دوسرے کے مدِّ مقابل رہے + ۵۴۷ء میں کنفوشییت سرکاری مذہب بن گیا اور حکومت کی نظروں میں ٹاویت اور بُدھ مت دونوں پر اُسے ترجیح دی گئی + یہ مروج مذہب اِن مقدّس کتابوں میں بیان کیا گیا ہے جن کا نام "شو اور شی بادشاہ" ہے اور جن کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ کنفیوشس نے اُنہیں زیادہ قدیم مسودات سے مرتّب کیا۔ اس مذہب کے مطابق آسمان اور زمین زندہ وجود ہیں اور مختلف مدارج کی ارواح باہم شریک ہو کر کائنات کا کام انجام دیتی ہیں جن میں مُردوں کی رُوحیں بھی شامل ہیں +

بدھ مت چین میں ۶۵ء میں ختن کی طرف سے داخل ہوا۔ اور تھوڑے ہی عرصے میں وہ چین میں چاروں طرف پھیل گیا + اس وقت چین میں کنفوشییت ٹاویت اور بُدھ مت ان تینوں مذہبوں کی کھچڑی پک رہی ہے کہیں وہ ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں کہیں پہلو بہ پہلو موجود ہیں اور ان کے امتزاج و اختلاط سے چین میں بعض ایسی مثالیں مذہبی اختلاط کی پیدا ہو گئی ہیں۔ جن کا وجود دنیا کے کسی اور ملک میں نہیں یہاں تک کہ ایک ہی شخص بعض اوقات اِن تینوں مذہبوں کا پیرو ہوتا ہے اور وہ سب کی رسوم ادا کرنے میں تامل نہیں کرتا + لطف یہ ہے کہ پہلے تصادم کے بعد یہ مذاہب صدیوں بخوشی ایک دوسرے سے خلط ملط ہوتے رہے + چھٹی صدی عیسوی کا واقعہ ہے کہ چینی شاہنشاہ وُوٹی نے مشہور بودھی عالم فوہی سے پوچھا کہ کیا تم بودھی ہو؟ تو فوہی نے اپنی ٹاوی ٹوپی کی طرف اشارہ کیا۔ اس پر دوبارہ شاہنشاہ نے سوال کیا تو کیا تم ٹاوی ہو؟ اس نے اپنی کنفوشی جوتی دکھا دی۔ پھر سوال ہوا کہ تم کنفوشی ہو؟ تو دیکھا کہ وہ ایک بودھی دوپٹہ زیب تن کئے ہوئے ہے + اب بھی بعض لوگوں کی کچھ یہی حالت ہے۔ گذشتہ صدی میں مغربی سیاح آبے ٹہک نے دیکھا کہ چین میں جب اجنبی ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو اخلاق کا تقاضا ہوتا ہے کہ ایک دوسرے سے پوچھے کہ تم کس شاندار مذہب کے پیرو ہو؟ ایک ممکن ہے بودھی ہو دوسرا ٹاوی اور تیسرا کنفوشی۔ سوال جواب کرکے وہ ایک دوسرے کے مذہب کی تعریف میں رطب اللسان ہو جاتے ہیں اور آخر میں ایک دوسرے سے کہتے ہیں "مذہب بہت ہیں ایمان ایک ہے۔ ہم سب بھائی بھائی ہیں"۔ لوشن یانگ ایک مشہور بودھی نے صدیوں پہلے کہا کہ مختلف فرقوں کی تعلیم کچھ مختلف نہیں فراخ دل انسان ان سب میں ایک ہی مشترک صداقت کی جھلک دیکھتا ہے تنگ نظر آدمی کی نگاہ صرف انکے اختلافات پر پڑتی ہے +

غرض چین کے تین بڑے مذاہب بالکل مخلوط ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بھی اپنی اصل پر قائم نہیں رہا۔ سب مذاہب میں بھوت پریت کی پرستش اور جادو اور یا لنسہ اور رمال کے ہتھکنڈے مل جل گئے ہیں + ایک بودھی لکھتا ہے کہ بُدھ مت میں آلائشیں اور پرستش کے مقامی طریقے مل گئے ہیں اور وہ معقول اور نامعقول کا مجموعہ بن گیا ہے" +

بدھ بُت پرستی کا سخت مخالف تھا اب جس بودھی مندر میں جاؤ تم بدھ کا ایک عظیم الجثّہ بت وہاں موجود پاؤ گے۔ بدھ بُت پرستی کا قائل نہ تھا اب بودھی مندروں کی دیواروں پر دیوتاؤں اور چڑیلوں کی ڈراؤنی شکلیں جلوہ گر ہیں۔ بدھ شفاعت سے منکر تھا اب نہ صرف بودھی بدھ کو اپنا نجات دہندہ سمجھتے ہیں بلکہ بودھی مذہبی پیشواؤں کو عوام کی نظر میں خدا کے آگے سفارش اور شفاعت کے اختیارات حاصل ہیں جاپان میں اُن کے مندروں میں بودھ کے چھوٹے چھوٹے بت ہوتے ہیں جن کی لوگ پرستش کرتے ہیں + پھر ان سب مختلف المذاہب لوگوں کے ہاں بزرگوں کی رُوحوں کی پرستش ہوتی ہے اور ارواح پرستی اور نذریں چڑھانے کا عام دستور ہے + یہ خیال رہے کہ چینی عام طور پر زیادہ مذہبی نہیں ہیں اگرچہ توہمات ان کے دلوں پر ایک ابرِ سیاہ کی طرح چھائے ہوئے ہیں + ربانیت کے خیال سے چینیوں کو عام طور پر زیادہ لگاؤ نہیں رہا اور جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں ان کے تین مذاہب کے بانیوں نے بھی خدا کی ذات کو عموماً نظر انداز ہی کیا + کسی چینی مندر میں جاؤ تو بجائے اس کے کہ تم چینیوں کو اپنے خدا کے حضور سنجیدہ و مرعوب پاؤ اکثر اُن کو ہنستے اور شور مچاتے دیکھو گے۔ اُن کے پیشوا اُن کی طرف سے نذریں لیتے ہیں دیوتاؤں کے آگے شمعیں روشن کرتے ہیں مگر وہ خود عموماً اپنے مذہبی نمائشوں کی ہنسی اُڑاتے ہیں + مشکل کے وقت میں چینی لوگ مذہبی سہارا ڈھونڈھتے ہیں اور جادو اور دیگر اوہام مثلاً ہوا پانی کے طریقے" میں اعتقاد رکھتے ہیں مگر بجز اس کے کہ ان کے مذہب نے ان کے اخلاق پر ایک گہرا نقش چھوڑا ہے وہ مذہب کے دوسرے اثرات سے چنداں متاثر نہیں + اسی لئے چینی ہمیشہ سے دنیاوی اور مادی کاروبار میں منہمک رہے ہیں اور باوجود متعدد مذاہب ہونے کے چین میں عام طور پر کوئی مذہبی مناقشات کوئی مذہبی لڑائیاں نہیں ہوئیں +

چین کی آبادی تقریباً بتیس ۳۲ کروڑ ہے۔ غالباً آبادی کا بیشتر حصہ بدھ مذہب کا پیرو ہے۔ یہی حال جاپان کا ہے۔ بدھ مت کے علاوہ جاپان میں ایک اور مذہب بھی ہے شنتوئیت (جس کے معنی ہیں جادۂ ربانی یا طریقت)۔ اس کے مطابق جاپانی شاہنشاہ مکاڈو اماتیراسو سورج کی دیوی کی نسل سے ہے۔ اسی لئے جاپانی ہمیشہ اپنے شاہنشاہ کا بہت احترام کرتے آئے ہیں + شنتو لوگ فطرت کے پرستار ہیں اور ایک قسم کی بزرگوں کی پرستش بھی اُن کے ہاں رائج ہے۔ وہ اپنے ملک کے ندی نالوں اور پہاڑوں، میدانوں پر عزت و حرمت کی نگاہیں ڈالتے ہیں۔ سو شنتوئیت بجائے ایک مذہبی مسلک کے زیادہ تر ربطِ ملّت اور ضبطِ حکومت کا ایک طریقہ ہے + شنتوی مندر میں عبادت کے لئے صرف ایک آئینہ ہوتا ہے۔ آئینہ انسانی دل کا نمونہ سمجھا گیا ہے جس میں اگر سکون و امان ہو تو وہ گویا خدا کی تصویر ہے + چھٹی صدی عیسوی میں بدھ مت جاپان میں داخل ہوا شنتوئیت پر بدھ مت کا بہت اثر پڑا چنانچہ اس وقت دونوں میں تمیز کرنا بھی مشکل ہے + اور لوگ بودھی اور شنتو مندروں دونوں میں بلا تمیز آتے جاتے ہیں + جاپانی اپنے مندروں کے بہت مشتاق

ہیں جہاں وہ نہ صرف عبادت کرتے ہیں بلکہ بے تکلفی سے آپس میں ملتے جُلتے اور مندروں کے خوبصورت باغات میں اپنا وقت ہنسی خوشی سے گذارتے ہیں مندر کے ساتھ ہی کچھ چھوٹی چھوٹی دوکانیں ہوتی ہیں جہاں ہر دلعزیز دیوتاؤں کے ننھے ننھے بُت خریدے جاسکتے ہیں + دولت کے سات بھاری بھرکم خداؤں کے بُت جاپانیوں کو بہت مرغوب ہیں۔ ان کے علاوہ چاول کے دیوتا اور دیوی ہیں اور بھیرحم کی دیوی جس کے بہت سے ہاتھ ہیں جن سے وہ گرتوں کو سنبھالتی اور مُصیبت زدوں کو اُبھارتی ہے + جاپان کی آبادی تقریباً سوا پانچ کروڑ ہے جس کا بیشتر حصہ بدھ مت کا پیرو ہے + علاوہ ان مذاہب کے جاپان کے تعلیم یافتہ طبقے میں چینی فیلسوفوں کنفوشس، لاؤتسی، منشی اس، کے خیالات کا چرچا ہے + بوشی ڈو (یعنی فوجی مسلک) کا بھی جاپانی زندگی پر بہت اثر پڑا ہے + یہ جاپان کے فرقۂ امراء کا جنہیں ساموُرے یا مخلصین کہتے تھے مسلکِ زندگی تھا۔ اِس کی بنا بارھویں صدی عیسوی میں ڈالی گئی + بوشی ڈو میں معدلت، شجاعت اور قوتِ برداشت کی تلقین ہے اور اس کے فلسفے کا دریا اس چھوٹے سے کوزے میں بند ہے کہ جاننا اور عمل کرنا بالکل ایک ہی بات ہے"+ ساموُرے نے اس سے بجز حصولِ عقل و فہم کے اور کام نہیں لیا یعنی اس کے زبردست اصولوں سے اپنی زندگی کو سنوارا۔ شیریں زبانی اور سچائی میں اس درجہ تک کمال حاصل کیا کہ ایک ساموُرے کا قول خود اپنی صداقت کا ضامن سمجھا گیا۔ ان کے ہاں رحم کی تعلیم تھی لیکن اس میں کمزوری کو مطلق دخل نہ تھا + ساموُرے ہی تھے جنہوں نے "ہری کری" (خودکشی) کے دستور کو ایک مذہبی اور قانونی حیثیت دی + جنگِ رُوس و جاپان کے بعد جب جاپانی مکاڈو کی وفات ہوئی۔ تو ایک وفادار محبِّ وطن نے اس کی مفارقت سے متاثر ہوکر "ہری کری" کرلی اور اس ایک ناقابلِ تقلید لیکن حیرت انگیز مثال سے دُنیا کو صاف دکھادیا کہ جاپان کا مذہب حبُّ الوطنی اور خدمت و محبّتِ قوم پر مبنی ہے !

مجوسیت یا زرتشتیت کا بانی زرتشت تھا جو دنیا کے مذہبی بلند نظروں میں شمار ہونے کے قابل ہے۔ زرتشت کی تاریخ کی بابت بہت کچھ اختلاف ہے۔ قدما کا خیال تھا کہ وہ چار پانچ ہزار سال ق م میں پیدا ہوا۔ حال کے علماء بھی اس امر کے متعلق متفق الرائے نہیں بعض ڈھائی ہزار سال ق م کا زمانہ بتاتے ہیں بعض ایک ہزار سال ق م کا۔ زیادہ میلان ایک ہزار ق م کی طرف ہے + زرتشت سے پہلے ایرانیوں میں ایک زبردست مذہبی جنگ ٹھنی ہوئی تھی ایک طرف اہورہ یعنی ارمزد کے پرستار تھے دوسری طرف دیوہ یعنی ہرمن کے پجاری تھے۔ وہ گائے کی تعظیم کرتے تھے یہ گوشت خوار تھے وہ کہتے تھے کہ ہم خدا کی پرستش کرتے ہیں اور یہ شیطان کے طرفدار ہیں۔ زرتشت نے آکر اہلِ ارمزد کا ساتھ دیا اور ایک ایسے مذہب کی بنا ڈالی جو صدیوں تک ایران کے آتش کدوں اور آج تک ہندوستان کے پارسی مندروں میں شعلہ زن ہے + زرتشت نے کہا کہ کائنات میں دو طاقتیں خدا اور شیطان یا نیکی اور بدی ہمیشہ

سے برسرِ پیکار ہیں اور اب وہ اس عالم میں انسان کے رُوح و رواں میں ایک دوسرے کے خلاف طاقت آزمائی کر رہی ہیں + اس حال میں انسان کا فرض ہے کہ وہ نیک کام کرے غریبوں اور محتاجوں کو خیرات دے اور سب سے اچھا سلوک کرے تاکہ اس کے اندر نیکی کی فتح اور بُرائی کو شکست ہو۔ اسی میں انسان اور کائنات کی بہتری اور ترقی ہے + خالص زرتشتیت کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ نیکی آخر کار بدی کو پچھاڑ دے گی ظلمت آخر کار دُور ہو جائیگی اور ہر طرف نور سے عالم پُرنور ہو جائے گا۔ نیکی نور ہے بُرائی ظلمت۔ اس لئے مجوسی سورج اور آگ کی پرستش کرتے ہیں جو خدا کا نشان یا مظہر ہے۔ اسی لئے آگ ہمیشہ اُن کے آتش کدوں میں فروزاں رہتی ہے + جب یہ لوگ مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی فوجوں کے آگے بھاگے اور اپنا آبائی وطن کھو بیٹھے تو اپنی سدا فروزاں آگ کو وہ اپنے ساتھ سنہ ۷۲۰ء میں ہندوستان میں لے آئے اور یہاں وہ پارسی کہلائے +

پارسیوں کی مقدس کتاب زند اوستا ہے جو گاتھا نیدی دادالایشت پر مشتمل ہے۔ گاتھا ان میں سب سے پرانی کتاب ہے جس سے زرتشت کی تاریخی حیثیت کا اندازہ ہوتا ہے باقی ماندہ حصص زرتشت کے بعد ایزاد کئے گئے اور بعد ہی میں زرتشت خداوندِ عالم کا مظہر سمجھا گیا ورنہ زرتشت نے کبھی اس قسم کا دعوےٰ نہیں کیا + زرتشتیت کے مطابق انسان کے اچھے اور بُرے سبھی کام شمار کئے جاتے ہیں اور ان کے لئے اُس کو جزا و سزا دی جاتی ہے اور اس عدل گستری میں عفو یا شفاعت کو مطلق دخل نہیں + دوبارہ زندہ ہونے پر آدمی کو "چنواد" کے پُل پر سے گذرنا ہوگا اور وہ اپنے اعمال کے مطابق دوزخ یا بہشت میں داخل ہوگا +

پارسیوں میں دو ذاتیں ہیں ایک عام لوگ "بہ دین" دوسرے مذہبی پیشوا "دستور" "موبد" "ہربد"۔ یہ "دستوریت" ورثے میں آتی ہے اور کسی طرح حاصل نہیں کی جا سکتی + پارسیوں کے دو فرقے ہیں تندقی اور شاہنشاہی لیکن اُن میں صرف جزوی اختلاف ہے + پارسیوں کے ہاں کثرتِ ازدواج ممنوع ہے اور بیوہ کو پھر شادی کر لینے کا حق حاصل ہے + بچّا پارسی صبح اُٹھتے ہی اپنی نماز ادا کرتا ہے پھر "نیرنگ" (بول البقر) مل کر شیطان سے خدا کی پناہ مانگتا ہے غسل کرتا ہے اور پھر نماز ادا کرتا ہے کستی یا مقدس رشتہ وہ ہمیشہ زیبِ تن رکھتا ہے + پارسی بچے کو ہمیشہ نیچے کی منزل میں پیدا ہونا چاہیئے کہ یہ انکسار کی علامت ہے + ساتویں روز نجومی آ کر نام رکھنے کی رسم ادا کرتا ہے اور ساتویں برس کے بعد اُسے "نیرنگ" سے پاک کیا جاتا ہے اور بہتر دھاگوں کی بٹی ہوئی رسی اُسے پہنائی جاتی ہے جو "یسنا" کے بہتر ابواب کا نشان ہیں + شادی کے وقت "دستور" ژند اور سنسکرت میں کچھ الفاظ دہراتا ہے اور دولہا دلہن ایک دوسرے پر چاول نچھاور کرتے ہیں + موت کے وقت دستور مرنے والے کے بستر کے پاس دعا مانگتا ہے اور کہتے ہیں کہ مذہبی پارسیوں کے پاس ایک کُتا بھی لایا جاتا ہے تاکہ بھوت پریت اُسے دیکھ کر اُڑان چھو ہو جائیں + پھر مردے

کو" مینارِ خاموشی" میں لے جایا جاتا ہے جہاں اُس کا جسم گدھوں کی ضیافت کے لئے کھُلی ہوا میں رکھ دیا جاتا ہے + پارسی اپنے مرحوم عزیزوں کی نجات کے لئے ہر روز پھولوں کے سامنے دُعائیں مانگتے ہیں اور خیرات دیتے ہیں + نیکی اور خیرات اُن کے مذہب کا اصل الاصول ہے - اسی لئے پارسیوں میں شاذ و نادر ہی کوئی سائل نظر آتا ہے + پارسیوں کی جسمانی صفائی اور خوبصورتی عورتوں سے اُن کا اچھا سلوک اُن کی محنت اور دیانتداری ایسی صفات ہیں جو اُنہیں بہت سی دوسری قوموں سے ممتاز رکھتی ہیں + اُن کا منتہائے زندگی یہ ہے کہ وہ خیال و اعمال میں فراخ دل، کاروبار میں صادق و راست رو اور تعلیم و تجارت میں ہمیشہ کوشاں و سرگرداں رہیں + ان کی آبادی ایک لاکھ کے قریب ہے وہ زیادہ تر ہندوستان میں اور چند طہران، یزد اور کرمان کے ایرانی صوبوں میں مقیم ہیں + وہ وحدانیت کے قائل ہیں اور تعلیم یافتہ پارسیوں کے دل اوہام پرستی سے قطعی طور پر خالی ہیں اُن کی ترقی اس بات کا روشن ثبوت ہے کہ جو قوم زندہ رہنا چاہے وہ خواہ تعداد میں کتنی ہی قلیل کیوں نہ ہو اگر اُس میں عمل اور ہمت کا جوہر موجود ہے تو وہ زمانے کی ہزاروں صعوبتوں کا سامنا کرکے دن دونی رات چوگنی ترقی کر سکتی ہے - وہ اگر میدانِ عمل میں آگے کو قدم بڑھائیگی تو قسمت ہمیشہ ہمتِ مرداں مددِ خدا کہہ کر بخوشی اُس کا ساتھ دے گی !!

باقی

بل

راگنیاں

جب رستے کی تکان اور گرم دن کی پیاس مجھے نڈھال کر دیتی ہے - جب دُھندلکے کی چھپی ہوئی گھڑیاں میرے جادۂ زندگی پر اپنا سایہ ڈالتی ہیں تو اے میرے دوست! میں صرف تیری آواز کے لئے نہیں بلکہ تیرے مس کے لئے چلا اُٹھا ہوں!

میرے دل میں اُن نعمتوں کے بارِ گراں کی سوزش محسوس ہوتی ہے جو میں نے تیرے آگے پیش نہیں کیں - اِس اندھیری رات میں تو اپنا ہاتھ باہر نکال اور مجھے اپنے ہاتھ میں اُسے لینے دے - مجھے اُسے مالا مال کرنے

دے ۔ مجھے اُسے اپنے دل پر رکھنے دے ۔ آہ! مجھے اپنی تنہائی کے طول طویل پھیلاؤ میں اُس کے مس کو ضرور محسوس کرنے دے!

کان دھر کے سُن میرے دل! اُس کی بانسری میں جنگلی پھولوں کی خوشبو کا راگ اور جھلکتے ہوئے پتوں اور چمکتے ہوئے پانیوں کا گیت ہے اور اُس سائے کی راگنیاں ہیں جو شہد کی مکھیوں کے نازک پروں سے گونج اُٹھتا ہے!

بانسری میرے دوست کے لبوں سے اُس کا تبسم اُڑا لیتی ہے اور پھر اُسے میری زندگی پر پھیلا دیتی ہے!

خوشبو کلی کے اندر چلّاتی ہے "آہ دن رخصت ہو چلا! ہائے میری بدنصیبی کہ بہار کا یہ پُر لطف دن جاتا ہے اور میں پنکھڑیوں میں مقیّد ہوں"! ـــــ اے بُزدل تو ہمت نہ ہار! تیری زنجیریں توڑ دی جائینگی، یہ کلی پھول بن جائے گی، اور جب تو معمورِ حیات ہو کر فنا ہو جائے گی، پھر بھی بہار اپنے نت نئے جوبن پر ہو گی!

خوشبو مضطرب ہے اور کلی کے اندر پھڑپھڑاتی ہے اور چلّاتی ہے "ذِلّت ہو میرے لئے! گھڑیاں گذری جاتی ہیں، تاہم میں نہیں جانتی کہ میں جا کہاں رہی ہوں اور مجھے تلاش کس شے کی ہے"؟ ـــــ

اے بُزدل تو ہمت نہ ہار! بادِ بہاری نے تیری آرزو کو سُن پایا ہے ۔ اب دن ختم نہ ہو گا جب تک تو اپنی ہستی کو مکمّل نہ کرلے!

مستقبل اُس کے لئے تاریک ہے اور خوشبو مایوس ہو کر چلا اُٹھتی ہے "اے وائے قسمت! آخر کونسی تقصیر ہے جس سے میری زندگی اس قدر بے معنی ہو گئی ہے؟ کوئی مجھے بتا سکتا ہے کہ میں زندہ کیوں ہوں اور کس لئے؟" ـــــ

اے بُزدل! تو ہمت نہ ہار! وہ صبح کامل قریب ہے جب تیری زندگی ہمہ گیر زندگی کے ساتھ گھل مِل جائے گی اور تو آخر کار اپنا مدّعائے حیات پالے گی!

گُلچیں

تقدیر و عمل

عموماً دس میں نو آدمی ایسے ملیں گے جن کی عمریں نصف سے زیادہ بغیر کسی ترقی کے گذر چکی ہوں گی۔ اگر ان سے اس کا سبب پوچھا جائے تو وہ صرف یہ کہیں گے

ہمارے سامنے کبھی کوئی عمدہ موقع پیش نہیں آیا، واقعات ہمیشہ ہمارے خلاف رہے۔ دوسرے لوگوں کی طرح نہ ہماری کسی مدرسے میں باقاعدہ تعلیم ہوئی۔ اور نہ اُن کی طرح کام کرنے کا موقع پیش آیا "

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہر انسان کو جوانی یا جوانی کے بعد کوئی نہ کوئی کام کرنے کا موقع ضرور پیش آتا ہے اور ہر کام جو مستعدی و کشادہ دلی سے اختیار کیا جائے اور اُسے ممکن سے ممکن عجلت کے ساتھ انجام دینے کی فکر کی جائے۔ اسی میں آگے بڑھنے کے بہترین مواقع پوشیدہ ہوتے ہیں جس طرح لڑکے اپنی تعلیم کے متعلق یہ خیال نہیں کرتے کہ یہ ہمیں اس لئے دی جارہی ہے کہ ہم اس سے خلیق پستی اور مستقل مزاج بنیں۔ اسی طرح بہت سے لوگ یہ خیال نہیں کرتے کہ ہم جن لمحات کو بیکاری و سستی میں ضائع کر رہے ہیں وہ ہماری آئندہ زندگی میں ترقیوں کے لئے سد راہ ثابت ہوں گے +

کسی محکمہ کے مالک کو بہ حیثیت نوکر کے گستاخانہ جواب دینا اور اپنے کاموں میں غفلت و بے پروائی برتنا تمام آنے والی خوشیوں اور کامیابیوں کا استیصال کر دیتا ہے +

وہ لوگ جو اپنے فرض کو فرض نہیں سمجھتے وہ جس قدر جو کام کرتے ہیں بددلی کی وجہ سے اُس سے زیادہ اُسے خراب و برباد کر دیتے ہیں۔ اُنہیں شروع شروع میں اپنی یہ غلطیاں بہت خفیف معلوم ہوتی ہیں لیکن بعد میں یہی نقائص بن کر کامیابیوں کے لئے دیوار بن جاتی ہیں +

ایسے لوگ کبھی اس پر غور نہیں کرتے کہ اُن کے بزدلانہ اطوار اُن کی غفلت اور کم ہمتی خود اُن کی کامیابیوں کے لئے سدِّ راہ ہوگی اور وہ کبھی اپنی منزلِ مقصود پر نہ پہنچ سکیں گے۔ جوانی کو حقیر و ناچیز سمجھنے کے بعد ایک انسان زیادہ سے زیادہ چپراسی کلرک یا کاشتکار بن سکتا ہے جس کے بعد زندگی کے اُن نقائص کو دُور کرنا اس کے امکان سے باہر ہو جاتا ہے اور پھر وہ اس قابل بھی نہیں رہتا کہ اپنی مقررہ قلیل آمدنی کے اسباب پر غور کر سکے۔ ہزاروں آدمی بظاہر کسی عمدہ موقع کی تلاش میں رہتے ہیں لیکن جب اُنہیں کوئی ایسا موقع میسر آجاتا ہے تو اس سے خاطر خواہ فائدہ نہیں اُٹھاتے +

اس کی کبھی پروا نہ کرو کہ تمہارے آباواجداد کیا تھے اور تم نے باقاعدہ کسی اسکول یا کالج سے کوئی سند حاصل کی ہے یا نہیں، بلکہ اپنی ذات پر بھروسہ کرو اور دیکھو کہ ہم کیا ہیں وہ امداد جو دوسروں سے تمہیں مل رہی ہے اُس پر کبھی مطمئن نہ ہو۔ بلکہ اس پر فخر کرو کہ تم خود مدد کر سکتے ہو۔ اپنی ذات پر بھروسہ کرنے کی عادت غیر محسوس طور پر انسانی طاقتوں کا نشوونما کرتی ہے کیونکہ دوسروں کے سہارے زندگی بسر کرنا اپنے آپ کو تباہی میں ڈالنا ہے۔ ہنری وارڈ بیچر کا مقولہ ہے کہ "یہ نہ دیکھنا چاہئے کہ انسان روپیہ کس قدر پیدا کرسکتا ہے بلکہ دیکھنا یہ چاہئے کہ وہ آدمی کیسا ہے"۔

یہ ہرگز قابل غور بات نہیں کہ تم نے کس قدر ناز و نعم میں پرورش پائی ہے یا تمہاری سوسائٹی کس قدر وسیع ہے، ان باتوں کے باوجود اگر تم میں ذاتی اعتماد نہیں ہے تو تم کبھی ایک کامیاب زندگی نہیں بسر کرسکتے۔

کامیابی کے مندر کا دروازہ ہر وقت کھلا نہیں رہتا۔ بلکہ اس میں داخل ہونے کے لئے ہر شخص کو اپنی کنجی گھمانی پڑتی ہے اور جب وہ داخل ہوجاتا ہے تو دروازہ پھر اُسی طرح بند ہوجاتا ہے یہاں تک کہ اس کی اولاد بھی بغیر جدوجہد کے داخل نہیں ہوسکتی۔

نوجوان لنکن کے اس قول پر کرافورڈ نے مضحکہ اُڑایا تھا کہ میں ایک دن کوشش کرکے جمہوریۂ امریکا کا صدر بن جاؤں گا، چنانچہ اس کا تمسخر ہی رہا۔ اور لنکن اپنی طاقتوں اور اعلیٰ صفات کا نشوونما کرنے کے بعد ایک دن اپنی خواہش کے مطابق صدر بن گیا۔ درحقیقت مستقل مزاجی موقعوں کا دروازہ کھول دیتی ہے اور دُنیاوی جدوجہد میں سر پر فتح و نصرت کا تاج رکھ کر انسان کو سربلند کر دیتی ہے۔ دوسروں کی مدد کے سہارے سے جو کام تم نے کئے تمہاری زندگی کے کاموں میں اُن کا شمار نہیں کیا جاسکتا۔ شمار کے قابل وہی کام ہیں جنہیں تم نے خود انجام دیا ہو۔

ایسے لوگ جو عیش و مسرت میں رہ کر کسی کام کے لئے مجبور نہیں ہوئے ہیں، اُن کی طاقتیں شاذ و نادر ہی عمل میں آسکتی ہیں، بخلاف اس کے وہ بیکس، غریب اور محتاج لڑکے جنہیں دُنیا حقارت کی نظر سے دیکھتی ہے اپنی ذاتی جدوجہد سے میدان ترقی میں سب سے آگے نکل جاتے ہیں۔

ایک مستقل مزاج نوجوان کی کامیابی کے راستے میں دُنیا کی کوئی طاقت سدِ راہ نہیں ہوسکتی، خواہ اُسے کتنی ہی مصیبتوں، مجبوریوں اور مفلسی کی حالت میں کیوں نہ رکھا جائے یا اُسے کسی تنگ و تاریک کوٹھری میں کیوں نہ محبوس کردیا جائے۔

اس کا کبھی خیال نہ کرو کہ تم ایک جھونپڑی میں پیدا ہوئے ہو یا ایک محل میں، بلکہ میدان ترقی میں آگے بڑھنے کی کوشش کرو۔ اور اپنی قسمت یا موقع کا کبھی انتظار نہ کرو، تمہارے دلوں میں کام شروع کرنے سے پہلے عمدہ اوزاروں کی ضرورت کا خیال بھی نہ آنا چاہئے، کیونکہ جو لوگ اپنی زندگی میں بڑے بڑے کام کرچکے ہیں وہ کسی اوزار یا سرمائے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔

نوجوان فراڈے جب کہ وہ دواؤں کی دوکان پر کام کرتا تھا، اگر صرف اپنے دل ہی میں سائنس کے بڑے بڑے

تجربوں کا خواب دیکھتا رہتا کہ "کاش مجھے سائنس کے آلات سے بھرا ہؤا کمرہ ملجاتا تو مَیں بھی بڑے بڑے محیر العقول اختراعات و ایجادات کا مالک ہوتا" تو کچھ نہ کرسکتا۔ مگر اس نے صرف خواہشات ہی میں اپنا وقت ضائع نہیں کیا بلکہ بدنما اور معمولی آلات ہی سے جو اُسے میسّر ہوئے اُس نے سائنس کے حیرت ناک تجربات حاصل کئے۔ اور ہنری ہمفری ڈیوی جیسے قابل شخص سے اپنا قابلیت کا اعتراف کرالیا +

کیا تم خیال کرسکتے ہو کہ اگر وہ، فروش کا یہ ادنٰے ملازم کچھ عرصے تک آلات اور قیمتی ادویات کا انتظار کرتا رہتا تو ڈیوی جیسا لائق شخص اُس کی ایجادات کو تسلیم کرلیتا اور اُسے مائیکل فراڈے کہنے پر مجبور ہوتا؟ نہیں ہرگز نہیں +

اسی طرح ایک اور مستقل مزاج انسان گزرا ہے۔ جس نے مائیکل کی طرح ایک معمولی پتھر سے جسے دوسرے صناعوں نے بیکار سمجھ کر چھوڑ دیا تھا ڈیوڈ کا مجسمہ تیار کیا +

بیورٹ جو ایک غریب لوہار کا لڑکا تھا اس نے کبھی کسی عمدہ موقع کا انتظار نہ کیا اور اس خیال کو بالکل نظر انداز کردیا کہ مختلف زبانیں سیکھنے کے لئے دوسرے ممالک کا سفر ضروری ہے۔ بلکہ اس نے اپنی فرصت کے ہر لمحے کو غنیمت سمجھ کر دوسری زبانوں کا از خود مطالعہ شروع کردیا۔ اور تھوڑے ہی عرصے میں مختلف زبانوں کا عالم ہوگیا +

دنیا میں ایک بڑا آدمی بننے کے لئے دولت اور با ثروت دوستوں کی ضرورت نہیں عظمت خود انسان میں موجود ہے وہ سُنہرے اتفاقات جن کی تمہیں تلاش ہے وہ خود تم ہی میں مضمر ہیں، قسمت، ماحول، مواقع اور دوسروں کی امداد، پر تمہاری ترقی کا انحصار نہیں ہے +

(ترجمہ) سید ابو محمد ثاقب

غزلیاتِ عابد

(۱)

عشرتِ حسن کو ثبات نہیں ہاں نہیں اور کوئی بات نہیں

ہائے وہ نغمہ ریز بربطِ عشق جس میں اب لرزشِ حیات نہیں

ہنس رہا ہے فلک پہ ماہ جبیں چاندنی کی پری ہے رات نہیں

یوں تو میٹھی زباں ہے ظالم کی آنکھ میں رنگِ التفات نہیں

عشق سے شششِ جہت میں رنگِ فروغ حُسن سے جوشِ کائنات نہیں

میکشی، عاشقی، پرستشِ حسن
میرے کچھ اور واقعات نہیں

(۲)

پرتوِ شوخیٔ انداز دکھائے جاؤ میرے سینے میں کوئی شمع جلائے جاؤ

بجلیاں خرمنِ ہستی پہ گرائے جاؤ مسکراؤ مجھے دیوانہ بنائے جاؤ

دوستو بہرِ خدا ذکرِ محبّت چھیڑو مجھ کو یہ نغمۂ گلپوش سنائے جاؤ

ڈالتے جاؤ مرے دل پہ نشیلی نظریں جاتے جاتے مجھے کچھ جام پلائے جاؤ

یا تو آوارگیٔ شوق کو الزام نہ دو یا مجھے منزلِ مقصود بتائے جاؤ

عاشقو! دل پہ کرو حرفِ محبّت تحریر کچھ بنے یا نہ بنے نقش بٹھائے جاؤ

قصۂ غم سے مجھے اُس نے یہ کہہ کر روکا مجھے رُلواؤ تو فرقت میں رُلائے جاؤ

غمِ دُنیا تو اُٹھانے سے رہے تم عابد
یہی اچھا ہے کہ دُنیا سے اُٹھائے جاؤ

سید عابد علی عابد بی۔ اے

خوشۂ پروین

: ۱ :

دردامن کوہ صبا — دیدم سحرگہ دخترے
خرم تر از موج صبا — تابندہ تر از اخترے
رُویش گلے از باغ جان ۔ مویش شبے عنبر فشاں — چشمان چو نرگس دلستان — چوں غنچۂ خندان دہان
دندان او سلک گہر — لوح جبین قرص قمر
بینی سر کلک ازل — قامت قیامت دربغل
حور زمین، نور زمان — یک برگ گل صد گلستاں
صبح بہار جاوداں

: ۲ :

می چید انگور از رزان — با دستہائے نازنین
گوئی ہمی چید اختران — از چرخ جبریل امین
تا بر بساط آسمان — چوں بادۂ پیر مغان — با یاریٔ رُوحانیاں — سازند حورانِ جنان
آبے پُر از موجِ شرر — وآنگاہ در جامِ سحر
آں آب آتشبار را — آں چشمۂ انوار را
پیر فلک با امر حق — آرد بگلزار شفق
وافشاندش برایں جہاں

: ۳ :

از آفتاب رُوے او — رُخ گشت چوں ماہ سحر
واز پیچ و تاب مُوئے او — شد موجزن خون در جگر
دل ہمچو مُرغ نیم جان — شد بیقرار و ناتوان — حیران ستادم در رزان — چوں رہروے کز کاروان

واماندہ کوہ و کمر … باشد پُر از خوف و خطر
واندر میان جادہ ہا … از جادہ اش ناآشنا
درزیر سقف نیلگوں … تنہا بقلبے پُر ز خوں
استادہ باشد لب گزاں

—— ۴ ——

ناگہ زچشم پُر شرر … انداخت سوئے من نگہ
چوں در شبے چادر بسر … از خیمۂ ابر سیہ
اندر بیابان ناگہاں … بر رہروے بے خانماں … گم کردہ راہ کارواں … برق از حصار آسماں
خندد، درو ہر پردہ را … وآں جادۂ گم کردہ را
روشن کند، وآں راہرو … بر جادہ اش گردد ز نو
سحر نگاہ پُر شرر … آوردم از حیرت بدر
وانداخت بر رہ آنچناں

—— ۵ ——

گشتم بدو نزدیک تر … کردم سلامے روستا
بکشود دُرج پُر گہر … دادم جوابے از حیا
چوں در بہاران بوستاں … گردد زباران گلفشاں … یا چوں خروزد شمع جاں … از جلوۂ گل باغباں
یا زآفتاب صبحدم … رخشد رُخ گل پُر زنم
یا از دم باد صبا … غنچہ بخندد در قبا
شد دل چناں در سینہ ام … پُر نور گشت آئینہ ام
از آں جواب درفشاں

—— ۶ ——

گفتم کہ اے سرو رواں … برگو کہ حوری یا پری؟
یا ماہ تاباں در رزاں … آمد ز چرخ چنبری؟

این لالۂ رخشان تو
این غنچۂ خندانِ تو   این نرگس فتان تو
واین سنبلِ پیچانِ تو

اندر کدامین گلستان   خوردند آب از باغبان؟
واین از آفتاب از کجا   بادو ہلال دل ربا
مانند ترکان تاختہ   وآنگاہ دو خنجر آختہ
از بہر جانِ عاشقان؟

— ۷ —

خندید و گفت از سادگی   جز دختر رزبان نیم
در کلبۂ آزادگی   من کمتر از شاہان نیم

در کوہساران میروم
در لالہ زاران میدوم   از چشمہ ساران میخورم
با آبشاران میجہم

انگور چینم صبحدم   ہر روز و آنگہ مادرم
در کوچہ و بازار ہا   بفروشد از بہر ما
نان آرد و ہنگام شب   خوانیم حمد و شکر رب
کاو آفرید این آسمان

— ۸ —

باز از زبان شاعری   گفتم کہ اے ماہ زمین
این چشمہ سار ساحری   این نرگس سحر آفرین

اندر خرابات مغان
از بادۂ مغبچگان   خوردہ است بارُ دھانیاں
در جام ماہ آسمان

مہر جہان افروز را   آن آب ظلمت سوز را
دادند تا مستان تو   بر چہرۂ رخشان تو
اندر شب زلف سیہ   چون اختران صبحگہ
باشند شمع بیدلان؟

— ۹ —

خندید باز از حرف من   چون گل کہ خندد از صبا

بکشود لب بہر سخن ـــ چوں طوطیٔ شیریں ادا
گفت اے زفطرت بیخبر! ـــ از مہر و ماہ خود گذر ـــ ایں خوشۂ پروین ببر ـــ حُسن طبیعت را نگر
در جلوۂ ایں اختراں" ـــ ایں گفت و دیدم ناگہاں
یک خوشہ داد و در رمید ـــ از من بکہساراں دوید
آہو صفت کاندر درہ ـــ از خوف صیاداں زرہ
بگریزد و گردد نہاں

:: ۱۰ ::

چوں در بیابانِ آفتاب ـــ اندر افق گردد نہاں
و آں موج نورش چوں سراب ـــ از گوشہ ہائے آسماں
انوار پاشد در نگہ ـــ یا از پس ابرے سیہ ـــ چوں سینۂ پُر از گنہ ـــ برقے بساں صبحگہ
خنداں شود و از خندہ اش ـــ گیتی شود خورشید وش
و از جلوۂ آں پرتوے ـــ مانند چشم رہروے
مانند آنچناں اندر نظر ـــ زاں غیرت حُور و قمر
بس جلوہ ہائے دلستاں

:: ۱۱ ::

آں خوشہ انگور را ـــ برداشتم کردم نگہ
دیدم جمال حُور را ـــ در اختران صبحگہ
چوں عاشق بیدل شدم ـــ گہ مرغک بسمل شدم ـــ گہ موجہ ساحل شدم ـــ آخر سوئے منزل شدم
دریا در رُوئے آں قمر ـــ ایں نغمہ خوانم ہر سحر
" ہاں اے زفطرت بیخبر! ـــ از مہر و ماہ خود گذر
ایں خوشۂ پروین ببر ـــ حُسنِ طبیعت را نگر
در جلوۂ ایں اختراں"

(محمد اکبر منیر)

ا م

اکبر کی انتظامی قابلیت

تمہید - یہ مسئلہ کہ سلاطین مغلیہ میں انتظامی نقطۂ نظر سے افضلیت کا سہرا کس کے سر باندھا جائے؟ نہایت پُرلطف اور دلچسپ ہے۔ مورخین کی نظر تعمق اس نتیجے پر پہنچے بغیر نہیں رہتی کہ اکبر ہی کی وہ یکتا شخصیت ہے جس نے اپنے جدامجد کے اُن تمام منصوبوں کو عملی جامہ پہنایا جو اسکے اولوالعزم دماغ میں چکر لگا رہے تھے اور جن کی تکمیل کی آرزو ہی آرزو میں اس نے دار بقا کی راہ لی۔ ہمایوں کے عہد حکومت میں ہندوستان کی فضا اُن زہریلے جراثیم سے متاثر ہو گئی تھی جو قدم قدم پر اُسکی ناکامی اور ہلاکت کے سامان مہیا کر رہے تھے۔ اس طرح عرصہ دراز تک ملک میں بدنظمی کا دور دورہ رہا۔ بالاخر واقعات نے پلٹا کھایا۔ اکبر بادشاہ کے اقبال کا ستارہ طلوع ہُوا اور اپنی ضیا پاشی سے اُن تمام گوشہ ہائے ملک کو منور کر گیا جہاں فقدان امن وامان کی وجہ سے تاریکی چھائی ہُوئی تھی۔

اکبر کی تخت نشینی کے وقت ہندوستان کی سیاسی حالت تاریخ شاہد ہے کہ ۲ ربیع الثانی ۹۶۳ھ م ۱۴ فروری ۱۵۵۶ء وہ تاریخ ہے جبکہ باغ کلانور (ضلع گورداسپور) میں اکبر کی تخت نشینی کی رسم منائی گئی۔ اس وقت وہ اپنی عمر کی چودھویں منزل طے کر رہا تھا۔ ہمراہ مٹھی بھر فوج کے سوا اور کوئی طاقت نہ تھی پنجاب کے معدودے چند اضلاع پر سیادت قائم تھی۔ دہلی اور آگرہ، علاوہ اُن تمام علاقہ جات کے جہاں مغلیہ اقتدار تھا شہنشاہی قبضے سے نکل چکے تھے اور ان پر ہیمو کا تصرف ہو گیا تھا۔ قحط سالی اور آئے دن کے لڑائی جھگڑوں سے وہ مہیب اور مایوس کن صورت حال پیدا ہو گئی تھی کہ مستقل حکومت کا قیام اور امن وامان کا خیال خام معلوم ہوتا تھا۔ مالوہ اور گجرات میں خودمختاری کا دور دورہ تھا۔ راجپوتانے کے وسیع علاقے میں راجپوتوں کی انانیت لازوال معلوم ہوتی تھی۔ گنڈوانے (صوبہ جات متوسط) میں سربرآوردہ امرا نے اپنا اقتدار قائم کر لیا تھا۔ بنگال میں تقریباً دو صدی قبل سے مسلسل افغانوں کا سکہ رواں تھا۔ اڑیسہ میں کسی مستقل بادشاہت کا وجود نہ تھا۔ دکن میں احمد نگر۔ بیجاپور برار۔ بیدر اور خاندیس اپنی اپنی خودمختاری کے نشہ میں چور "ما ہمچو ما دیگرے نیست" کا راگ الاپ رہے تھے، وجیانگر جس کی سرحد راس کماری تک پہنچ گئی تھی۔ بالکل بیباکانہ طور پر اپنی آزادی کا ترانہ گا رہا تھا اور مغربی ساحل پر پرتگالیوں کا پرچم لہرا رہا تھا۔

جس وقت کلانور میں اطلاع پہنچی کہ دہلی پر ہیمو کا قبضہ ہو چکا ہے اور دیگر مقبوضات میں عام طور پر

انتشار پھیلا ہُوا ہے تو اکبر اور اس کے ہمراہیوں پر یاس کا عالم طاری ہو گیا لیکن بہت جلد تیموری خون میں جوش پیدا ہُوا اور بیرم خان کے زریں اور انمول مشورہ نے اسکو اپنے حریف سے نبرد آزما ہونے کے لئے آمادہ کیا۔ کمسن بادشاہ کی مردانگی اور خان بابا کی اصابت رائے دیکھ کر ساتھیوں نے بھی میدان جنگ میں سر بکف جانیکے لئے مستعدی ظاہر کی۔ جنگ کی تیاریاں ہونے لگیں اور بتاریخ ۱۰ محرم الحرام ۹۶۴ھ م ۱۳ار نومبر ۱۵۵۶ء پانی پت کے میدان میں معرکہ آرائی ہوئی جسکا نتیجہ ہیمو کی کامل پسپائی بلکہ ناگہانی موت اور اکبر کی کامل فتح و نصرت میں نمودار ہُوا۔

اس فتح نے دیگر باغیوں کو مطیع و منقاد کرنے میں جادو کا کام کیا۔ تقریباً چار سال کے قلیل عرصے میں علاوہ صوبہ جات متحدہ کے اجمیر۔ گوالیار۔ میواڑ۔ اور جونپور پر بھی شہنشاہی سیادت قائم ہو گئی۔ اس طرح جب حالات روز بروز امید افزا ہوتے گئے تو اکبر کے دل میں یہ خیال پیدا ہُوا کہ اپنی حکومت کو مستحکم۔ دیرپا۔ وسیع اور ہر دلعزیز کرنیکے چند اصول مرتب کئے جائیں۔ ذیل میں اُن کی تفصیل بطور مشتے نمونہ از خروارے، بیان کیجائیگی جس سے واضح ہوگا کہ بادشاہ موصوف میں قدرت نے کس قدر فیاضی کے ساتھ انتظامی قابلیت کا مادہ ودیعت فرمایا تھا۔

اصول حکمرانی ۔ پیشرو بادشاہوں کے تاریخی واقعات نے اکبر کے روبرو اس امر کی صداقت پیش کی۔ کہ بغاوتوں کے بانی بالعموم سلطنت کے صوبہ دار۔ جاگیردار اور امرائے عظام ہی رہے ہیں، انہی کی باغیانہ طرز حکومت کا نتیجہ نقض امن کی مہیب صورت میں رونما ہُوا، انہی کے جور و ظلم سے فرقہ بندیاں ظہور میں آئیں اور انہی کے جا و بیجا دباؤ سے رعایا میں بادشاہ کی طرف سے بیدلی پھیلی رہی۔ لہٰذا ان مضر اسباب کا سدِباب کرنا اُسکے خیال میں ازبس ضروری تھا۔

پہلا کام جو اس نے کیا وہ رعایا کے اور اپنے درمیان ہر دلعزیزی پیدا کرنا اور راعی و رعایا کے صحیح تعلقات کا قائم کرنا تھا۔ تاکہ اُنہیں اپنے آقا کی ہمدردی اور سرپرستی کا ہمیشہ احساس رہے۔ اس اصول کو کامیاب کرنیکے لئے ہر ممکن کوشش عمل میں لائی گئی۔ چنانچہ قدیم محاصل جو جزیہ کی شکل میں وصول کئے جاتے تھے۔ قطعاً موقوف کر دئے گئے۔ مذہبی رواداری کا علی الاعلان اطمینان دلایا گیا (گو آگے چل کر "دین الٰہی" کی اشاعت نے اس اصول میں تزلزل پیدا کر دیا) پیشوں کے اختیار کرنے میں رعایا کو عام آزادی عطا کی گئی۔ میدان ترقی کو وسیع کرنیکے لئے اس بات کا بھی یقین دلایا گیا کہ جلیل القدر مراتب سے ہر ایک شخص بلالحاظ مذہب و ملت سرفراز کیا جائیگا۔ بشرطیکہ وہ انکا اہل ثابت ہو۔ علاوہ ازیں ملک میں اتحاد و اتفاق

بڑھانے کے لئے اس قسم کے احکام صادر ہوئے کہ شادی بیاہ کی رسموں میں ذات پات کے قیود کو بالکل نظرانداز کر دیا جائے، مثال قائم کرنے کے لئے خود ذاتِ شاہانہ نے راجپوتوں کے معزز خاندانوں کی شریف لڑکیوں سے شادی بیاہ کیا۔ اُن سے محبت و اُلفت کے تعلقات قائم کئے۔ اُن کو ممتاز اور جلیل القدر خدمات سے سرفراز کیا۔ چنانچہ راجہ ٹوڈرمل اور مان سنگھ اس عہدِ حکومت کے نہایت شاندار عمائد گزرے ہیں۔ اندرون ملک کے قیام امن و امان کے لئے ہر شہر میں ایک ایک کوتوال مقرر کیا جاتا تھا تاکہ مقامی حالات کی کما حقہٗ نگرانی رکھے اور عامۃ الناس کے فلاح و بہبود میں ساعی رہے۔

صوبہ داریاں ۔صوبہ داروں کی بیوفائی۔ بد دیانتی اور بغاوت آمیز روش نے بادشاہ کو اس بات پر آمادہ کیا کہ یہ عہدہ ہمیشہ کے لئے منسوخ کر دیا جائے۔ لیکن سلطنت کی عظیم الشان وسعت اسکی مقتضی ہوئی کہ اس کو چند شرائط اور بندشوں کے تحت میں قائم رکھا جائے۔ چنانچہ اسی طرح عملدرآمد رہا۔ صوبہ دارو پر ایسی بندشیں عاید کی گئیں کہ انہیں اپنے تمام صوبہ پر تو کجا اپنے مستقر تک پر اثر پیدا کرنیکا موقع نہ مل سکا۔ ابتداً سلطنت کو بارہ صوبوں میں تقسیم کیا گیا۔ چند سال بعد تین اور صوبے فتح کئے گئے جن کا شمار ان بارہ صوبوں سے علیحدہ ہے۔ یعنی بطور مجموعی سلطنت کے پندرہ صوبے تھے۔ ان پر ثقہ اور معتبر اشخاص کا تقرر ہوا کرتا تھا۔ ان کے ماتحت کچھ فوج بھی رہا کرتی تھی۔ صرف سرحدی صوبہ جات پر زیادہ فوج رکھی جاتی تھی۔ یہ فوج گو صوبہ دار کے ماتحت ہی ہوتی تھی لیکن اہم معاملات میں مرکزی حکام کے زیراثر تھی۔ یہ صوبہ دار سپہ سالارِ فوج کہلاتے تھے۔ انکو کسی قسم کی جاگیر وغیرہ نہ دی جاتی تھی۔ جو کچھ تنخواہ دی جاتی تھی وہ بشکل زر ہوتی تھی۔ ان پر لازم تھا کہ وقتاً فوقتاً مرکزی حکومت کو اہم معاملات کی اطلاع دیتے رہیں اور مناسب ہدایت حاصل کرتے رہیں۔ انکا قیام کسی مستقر پر پانچ سال سے زائد نہیں ہوتا تھا کیونکہ مرکزی حکومت اپنی مصلحت کو مدنظر رکھ کر عہدہ داروں کو مقررہ مدت کے بعد تبدیل کرتی تھی ان پر نگرانی رکھنے کے لئے ایک "محکمۂ راز" جو اور محکمہ جات پر بھی نگرانی رکھتا عمل میں آتا تھا۔ صوبہ دار کو اندرونی امن برقرار رکھنے کے لئے انتظامی اور عدالتی اختیارات عطا کئے گئے تھے۔ لیکن مالی اختیارات قطعاً حاصل نہ تھے محکمۂ مال صوبہ داری سے بالکل علیحدہ تھا اس اصول سے اس حکیمانہ مسلک کا اظہار ہوتا ہے جس کے اختیار کرنیکی ہندوستان میں زمانہ دراز سے تحریک ہو رہی ہے اور الحمد للہ ریاست حیدرآباد میں یہ تحریک بارآور بھی ہو گئی، ہر ایک صوبے میں ایک سو سرکاریں یا اضلاع شامل تھے جن پر علیحدہ علیحدہ ذی اختیار

عہدہ داروں کا تقرر عمل میں آتا تھا۔ ضلع کا حاکم اعلیٰ شقدار یا صاحب ضلع کہلاتا تھا۔ ضلع میں کئی پرگنہ جات شامل تھے۔ جن پر متعدد حکام مقرر کئے جاتے تھے۔ ہر ایک پرگنہ کلیتہً پٹیل کی نگرانی میں ہوتا تھا۔

محکمۂ راز کی طرف سے جب کسی عہدہ دار کی شکایت ہوتی تو مزید اطمینان کے بعد مناسب سزائیں تجویز کیجاتیں۔ عہدہ داروں کے بارے میں کسی قسم کا جانبدارانہ سلوک نہیں کیا جاتا تھا۔ اس طرز عمل سے کسی کی جرأت نہ ہوتی تھی کہ شاہی احکام کے منافی کوئی کام انجام دے سکے کیونکہ اس قسم کی خلاف ورزی سے اُن کی جان و مال خطرے میں پڑ جانیکا اندیشہ لگا ہوا تھا۔

جاگیر اور منصب ۔ جاگیرداروں کی خود غرضی۔ کورنمکی اور درازدستی کے خطرناک اثرات اس امر کے مقتضی تھے کہ بادشاہ جاگیروں کی عطا کو فوراً موقوف کردے۔ چنانچہ جاگیروں کی عطا نہ صرف ہمیشہ کے لئے موقوف ہوگئی بلکہ سابقہ جاگیروں کو بھی خالصہ بنالیا گیا۔ البتہ وفاداروں کی وفاداری نے بادشاہ کو ترغیب دی کہ منصبداری کا عہدہ قائم کیا جائے جس سے مستحقین کی نہ صرف ہمت افزائی متصور تھی بلکہ عزت افزائی بھی۔ ثقہ اور معزز اشخاص اس قسم کے عہدوں سے سرفراز کئے گئے۔ ان کو کسی قسم کی اراضی عطا نہ کیگئیں بلکہ تنخواہ بشکل زر دی جاتی تھی۔ بسا اوقات خطابات بھی دئے جاتے تھے۔ انکا کام مثل جاگیرداروں کے فوج کی فراہمی تھا۔ انکے پاس فوج مہیا رہتی تھی جسکے مصارف انہیں اپنی ماہوار مقررہ آمدنی سے ادا کرنے پڑتے تھے یہ فوج مثل جاگیردار کی فوج کے بادشاہ وقت کے تحت جنگ و جدال میں شریک ہوتی تھی۔

انکا عہدہ دس سے لیکر دس ہزار تک تھا۔ آٹھ اور دس ہزار کی منصب داریاں شہزادگان والا تبار کیلئے مخصوص تھیں۔ ٹوڈرمل کو ہفت ہزاری کا منصب عطا کیا گیا تھا۔ پانچہزار سے کم جو منصبدار کا عہدہ تھا اُسکو کسی خطاب سے سرفراز نہیں فرمایا گیا تھا۔ البتہ پانچ سو سے لیکر پچیس سو تک جو منصبدار تھے ان کو امراء کے خطاب سے ممتاز کیا گیا تھا۔ اعلیٰ ترین خطاب امیر اعظم تھا۔ کبھی کبھی بعض اشخاص کو امیر الامراء کے خطاب سے سرفراز کیا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں خانخاناں بھی نہایت ممتاز اور باعث افتخار خطاب تھا۔ جس سے بیرم خان خان بابا کے صاحبزادے کو سرفراز فرمایا گیا تھا۔

مالی اصول اور انتظامات ۔ سیاسی انتظامات کے بعد مالی انتظامات کا بیان ضروری ہے لہذا

ذیل میں ان پر روشنی ڈالی جائیگی:۔

آئے دن کی جنگوں کا خیال مدِنظر رکھکر اکبر نے اس امر کا انتظام رکھا کہ ہمیشہ شاہی خزانہ معمور رہے مالی انتظام کے سلسلے میں متدین اور معتبر اشخاص کا تقرر عمل میں آیا۔ خزانہ شاہی کے رائج الوقت سکے کے ایک جانب "اللہ اکبر" اور دوسری جانب "جل جلالہ" کا نقش کندہ تھا۔

مالگزاری کا کل کام دیوان کے تحت تھا جس کے پاس باضابطہ محکمہ ہوتا تھا۔ صوبہ جات میں یہ اپنے محکمے کے روزانہ متعلقہ کاروبار کو انجام دیتا رہتا تھا۔ اس کا تقرر بھی مرکزی حکومت کی طرف سے عمل میں آتا تھا۔ جس طرح صوبہ دار کو مرکزی حکومت کے احکام کی پابندی اور اس کی ہدایات کا انتظار رہتا تھا۔ اسی طرح دیوان کو بھی رہتا۔ اراضی کی پیمایش اور تشخیصِ محصول کا کام اسی کے تفویض تھا۔ پیمائش کے لئے "الہی گز" مقرر تھا جس کی لمبائی تخمیناً (۳۳) انچ تھی (اس میں بعض کو ذرا سا اختلاف ہے۔ کوئی قطعی رائے قائم نہیں ہوئی۔ کوئی کہتا ہے کہ اسکی لمبائی (۱/۱۲ ۳۰) انچ تھی) تشخیص اراضی کا طریق دہ سالہ تھا اور ان کو چار حصّوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ مثلاً:۔

پولج۔ اس میں ہمیشہ کاشت ہوا کرتی تھی۔

پراوتی۔ اسکو سال دو سال کے لئے بغیر کاشت کئے چھوڑ دیتے تھے تاکہ اُس کی قوت پیدا آوری عود کرتی رہے۔

چاچر۔ اس میں چار سال تک مسلسل کاشت نہیں ہوتی تھی۔

بنجر اسکو پانچ سال یا اس سے زائد مدت تک بغیر کاشت کے چھوڑ دیا کرتے تھے۔

پہلی تین قسموں کی دوبارہ تین تین قسمیں کی گئی تھیں اور ان کی اوسط آمدنی پر ۱/۳ محصول عائد کیا جاتا تھا۔ محصّلین کو خاص طور پر ہدایت کی گئی تھی کہ کاشتکاروں کو مجبور نہ کریں۔ اگر وہ محصول بہ شکل زر دینے سے معذور ہوں تو ان سے بشکل جنس ہی وصول کر لیا جائے قحط سالی کے زمانے میں تو محصول معاف بھی کر دئے جاتے تھے۔ مقررہ محصول سے زائد لینے کے لئے محصّلین کو بطور خاص منع کیا گیا تھا۔ نیز اہلِ فوج کو بھی سخت تاکید تھی کہ کوچ کے وقت وہ فصل کو برباد نہ کریں

اصول فتوحات۔ فتوحات حاصل کرنیکی امنگ اور کل ہندوستان پر تصرف حاصل کرنے کے عزم بالجزم نے اکبر کو اس امر پر آمادہ کیا کہ وہ اپنی سیادت کو ملک کے ہر ایک گروہ۔ اور قوم

سے (بلالحاظ ملت و مذہب) منوائے۔ بادشاہ کا یہ مقصد تھا کہ کل اقوام ہند اُسکے سامنے سر تسلیم خم کریں اور باجگزار رہیں۔ اس دعوے کے تاویل عجیب پُر لطف اور ایک حد تک معقول ہے۔ دعویٰ یہ ہے کہ جس طرح ساری دنیا ایک ہی خدائے برتر کے زیر حکومت ہے اسی طرح کل ملک پر بھی ایک ہی ہستی کی حکومت قائم رہے تاکہ تمام کاروبار میں یکرنگی اور یکسانی ہو۔ مختلف بادشاہوں کے وجود سے امن و آسائش معرض خطر میں پڑ جاتی ہے۔ اس قسم کا خیال بادشاہ کے دماغ میں اس قدر راسخ ہوگیا تھا کہ اس نے اس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے رُوسا، اور اقوام ملک کے سامنے پیش کیا۔ بعضوں نے بادشاہ کے خیال اور رعب و داب سے متاثر ہوکر فوراً اتفاق کرلیا۔ جس کی وجہ سے وہ مراحم خسروانہ سے مالامال کئے گئے۔ اور شاہی قوت میں اُنکی قوت بھی شامل کرلی گئی جنھوں نے اختلاف کیا اُن سے جنگ کی گئی جس کا نتیجہ ہمیشہ غنیم کی پسپائی اور بادشاہ کی فتح و ظفر میں رونما ہُوا غنیم کو شکست دینے اور مغلوب کرنے کے بعد بھی اس کی طاقت و قوت کو ضائع نہ ہونے دیا بلکہ شاہی طاقت و قوت میں اسکو شامل کرلیا گیا۔ اس بالغ نظرانہ اصول کی جھلک اکبر کی ہر جنگ میں نظر آتی ہے ۱۵۵۶ء سے ۱۶۰۵ء تک جنگ و جدال کا زمانہ گزرا زبردست سے زبردست حریف مقابلے پر آئے لیکن میدان سے بے نیل مرام ہیک بینی و دوگوش واپس ہُوئے۔ اکثر تو جانبر بھی نہ ہوسکے۔ بادشاہ کی شجاعت اور بے نظیر قابلیت نے عظیم الشان فتوحات حاصل کیں۔ چنانچہ ۱۶۰۵ء میں ہندوستان کے نقشے کی حالت ظاہر کرتی ہے کہ کشمیر سے دکن تک اور سندھ و بلوچستان سے بنگال کے آخری حدود تک اکبر بادشاہ کی سیادت کا سکّہ رواں تھا۔ ان فتوحات کا سیلاب بڑھا چاہتا تھا اور دوسری طرف کشمیر کے حدود طے کرکے تبّت کی طرف گزرا چاہتا تھا کہ وہاں کے والیانِ ریاست نے نہایت عجز و انکسار سے دربار مغلیہ میں مصالحت و اطاعت کے پیام روانہ کئے اور باجگزار ہونیکا اقرار کیا +

ان فتوحات کے تذکرے سے شاید ناظرینِ کرام کے دل میں یہ خیال پیدا ہوگا کہ بادشاہ موصوف کے پاس مستقل طور پر لشکر جرار موجود تھا، باقاعدہ توپ خانہ تھا یا اعلیٰ تعلیمیافتہ تیرانداز اور جنگجو موجود تھے۔ لیکن مورخین کو اس امر پر اتفاق ہے کہ بادشاہ موصوف کے پاس تھوڑی سی مستقل فوج تھی جنگ کے وقت جو فوج مہیا ہوتی یا تو اُجرت پر جمع کی ہوئی ہوتی یا منصبداروں کی فراہم کردہ ہوتی توپ تفنگ کی تیاری میں بیشک

بادشاہ کو خاص مہارت حاصل تھی لیکن وہ ایسی زبردست تیار نہیں ہوئی تھیں۔ جن پر عظیم الشان فتوحات کا دارومدار ہوسکے۔ اعلیٰ سپہ گری کے ساتھ ساتھ بادشاہ کو تیر اندازی میں یدطولیٰ حاصل تھا۔ رانا کی موت (جنگ چتوڑ کے زمانے میں) کا اصلی سبب بادشاہ کی تیراندازی تھی۔ عین لڑائی میں بادشاہ نے موقع پاکر رانا کو تیر کا نشانہ بنایا۔ اور فتح کامل حاصل کرلی۔

اکبر بادشاہ میں علاوہ مذکورہ بالا اصول اور صفات کے وہ انتظامی مادہ بھی موجود تھا۔ جو ایک کامل سپہ سالار کے لئے ازبس ضروری ہے۔ فوج کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو۔ لیکن اگر منظم حالت میں نہ ہو تو تھوڑی سی باقاعدہ اور منظم فوج کے مقابلے میں تاب مقاومت نہیں لاسکتی۔ بادشاہ میں کامل جنرل کی صفت بدرجۂ اتم موجود تھی۔ شاہی ہدایات کے بموجب فوج صف آرا ہوتی اور غنیم سے مقابلہ کرتی۔ بسا اوقات شاہی معتمدین کے زیر کمان جنگ پر فوج روانہ کی جاتی تھی۔ جو کچھ فوج مستقل طور پر ہوتی اس پر خاص نگرانی رکھی جاتی تھی۔ منصبداروں کے پاس جتنے بھی گھوڑے رکھے جاتے ان پر داغ لگادئے جاتے تھے تاکہ شاہی جانوروں کا سرقہ نہ ہوسکے اور اگر ہو بھی جائے تو بآسانی پتہ چل سکے۔

فوجی انتظامات کے بعد معاشرتی انتظامات کا مسئلہ رہ جاتا ہے جس پر روشنی ڈالنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

معاشرتی اصلاح۔ جوں جوں آسودگی اور خوشحالی بڑھتی گئی تہذیب و تمدن کو ترقی دینے کا خیال بھی پیدا ہوتا گیا۔ بادشاہ کی نظر معاشرتی حالات پر پڑی اور بعض باتیں قابل اصلاح معلوم ہوئیں۔ چنانچہ ذیل میں اُن کی تفصیل درج کی جاتی ہے:۔

ملک میں قدیم زمانے سے کمسن لڑکیوں کے شادی بیاہ کی رسم چلی آتی تھی۔ چنانچہ اب بھی اس کا رواج ہے۔ اسکے نقصانات کو پیش نظر رکھ کر بادشاہ نے اس رسم کو قطعاً موقوف کرنے کے لئے احکام نافذ فرمائے۔ اس طرح ستی کی رسم کے لئے بھی جو عہد برطانیہ میں بالکل موقوف کردی گئی۔ امتناعی احکام جاری ہوئے۔ بیوہ کی دوبارہ شادی کے متعلق ہنود میں جو ممانعت ہے اسکو بھی منسوخ کردیا گیا۔ مسلمانوں میں لڑکوں کا ختنہ اکثر مرتبہ کمسنی میں ہوتا ہے اس رسم کے بارے میں یہ اصلاح کردی گئی کہ لڑکا جب تک بارہ سال کا نہ ہوجائے اُس وقت تک ختنہ نہ کیا جائے

علاوہ ازیں گائے۔ اونٹ اور گھوڑے کے ذبح کرنے کے بارے میں بھی امتناعی احکام صادر کئے گئے۔ ان تمام احکام کی تعمیل کے لئے کوتوالِ شہر کو خاص طور پر نگرانی رکھنی پڑتی تھی، عدول حکمی کی صورت میں باضابطہ چارۂ کار موجود تھا۔

اس عہد کے چند عہدے۔ اکبر کے عہد حکومت میں جو عہدے مقرر کئے گئے تھے اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ نظام حکومت کس قدر منظم اور سُلجھا ہُوا تھا اور بادشاہ کی اس میں کس قدر حکمت اور دور اندیشی مضمر تھی جلیل القدر اور ممتاز ترین عہدہ دار وکیل تھا جسکو وزیر اعظم بھی کہتے تھے۔ بادشاہ کی طرح یہ بھی تمام شعبہ جاتِ حکومت پر نگرانی رکھتا تھا اور ہر وقت مشورے میں شریک رہتا تھا۔ مالیات کا کام جس طرح ابتدائی بیان میں ظاہر کیا گیا ہے دیوان کے زیر نگرانی تھا تنخواہوں کی تقسیم، ملازمین سلطنت کے دفاتر کی حفاظت۔ جنگ کے وقت فوج کی ترتیب اور محلات شاہی کی نگرانی کیلئے بخشی مقرر تھا اور تمام کاروبار متعلقہ کا وہی ذمہ دار تھا۔ انصاف کرنیکے لئے عدالت کا ایک بڑا محکمہ قائم کیا گیا تھا جس میں میر عدل اور قضاء اجلاس کیا کرتے اور فریقین کی نزاعات کا تصفیہ کیا کرتے تھے۔ قضاء کا کام میر عدل کو صحیح مشورہ دینا اور مقدمہ فیصل ہوتے وقت مدد دینا تھا۔ اس فیصلے سے اگر کوئی فریق ناراض ہوتا تو اسکے لئے بادشاہ کی طرف رجوع کرنیکے لئے موقع حاصل تھا۔ بادشاہ ہر وقت اس قسم کی اپیل سُننے کے لئے مستعد رہتا تھا۔ فیصلے مقررہ احکام قانون اور شرع وغیرہ کے موافق صادر ہوتے تھے علاوہ ازیں کوتوال کا بھی عہدہ تھا جسکا تذکرہ ابتدائی بیان میں کر دیا گیا ہے۔

غرض کہ اکبر بادشاہ میں قدرت نے وہ غیر معمولی انتظامی قابلیت ودیعت فرمائی تھی جس کی وجہ سے اس نے اپنے جدامجد ظہیر الدین بابر بادشاہ کی ڈالی ہُوئی بناء پر مغلیہ سلطنت کی سر بفلک عمارت کھڑی کی۔ اسکی شہرت اور عظمت آج بھی اسی طرح باقی ہے جس طرح اُس کی زندگی میں تھی۔ اس کا نام بہ حیثیت فاتح اعظم کے صفحۂ دہر پر جلی قلم سے لکھا ہُوا ہے اور رہیگا۔ مورخین اکثر اسکا مقابلہ یورپ کے فاتحین مثلاً سکندر اعظم۔ نپولین بونا پارٹ وغیرہ سے کیا کرتے ہیں اور بغیر اس نتیجے پر پہنچے کے نہیں رہتے کہ اکبر اُن مشاہیر عالم سے کسی طرح کم نہیں بلکہ بعض امور میں قابل ترجیح ہے، بلاشبہ اولوالعزم فاتحین اور مشہور سلاطین کی محفل میں اکبر بادشاہ کا شمار پہلی صف میں ہے۔

تجمل حسین

شیفتۂ محال

اخترِ صبح کی فضا! اے سحرِ سکوں نما!
مجھ کو یہ بھید تو بتا مقصدِ زندگی ہے کیا؟

گلشنِ ہست و بود میں
اِک دلِ پُر ملال ہوں
گرچہ خموش ہوں مگر
میں ہمہ تن سوال ہوں!

اک دلِ پُر ملال ہوں غرقِ یمِ خیال ہوں
بے خبرِ مآل ہوں منتظرِ کمال ہوں

بر لبِ جوئے زندگی
شیفتۂ محال ہوں!
گرچہ خموش ہوں۔ مگر
میں ہمہ تن سوال ہوں!

امینِ حزیں

ریاضیات

خواص الاعداد کا تاریخی پہلو

ہر عنوان پر قلم اُٹھانے سے پہلے اُس کے واضع اور ضرورتِ وضع پر نظر کرنا فطرت انسانی میں داخل ہے، اسی لئے تمام علوم کے موضوع مقدم الذکر ہوتے ہیں۔ ہر موضوع کے دو رخ قابل الذکر ہیں (۱) مافیہ (۲) ماعلیہ لیکن مصنفین کا زور قلم مافیہ کے بیان میں ختم اور ماعلیہ کا تارک ہوا کرتا ہے اور یہی رخ تاریخ کے لئے چھوڑ دیا گیا ہے اسی وجہ سے کسی علمی کتاب میں اُس کے مبدء و معاد "تدوین و اضافات" کا ذکر نہیں ہوتا۔ بلکہ اپنی بیتی تاریخ سے کہلوائی جاتی ہے۔ تاریخ واقعات اقوام و ملل و انقلابات شخصی و قومی کو اپنا اصلی مقصد جان کر ایسی مبتلا ہوتی ہے کہ گاہ گاہ اُسکو قطع نظر کرنا پڑتا ہے اور بعض علوم کا حال مجہول رہ جاتا ہے۔ اور اگر فیصدی ایک یا دو تاریخوں نے لکھ بھی دیا تو مستنبطین کے لئے اس قحط الکتب اور افلاس کی بارش میں استنباط دشوار رہے یہی اسباب ہیں جن سے تاریخدان دماغوں میں اختلاف کی تخم ریزی ہوتی ہے ؛

ریاضی کا موضوع عدد ہے اور اُس کی کثیر تعریفوں میں سے ایک تعریف یہ ہے کہ "جو کئے" کے جواب میں کہا جائے موضوع مذکور کے ایک رخ مافیہ پر مستقل و کافی تصانیف موجود ہیں جو خواص اعداد، مراتب طبعی و اضافی اُنکے باہمی ربط و نتائج سے آگاہ کرنے میں خاصے کار آمد ہیں۔ لیکن دوسرا اہم و دلچسپ رخ یہ بھی ہے کہ دنیا کی عدد آشنائی و ضرورتِ آفرینش عدد کی تاریخ مرتب ہو اور عقل و ادراک کی مناکحت سے جو سلسلۂ توالد شروع ہوتا ہے اُس کا انضباط کیا جائے مبدء سے درمیانی اضافوں، انتہائی ترقیوں کو روشنی میں لایا جائے جس سے ہر عہد کی علم پروری کے ساتھ ساتھ ذہن انسانی کے ارتقا کی تاریخ مرتب ہوتی جائے اسکے برخلاف ہمارے مصنفین کا یہ حال ہے کہ جب لکھنے بیٹھتے ہیں تو اصل علم سے قبل بسم اللہ کی شرح (تفسیر سے جداگانہ) ہر علم کی کتاب میں شروع کر دیتے ہیں اور خطبہ کی صنائع ادبیہ و واردات نحوی و صرفی کا ایک نکتہ ترک نہیں کرتے پھر امابعد کے جوڑ توڑ پر کافی سے زیادہ وقت صرف کرنے میں بھی انکو افسوس نہیں ہوتا ؛

اور جب اختصار پر آتے ہیں تو ختم کتاب پر اپنا نام بھی نہیں لکھتے چنانچہ آج بیشمار قلمی نسخے ممتاز کتبخانوں میں ایسے موجود ہیں جو سرے سے خالق و مخلوق کی نسبت ہی نہیں رکھتے بالکل اسی طرح بعض علوم بھی تاریکی میں ایڑیاں رگڑ رہے ہیں اور فضائے شعاع سے اُن کا کوئی ربط نہیں ہے ؛

انہی میں سے ریاضی کا پہلا شعبہ خواص الاعداد بھی ہے جو اپنے موجد کو کسی گنتی میں شمار نہیں کرتا اور جس طرح اس فن کا موجد پوشیدہ ہے اُسی طرح اُس کے مولد و منشاء کا بھی نشان نہیں ؛

ہندوستان اپنا راس المال بتاتا ہے ریگستانِ عراق اپنے ذرات میں سے ایک ذرہ جانتا ہے حکمت کدۂ یونان اپنی طرف سے فرعاتِ بعض کا شمار دلیلاً پیش کرتا ہے رومۃ الکبریٰ اپنے دعوائے شاہی پر نازاں اور ایران اپنے عروج اولین کے خیال سے مالکانہ نگاہیں ڈال رہا ہے لیکن موجد اول کا صاف صاف پتہ کسی دنیا میں نہیں ہے ؛

ارشمیدس اول جو طوفان نوح سے اول اور ریاضی کا متبحر عالم ہے اس پر شبہ کی گنجایش تو ہے مگر ایقانِ تسلی کیلئے کوئی دلیل موجود نہیں اسکے بعد اقلیدس النجار کا نام بھی لیا جاتا ہے لیکن یہ ارشمیدس سے بعد ہے تو موجد کیونکر کہا جا سکتا ہے۔ ان دونوں کے بعد بطلیموس القلوذی پر نگاہیں پڑتی ہیں جو علوم حکمت کا آدم اور ہیئت و نجوم کا ماہر اول تھا یہ سچ ہے کہ ہیئت و نجوم کا ستارہ طالع بطلیموسی ہی سے مقام شرف پر پہنچا اور آلاتِ رصدیہ کے استعمال و ایجاد کا سہرا اسی کے سر رہا لیکن خواص الاعداد کا ایجادی مرتبہ اسکو بھی دستیاب نہیں ہے ؛

یہ اعتراف ضروری ہے کہ بطلیموس کے تلازم تبحر کی موجیں اس ساحل (خواص الاعداد) سے بھی بار بار ٹکرائی ہیں اور اسکی غواص طبیعت نے تصانیف کی صورت میں چند بیش بہا موتی حاصل کئے ہیں۔ مگر اس سے پہلے طبیعت انسانی نے اپنے ہاتھ کی پوریں گن لی تھیں اور اس مختصر اور قدرتی صحیفہ سے علم حساب شروع ہو چکا تھا تذکرہ بطلیموس میں کہا گیا ہے هو صاحب کتاب المجطی امام فی الریاضیہ کامل فاضل من علماء یونان ۔ لیکن امام ہی کہا گیا ہے اور مرتبۂ فاطر تک پہنچنے کے لئے ایک زینہ نبوت بیچ میں اور باقی ہے صرف لفظ امام مفید ایجاد نہیں ہو سکتی۔ درحقیقت بطلیموس موجد کے حساب سے متاخرین میں ہے ؛

یہاں تک کہ مصنف صناعت الحساب نے آخر اپنی ناکامی کا اعتراف ان الفاظ میں کر لیا۔

لیس لنا علم بمبدء هذا الفن وایجاده فلا ندری متی اوجد وکیف ابتدع ٭

آگے چل کر بھی مصنف کہتا ہے کہ حکم عقلی یہ ہے کہ جہاں ضرورت حساب ابتداءً پیدا ہوئی ہوگی۔ اُسی زمین کو اس فن کے مولد کا بھی شرف حاصل ہُوا ہوگا اور حساب کی ضرورت تجارت کو سب سے زیادہ ہے لہذا دنیا کی پہلی تجارت گاہ کو حساب کے گہوارہ جنبانی کا فطری حق ہے۔ واذ کان مفتح التجارة من عراق العرب فحکمنا ان الحساب عراقی المولد والمنشاء

صاحب صناعة الحساب کی رائے ایک حد تک درست ہے اور انکے قیاس کو تاریخی روشنی میں لایا جا سکتا ہے انہی کی رائے پر عراق ومصر ویونان کی حسابی زندگی کی جستجو سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ادریس بن قینان بن انوش بن ہیبت اللہ شیث بن صفی اللہ آدم جو حضرت نوح سے بھی قبل اور ارشمیدس اول سے بھی مقدم اور اکثر صنائع کے موجد اول ہیں عراق ہی کی زمین پر پیدا ہوئے اور بابل کی تازہ تازہ سلطنت سے زور نبوت کو ٹکرانے لگے ساتھ ہی ساتھ قلم سے لکھنا اور درس وتدریس کا سلوک بھی موجد بن کر شروع کیا۔

هو اول من استخرج الحکمة وعلم النجوم فان اللّٰہ افهمه سر الفلک وترکیبه ونقطة اجتماع الکواکب فیه وافهمه عدد السنین والحساب ولولا ذالک لم تصل الخواطر باستقرائها (اخبار العلما باخبار الحکما واخبار الدول)

بابل کی متمرد قوم نے جب آپکی نہ سنی تو حضرت ادریس اپنے چند طالب علموں کو لیکر ہجرت پر آمادہ ہوئے چونکہ یہ طلبہ بھی آخر اُسی قوم سے تھے۔ اس لئے انہوں نے ایک تازہ عذر پیدا کیا یعنے دجلہ وفرات کی لہریں ہمارا دامن نہیں چھوڑتیں اور یہ کثیر پانی ترک نہیں کیا جاسکتا آپ نے وعدہ فرمایا کہ تمکو اس پانی کا عوض بھی دیا جائیگا ٭

اس وعدہ پر شاگرد راضی ہوئے اور حضرت ادریس ۸۲ برس کے سن میں رودنیل (مصر) کے کنارے آبسے دریائے نیل کی لطافت وکثرتِ آب نے تلامذہ کے دل سے بھی کدورت دھوڈالی ٭

زمین مصر غیر آباد نہ تھی مگر تمام آبادی پر قربت مبدء کی وحشت برس رہی تھی اسی لئے کثیر آبادی جنگلی زندگی اور صحرائی زبانوں میں حیات انسانی کی روشنی کو دھندلا کر رہی تھی اُن میں بہتّر زبانیں جاری تھیں۔ اور تشتت اللسن اُنکے وطنی نفاق اور قومی منافرت کا باعث تھا ٭

حضرت ادریس نے اپنے درس کے لئے کسی زبان کو مخصوص نہیں کیا بلکہ ہر طبقہ کے لہجہ میں پڑھانے

لگے اگر آپ ایسا نہ کرتے تو جنبہ داری کا الزام بہت جلد قوم میں آپکی وقعت کو کھو دیتا۔ یہانتک کہ قوم میں تعلیم عام ہوگئی اور وحشی آبادی حیوان و انسان کے حفظ امتیاز کو تیز کرنے لگی تعلیم کے ساتھ ساتھ علم تمدن پر بھی عمل درآمد شروع کر دیا گیا تھا اور شہر والے تین قسم پر منقسم ہوئے رعایا بادشاہ کاہن کاہن حاکم کل تھا۔ لیکن اسکو رعایا کے تمدنی و معاشرتی معاملات سے تعلق نہ تھا بلکہ یہ احکام آسمانی کی رپورٹ بنا کر سالانہ یا ششماہی بادشاہ کے سامنے پیش کرتا تھا اور بادشاہ احکام پر عمل کرتا تھا۔

آپ کے درس میں حساب بھی تھا اور یہی وہ حساب تھا جس کا مولد عراق تھا لیکن اسکی جولانگاہ ترقی مصر کی زمین تھی جہاں عہد فیثا غورث تک نشو نما پاتا رہا کیونکہ یہ مشہور حکیم یونانی النسل تھا اور تحصیل علم کے لئے مصر میں آیا تھا اور سب سے پہلے اس نے حساب ہی سیکھا اور ایک مدت کے قیام کے بعد اپنے وطن میں آیا اور حساب کی تعلیم دینا شروع کی جہاں کی آبادی اس علم سے قطعی ناواقف تھی۔

فیثا غورث نے تعلیم کے ساتھ ساتھ اصل علم میں اضافات بھی شروع کئے اور مستقل تصانیف سے اس علم کی تدوین و تشریح و توشیح کا کام بھی لیا۔ حکمت کا ایک شعبہ تالیف الالحان (موسیقی) جس طرح اسکی لطیف ایجاد تھی اُسی طرح خواص الاعداد بھی اسکی عرق ریزیوں کا ممنون ہے۔ اس جدت آفرین حکیم سے پہلے صرف جمع و باقی کا رواج تھا اور اُس عہد کی چھوٹی تجارتوں اور شاہی خزانوں کے لئے اسی قدر حساب کافی جانا جاتا تھا

فیثا غورث نے اکثر چیزوں کا اضافہ کیا اعداد کا نظم ضرب و تقسیم اعداد کے اقسام اور اُنکے نتائج یہ سب کچھ اسی حکیم کی کاغذی مخلوق ہے۔

فیثا غورث اور تعریف اعداد

اعداد کی پہلی تعریف ہم بیان کر چکے ہیں فیثا غورث نے ایک نئی اور بہترین تعریف پیدا کی جو تعریف اول سے بہتر و لطیف ہے اس لطافت کے ساتھ خود حکیم کے جذبات مذہبی بھی ظاہر ہوتے ہیں اور کم از کم اس کا موحد ہونا ثابت ہوتا ہے۔

فیثا غورث نے عدد کی تعریف اس طرح کی ہے کہ عدد اپنے مجموعہ ماقبل و مابعد کا نصف ہوتا ہے۔ جیسے ۲ کہ اس سے پہلے ۱ ہے اور بعد ۳ ایک اور تین کا مجموعہ ۴ ہے اور ۴ کا نصف وہی دو اس تعریف سے کوئی عدد خارج نہیں ہے البتہ واحد کہ اُس سے ماقبل کچھ نہیں ہے، مگر فیثا غورث (۱) کو اعداد میں داخل

نہیں کرتا بلکہ اُس کو خالق اعداد دمبدء منشائے اعداد کہتا ہے اور (۲) کو اول عدد جانتا ہے۔ چونکہ تکرار کا مجموعہ عدد ہوتا ہے اور پہلی کثرت ۲ سے شروع ہوتی ہے اس لئے یہی عدد اول ہے ۔

توحید پرست اسلام و فرزندان توحید مسلمان فیثاغورث کے اس عقیدے کو دیکھ کر اپنے دماغوں کے محفوظات پر ناز کریں تو بیجا نہیں ہے اس لئے کہ وہ اسی شمار کو توحید میں مان چکے ہیں خدا کو واحد اور اپنے رسول کو کائنات کی ہستی اول اور شمار میں دوسری ذات تسلیم کرتے ہیں۔ حکیم اسلام امیرالمومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام (گویا) فیثاغورث کی اصطلاح میں رسولخدا کی تعریف فرماتے ہیں۔ یہ وہ وقت ہے جب آپ نے آنحضرت کو زمین مزار پر لٹایا ہے اور اب قریب ہے کہ حجاب عرش تک پہنچنے والا پردہ خاک سے چھپ جائے۔ اُس وقت آپ فرماتے ہیں اللھم ھذا اول العدد وصاحب الابد جسمہ معانی الملک والملکوت وقلبہ خزانۃ اللہ الذی حی لا یموت الخ (نہج البلاغت)

فیثاغورث سے پہلے واحد بھی شامل اعداد تھا اس لئے کہ یہ بھی گنے کے جواب میں بولا جاسکتا تھا لیکن اس حکیم نے واحد میں وہ آثار دیکھے کہ آخر اعداد سے علیحدہ ایک مرتبہ واحد کے لئے تجویز کرنا پڑا فیثاغورث نے دیکھا کہ واحد احد سے مشتق ہے اور احد کے معنے یہی ہیں کہ جس میں جز غیر شریک نہ ہو اس لئے جب احد اپنے پورے معنوں میں ہوگا تو ناقابل تقسیم ہوگا اور عدد تقسیم چاہتا ہے اسی طرح وہ دیکھتا ہے کہ بغیر واحد کے ملنے کے کوئی عدد پیدا نہیں ہوا یعنی واحد کی تکرار ۲ اور ۲ میں واحد کا ملنا ولادت ۳ کا سبب ہے اس لئے وہ واحد کو خالق اعداد مانتا ہے اور اعداد کی فہرست سے اس لئے خارج کرتا ہے کہ خالق و مخلوق ایک جنس سے نہیں ہوتے یونہی جسطرح (۱) کا مرتبہ فطری اولیت ہے اس طرح وہ آخر بھی ہے یعنے اعداد کو جہاں سے چاہو کم کرتے چلے جاؤ لیکن سب کے بعد واحد باقی رہیگا جو اسکے قدم پر دلیل ہے۔

غرض ان مسائل کو کلام کی روشنی میں دیکھا جائے تو ایک موحد کے معتقدات پائے جائینگے اور یہ سب کچھ ہمارے لئے بعید از عقل نہیں ہے اس لئے کہ اول تو وحدت پرستی عقلی و فطری ہے دوسرے فیثاغورث کا دعوے تھا کہ اُسکی تربیت و تعلیم مشکوۃ نبوت (ا دمبیاء حضرت سلیمان بن داؤد) کی روشنی میں ہوئی ہے ۔

فیثاغورث اور اقسام اعداد

اس حکیم سے پہلے حساب کا دامن تنگ تھا اور اسی لئے اعداد کو قسموں کی ضرورت نہ تھی

لیکن جب حساب کو وسعت درکار ہوئی تو اس حکیم نے قسم قسم کے اعداد سے کام لینا شروع کیا اور ہر قسم کا ایک نام علیحدہ وضع کیا جن میں سب سے پہلے صحیح و کسور کی تقسیم ہے ٭

مراتب اعداد میں اضافہ

پہلا حساب اس قدر مختصر تھا کہ کل بارہ لفظوں پر اصطلاح عددی تمام ہوجاتی تھی ایک سے ۹ تک ۹ اسم تھے جنکو احاد (اکائی) کہا جاتا تھا اور دسواں نام عشرات (دہائی) اور پھر ماٗسات (سینکڑہ)۔ اور الوف (ہزار) پر بارھواں نام فہرست اعداد کا خاتمہ کردیتا تھا، فیثاغورث نے کرور دس کرور تک اضافہ کیا اور حسب ضرورت اضافہ کی اجازت دی ٭

عدد کسور

فیثاغورث نے ان اعداد کو بے پایاں بتایا ہے کیونکہ صحیح بھی تقسیم کے بعد کسور ہوجاتا ہے مگر اُن کے حصوں کے دس نام رکھے ہیں جن میں سے ایک اسم عامہ مبہمہ (جزء) ہے اور نَو نام مخصوصہ مفہومہ ہیں ان میں سے ایک وصفی (نصف) اور آٹھ مشتق ہیں یعنے ثلث و ربع و خمس وغیرہ جزء کا اختراع علم حساب کے لئے بہت کچھ مفید ثابت ہُوا ہے اور بہت سی دشواریاں آسان ہوگئی ہیں اس لئے کہ بعض اجزاء ان مرسومہ الفاظ کے حدود معنے سے باہر تھے جیسے ۱۱ میں سے ۱ ثلث و ربع وغیرہ میں نہ گنا جاسکتا تھا $\frac{1}{11}$ کا جزء کہا جاتا ہے ٭

خواص الاعداد

اعداد کی مجموعی تعریف کے بعد ضرورت پیدا ہُوئی کہ تمام اعداد میں خط تمیز پیدا کیا جائے اس لئے خواص اعداد کی اختراع کی گئی خواص خاصہ کی جمع ہے اور خاصیت تعریف مخصوص کو کہتے ہیں جو غیر میں نہ پائی جائے ٭

۲

کو عدد اول اور تمام اعداد ازواج کا نصف مانا ہے اگرچہ نصف آخر ہی کیوں نہ ہو جیسے آٹھ کا نصف چار اور چار کا نصف دو

۳

اول اعداد افراد ہے۔

۴

اول عدد مجذور ہے جذر و مجذور وہ عدد ہیں جو خود اپنے میں ضرب دئے جائیں جیسے ۳ کو ۳ سے ضرب دیا جائے تو ۹ پیدا ہونگے ۳ کو جذر اور ۹ کو مجذور کہینگے چونکہ چار دو کی ضرب سے حاصل ہوا ہے اس لئے مجذور ہے۔

۵

عدد دائر ہے جب اسکو اسکے ساتھ ضرب دو تو خود ہی پلٹ پڑیگا جیسے ۵/۲۵ یہ عدد کسی دوسرے عدد میں مخلوط نہیں ہوتا بلکہ ضرب اول میں جو اعداد اسکے ساتھ ہو جائیں ضرب آخر میں انکی بھی حفاظت کرتا ہے ۲۵/۶۲۵ ۲۵ اور ۶۲۵/۳۹۰۶۲۵ ۶۲۵ ہوتے ہیں۔

۶

اول عددِ تام کیونکہ اسکے اجزا کا مجموعہ اسکی ذات ہے نصف ۳ ثلث ۲ سدس ۱ ان سب کا مجموعہ ۶ ہے۔

۷

اول عدد کامل ہے اس لئے کہ اعداد یا زوج ہوتے ہیں یا فرد (طاق وجفت) فرد اول ۳ ہے اور فرد ثانی ۵ اور زوج اول ۲ ہے اور زوج ثانی ۴ اور ان چاروں کو آپس میں ملانے سے ۷ پیدا ہوتے ہیں ۵و۲=۷ یا ۴و۳=۷

۸

عدد مکعب و مجسم ہے مکعب وہ عدد ہے جو مجذور کے جذر میں ضرب سے حاصل ہوتا ہے جیسے ۲ ۸ پیدا ہوتے ہیں اور مجسم اس لئے کہا گیا ہے کہ اس میں نقطہ و خط و سطح پائے جاتے ہیں اسکو فن ہندسہ کے مضمون میں بیان کیا جائیگا واللہ ولی التوفیق۔

۹

اول فرد مجذور اور آخر مرتبہ احاد ہے اس لئے کہ جب تین سے ضرب دیا جائے تو ۹ حاصل ہوتے ہیں۔

۱۰

اول عشرات ہے متاخرین نے اس عدد کو اپنے ماقبل ۹ اور مابعد ۱۱ کے مجموعہ کا نصف نہیں مانا ہے بلکہ مستقلاً ۲۰ کا نصف کہا ہے تاکہ احاد و عشرات کا بے ربط جوڑ نہ لگے مگر نتیجہ ایک ہی ہے۔

سید اولاد حسین شاعر

غزل

یہ سچ ہے تو گرفتارِ قفس فریاد کیا جانے
گذرتی ہے مگر جو دل پہ وہ صیّاد کیا جانے

ذرا او لذتِ مجبوریٔ دل بڑھ کے سمجھا دے
وہ نو مشقِ جفا اندازۂ بیداد کیا جانے

مری خاموشیٔ مجبور درد انگیز ہے شاید
جگر تھامے ہُوئے پھرتا ہے کیوں صیّاد کیا جانے

کوئی ڈوبا ہُوا تھا کن خیالاتِ پریشاں میں
سنانے والا پیغامِ مبارکباد کیا جانے

مری تخیُّل کی نیرنگیاں بے کیف رہتی ہیں
مجھے بھُولے ہُوئے ہے کیوں تمہاری یاد کیا جانے

وہ دیتے ہیں تسلی اور مجھے تسکیں نہیں ہوتی
ہے اتنا مضطرب کیوں یہ دلِ ناشاد کیا جانے

ستم کش کے لئے اک اک ستم میں کیف ہوتا ہے
یہ رازِ عشق ہے اس کو ستم ایجاد کیا جانے

محمد عبد الحی صدیقی (علیگ)

غزل

جو ابھی پردۂ جمال میں ہے
اُس کا ادراک، کس خیال میں ہے؟

یہ بھی اُمید کا کرشمہ تھا
ورنہ کیا فکرِ ماہ و سال میں ہے

رخصتِ التجا نہیں ملتی
آرزو، حسرتِ سوال میں ہے

سعیِ ادراک کے خلاف نہیں
بحث تو ممکن و محال میں ہے

نگہِ التجا کے ساتھ ہے دل
میری دنیا، مرے سوال میں ہے

اُس کی تصویر ڈھونڈھتا ہے تو
کیوں گرفتاریٔ مثال میں ہے

دل کی بے تابیاں معاذ اللہ
زلزلہ عالمِ خیال میں ہے

اس کو کیا کہتے ہیں، بجز تیرے
سارا عالم مرے خیال میں ہے

بے خودی، بے خودی نہیں گویا
بے خیالی، کسی خیال میں ہے

گویا جہان آبادی

کاندھوں پر مسجد نبوی کا بوجھ رکھا گیا تھا۔ ناقابل تردید سچائی کے اس انکشاف کے بعد کیا کسی کو کلام ہوسکتا ہے کہ انسان اپنے جسم کی پرورش اور حفاظت، دل و دماغ کی تربیت اور روح کی پاکیزگی کیلئے درخت کا رہین منت نہیں؟

۲

کل میں نے ایک مردہ چیز کو دیکھا۔ میرے علاوہ وہاں چند اور لوگ بھی تھے، بچے بوڑھے، امیر و غریب، جو بے معنی نگاہوں سے اُسے دیکھ کر چل دیتے اور نو وارد اُنکی جگہ لیکر اُس مُردہ چیز کو دیکھنے لگتے کچھ حیرت و استعجاب سے اور کچھ خندۂ استہزا کے ساتھ، حتیٰ کہ میں وہاں اکیلا رہ گیا اور اُس چیز کو بادیدۂ نم دیکھنے لگا جس کی غریب الوطنی اور حسرتناک موت پر میرے سوا کوئی تاسف کرنے والا نہ تھا۔ فضائے بسیط پر خاموشی چھا رہی تھی اور میرا دوست چاند کی ٹھنڈی چاندنی میں دریائے جہلم کے کنارے بے حس و حرکت پڑا تھا۔

یہ ایک دیودار کے طوبےٰ قامت درخت کا مضبوط اُور جسیم تنا تھا جو کوہ ہندوکش کے نواح کی رشک ارم وادیوں سے کاٹ کر لایا گیا تھا۔ یہ نوے فٹ مدور اور تقریباً دو ہزار سال کی عمر کا بوڑھا تھا اور اس وقت بھی رائج الوقت روپے کی طرح کھرا تھا جب اسکے قاتلوں نے اپنی انتہائی طاقت صرف کرکے اسے کاٹ ڈالا تھا۔

قاتل!

میرے دل میں خیال پیدا ہوا اور آن کی آن میں یہ ننھا سا خیال مشتعل ہو کر میرے دل و دماغ پر محیط ہوگیا۔ غیر ذمہ دار اشخاص کے ہاتھوں کس طرح درختوں کا قتل عام ہو رہا ہے، محض روپے کی خاطر، تعیش و تنعم کے لئے اور اس انجام سے بے خبر ہو کر کہ قدرت کی فیاضیوں میں خوراک اور ہوا کے بعد انسان کی بقا اور حفاظت کے لئے درخت سب سے زیادہ لازمی چیز ہے۔

پھر رات کے سکوت اور چاند کی پاکیزہ روشنی میں مجھے ایسا معلوم ہونے لگا کہ بوڑھے درخت کی روح مجھے مخاطب کر رہی ہے۔ میں نے اُسے گوش ہوش سے سُنا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی اُس میں حرکت اور زندگی موجود ہے اور وہ اس سعی میں مبتلا ہے کہ مجھے اپنے متعلق کچھ سمجھانے کی کوشش کرے اور مجھے اپنا ایک دوست اور خیر خواہ سمجھ کر جو اتفاقاً اُس سے دو چار ہوا تھا، بنی نوع انسان کے لئے اپنا آخری پیغام دے۔

"سنو اور براہ کرم توجہ سے سنو" ایسا معلوم ہوتا تھا کہ درخت کے مجروح دل سے یہ الفاظ نکل کر میرے دل و دماغ پر نقش ہو رہے ہیں "تم نے سرزمین فراعنہ کا حال پڑھا ہوگا جہاں پرانے کھنڈر اور بیش قیمت خزانوں کی کھدائی ہو رہی ہے اور قدیم مقابر و معابد کو دوران سیاحت میں احترام کی نگاہوں سے دیکھا ہوگا اس لئے کہ

کاندھوں پر مسجد نبوی کا بوجھ رکھا گیا تھا۔ ناقابل تردید سچائی کے اس انکشاف کے بعد کیا کسی کو کلام ہو سکتا ہے کہ انسان اپنے جسم کی پرورش اور حفاظت، دل و دماغ کی تربیت اور روح کی پاکیزگی کیلئے درخت کا رہین منت نہیں؟

۲

کل میں نے ایک مردہ چیز کو دیکھا۔ میرے علاوہ وہاں چند اور لوگ بھی تھے، بچے بوڑھے، امیر و غریب، جو بے معنی نگاہوں سے اُسے دیکھ کر چلدیتے اور نوواردوں کی جگہ لیکر اُس مُردہ چیز کو دیکھنے لگتے کچھ حیرت و استعجاب سے اور کچھ خندہ استہزا کے ساتھ، حتیٰ کہ میں وہاں اکیلا رہ گیا اور اُس چیز کو بادیدۂ نم دیکھنے لگا جس کی غریب الوطنی اور حسرتناک موت پر میرے سوا کوئی تاسف کرنے والا نہ تھا۔ فضائے بسیط پر خاموشی چھا رہی تھی اور میرا دوست چاند کی ٹھنڈی چاندنی میں دریائے جہلم کے کنارے بے حس و حرکت پڑا تھا +

یہ ایک دیودار کے طوبٰی قامت درخت کا مضبوط اور حسین تنا تھا جو کوہ ہند دکش کے نواح کی رشک ارم وادیوں سے کاٹ کر لایا گیا تھا۔ یہ نو فٹ مدوّر اور تقریباً دو ہزار سال کی عمر کا بوڑھا تھا اور اس وقت بھی رائج الوقت روپے کی طرح کھرا تھا جب اسکے قاتلوں نے اپنی انتہائی طاقت صرف کرکے اسے کاٹ ڈالا تھا +

قاتل!

میرے دل میں خیال پیدا ہوا اور آن کی آن میں یہ ننھا سا خیال مشتعل ہو کر میرے دل و دماغ پر محیط ہو گیا۔ غیر ذمہ دار اشخاص کے ہاتھوں کس طرح درختوں کا قتل عام ہو رہا ہے، محض روپے کی خاطر، تعیش و تنعم کے لئے اور اس انجام سے بے خبر ہو کر کہ قدرت کی فیاضیوں میں خوراک اور ہوا کے بعد انسان کی بقا اور حفاظت کے لئے درخت سب سے زیادہ لازمی چیز ہے +

پھر رات کے سکوت اور چاند کی پاکیزہ روشنی میں مجھے ایسا معلوم ہونے لگا کہ بوڑھے درخت کی روح مجھے مخاطب کر رہی ہے۔ میں نے اُسے گوش ہوش سے سُنا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی اُس میں حرکت اور زندگی موجود ہے اور وہ اس سعی میں مبتلا ہے کہ مجھے اپنے متعلق کچھ سمجھانے کی کوشش کرے اور مجھے اپنا ایک دوست اور خیر خواہ سمجھ کر جو اتفاقاً اُس سے دوچار ہوا تھا، بنی نوع انسان کے لئے اپنا آخری پیغام دے +

"سنو اور براہِ کرم توجہ سے سنو" ایسا معلوم ہوتا تھا کہ درخت کے مجروح دل سے یہ الفاظ نکل کر میرے دل و دماغ پر نقش ہو رہے ہیں "تم نے سرزمین فراعنہ کا حال پڑھا ہوگا جہاں پرانے کھنڈرات اور بیش قیمت خزانوں کی کھدائی ہو رہی ہے اور قدیم مقابر و معابد کو دوران سیاحت میں احترام کی نگاہوں سے دیکھا ہوگا اس لئے کہ

یہ تمام کے تمام اُس وقت کے تعمیر شدہ ہیں جب دنیا عروجِ شباب پر تھی۔ اقوامِ عالم کے مخلص فرزندان بتکدوں
عبادتگاہوں اور پرانی یادگاروں کو اس لئے بچا رہے ہیں کہ انکے بعد آنے والی نسلیں انہیں غور و تعمق
سے دیکھیں اور زمانہ گذشتہ کی ہیبت و جبروت اور بنانے والوں کی عالی ہمتی اور الوالعزمی سے متاثر ہوں
لیکن میں، کہ جسکی عروق نیم مردہ میں زندگی کا خون ابھی تک خشک نہیں ہُوا اور جو روضۃ الکبرےٰ کے کھنڈروں، روضہ
ممتاز محل، دہلی کے لال قلعہ، مقبرہ جہانگیر اور نشاط باغ سے بھی زیادہ بوڑھا ہوں۔ اُسکو نیست و نابود کرنیکے لئے
یہ جد و جہد ہو رہی ہے۔ ابھی کل کی بات ہے کہ میں زندہ تھا جب میرے انسان قاتل میرے پاس آئے
اور مجھے ہلاک کر دیا۔ ہلاک کر دیا بلند قہقہوں کے شور میں، حقارت آمیز فقرات اور ایک فتحمندانہ غرور
کے ساتھ۔ لیکن نادان یہ نہ سمجھ سکے کہ میرے ساتھ دو ہزار سال کے علم اور زندگی کو بھی فنا کر رہے ہیں ؛

جب دنیا کا اکمل ترین انسان پیدا ہُوا تھا، جسے تم محمدؐ (صلے اللہ علیہ وسلم) کہتے ہو اور جس کی تعلیم نے
غلام اور شہنشاہ کو اصولِ مساوات کے تحت میں ایک ہی صف کے اندر لا کھڑا کیا تھا، اُس وقت میں عالم
عنفوان میں تھا اور یہ کل کی بات معلوم ہوتی ہے جب خلیفہ عمرؓ نے یزدگرد، ہرقل اور مقوقس جیسے قہار
حکمرانوں کی سلطنتوں کے تختے اُلٹ دیئے تھے ـــــ جب کولمبس جیسے عزم صمیم رکھنے والے انسان
نے نئی دُنیا دریافت کی تو میں اپنے ہمعصروں سے چند بالشت بلند تھا اور جب ازمنہ وسطیٰ کی حکومتوں کا خاتمہ
ہُوا تو اُس وقت میں نیلگوں آسمان کی لامتناہی وسعتوں میں اپنا سر بلند کر رہا تھا کیونکہ یہ خلائے بسیط خلاق
عالم نے درختوں ہی کی سر بلندی کے لئے محفوظ رکھا ہے۔

میں دو ہزار سال کا بوڑھا تھا جب اُنہوں نے مجھے کاٹ ڈالا۔ اور اُن لوگوں نے جو میرے قتل
میں شریک تھے اور اُن سے زیادہ تعداد میں وہ لوگ جو میری ہلاکت کا دلچسپ منظر دیکھ رہے تھے، اس وقت
نہ تو اُنہوں نے روضۃ الکبرےٰ کی سطوت و شوکت، نہ شاہجہان کی محبت و امارت اور نہ جہانگیر کے تاریخی
افسانہائے عشق کا خیال کیا اور نہ رحمۃ اللعالمینؐ کا، جنہیں میرے بھائی، یعنی کھجور کے درختوں سے بیحد
محبت تھی اور نہ خدا کا خیال کیا جس نے مجھے اور میرے قاتلوں کو پیدا کیا تھا ؛

درد و کرب سے لبریز آواز دریا کی مضطرب لہروں کے شور میں آہستہ آہستہ جذب ہو کر رہ گئی
اس تنہائی اور سکوت شب میں نور فشاں چاند اور میں اس داستان الم کو سن کر چشم حیرت بنے ہوئے تھے
شش جہت پر خاموشی مسلط تھی اور میرے دل میں مختلف قسم کے جذبات کروٹیں بدل رہے تھے۔

یکایک ایک قہقہہ کی آواز میرے کان میں آئی، تمسخر و استہزا سے معمور ـــــــ یہ اس دم توڑنے والے معمر درخت کا آخری خندہ تھا جو نیرو کا ظلم، کلیوپیٹرا کی پر معصیت زندگی کے نشیب و فراز، امام حسینؑ کی حق پرستانہ قربانی، فخرِ موجودات کا حلم، فاروقِ اعظمؓ کا عدل و انصاف اور شاہجہان کی شان و شوکت کے نظارے دیکھ چکا تھا اور دو ہزار سال کی تاریخ کے نقوشِ رنگین اپنے دل کے دامن میں پنہاں رکھتا تھا" مجھے اپنے مرنے کا کوئی افسوس نہیں"، ڈوبی ہوئی آواز ٹمٹماتے چراغ کی روشنی کی طرح اُبھرنے لگی" بقائے دوام تو صرف اُسی کی ذات کو ہے جس نے زمین و آسمان پیدا کئے ہیں۔ اگر میری لکڑی کو کسی مسجد یا معبد کی تعمیر کے لئے صرف کیا جائے تو مجھے از حد مسرت ہوگی کہ میری ناچیز زندگی خدائے واحد کی پرستش کرنے والوں کی خدمت کے لئے قربان ہوئی لیکن مجھے افسوس ہوگا اگر میرے گوشت پوست سے امرا کے لئے فلک بوس محلات تیار ہوں جن کے مکین عیش و عشرت کی فریب کاریوں میں مبتلا ہو کر مالکِ حقیقی کو فراموش کر دیں۔ اور نہ میں چاہتا ہوں کہ اُن انصاف بیچنے والے پُرہیبت ایوانوں کی تعمیر میں مجھے صرف کیا جائے جہاں انصاف و قانون کے بدلے ظلم اور رشوت کی گرم بازاری ہو اور سب سے زیادہ نفرت ہے مجھے اُن پُرجبروت عمارتوں سے جہاں سلطنتوں کے منتخب نمائندے جوع الارضی کے نشے میں سرشار ہو کر بنی نوع انسان کی ہمدردی کی آڑ میں پس ماندہ اقوام کا خون پی کر اپنے جسم کی فربہی میں کوشاں رہتے ہیں۔ رفاہِ عام کے کاموں کے لئے میری جان حاضر ہے۔ چند سال ہوئے کہ اسی نوع کی دلچسپ گفتگو میں روضہ ممتاز محل کے خوبصورت گنبد نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر آج تمام دنیا کے مرد اس بات کا اقرار کرلیں کہ وہ اپنی عورتوں کو اسی طرح پیار کرینگے اور اسی تکریم و عزت کی نگاہ سے دیکھینگے جس طرح شاہجہان اپنی پیاری بیوی ممتاز محل کو دیکھتا تھا تو مجھے اپنی جان دینے میں کوئی عذر نہیں کیونکہ میں تو محبت کا ایک سبق ہوں کہ جب ازبر یاد ہُوا تو پھر کتاب کی کوئی ضرورت نہیں"

رُک رُک کر نکلنے والی آواز دھیرے دھیرے خاموش ہوگئی اور اسکے بعد بوڑھے درخت نے اپنے آخری الفاظ میرے گوش گذار کئے "مہربانی کر کے میرے متعلق اُنہیں سب کچھ بتا دینا۔ فرصت کے اوقات میں جب تمہارا جی چاہے"، اُس نے کہا "ضرور بتا دینا اور لو ـــــــ خدا حافظ"۔

"تخیل بحیثیت جزئیات ماخوذ"

محمد ضیاء الدین شمسی

غزل

اُدھر دل طولِ حسرت سے بحالِ زار شیون میں
اِدھر میں دل کی اس گت سے پریشانی میں اُلجھن میں

جلادے خرمنِ حسرت دکھا کر جلوۂ تاباں
بجھادے آتشِ فرقت لگا کر آگ تن من میں

تمہارا رنجِ فرقت ہے کہ طاری ہے مرے دل پر
تمہارا دردِ اُلفت ہے کہ ساری ہے مرے تن میں

یہ کیا آفت ہے۔ اب تقدیر کروٹ تک نہیں لیتی
یہ کیا شامت ہے، اب تاثیر آہوں میں نہ شیون میں

نشان راہ ہاتھ آیا تو کس سے صرف اُلفت سے
کمال رہبری پایا تو کس میں صرف رہزن میں

نزاکت ہے کہ قربان ہے تری ترکیبِ اعضا پر
قیامت ہے کہ پنہاں ہے تیرے بیساختہ پن میں

طبیعت شاد پاتا ہوں جلا کر حاصلِ حسرت
خوشی کے راگ گاتا ہوں لگا کر آگ خرمن میں

ترا اے نو بہارِ باغِ عالم! واہ کیا کہنا
نہ ایسا رنگ پھولوں میں نہ ایسے پھول گلشن میں

ستم ہے ہم تری محفل سے نکلیں اور یوں نکلیں
وفا کی لاش کاندھے پر۔ جفا کا ہاتھ گردن میں

کبھی ہمکو بھی سمجھانا۔ یہ آنا ہے تو کیا آنا
کہ آنا اور چھپ جانا شعاعِ رُخ کی چلمن میں

خوشا وہ دن۔ کہ ہم منزل کو پہنچیں اور یوں لوٹیں
دُرِ مطلوب مٹھی میں گلِ مقصود دامن میں

نجاتیں کس کے قبضے کی تری قدرت کے قبضے کی
پناہیں کس کے دامن میں۔ تری رحمت کے دامن میں

مجھے میری طبیعت کی رواداری مبارک ہو
جنونِ دشمنی جھلکا کرے عاداتِ دشمن میں

بس اب آزاد! نعشِ دل لئے پھرنے سے کیا حاصل
چلو۔ اسکو بھی گاڑ آئیں تمناؤں کے مدفن میں

حکیم آزاد انصاری

خطاب

چمک اے میرے پیارے چمک! اپنی نورانی روشنی سے، اپنے معصوم دل کی نورین تابش سے، دنیا کو ضو فشاں بنا دے۔ ہاں اے میرے ہلال روشن ہو جا روشن ہوتا جا!!!

چمک اے میرے پیارے چمک! ٹھنڈی اور صاف وادیوں پر، ہموار زمین پر، سفید پوش پہاڑوں پر، اپنا عکس پھیلا دے، مرتسم کر دے، ہاں اے میرے ہلال روشن ہو جا، روشن ہوتا جا!!!

چمک اے میرے پیارے چمک! پہاڑ کی دشوار گزار گھاٹیوں میں، سنگین غاروں میں، خاموش اور سنسان جنگلوں میں، اپنی سیمیں تجلیوں سے ضیا پاشیاں کر۔ ہاں اے میرے ہلال روشن ہو جا، روشن ہوتا جا!!!

چمک اے میرے پیارے چمک! دنیا کے خوبصورت مرغزاروں کو، دلکش باغوں کو، سبزۂ جوئبار کو، گل لالہ فام کو، اپنے پرتو سے فروزاں کر دے۔ ہاں اے میرے ہلال روشن ہو جا روشن ہوتا جا!!!

چمک اے میرے پیارے چمک! خندہ زن بلبلوں، اور نغمہ نواز پرندوں کے چکنے اور چمکدار پروں پر اپنے سینہ کی نکلی ہوئی لمعہ خیز چاندنی نازل کر، متبسم پھولوں کے بھولے بھولے چہروں کو اپنی آنکھوں سے چوم، اور اپنے طلا سیما حسن کے عکس سے ان کو زیادہ دلفریب بنا دے، ہاں اے میرے ہلال روشن ہو جا، روشن ہوتا جا!!!

چمک اے میرے پیارے چمک! بہنے والے دریاؤں پر، عظیم الشان مگر سبک خرام سمندر کے اوپر، چاندنی کا زردی مائل فرش بچھا، اور اپنے جلوہ کی آبگوں چادر سے گرنے والے آبشاروں کو ڈھک لے۔ ہاں اے میرے ہلال روشن ہو جا، روشن ہوتا جا!!!

چمک اے میرے پیارے چمک! اور رفتہ رفتہ آسمان کے نیل پر ایک رنگین اور سنہری روشنی کا انعکاس کر۔ گوشۂ مشرق سے اٹھ اور سطح فلک پر زیادہ شان سے رونق افروز ہو۔ یہاں تک کہ روشن تارے اور روشن تر سیال سیارے شرما جائیں۔ ہاں اے میرے ہلال روشن ہو جا، روشن ہوتا جا!!!

اے میرے چاند، اے رات کے شعلہ افروز چاند! آ اور میری قائم مقامی کر۔ مجھ سے نہ شرما میں تو تیرا آفتاب ہوں گو میں تجھ سے دور ہوں۔ تو مجھ سے آنکھ ملاتے ہوئے کیوں شرماتا ہے؟ میں اپنے مستقل نور سے تجھکو ہمیشہ چمکاتا رہونگا میں تیرے آئینہ گوں ہیولے کو اپنے عکس سے روشن کرتا رہونگا۔ تو لالہ فام بن جا مگر خدا کیلئے آگے بڑھ اور ظلمت آفریں شب کو تجلیات میں غرق کر دے۔ ڈبو دے۔ ہاں اے میرے ہلال روشن ہو جا، روشن ہوتا جا!!!

خاک نشین تہذیب فاطمہ عباسی

آج کے دُشمن

خوش ہونے کا وقت آج ہے۔ موجودہ خوشی کے دو بڑے دشمن ہیں + وہ آج جو مسرت کی تازہ لہروں کی بازیگاہ ہے جس سے دُنیا کے رگ و پے میں زندگی کا خون حرکت کرتا ہے وہ آج دو ڈاکوؤں کے درمیان خطرے میں ہے ــــ کل اور کل !

گذرا ہُوا کل ندامت اور افسوس کی فوجیں بھیجتا ہے "اے کاش ایسا ہوتا" "یا میں نے کیسی غلطی کی" یا پھر "ایسا کیوں ہُوا ویسا کیوں نہ ہُوا" غور کرو تو اس گذرے ہُوئے کل کی اک یہی اچھی بات ہے کہ وہ گذر گیا ہے کہ وہ اب ہاں ہے یہاں ہے ہی نہیں اور یہی وہ بات ہے جو ہم بھول بھول جاتے ہیں +

ہاں مجھے یاد آیا دراس کل کی ایک اور اچھی بات یہ ہے کہ گذشتہ غلطی یا کلفت موجودہ خوشی کی بنیاد اُستوار کرنے کے لئے ایسی ہی مفید ہے جیسی کہ گذشتہ مسرت بلکہ اکثر زیادہ مفید + اگر یہ قول درست ہے کہ غم میں بڑا غم یہی ہے کہ گذری ہُوئی خوشیاں یاد آتی ہیں تو یہ بھی اتنا ہی درست ہے کہ خوشی میں بڑی خوشی یہی ہے کہ گذرے ہُوئے غم گذر چکے ہوتے ہیں +

دُوسرا ڈاکو آنے والا کل ہے !

وہم خوف اور تمام ذہنی چوروں کا جتھا ادھر سے آتا ہے + لیکن ڈرنے سے حاصل کیا ؟ مصیبت کو آنا ہی ہے تو ہم اُسکے حملے کو زیادہ اچھی طرح برداشت کر سکیں گے اگر ہم آج کی خوشی کے ساتھ اپنی توانائی کو بڑھائیں بہ نسبت اس کے کہ ہم اُس بڑھتے ہُوئے اژدہا کی خیالی ٹکر سے اپنی روح کو ابھی سے پاش پاش ہو جانے دیں +

بھائیو ! زندگی کو ملتوی کیوں کرتے ہو ؟

گلچیں

نگار خانۂ چین

ماہی گیر

جھیل کے خوش رنگ پانی میں، ہلال کا روپہلی عکس لرز رہا ہے۔
چینگ کی پہاڑی ایک عظیم الشان ماہی گیر کی طرح تاک لگائے بیٹھی ہے۔ انتظار کر رہی ہے۔ کہ کوئی مچھلی آئے اور اس روپہلی کانٹے میں اُلجھ کر رہ جائے ؛

"ژی کی"۔ کی دوشیزہ لڑکیاں

چاندنی راتوں میں جب "ژی۔ کی" کی نوجوان لڑکیاں کشتیوں پر سوار ہو کر پھول چُننے جاتی ہیں۔ تو سب کی سب مل کر ایک گیت گاتی ہیں۔ اگر کوئی اجنبی مسافر اُنکی طرف دیکھتا ہے تو وہ اپنے سفید یاسمن کے گلدستوں کی آڑ میں اپنے آپ کو چھپا لیتی ہیں۔ دم سادھے رکھتی ہیں۔ اور پھر وہ یکبارگی کھلکھلا کر ہنس پڑتی ہیں۔ اور ہنستے ہی چلی جاتی ہیں ؛

طلوعِ ماہتاب

دریا نے پہاڑ کو تلوار کی طرح چیر رکھا ہے۔

دیکھنا! وہ سُنہری کشتی۔ وہ سامنے۔ دریا پر . . . .

آہ نہیں یہ تو چاند طلوع ہو رہا ہے ؛

کشتی کی سیر

خزاں کے چاند کا عکس، جھیل کے سبز پانی میں ناچ رہا ہے۔

میرے چپوؤں نے پریم کے اُس گیت کو توڑ ڈالا جو یاسمن کے پھول چاند کو سنا رہے تھے ۔

ایک نوجوان عریاں لڑکی

دریا کے کنارے، بیدِ مجنوں کے گھنے درخت کے نیچے، اپنے منگیتر سے ملنے کو جاتے ہوئے اُس نے بنفشئی اور چمپئی رنگ کی دو نہایت نفیس پوشاکیں اوپر تلے زیبِ تن کیں۔

سُورج سنہرے افق میں ڈوبتا چلا۔ مگر اُن کی بے تابانہ باتیں ختم نہ ہوئیں ۔

یکایک وہ وہاں سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ شرم سے پانی پانی ہوئی جا رہی تھی۔ کہ اب اُس کی تیسری پوشاک نہیں رہی جو بیدِ مجنوں کا سایہ تھا ۔

(ماخوذ از ادبیاتِ چین) غلام عباس

ذکی الحس —— درست —— بجا —— میں ذکی الحس۔ نہایت خطرناک طور پر ذکی الحس تھا اور ابھی تک ہوں لیکن تم مجھے پاگل کیوں کہتے ہو؟ بیماری نے میرے حواس معطل اور مردہ نہیں بلکہ تیز کر دئے تھے۔ میری قوّتِ سامعہ بہت زیادہ تیز ہو گئی تھی۔ یہاں تک کہ میں آسمان اور زمین کی خفیف سے خفیف آواز اور معمولی سے معمولی صدائیں سن لیتا تھا۔ اور اکثر دفعہ مجھے دوزخ کے واقعات سے بھی بہت کچھ سنائی دیتا تھا۔ تو پھر بھی کیا میں پاگل ہوں؟ توجّہ سے میری کہانی سنو! اور دیکھو۔ کہ میں آپ بیتی کیسی صحت اور وضاحت سے سُنا سکتا ہوں —— کیا تم اب بھی مجھے پاگل کہوگے؟

یہ بتانا ناممکن ہے کہ "یہ جنون" میرے سر میں کیسے داخل ہُوا۔ لیکن جب ایک دفعہ جاگزیں ہو چکا تو رات دن مجھے اس کی دھن رہنے لگی۔ یہ کوئی خاص مقصد نہ تھا —— مُدعا نہ تھا۔

مجھے بوڑھے۔ اس بوڑھے فرتوت سے اُلفت تھی۔ اس نے مجھے کوئی دکھ نہیں پہنچایا تھا۔ اُس نے کبھی میری بے حرمتی یا ہتک کی جرأت نہیں کی تھی۔ اس کے زر و مال کی میرے دل میں حرص و طمع ہرگز نہ تھی...... ہاں ہاں مجھے یاد آ گیا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ اس کی "آنکھ" ہی تھی۔ جو چشمِ کرگس کے مشابہ تھی۔ اور جس پر ایک نیلا بے رونق پردہ تھا۔ جب وہ مجھے اس آنکھ سے دیکھتا تھا تو بس میرا خون سرد پڑ جاتا...... اور اس طرح بتدریج میں نے اس پیرِ فرتوت کی جاں ستانی کا مصمم ارادہ کر لیا۔ تاکہ اپنے آپ کو اس طرح اس "عذابِ چشم" سے نجات دے سکوں۔

"جنون" دراصل یہ تھا۔ تم تو مجھے پاگل تصور کرتے ہو۔ پاگل تو کچھ جانتے ہی نہیں۔ کچھ سمجھتے ہی نہیں۔ تم یہ دیکھ کر حیران رہ جاؤگے کہ میں نے اس حادثہ کی ابتدا کیسی عقلمندی سے کی۔ اور کیسی احتیاط اور مکاری سے اس فرض کو انجام دیا...... جس ہفتہ میں نے بوڑھے کا قصّہ تمام کیا اس ہفتہ سے زیادہ مہربانی کا سلوک اور نوازش آمیز برتاؤ میں نے اس سے قبل کبھی نہیں کیا تھا۔

ہر روز نصف شب کے قریب میں چٹخنی پھیر کر اس کا دروازہ کھولتا —— اُف کیسی آہستگی سے کھولتا۔ اور جب سر کے گذرنے کا رستہ کر لیتا تو ایک سیاہ لالٹین —— سیاہ —— بالکل سیاہ لالٹین اپنے سر کے ہمراہ اندر داخل کر لیتا۔ تم سُن کر ہنسو گے کہ کیسے مکارانہ طریق سے میں اپنا سر آگے بڑھاتا —— میں سر کو آہستہ آہستہ —— بہت ہی آہستہ حرکت دیتا۔ تاکہ بوڑھے کی نیند میں خلل انداز نہ ہو سکوں۔ آخرکار میں اپنے سر کا اتنا حصّہ اندر داخل کر دیتا کہ جس سے میں اس کو حالتِ خواب میں

بہ سہولت دیکھ سکتا ۔ یہاں تک کہ اسی کام میں تقریباً ایک گھنٹہ صرف ہو جاتا ... اُف کبھی کوئی پاگل ایسا محتاط ہو سکتا ہے ..... جب یہ ہو جاتا تو میں لالٹین کے سیاہ پردہ کو بڑی احتیاط سے کھولتا کیونکہ اس کے پردوں کے کھلنے میں کرکرانے کی آواز نکلتی تھی ۔ اور اسے بس اس قدر کھولتا کہ صرف ایک شعاع ــــ روشنی کی واحد شعاع ــــ اُس کی گرِس نما آنکھ پر پڑتی ...... میں سات شب برابر بڑے استقلال سے ایسا کرتا رہا ...... اور ہر بار نصف شب کے عمل میں اس "آنکھ" بدنما آنکھ" کو "بند" پایا ۔ اس لئے مجھے اپنے ارادے میں کامیاب ہونا ناممکن معلوم ہوتا تھا کیونکہ یہ بوڑھا نہیں تھا جس سے انتقام لینا تھا بلکہ یہ اس کی ظالم و جبار بلکہ شیطانی آنکھ تھی ۔

اور ہر صبح جب پَو پھٹتی میں بڑی جرأت اور ہمت سے اس کے کمرے میں جاتا اور اسے نام سے پکار کر پوچھتا کہ رات کیسے گزری ۔

آٹھویں رات میں دروازہ کھولنے میں معمول سے زیادہ محتاط تھا ۔ ایک گھڑی کی منٹ والی سوئی بھی مجھ سے زیادہ تیز حرکت کرتی ہوگی ..... یہ پہلی رات تھی جبکہ میں نے اپنی طاقت و قدرت اور امکان و ذہانت کی حدود مقدار کو محسوس کیا ...... میں اپنی موہوم فتحیابی و ظفر مندی کی حسیات کو بڑی مشکل سے ضبط کر سکا ۔ اس دن اور صرف اس دن میں یہ محسوس کرتا تھا کہ آہستگی سے دروازہ کھول رہا ہوں اور بوڑھے کو میری پوشیدہ کارروائیوں کی مطلق خبر نہیں ...... میں اپنے اس خیال پر اچھی خاصی طرح ہنسا ۔ شاید اب اس نے میری آواز سن لی تھی کیونکہ وہ بستر پر تھوڑا سا سر کا گویا چونک پڑا ہے ۔ تمہارے دل میں خیال پیدا ہوا ہوگا کہ میں فوراً "دروازے سے" پیچھے ہٹ گیا ہونگا لیکن ہرگز نہیں ۔ اس کا کمرہ شبِ دیجور کی طرح سیاہ تھا کیونکہ تمام کواڑ چوروں کے خوف سے بالکل بند تھے ...... مجھے معلوم تھا کہ مجھے وہ دیکھ نہیں سکتا .... سو میں آہستہ آہستہ آگے بڑھا ۔

میں سر آگے کر کے لالٹین کھولنے ہی کو تھا کہ میرا انگوٹھا لالٹین پر سے کھسک گیا اور بوڑھا فوراً بستر پر کود کر بیٹھ گیا اور چلایا : ۔ "کون ہے" ؟

میں خاموش رہا ۔ بالکل نہ بولا ۔ پورے ایک گھنٹہ تک میں نے اپنے جسم کے ایک روئیں تک کو بھی حرکت نہ دی ۔ اور نہ اسی کے بستر پر لیٹنے کی آواز سنی ۔ وہ ابھی تک میری آہٹ پر کان لگائے بیٹھا تھا .... گویا موت کی گھڑی کا انتظار کر رہا تھا ۔

عین اس وقت میں نے ایک "سرد آہ" سنی ۔ میں جان گیا کہ یہ خوف نزع کی آہ ہے ۔ یہ رنج و درد کی آہ نہیں ۔ یہ خفگی نفس کی آہ تھی جو گوشۂ دل کو چیر کر نکل رہی تھی ۔ میں اس آواز کو پہچانتا تھا کیونکہ اکثر جب تمام عالم محوِ خواب ہوا کرتا تھا تو

مَیں بھی اس ہُو کے عالم میں ہیبت زدہ ہو کر آہِ سرد بھرا کرتا تھا۔

جو کچھ کہ بوڑھا محسوس کرتا تھا میں پا گیا تھا۔ اگرچہ دل میں خوش تھا لیکن مجھے اس کی حالت پر رحم بھی آیا۔ کیونکہ وہ اس وقت سے بیدار تھا جب سے اس نے بستر میں کروٹ لی تھی۔ وہ اس دہشت کو بے بنیاد تصوّر کرنے کی کوشش کرتا تھا لیکن بے سود۔ وہ اپنے دل میں کہتا ہو گا کہ "محض چمنی میں سے ہوا گزری ہو گی" "یا یہ صرف جھینگر تھا جو ایک جست لگا کر رہ گیا" "یا یہ کسی چلنے والے کی آہٹ تھی"۔ ہاں وہ اپنے قلبِ مضطر کو ان توہمات و تخیلات سے تسلی دینا چاہتا تھا۔ لیکن لاحاصل...... کیونکہ عزرائیل اندھیرے میں اس کا تعاقب کر رہا تھا...... ظلمتِ مرگ نے اسے ہر جانب اور ہر پہلو سے گھیر لیا تھا...... اور یہ اس نامعلوم سائے کا۔ اس نادیدہ اندھیرے کا المناک اثر تھا کہ وہ "میری موجودگی محسوس کر رہا تھا" اگرچہ نہ اس نے مجھے دیکھا تھا اور نہ آہٹ سُنی تھی۔

جب میں بہت دیر تک مستقل مزاجی سے انتظار کر چکا اور اسے بستر پر لیٹتے نہ سُنا تو مَیں نے لالٹین کے پردے میں ذرا سا ــــ بالکل خفیف سا ــــ شگاف کرنے کا ارادہ کیا ...... تم تصوّر کر سکتے ہو کہ مَیں نے کتنی آہستگی سے پردہ کھولا ہو گا...... یہاں تک کہ ایک بالکل باریک سی شعاع خود بخود گویا کسی طاقتِ روحانی سے ــــ اس کی "کرگس نما" آنکھ پر جا پڑی۔ یہ بالکل وا تھی۔ مَیں اسے دیکھتے ہی غضبناک ہو گیا ــــ مَیں نے صاف طور پر دیکھا ــــ وہی نیلگوں پردے والی بے رونق آنکھ جس نے میرے مغزِ استخواں تک کو منجمد کر دیا۔

جیسا مَیں پہلے بتا چکا ہوں تم میری ذکی الحسی کو دیوانگی سے تعبیر کرتے ہو۔

اب میرے کانوں میں ایک "دھیمی" "سست" "بھدی" اور "واضح" سی آواز آنے لگی ایسا معلوم ہوتا تھا گویا ایک گھڑی کو روئی میں لپیٹا ہوا ہے"۔ میں اس آواز سے بھی آگاہ تھا...... یہ بوڑھے کے مضطرب دل کی دھڑکن تھی۔ اس نے میری وحشت کو اور تند کر دیا۔ جیسے سپاہی بانگِ دہل سُن کر جوش میں آجاتا ہے۔

تاہم مَیں نے ضبط کیا۔ سانس روک لیا۔ اور شعاعِ روشنی کو بوڑھے کی آنکھ پر جمائے رکھا۔ اس کے دل کے دھڑکنے کی صدا "بلند ہوتی گئی" لمحہ بہ لمحہ "تیز تر" "کرخت تر" اور "واضح تر" ہوتی گئی۔ بوڑھے کا خوف واقعی حد سے تجاوز کر چکا تھا۔ مَیں کہتا ہوں کہ صدائے دل ہر لحظہ "تیز تر اور واضح تر" ہوتی گئی کیا تم ان الفاظ کو توجہ سے سُنتے ہو؟

مَیں تمہیں بتا چکا ہوں کہ مَیں ذکی الحس ہوں۔ اس رات کے سناٹے، اس مکان کی مہیب خموشی اور ایسے غیر معمولی شور نے مجھے حواس باختہ سا کر دیا۔ تاہم مَیں نے کچھ دیر اور ضبط کیا۔ دل کی ضرب "بلند تر" اور "واضح تر" ہوتی گئی۔

میں نے خیال کیا بوڑھے کا دل پھٹ جائے گا .... اب مجھے نئی فکر دامنگیر ہوئی یعنی یہ آواز ہمسایہ نہ سن پائے بوڑھا قریب بہ مرگ ہے ۔

میں چلایا اور لالٹین کا پردہ یک لخت اُتار کر پھینک دیا ۔ اور چھلانگ مار کر کمرے میں داخل ہوگیا ..... بوڑھے نے ایک ..... محض ایک ..... چیخ ماری اور ـــ اور ـــ میں نے اسے گھسیٹ کر بستر سے نیچے پھینک دیا اور اوپر کمبل دے دیا ۔ میری خوشی اور میرا اطمینان اس وقت حلقۂ اظہار سے باہر تھا .... میں نے اس کے دل پر ہاتھ رکھا ۔ وہ بالکل بے صدا تھا اور بے حرکت تھا ۔ اس کا جسم پتھر کی طرح سرد ہوگیا ...... اب مجھے اس کی "آنکھ" آئندہ کبھی نہ ستائیگی ..... اگر اب تک بھی تم مجھے پاگل خیال کرتے ہو تو جب میں تمہیں بتاؤں گا کہ میں نے اس لاش کے چھپانے میں کن کن دُور اندیشیوں اور احتیاطوں سے کام لیا تو تم مجھے پھر ایسا نہیں کہو گے ۔

رات گزر رہی تھی میں نے جلدی جلدی لاش کے ٹکڑے کئے اور فرش کے لکڑی کے تختے اُکھاڑ کر اُن کے نیچے دبا دئے اور پھر تختے اسی طرح اوپر جڑ دئے ۔ ان پر کوئی خون کا دھبہ تک نہیں تھا ۔ یہ کام ایک طاس نے بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا تھا ۔

جونہی میں نے اس قضیہ سے نجات پائی دروازے پر کسی نے دستک دی میں نے فوراً دروازہ کھول دیا ۔ کیونکہ اب مجھے کسی کا خوف نہ تھا ۔ تین "پولیس" افسر اندر آ گئے اور کہنے لگے :" رات ایک بلند چیخ اس مکان میں سُنی گئی تھی ۔ تمہارے ہمسائے نے ہمیں اطلاع دی ۔ ہم اس "مشکوک" معاملہ کی تفتیش کرنے آئے ہیں" میں مُسکرا دیا ۔ اب مجھے کس کا خوف تھا ؟ میں نے استقبال کرتے ہوئے مسرت آمیز لہجہ میں کہا :" وہ چیخ میری تھی ۔ مجھے آج خواب میں ڈر لگا تھا کیونکہ بوڑھا کل سے کہیں باہر مہمان ہے اور میں اکیلا یہاں ہوں " میں نے تمام مکان اچھی طرح دکھا دیا اور پوری پوری تفتیش کرنے کی استدعا کی میں نے اُنہیں بوڑھے کا تمام سامان اور زر و سیم امن و اماں سے پڑا دکھا دیا ۔ اور انہیں بوڑھے کے "اسی" کمرے میں آرام کرنے کی دعوت دی ۔ میں نے اپنی کرسی عین اس مقام پر بچھالی جہاں بوڑھا دفن تھا ۔ افسروں کی "تشفی" ہوگئی ۔ میرے طرزِ عمل نے انہیں میری بریت کا یقین دلا دیا تھا ۔ وہ بیٹھ گئے اور معمولی باتیں کرنے لگے ۔

میں نے چند ہی منٹ میں اپنے آپ کو زرد پڑتے محسوس کیا ۔ میں نے چاہا کہ افسر چلے جائیں ۔ میرا سر چکرانے لگا ۔ اور میں نے محسوس کیا کہ میرے کانوں میں کچھ "ٹِک ٹِک" سی ہو رہی ہے ۔ لیکن ابھی تک وہ بیٹھے باتیں کر رہے تھے "ٹِک ٹِک" زیادہ "واضح" ہوتی گئی ۔ جاری رہی اور اور "واضح" ہوگئی ...... میں اس مصیبت سے آزادی حاصل

کرنے کے لئے زیادہ روانی سے بولا۔ لیکن یہ صدا" واضح تر" ہوگئی۔ یہاں تک کہ میں نے محسوس کیا کہ یہ آواز میرے کانوں میں نہیں بلکہ کہیں "باہر" سے پیدا ہو رہی ہے...... میں اور زیادہ زرد پڑ گیا.... لیکن میں اور زیادہ روانی سے بولنے لگا ــــ تاہم صدا اور زیادہ واضح تر ہوگئی اور اس نے ایسی دھیمی سست واضح اور بھدی سی صورت اختیار کرلی گویا روئی میں گھڑی لپیٹی ہوئی ہے۔ میں سانس رکنے کی وجہ سے ہانپنے لگا۔ افسروں نے نہ سنا۔ میں زیادہ جلد جلد اور جوش سے بولنے لگا۔ ٹک ٹک اور واضح ہوگئی۔ میں اٹھا اور بحث مباحثہ میں مشغول ہوگیا۔ صدا اور زیادہ واضح ہوگئی۔ میں غضبناک ہوگیا۔ کیا وہ جائیں گے نہیں۔ صدا اور زیادہ تیز اور واضح ہوگئی...... توبہ توبہ میں کیا کرسکتا تھا۔ منہ میں جھاگ آگیا۔ حواس باختہ ہوگئے۔ زبان بڑبڑانے لگی۔ میں کرسی میں جھولنے لگا۔ پھر کرسی تختوں پر گھسیٹی۔ لیکن صدا زیادہ تیز اور واضح ہوگئی اور بلند ــــ بلند ــــ نہایت بلند ہوگئی...... ابھی تک پولیس افسر مزے سے باتیں کرتے تھے اور مسکراتے تھے۔ کیا یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ وہ اس صدا کو نہ سنتے تھے ۔ او خدایا...... وہ ٹک ٹک سنتے تھے۔ ضرور سنتے تھے...... وہ مجھ پر شک کرتے تھے ۔.... نہیں وہ معاملہ کی تہ کو پہنچ گئے تھے ...... وہ میرے خوف کا مضحکہ اڑا رہے تھے ..... میں یہی خیال کرتا تھا اور یہی خیال کرتا ہوں ...... بدترین مصیبت و عذاب بھی اس پریشانی سے بہتر ہوگا...... کیا اس استہزا سے زیادہ ناقابل برداشت بھی کچھ ہوگا؟..... مجھ میں وہ ریائی اور بناوٹی تبسم دیکھنے کی زیادہ تاب نہ تھی...... مجھے ایسا محسوس ہوا کہ گویا میں بے تحاشا چلا اٹھوں گا ورنہ اس عذاب میں دم گھٹ کر مر جاؤں گا۔ اور وہ ٹک ٹک بلند ــــ واضح ــــ بلند تر ــــ واضح تر ...... اور نہایت بلند ہوتی گئی۔ "دغا بازو" میں بے تحاشا چلا اٹھا "زیادہ مت اخفاء راز کرو۔ میں جرم کا اقبال کرتا ہوں ــ ان ــ ان تختوں کو اکھاڑ لو۔ یہ ٹک ٹک اس مردود دل کی دھڑکن ہے" *

(ماخوذ از ایڈگر ایلن پو)

فضل محمد افضل

شبنم کا ایک قطرہ

ٹپک اے شبنم کے قطرہ ٹپک! میدان کی بوٹی بوٹی پر۔ جنگل کی ڈالی ڈالی پر۔ کہسار کے ذرہ ذرہ پر۔ ٹپک اور گہر بن جا!
ٹپک اے شبنم کے قطرہ ٹپک! نو شگفتہ پھولوں کے رخساروں پر۔ لب بستہ کلیوں کے سینوں پر۔ پتیوں کی رگہائے رنگین پر ٹپک
اے قطرۂ ناچیز ٹپک! اور گہر بن جا! ٹپک اے شبنم کے قطرہ ٹپک! خوشنما پھولوں کے گلشن میں۔ گلہائے رنگین کی انجمن میں۔
سر بفلک۔ ہمالیہ کے دامن میں۔ ٹپک اے قطرۂ ناچیز ٹپک! اور گہر بن جا! ٹپک اے شبنم کے قطرہ ٹپک! زمین کے فرش مخملین پر۔
صحرا کے ذرہ ہائے آتشین پر۔ کسی خاک میں سونے والے کی خوابگاہ آخرین پر۔ ٹپک اے قطرۂ ناچیز ٹپک! ٹپک اور گہر بن جا! ٹپک اے
شبنم کے قطرہ ٹپک! طیور کے آشیانوں پر۔ انسان کے کاشانوں پر۔ مساجد کی دیواروں پر۔ ٹپک اے قطرۂ ناچیز ٹپک! ٹپک
اور گہر بن جا! ٹپک اے شبنم کے قطرہ ٹپک! پہاڑ کی چوٹی پر۔ فقیر کی کٹی پر۔ میدان کی خشکی پر۔ ٹپک اے قطرۂ ناچیز ٹپک! ٹپک
اور گہر بن جا! ٹپک اے شبنم کے قطرہ ٹپک! دریا کی بے قرار موجوں پر۔ نہروں کی بے تاب لہروں پر۔ سمندر کی سپید دھاریوں
پر۔ ٹپک اے قطرۂ ناچیز ٹپک! ٹپک اور گہر بن جا! ٹپک اے شبنم کے قطرہ ٹپک! پہاڑ کی عمیق گہرائیوں میں جنگل کی گھنی جھاڑیوں میں چمن
کی پوشیدہ گلکاریوں میں۔ ٹپک اے قطرۂ ناچیز ٹپک! ٹپک اور گہر بن جا! ٹپک اے شبنم کے قطرہ ٹپک! قدرت کے کشت زاروں
میں فطرت کے مرغزاروں میں۔ دنیا کے وسیع گلزاروں میں۔ ٹپک اے قطرۂ ناچیز ٹپک! ٹپک اور گہر بن جا! ٹپک اے شبنم
کے قطرہ ٹپک! باغ کے نورس پودوں پر۔ دنیا کی ہموار و ناہموار زمینوں پر۔ سنگ مرمر کے شفاف مزاروں پر۔ ٹپک اے قطرۂ ناچیز
ٹپک ٹپک! اور گہر بن جا! ٹپک اے شبنم کے قطرہ ٹپک! مسجد کے سیمین گنبدوں پر۔ مندر کے مرمرین میناروں پر۔ کلیسا کی
الماس آگین دیواروں پر۔ ٹپک اے قطرۂ ناچیز ٹپک۔ ٹپک اور گہر بن جا! ٹپک اے شبنم کے قطرہ ٹپک! رؤسا کے
محلوں میں۔ غربا کے جھونپڑوں میں۔ وحوش کے مسکنوں میں۔ ٹپک اے قطرۂ ناچیز ٹپک۔ ٹپک اور گہر بن جا! ٹپک اے
شبنم کے قطرہ ٹپک! مشائخ کی عبادت گاہوں میں۔ مے خواروں کے مے خانوں میں۔ آبادیوں میں ویرانوں میں۔ ٹپک اے قطرۂ
ناچیز ٹپک۔ اور گہر بن جا! ٹپک اے شبنم کے قطرہ ٹپک! دلکش باغوں میں۔ خوفناک غاروں میں۔ پر خطر گھاٹیوں میں
ٹپک۔ اے قطرۂ ناچیز ٹپک۔ ٹپک اور گہر بن جا! ٹپک اے شبنم کے قطرہ ٹپک! انسانی آبادی میں۔ درندوں کی وادی میں۔
کوہ کے دامن وحشی میں۔ ٹپک اے قطرۂ ناچیز ٹپک۔ ٹپک اور گہر بن جا! ٹپک اے شبنم کے قطرہ ٹپک!

اے عرش اعلےٰ سے ٹپکنے والے پانی ٹپک۔ ہوا میں منتشر ہو اور اس کو منجمد کر دے۔ فضا میں شامل ہو اور اس کو طراوت بخش

بنادے ۔ پانی میں مل اور اس کو طاقت بخش بنادے ۔ سبزے پر گر اور اُس کو گُرد ادبنادے خشکی پر ٹپک اور اُس کو نم کردے پھول پر گر اور اُس کو ترکردے ۔ کلی پر ٹپک اور اس کو نہلادے ۔ آنکھ میں داخل ہو اور اُس کو رُلادے ۔ زمین پر آ اور اس کی ہر چیز کو نمناک بنادے ! ٹپک اے شبنم کے قطرہ ٹپک ! ٹپک اے قطرۂ ناچیز ٹپک اور گوہر بن جا ! اے عرش اعلیٰ سے ٹپکنے والے پانی ٹپک ! ٹپک اور گوہر بن جا ! تاکہ میں تیرے موتیوں سے اپنا دامن بھرلوں ۔ ٹپک اے شبنم کے قطرہ ٹپک ۔ ٹپک اے قطرۂ ناچیز ٹپک اور گوہر بن جا !!!

خاکسار اخلاق فاطمہ

چاندنی رات اور دریا کا کنارہ

شفاف ہے روشنی قمر کی — ہے چادر نور بحر و بر کی
کیا دلکش و دلربا سماں ہے — تاروں سے مزین آسماں ہے
قطرے شبنم کے گھاس پر ہیں — یا نور کے موتی جلوہ گر ہیں
پھولوں سے بھرا ہوا ہے میداں — خوشبو سے ہے دشت عنبر افشاں
وادی در و دشت و بحر و کہسار — قدرت کے بنے ہیں آئینہ دار
خلوت ہے سکوت ہے قمر ہے — تو بھی مرے چاند آ کدھر ہے
دریا خاموش بہ رہا ہے — چادر میں نور کی چھپا ہے
آئینہ کی طرح صاف پانی — لہروں میں یہ چاند کی روانی
سناٹا ہے بحر و بر پہ طاری — موجیں ہیں سکون کے ساتھ جاری
ہیں جتنے پرند گلستاں میں — دبکے بیٹھے ہیں آشیاں میں
یوں خواب میں محو ہیں سب انساں — بیہوش پڑے ہیں جیسے بے جاں
ہر شے خاموش ہو گئی ہے — آرام کی نیند سو گئی ہے

بیدار مگر اثر کا دل ہے
جذبات کی آگ مشتعل ہے

محمد علی خاں اثر

جادوگرنی

موسمِ گرما کا دن ختم ہو رہا تھا۔ خاک آلود اور بدن کو جھلس دینے والی لُو کے جھونکے اپنی سرگرمیاں ختم کر چکے تھے اور اس کی جگہ خوشگوار اور راحت بخش ہوا کی لطف افزا لوریوں نے لے لی تھی افسردہ اور مضمحل دلوں میں فرحت و تازگی پیدا ہو چلی تھی ؂

عابد دفتر سے تھکا ماندہ گھر واپس آ چکا تھا۔ وہ ایک تجارتی کارخانہ میں معمولی کلرک تھا اور اس کی تنخواہ بہت قلیل تھی۔ بجز ایک بیوی کے جو مجسمہ محبت تھی دنیا میں کوئی اُس کا عزیز نہ تھا۔ سارا دن وہ محنت کرتا اور جان توڑ محنت کرتا تاکہ اس کشمکشِ حیات میں اپنے جسم و روح کا اتحاد برقرار رکھ سکے۔ اُس کی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔ اس کا جسم ہڈیوں کا ڈھانچ تھا، بے حد کمزور اور ناتواں محنت و مشقت نے اس کا خون چوس لیا تھا۔ اس کے لئے قدرت کی خوبصورت اور رعنا اشیاء میں نہ کوئی لطف و مسرت تھی نہ دلکشی و دلفریبی۔ آفتاب کا غروب و طلوع اُس کے لئے یکساں تھا ان نظرافروز مناظر سے اس کو کوئی دلچسپی نہ تھی۔ پُرکیف اور فرحت بخش ہوا کے نزہت بار نغمے اور مجسمت افزا سرود اس کے لئے بالکل بے کیف اور بے مزہ تھے۔ رات کی ہمہ گیر خاموشی بھی اس کے لئے سکون آور اور آرام دہ نہ تھی اطمینان اس سے کوسوں دُور تھا۔ ہر وقت اُسے مہیب اور مہلک دیو "احتیاج" کا سامنا رہتا۔ لیکن بایں ہمہ مسرت کی ایک شعاع اس کی حیاتِ ارضی کے تاریک لمحات میں جلوہ پاشی کرتی رہتی تھی۔ جب وہ شام کو اپنی بیوی افروز کی دلنواز باتیں سُنتا تو اس کا قلبِ حزین ایک لمحہ کے لئے فرحت افزا جذبات مسرت سے معمور ہو جاتا اور اس پر ایک کیف آگین لرزش طاری ہو جاتی۔ اس وقت وہ اپنے آپ کو زندوں میں شمار کرنے لگتا۔ مگر اس وقفۂ مسرت کی میعاد بالکل مختصر ہوتی۔ اس کے بعد پھر وہی ظلمت و تاریکی اُس کے چہرے پر محیط ہو جاتی۔ ایک دن عابد گھر میں داخل ہوتے ہی اس افسوسناک منظر کو دیکھ متحیر و متعجب ہو کر رہ گیا کہ افروز ۔۔۔ اس کی بیوی فرشِ صحن پر نیم مردہ آدمی کی طرح پڑی ہے۔ وہ لپک کر اس کی طرف گیا۔ اور اُس کے دستِ نازک کو آہستہ سے دبایا اور بے تحاشا "افروز" "افروز" کہہ کر پکارنے لگا۔ اس نے اپنی غمگین آنکھیں کھولیں۔ جن میں آنسو جھلک رہے تھے۔ عابد کی آنکھیں بھی پُرآب ہو گئیں۔ اس نے تاسف انگیز لہجے میں کہا "پیاری اللہ یہ تو بتاؤ تم پر کیا گذری تمہارے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا۔ یہ دردناک حالت مجھ سے دیکھی نہیں جاتی۔ افروز نے اس کا جواب خاموشی سے دیا۔ اور

چھوٹے بچوں کی طرح اس نے ایک آہ سرد بھری۔ عابد مضمحل ہو کر رہ گیا۔ پہلے ہی ضروریاتِ زندگی نے اُس کی روح نکال رکھی تھی۔ اس کی بیوی کی سرد آہیں اور طول و مغموم طبیعت نے اُس کو اور نڈھال بنا دیا۔ کیونکہ اس کی بیوی ہی اس کا دہ آخری سہارا تھی جس کی وجہ سے اس کی زندگی قائم تھی۔ وہی اور صرف وہی اس کے ولولوں اور اُمیدوں کا مرکز تھی۔ اس نے اس وقت اپنے تئیں بے یار و مددگار اور بالکل بیکس پایا۔ عابد کے ہوش و حواس پراگندہ ہو گئے تھے۔ جب افروز نے زار و قطار رونا شروع کیا۔ اس نے اس کی دلدہی کی کوشش کی لیکن اس کی مساعی ناکام رہیں۔ آخر وہ مایوس ہو کر گھر کے ایک کونے میں بیٹھ گیا اور اپنی دُکھ بھری زندگی کے حسرتناک واقعات کی یاد سے اپنے زخموں پر نمک پاشی کرنے لگا۔ وہ دیر تک انہیں خیالات میں غرق رہا اور آخر نیند سے مغلوب ہو کر اُسی حالت میں سو گیا۔ جب وہ بیدار ہوا۔ اُسکی آنکھوں سے اُسکے دل کا کرب و اضطراب ظاہر ہو رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ افروز اُس کی چاہتی بیوی اُس کے قریب اس بچہ کے مانند بیٹھی ہے جس سے کوئی قصور سرزد ہو جاتا ہے اس نے اپنی بیوی کو قریب تر کھینچ کر اپنی باہیں اس کے گرد حمائل کر دیں۔ آہ مسرتِ زندگی کے لئے ضروری ہے وہ مسرتوں سے محروم تھی +

"افروز تم کیوں رو رہی تھیں"؟

اس ہمدردانہ استفسار کے وقت اس کی آواز جذبات محبت میں ڈوب گئی۔ عابد کا دل بھر آیا۔ اس کی غمناک آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ افروز نے روتے ہوئے اپنے شوہر کو بتایا کہ یہ لوگ جو سامنے والی شاندار عمارت میں رہتے ہیں اور جن کو اپنے تمول پر غرور ہے اُنھوں نے میری سخت توہین کی ہے۔ وہ مجھے جادوگرنی کہتے ہیں۔ کیونکہ ان کا اکلوتا بچہ۔ نتھارشن بدقسمتی سے بیمار ہو گیا ہے۔ اُن کا دربان آج میرے پاس آیا۔ اور مجھے اس نے سخت ذلیل کیا۔ یہ کہتے ہوئے اس کی ہچکی بندھ گئی۔ عابد نے جب یہ سُنا کہ اُنھوں نے اس کی بیوی کو "جادوگرنی" کہا تو وہ غصے سے کانپنے لگا۔ نتھارشن روز ان کے ہاں آتا اور اس کی بیوی کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ ایک دن اتفاقیہ طور پر وہ بیمار ہو گیا اور اُس کی بیوی "جادوگرنی" بن گئی ؛ غصے کی ایک خوفناک لہر اُس کے رگ و پے میں سرایت کر گئی۔ وہ ان ناانصاف احمق لوگوں کے سر پاش پاش کر دینا چاہتا تھا۔ لیکن وہ مجبور اور معذور تھا۔ افلاس اور کمزوری اس کے راستے میں حائل تھی۔ تھوڑی دیر بعد اس کا غصہ کچھ فرو ہو گیا۔ لیکن وہ اسی طرح اضطراب اور بے بسی کی حالت میں پڑا رہا۔ افروز نے اپنے میاں کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیکر کہا "پیارے رنج مت کرو۔ کچھ پروا نہیں۔ خدا جانتا ہے۔ کہ ہم اس بچے کو کس قدر چاہتے ہیں" خواب میں وہ میرا نام باآوازِ بلند پکارتا ہے گھر والے یہ سمجھتے ہیں کہ میں جادوگرنی ہوں عابد خاموش تھا +

ڈاکٹر بلایا گیا۔ اس نے معائنہ کرنے کے بعد کہا کہ بچے کو نمونیا ہو گیا ہے گھر کے تمام لوگ یہ سُن کر بے چین ہو گئے۔ سب کی آنکھیں اشک بار ہو گئیں۔ نوکر۔ چاکر اور گھر کے سب افراد اندوہگین نظر آتے تھے۔ رشن اس متمول گھرانے کا اکلوتا فرزند تھا۔ رشن کی امی بولیں۔ آہ اگر میں پہلے سے یہ جانتی۔ تو ہرگز اس ڈائن جادوگرنی کے ہاں اپنے پیارے جگر پارے کو نہ جانے دیتی اور نہ اس کے ساتھ اس کو کھیلنے کی اجازت دیتی۔ میرا نورِ نظر محض اس ذلیل عورت کے ہاں جانے سے بیمار ہوا ہے۔ یہ کہتے ہی وہ درد انگیز آواز سے رونے لگی ۔

کئی دن گذر گئے ڈاکٹر نے کہا اب بچے کی حالت خطرناک ہو چلی ہے اور اس کا جانبر ہونا مشکل ہے۔ گھر کا ہر شخص رو رہا تھا۔ خوبصورت بچہ آہستگی سے انگڑائی لیتے ہوئے دھیمی آواز میں بولا "امی ا..... تم..... بی یہاں آؤ۔ اس کی امی لپک کر اس کے پاس گئی۔ اور اس کے نازک ہونٹوں کو چوما۔ بچے نے دوبارہ جلدی سے کہا ـــــ "آپا اف روز" "افروز" خوف دہراس کے باعث اس کی ماں کانپ رہی تھی۔ پھر ننھے رشن نے پکارا ـــــ "امی"..... اب خوبصورت بچہ بصد مشکل حالتِ کرب و اضطراب میں بولنے کی جدوجہد کر رہا تھا۔ اس نے کہا "میری"۔ میری آپا افروز۔ وہ تھک گیا۔ اس کا سانس تیزی سے چل رہا تھا ۔

اب گھر والوں نے بہ متفقہ طور پر فیصلہ کیا کہ "افروز" کو اس بچے کے بسترِ مرگ کے پاس لانا چاہئے۔ بالآخر وہ بلائی گئی۔ جب وہ آئی تو ایک ملازم نے اس سے کہا۔ اری کم بخت میرے آقا کے اس ننھے لعل کو تندرست کر دے ورنہ یاد رکھ میں تجھے جہنم میں پہنچا دوں گا۔ یہ افروز کے لئے محض دھمکی ہی نہ تھی بلکہ اس کو عملی جامہ پہنانے میں بھی ان سرمایہ داروں کو باک نہ تھا ۔

رشن اُٹھ بیٹھا۔ اس نے پھر پکارا میری آپا افروز۔ افروز لپک کر اس کے پاس پہنچی۔ افروز کی پیشانی نورِ مسرت سے جگمگانے لگی۔ اس انبساط و شادمانی کو جو افروز کے چہرے پر جھلک رہی تھی کوئی جانچ نہ سکا۔ رشن نے آہستہ سے اپنی بانہیں اُس کی جانب پھیلا دیں۔ افروز نے فوراً اس کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ تمام لوگ مضطرب و خاموش کھڑے رہ گئے۔ مشہور اور نامی گرامی ڈاکٹر جو دو ہفتوں سے اس کا علاج کر رہے تھے اس بچے کو تندرست نہ کر سکے۔ لیکن افروز کے آتے ہی بچہ اُٹھ بیٹھا۔ اور اس کی گود میں جاتے ہی اس کی بیماری جاتی رہی۔ ایک ہفتہ بعد بچہ بالکل پہلے کی طرح تندرست ہو گیا۔ اب ایک مرتبہ پھر جاگیردار کا گھر مسرت سے ہم آغوش تھا۔ افروز ایک اقبال مند۔ بلند طالع۔ فرشتہ سیرت۔ اور مسرت آور دیوی تصور کی گئی۔ اور بالآخر اس کی حقیقی عزت افزائی کی گئی۔ یعنی اس کا شوہر جاگیر کا منتظم بنایا گیا جس سے اُسکی بھی بگڑی بن گئی اور فضلِ خدا ہو گیا ۔

ایک دن عابد خوش خوش افروز کے پاس بیٹھا تھا۔ افروز کا ہاتھ عابد کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے افروز سے کہا۔ تم کیسی جادوگرنی ہو؟ دیکھو تمہارے جادو نے کیا گل کھلایا؟ افروز کھلاکھلا کر ہنس پڑی۔ درحقیقت اس نے اپنے شوہر کی بات کا نہایت صحیح جواب دیا*

غلام احمد خاں مترجم

تلاشِ دوست

لالہ وہی گُل وہی
نرگس وسُنبل وہی
جام و مے وقُل وہی
نغمۂ قُلقُل وہی
نالۂ بُلبُل وہی   آہ مگر تو کہاں

دیکھ لیا کو بکو
ڈھونڈ لیا سُو بسُو
دل ہے کہ مثلِ سبُو
ہوگیا غم سے لہو
کاش کہ مِل جائے تو   آہ مگر تو کہاں

رقص میں ہیں ندیاں
مست ہے آبِ رواں
نیند میں ہیں وادیاں
سامنے تیرا مکاں
فطرتوں کا بوستاں   آہ مگر تو کہاں

وادی وکہسار میں؟
دشت میں گلزار میں؟
برگ وگل وخار میں؟
عیش میں آزار میں؟
دیدۂ بیدار میں   آہ مگر تو کہاں

آئی وہ ٹھنڈی ہوا
ابرِ کرم چھا گیا
میری تمنا بر آ
درد سے جی بھر گیا
کاش تجھے دیکھتا   آہ مگر تو کہاں

سُن مرے دل کی ندا
نالۂ درد آشنا
راہ سکوں کا پتا
نغمۂ فطرت سُنا
اَحمدِ مرحُوم آ   آہ مگر تو کہاں

جلال

محفلِ ادب

شہیدِ جستجو

مجھے عیش سے ہے نفرت کہ حریفِ ارتقا ہے
مجھے رنج میں ہے راحت کہ یہی رہِ بقا ہے
نہ شغف ہے معصیت سے نہ غرورِ اتقا ہے

نہ حریصِ زندگی ہوں نہ حریفِ زندگی ہوں
ہے مجھے یقین کامل کہ ردیفِ زندگی ہوں

نہ چمن سے واسطہ ہے نہ اسیرِ رنگ و بو ہوں
نہ میں بندۂ غرض ہوں نہ غلامِ آرزو ہوں
ہے مجھے تلاش اپنی میں شہیدِ جستجو ہوں

مری کاوشوں کی غایت نہ زمین ہے نہ زر ہے
مری زندگی کا مقصد تو کہیں بلند تر ہے

منقول

امینِ حزیں

اُردو نثر میں حالی کا درجہ

حالی کی نثری خدمات پر ایک سرسری نظر ڈالنے کے بعد ہم اس نتیجہ تک پہنچتے ہیں کہ جس طرح عام طور پر ان کو شاعری کی حیثیت سے اہمیت دی جاتی ہے ایک نئے دبستان سخن کا بانی قرار دیا جاتا ہے نثر کے لحاظ سے بھی ان کی مصنفات ادبیات اُردو کے ایک جزو لاینفک میں اور ایسے جزو لاینفک جو ان کی شاعری کی طرح ادبیات اُردو میں ایک نئے اور ضروری باب کے اضافہ کے باعث ہیں۔ اس وقت بھی جبکہ اردو کا سرمایہ نثر کافی ترقی کر چکا ہے۔ اگر مولوی حالی کی نثری خدمات کو اس سے علیحدہ

کرلیا جائے تو ایسا فقدان نظر آئیگا جس کی تلافی شاید ہی متعدد انشا پردازوں کی متفقہ کوششوں کے بعد بھی ایک عرصہ تک ہو سکے، واقعہ یہ ہے کہ حالی کی نثری تصانیف ادبیات اُردو کی بساط کے ایسے پیوند ہیں جن کے بغیر اس کی بدنمائی ہرگز نہیں چھپ سکتی ؛

اگرچہ اُردو نثر میں سب سے پہلے جدید طرز کی علمی و ادبی کتابیں لکھنے کا سہرا مولوی محمد حسین آزاد کے سر ہے لیکن اُن کا اسلوب بیان کچھ اس قسم کا ہے کہ وہ معیاری اُردو کی کتابیں نہیں قرار دی جا سکتیں۔ آزاد اپنی تحریروں میں اس قدر بے تکلف ہو جاتے ہیں کہ ہر جگہ اپنی ذات کے متعلق کچھ نہ کچھ کہے بغیر نہیں رہ سکتے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی حساس شخص خانگی ملاقات میں باتیں کر رہا ہے۔ یہی حال مولوی نذیر احمد کا ہے، وہ اس معاملہ میں ایک طرح سے آزاد سے بھی بڑھ گئے ہیں آزاد کی عبارتیں پڑھتے وقت یہ سمجھ میں آتا ہے کہ کوئی شخص گھر میں بیٹھ کر بے تکلف گفتگو کر رہا ہے لیکن نذیر احمد کی تحریروں سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا مصنف بازاروں اور گلی کوچوں میں چکر لگاتے ہوئے عوام سے بات چیت کر رہا ہے۔ حالی نے اپنے اسلوب کے ذریعہ سے ان دونوں زبردست خرابیوں کو دور کر دیا، اور سنجیدہ و علمی مضامین کو اس طرح لکھنا شروع کیا کہ پڑھنے والا اُن سے مرعوب ہو جائے اور اس کو معلوم ہو کہ یہ ایک علمی بحث ہے۔ اس قسم کے اسلوب کی اس زمانہ میں سخت ضرورت تھی کیونکہ یہ ایک ردعمل تھا اُردو کی اُن پرانی طرز کی تحریروں کا جن میں مواد اور کام کی باتیں تو بہت کم ہوتی تھیں لیکن لفظی خوبیوں اور ظاہری صناعیوں کا خاص طور پر لحاظ رکھا جاتا تھا۔ یہ حالی جیسے سنجیدہ اور اعلیٰ مذاق رکھنے والی ہستی ہی کا کام تھا۔ کہ اگر اُردو کو ایک طرف بیجا جکڑبندیوں سے نکالنے کی کوشش کی تو دوسری طرف لحاظ رکھا کہ وہ بالکل آزاد ہو کر بازاری اور مبتذل نہ ہونے پائے ؛

اسلوب کی خوبی کے علاوہ حالی کی نثری مصنّفات نوعیت موضوع و مضامین کے لحاظ سے اُن کے ہم عصروں میں اُن کو ممتاز رکھتی ہیں۔ یہ پہلے ادیب ہیں جنہوں نے تنقیدی خیالات کو اردو میں روشناس کرایا۔ حالی سے قبل اردو کے کسی انشا پرداز نے بھی اس طرح غیر جانبدارانہ تنقیدیں نہیں پیش کی تھیں۔ اگرچہ آزاد نے آبحیات میں اس فرض کو انجام دینا چاہا ہے لیکن اُن کے ایک ایک لفظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ غیر جانبدار نہیں رہ سکتے وہ جگہ جگہ اپنے ذاتی معتقدات سے کام لینے ہیں اور اس بات پر غور کرنے کی کوشش نہیں کرتے کہ میں کس کے ساتھ انصاف کر رہا ہوں اور کس کے حق میں ظلم؟ مولوی نذیر احمد تو اس میدان کے مرد ہی نہیں۔ برخلاف ان دونوں کے حالی کو قدرت کی جانب سے ایک تنقیدی دماغ عطا ہوا تھا اگرچہ انہوں نے فن تنقید پر کچھ نہیں لکھا لیکن وہ انشا پردازوں کا بالمقابلہ مطالعہ کرنے میں خاص طور پر اعلیٰ مذاق سے کام لیتے تھے غیر جانبدار تنقیدی خیالات کی جس قدر فراوانی اُن کی تحریروں میں پائی جاتی ہے۔ اس زمانہ کے کسی اور انشا پرداز کی مصنفات میں نہیں پائی جاتی، یہی وہ زبردست امتیاز ہے جس کے باعث حالی نے...... اردو ادب میں ایک اہم رتبہ حاصل کر لیا ہے اور جس کے اثر سے آج تک اُردو کے تنقید نگاروں کی خاص رہبری ہوتی رہی ہے ؛

اُردو شعرا نے جہاں حالی کی نئی طرز کی نظموں کو آنے والی شاعری کے صحیح نمونے سمجھ کر اُن کی تقلید کرنی شروع کی ان کے دیوان کے دیباچہ اور مقدمہ کے مطالعہ کے بعد بھی یہ معلوم کیا کہ یہ نمونے کیا اہمیت رکھتے ہیں اور ہم کو اُن کی تقلید کس طرح کرنی چاہیئے؟ اگر حالی کی نظمیں ملک

قوم کے سامنے ان کے نثری مقدمہ اور دیباچہ کے بغیر پیش ہوتیں تو اُن کا اثر اُردو کے شاعروں پر اس قدر دیرپا نہ ہوتا ۔

حالی نے نہ صرف نمونے پیش کر دئیے بلکہ ان نمونوں کو آنے والی نسلوں کے لئے چراغ راہ بنانے کی خاطر ان کی خوبیوں ضرورت اور اصولوں پر بھی روشنی ڈال دی اِس میں کوئی شک نہیں کہ مولوی محمد حسین آزاد نے بھی اس قسم کے نمونے ضرور پیش کئے ہیں اس میں اولیت کا فخر انہیں کو حاصل ہے اور اُن کی بعض نظمیں حالی کی بعض نظموں سے یقیناً بلند پایہ قرار دی جا سکتی ہیں لیکن وہ اتنی مقبول نہ ہو سکیں جتنی حالی کی نظمیں ہوئی ہیں حالی نے ایک اعلیٰ و ارفع مقام پر پہنچکر عام روش کے خلاف نہ صرف ایک زوردار اور انوکھی آواز بلند کی ہے بلکہ آواز سن کر اُن کی طرف متوجہ ہونے والوں کے لئے ایسے نقش قدم بھی چھوڑ دئیے ہیں جن پر چلنے کے بعد ہر شخص اُس اعلیٰ مقام تک پہنچ سکتا ہے جہاں سے حالی نے صدا دی تھی ۔

تنقید نگاری کے بعد حالی کا زبردست نثری کارنامہ ان کی سوانحعمریاں ہیں جس طرح اُردو تنقید نگاروں میں انکو اولیت کا رتبہ حاصل ہے سوانحعمری کو روشناس کرانے میں بھی حالی سب سے پیش پیش ہیں فن سوانح نگاری اگرچہ مشرق کے لئے کوئی نئی چیز نہیں ہے لیکن حالی سب سے پہلے شخص ہیں جنہوں نے یورپ کی جدید ترین طرز سوانح نگاری کے مطابق ہندوستان میں بیٹھ کر سوانحعمریاں لکھنی شروع کیں ۔ غور طلبانہ تدقیق، حالات و واقعات سے منطقی طور پر نتیجوں کا استخراج اور جس کی سوانح عمری لکھی جائے اُس کے کارناموں اور زندگی میں غور و خوض کرنے کی ابتدا حالی ہی نے کی اور اُن کے بعد اُردو کے جس قدر انشا پردازوں نے سوانح نگاری کی طرف توجہ کی ۔ ان سب کو غیر ارادی طور پر حالی ہی کی تقلید کرنی پڑی اس بارے میں علامہ شبلی جیسی ہستی بھی حالی کی خوشہ چین نظر آتی ہے ۔ اگرچہ شبلی کا دائرہ عمل اسلوب بیان اور نوعیت مضامین دونوں کے لحاظ سے حالی کے جولانگاہ سے بہت زیادہ دلچسپ اور وسیع تھا لیکن جب انہوں نے سوانح نگاری کی طرف توجہ کی تو انہیں بھی حالی کے پیش کردہ نمونہ کو اختیار کرنا پڑا ۔ یہ حالی کی صحت مذاق کی دلیل ہے کہ شبلی جیسا بلند پایہ شخص بھی انہی کے اصول پر کاربند ہوتا ہے یہی وہ مقام ہے جہاں سے اُردو نثر میں حالی کی اہمیت ایک خاص انفرادی شان کے ساتھ جلوہ گر ہونے لگتی ہے ۔

حالی دنیا کی ان خوش قسمت ہستیوں میں سے تھے جو اپنے ہاتھ سے لگائے ہوئے پودے کو اپنی آنکھوں سے پروان چڑھتا ہوا دیکھ کر فخر حاصل کر سکتے ہیں انہوں نے جس قدیم پیرایہ تحریر کا ردعمل شروع کیا تھا وہ اُن کی زندگی ہی میں حرف غلط بن کر مٹ چکا تھا اُن کے نئے رنگ کی نظموں نے انہی کے سامنے پرانے اور بدوضع رنگوں کی شاعری کو اپنے وسیع دامنوں میں محو کر لیا ۔ انکے نقد اور سنجیدہ تنقیدی خیالات نے ایک طرف قدیم بے راہ روی اور بدمذاقی کے خرمنوں کو بجلی بن کر جلا دیا اور دوسری طرف بوستان علم و ادب کے نونہالوں کو ابر نیساں بن کر سرسبز و شاداب بنا دیا ۔

اس کامگار انسان کی مسرت و اطمینان کی کوئی حد بھی ہو سکتی ہے جس نے اپنی جوانی میں جن کاموں کے کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا ان کو اپنے بڑھاپے تک فتحمندی کے ساتھ انجام کو پہنچا دیا ہو ! ؟

اپنے فرائض سے سبکدوش ہونے اور اپنی اُمیدوں کو بارآور پانے کے بعد اگر حالی کو وہ اطمینان و سکون نصیب نہ ہوتا جو انکی آخر عمر میں انکو حاصل ہوا تھا اور جس کے بعد انہوں نے کوئی بڑا ادبی کام نہیں پیش کیا تو فطرت کی اس سے بڑھ کر احسان فراموشی اور ناقدردانی کوئی اور نہیں ہو سکتی تھی ۔

(نگار)

فہرست مضامین

جلد ۱۱	بابت ماہ مارچ ۱۹۲۷ء	نمبر ۳

تصحیح:۔ کاتب نے ۲۲۰ صفحے کے بعد بعض صفحوں کے نمبر رسالہ میں غلط درج کر دیئے ہیں ناظرین تصحیح فرمالیں۔

جہاں نما

پردہ اور تعدّد ازواج - مولانا محمد مارماڈیوک پکتھال نے مدراس میں اپنی ایک بصیرت افروز تقریر کے دوران میں پردہ کی شرعی حیثیت پر روشنی ڈالی - ہندوستان میں مسلمان عورت کے حقوق مردوں کے جبرو استبداد پر جس طرح بے دریغ قربان کئے جارہے ہیں انہوں نے اس پر اظہار تاسف کرتے ہوئے کہا کہ مسلمان اپنے مذہب کی توہین کررہے ہیں - اسلام نے عورت اور مرد کو مساوی حقوق دیئے ہیں - یہاں تک کہ اگر مرد طلاق کے ذریعہ سے بوجوہ عورت سے علیحدگی اختیار کرسکتا ہے - تو عورت کو بھی شرعاً حق حاصل ہے کہ خلع کے ذریعہ سے بعض حالات کی موجودگی میں مرد سے علیحدہ ہوجائے -

مقرر نے پردہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ نقاب پوشی کا رواج دنیائے اسلام میں ہمیشہ سے موجود نہ تھا عرب میں پردہ کا مفہوم یہ تھا کہ عورت اپنے بالوں اور گردن کو چھپائے رکھے - ورنہ یوں مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد زراعت پیشہ ہے اور عورتوں کو اپنے شوہروں اور بھائیوں کے ساتھ بعض اوقات کھیتوں میں کام کرنا پڑتا ہے - ایسی حالت میں ان پر نقاب پوشی کی فرضیت ایک بلائے بے ہنگام سے کم نہ ہوتی -

پردہ کی ابتدا زرتشتی، ایرانی اور عیسائیوں کے بازنطینی عہد سے ہوئی - ابتدا میں یہ پردہ امرا کی خواتین سے مخصوص رہا اور از بس کہ ان کے وسیع اور دلکشا محل، ان کے خوبصورت باغ، ان کی روح افزا سیرگاہیں انہیں قدرت کے انعامات سے متمتع ہونے کا موقع بہم پہنچا دیتی تھیں - ان کے لئے پردہ میں کسی قسم کی دقت پیدا نہ ہوئی - لیکن پردہ کی یہ قابل اعتراض رسم ہر طبقہ کے لئے جائز نہیں سمجھی جاسکتی - ہندوستان میں جس پردہ کا رواج ہے اسلام اس کی تعلیم نہیں دیتا - ترکی حکومت کو اس غلطی کے احساس نے نقاب پوشی کی رسم کی تنسیخ پر مجبور کیا، چنانچہ وہاں اس قسم کا پردہ منسوخ ہوگیا ہے - اور وہاں کی عورتیں کھلی ہوا میں سیر و تفریح سے اپنی صحت کو بحال رکھ سکتی ہیں - مولانا نے سلسلۂ تقریر کو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ اناطولیا کے مسلمانوں سے زیادہ شرعی احکام کا پابند اور کوئی نہیں وہاں عربی قبائل میں عورتوں کو اس قدر آزادی حاصل ہے کہ ہندوستان کے مولوی انہیں دیکھ پائیں تو ہکا بکا رہ جائیں -

اسلام کے قوانین انسان کی فطرت کے مطابق وضع ہوئے ہیں - شرع اسلام کبھی ایسی رسوم کے جواز کی روادار نہیں ہوسکتی جن سے عورت کو تکلیف یا نقصان پہنچتا ہو - تعدد ازواج کو بھی رواجی پردہ کی طرح شعار اسلامی

قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اسلام نے انسانی فطرت اور رغبت کو مدنظر رکھ کر بعض کڑی شرائط کے ساتھ ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کی اجازت دی ہے۔ اسی طرح اسلامی معاشرت بعض شرائط کے ساتھ عورت کو بھی شوہر کے انتخاب کی اجازت دیتی ہے۔ عورتوں کی غلامی اور تعلیم سے محرومی اسلامی ہندوستان کو تباہ کر رہی ہے ◆

تحریک آزادیٔ نسواں کا دوسرا پہلو: "کرنٹ ہسٹری" میں جینا لمبروسو فیررو نے جو ایک مشہور اطالوی مؤرخ کی بیوی ہے۔ موجودہ نسوانی تحریکات کے متعلق ایک مضمون لکھا ہے۔ جس میں عورتوں کے مختلف مطالبات پر اظہار خیالات کرتے ہوئے وہ لکھتی ہے:۔

بعض عورتوں کی خواہش ہے کہ اُن کو بھی اُن سب معاملات میں آزادی حاصل ہو جن میں مرد آزاد ہیں۔ بعض عورتیں چاہتی ہیں کہ وہ اپنی نسوانیت میں اور زیادہ کمال بہم پہنچائیں۔ بعض کا مطمح نظر یہ ہے کہ عورتیں اصول اخلاق کی پابندی میں مردوں سے بڑھ چڑھ کر ہوں۔ بعض کی خواہش یہ ہے کہ کاروبار کے اُن تمام شعبوں میں جن کے تنہا اجارہ دار اس وقت مرد ہیں عورتوں کو بھی آزادی کے ساتھ حصّہ لینے کا حق مل جائے۔ اور بعض اس بات کی متمنی ہیں کہ عورتوں کو اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے ملک کے نظم و نسق میں بھی حصّہ ملے ◆

مختلف ممالک میں اس قسم کی تمام نسوانی تحریکات کی متفقہ کوشش یہ ہے کہ عورتوں کو وہ تمام حقوق دلائے جائیں جو اس وقت مردوں کو حاصل ہیں۔ عورتوں کو مردوں کی طرح تمام حقوق دلانے کی یہ متحدہ مساعی اس فرضیہ کو مدنظر رکھ کر عمل میں لائی جا رہی ہیں کہ اس طرح عورتوں کو اپنی موجودہ مسرتوں کے علاوہ وہ تمام مسرتیں اور دلچسپیاں بھی حاصل ہو جائیں گی۔ جو اس وقت صرف مردوں کو حاصل ہیں ◆

اِس بات سے انکار کرنا ممکن نہیں کہ اس تحریک کو اپنے نظام عمل کی تبلیغ میں نمایاں کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ وہ تمام کڑی منزلیں جن میں سے اس تحریک کو گزرنا پڑا اور وہ تمام رکاوٹیں جو عورت کی مسرت کے راستہ میں حائل سمجھی جاتی تھیں اب طے ہو چکی ہیں۔ کاروبار، پیشوں اور فرائض کا امتیاز جو اس سے قبل مرد اور عورت کے درمیان حائل تھا باقی نہیں رہا۔ آج کل کی عورت کو مرد اور ووٹ دونوں حاصل ہیں۔ عورتیں مردوں کی طرح اور مردوں کے برابر تعلیم حاصل کر سکتی ہیں، عورتیں وزیر ہو سکتی ہیں، بعض قوموں میں انہیں مذہبی پیشوائی بھی حاصل ہو سکتی ہے۔ وہ موٹربان، سیاسی رہنما، ہیئت دان غرضکہ سب کچھ ہو سکتی ہیں۔ عورتیں ہر عہدہ، ہر اعزاز اور ہر منصب پر فائز ہو سکتی ہیں۔ وہ تمام مردانہ کھیل تماشوں میں حصّہ لے سکتی ہیں

بارنس لینگلن کی مثال کو پیش نظر رکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ ایک ٹینس کھیلنے والی مشاق عورت بیش قرار دولت بھی کما سکتی ہے ؛

لیکن اگر مجھ سے یہ سوال کیا جائے کہ کیا ان تمام کامیابیوں اور فتحمندیوں نے عورت کی زندگی کی مسرتوں میں اضافہ کیا ہے تو مجھے اِس بات کا جواب بطور اثبات دینے میں تامل ہوگا ؛

محبت عورت کا مستقل مستحکم اور غیر متبدل منتہائے نظر ہے۔ محبت عورت کے آسمان کا درخشندہ آفتاب ہے محبت سے مراد وہ سفلی جذبہ نہیں جو مادی کشش اور ہوس پرستی میں پرورش پاتا ہے۔ بلکہ عورت ہی کے الفاظ میں یہ خواہش، کہ کسی کے خیال سے اس کی رُوح سرشار ہو اور کسی کے دل کا قرار اُس کی تمنا سے وابستہ ہو۔ وہ اس کی پرستش کرتی ہو اور وہ اُس کا پرستار ہو۔ اعلیٰ درجہ کی محبت کی ایک عام مثال ماں اور بچہ کی محبت میں ملتی ہے۔ عورت اگر اسی کو اپنی زندگی کا مقصد قرار دے تو یہ آزادی، خود مختاری، سیاسی تفوق، دولت، قوت اور شہرت و ناموری سے زیادہ اُسکی امیدوں اور آرزوؤں کی تسکین کا باعث ہو ؛

ہندوستانی اور انگریزی کھانا۔ کرنل مکارسن نے زراعتی کمیشن کے سامنے بیان دیتے ہوئے کہا کہ انسانوں، جانوروں اور پودوں کی تمام بیماریاں غذا کی خرابی سے پیدا ہوتی ہیں۔ انہوں نے بیان کیا کہ ساڑھے نو کروڑ جو ہسپتالوں میں آئے اُن میں سے تیس لاکھ سے زیادہ ایسی بیماریوں میں مبتلا تھے جو خرابیٔ غذا سے پیدا ہوتی ہیں۔ ہندوستان کی سب سے بڑی ضرورت اِس وقت دودھ کی بہم رسانی اور جانوروں کے چارہ کی اصلاح ہے۔

کرنل مکارسن نے یہ بھی بتایا کہ جن ہندوستانیوں نے اپنی عام غذا کو چھوڑ کر انگریزی طرزِ خورو نوش اختیار کر لیا ہے اُن کی جسمانی حالت کو خطرناک نقصان پہنچ رہا ہے ؛

ہندوستان میں موٹر کاروں کی کثرت۔ اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۱۹۲۴-۲۵ء اور سنہ ۱۹۲۶ء میں یکم اپریل سے لیکر ۳۱ اکتوبر تک سات ماہ کے عرصہ کے اندر ہندوستان میں جن موٹر کاروں کی درآمد ہوئی اُن کی قیمت بالترتیب ۱۲۲۱۰۷۵۵ روپے ۱۸۴۴۰۱۳۰ روپے اور ۱۵۲۳۶۴۹۵ روپے تھی ان موٹر کاروں کی برآمد انگلستان، بلجیم، فرانس، اٹلی اور دوسرے مغربی ممالک سے ہوئی تھی ان میں سے ۳۰ فیصدی بنگال نے ۲۹ فیصدی بمبئی نے ۱۵ فیصدی سندھ نے ۱۵ فیصدی مدراس نے اور ۱۱ فیصدی برما نے خریدیں۔ ان اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان کا سرمایہ کس طرح بے دریغ روز افزوں مقدار کے ساتھ ممالکِ غیر کو جا رہا ہے معلوم نہیں ہندوستان کب اپنے لئے یہ چیزیں پیدا

امان اللہ خان غازی بادشاہ افغانستان

امان اللہ خان دنیائے اسلام کے ان چند مایۂ ناز افراد میں سے ہیں جن کا وجود ایک تاریک دَور کے بعد اسلام کی عظمت و شوکت اور سربلندی کا باعث ہوا ہے۔ امان اللہ خان کے برسرِ تخت ہونے سے قبل افغانستان کے کندھوں پر غیر ملکی اقتدار کا جوا پڑا ہوا تھا۔ لیکن اس جوان بخت وجواں سال شہریار نے عنانِ سلطنت سنبھالتے ہی سب سے پہلے اپنے ملک کو آزاد کرایا۔

امان اللہ خاں امیر حبیب اللہ خاں مرحوم کے منجھلے بیٹے ہیں۔ بچپن ہی میں یہ نہائیت آزاد خیال قوم پرست تھے اور ہمیشہ اپنے ملک کی اصلاح و آزادی کی تدابیر سوچنے میں منہمک رہتے تھے +

امیر حبیب اللہ خاں کے قتل ہوتے ہی اُن کے بھائی نصر اللہ خاں نے اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا اور ولیعہد سلطنت شاہزادہ عنائیت اللہ خاں سے اپنی حکومت تسلیم کرالی۔ اُس وقت امان اللہ خاں کابل کے گورنر تھے۔ اُنھوں نے اعیانِ سلطنت کو جمع کر کے مشورہ کیا اور سب نے متفقہ طور پر ان کا حق امارت تسلیم کر لیا۔ اس کے بعد انھوں نے نصر اللہ خاں کو پیغام بھیجا کہ چونکہ ولیعہد آپکے حق میں حکومت سے دست بردار ہو چکے ہیں۔ اس لئے اب بادشاہی کا حق قانوناً مجھے پہنچتا ہے۔ آپ میری امارت کو تسلیم کیجئے۔ جنرل نادر خاں کو نصر اللہ خاں نے سابق امیر کے قتل کے الزام میں قید رکھا تھا۔ نادر خاں کے امان اللہ خاں سے نہائیت گہرے دوستانہ تعلقات تھے۔ اس لئے انہیں ڈر تھا کہ مبادا ان کی دوستی نادر خاں کی جان پر کوئی آفت آنے کا باعث ہو۔ چنانچہ امان اللہ خاں نے نصر اللہ خاں سے یہ مطالبہ بھی کیا کہ اُن کے باپ کا قاتل اُن کے حوالہ کیا جائے۔ تاکہ وہ اسے قرار واقعی سزا دے سکیں۔ نصر اللہ خاں نے نادر خاں کو امان اللہ خاں کے پاس بھیج دیا۔ جب نادر خاں دربار میں پہنچے۔ انہیں ہتھکڑیاں لگی ہوئی تھیں۔ امان اللہ خاں نے فوراً ہتھکڑیاں کھلوا دیں اور اُنہیں افواج افغانستان کا سپہ سالار اعظم مقرر کیا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں نصر اللہ خاں اپنے ہی سپاہیوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے۔ اب امان اللہ خاں کے لئے میدان میں کوئی حریف نہ رہا تھا۔ جس وقت امان اللہ خاں کے بڑے بھائی شاہزادہ عنائیت اللہ خاں سابق ولیعہد اُن کے سامنے پیش ہوئے تو امان اللہ خان نے اپنی تلوار کمر سے کھول کر اُن کو دی اور کہا کہ مجھے معلوم ہے کہ وارثِ تخت و تاج آپ ہیں۔ لیکن چونکہ آپ نصر اللہ خان کے حق میں دستبردار ہو گئے۔ اس لئے میں نے اپنا آبائی حق حاصل کیا۔ اب بھی اگر آپ کو امارت کی خواہش ہے تو تخت حاضر ہے

مجھ سے کسی قسم کا اندیشہ ہو تو یہ تلوار لیجئے اور میرا سر قلم کر دیجئے"۔ سابق ولیعہد اس تقریر سے بہت متاثر ہوئے اور انہوں نے جواب میں اپنے چھوٹے بھائی سے کہا کہ "تختِ افغانستان خدا نے تمہیں دیا ہے اور تمہیں کو مبارک ہو"۔ امان اللہ خاں کے تخت نشین ہوتے ہی حکومت برطانیہ سے افغانستان کے تعلقات بگڑ گئے۔ ایک جنگ ہوئی جسکے بعد انگریزوں نے صلح کی خواہش ظاہر کی۔ عہد نامہ میں افغانستان کی کامل آزادی تسلیم کی گئی۔ اب افغانستان کی حکومت دوسرے آزاد ممالک کی طرح ہے اور اس کے سفیر یورپ و ایشیا کی سلطنتوں میں موجود ہیں +

امان اللہ خاں اس وقت افغانستان کی معاشرتی اصلاح اور ترقی تعلیم میں مصروف ہیں۔ تھوڑے ہی عرصہ میں افغانستان نے غیر معمولی ترقی کی ہے۔ اس کے علاوہ افغانستان نے صنعت و حرفت اور تجارت کی طرف بھی قدم بڑھائے ہیں۔ اُمید ہے کہ اب یہ ملک بہت جلد ہر لحاظ سے دوسرے آزاد ممالک کا ہم پلّہ ہو جائیگا +

(حامد علی خان)

میڈوسا کا سر

اس تصویر کا ماخذ یونان کی قدیم مذہبی حکایات ہیں۔ پرسیس یونانیوں کے سب سے بڑے دیوتا جوپیٹر کا بیٹا اور ایکریسیس شاہ آرگاس کا پوتا تھا۔ ایک نجومی نے پیشینگوئی کی تھی کہ ایکریسیس اپنے پوتے کے ہاتھوں ہلاک ہوگا۔ چنانچہ حفظ ماتقدم کیلئے اُس نے اپنے پوتے کو آرگاس سے جلاوطن کر دیا۔ جلاوطنی کے زمانے میں پرسیس کو بہت سی مہمات در پیش ہوئیں۔ جن میں سے میڈوسا کے ساتھ اسکی نبرد آزمائی کا قصّہ بھی مشہور ہے۔ میڈوسا دراصل ایک خوبصورت عورت تھی جس پر علوم و فنون کی یونانی دیوی منروا کسی وجہ سے ناراض ہوگئی اور اُس نے اُسکے بالوں کو زہریلے اور خوفناک سانپوں کی صورت میں تبدیل کر دیا۔ اسکے علاوہ اس کی صورت اسقدر خطرناک بنادی کہ جو شخص اسکی طرف دیکھتا پتھر ہو جاتا۔ اس وجہ سے پرسیس کو میڈوسا کے ساتھ لڑتے وقت بہت احتیاط کرنی پڑی۔ وُہ اپنی ڈھال میں سے اسکا عکس دیکھ کر اس پر حملہ آور ہوتا رہا، کیونکہ اگر وُہ بلاواسطہ اُسے دیکھتا تو پتھر ہو جاتا۔ بالآخر پرسیس میڈوسا کا سر تن سے جُدا کرنے میں کامیاب ہوا۔ اس نے اس سر کو اپنی تھیلی میں ڈال لیا۔ جب وُہ واپس آرہا تھا اُسے انڈرومیڈا جو ایک یونانی شاہزادی تھی ایک خوفناک اژدہا کے چنگل میں پھنسی ہوئی نظر آئی۔ اس شاہزادی کی ماں نے از راہ فخر یہ کہا تھا کہ اس کی بیٹی سمندر کی تمام دیویوں سے خوبصورت ہے اس پر سمندر کا دیوتا نبیٹیون ناراض ہوگیا اور اُس نے انڈرومیڈا کو اس اژدہا کے سامنے ڈلوا دیا۔ پرسیس نے اژدہا کو مار کر انڈرومیڈا کو اس سے چھڑایا اور اس کو اپنی بیوی بنا لیا۔ اس تصویر میں پرسیس انڈرومیڈا کو میڈوسا کا

سر دکھا رہا ہے۔ مرنے کے بعد بھی اس سر میں یہ طاقت برقرار تھی کہ اس کو دیکھنے والا پتھر ہو جاتا۔ پرسیس اپنی بہادرانہ فتحمندی کی یہ نشانی انڈرومیڈا کو دکھانے کے لئے دوسری چیز میں اس کا عکس ڈال رہا ہے۔ اس نے انڈرومیڈا کو مڑکر نہ دیکھنے کی سخت تاکید کر رکھی ہے +

اس تصویر سے اس حقیقت کا اظہار مقصود ہے کہ بدی کی ایسی خوفناک شکلیں بھی ہوسکتی ہیں کہ ان پر براہ راست نظر ڈالنے سے خون رگوں میں منجمد ہو جاتا ہے۔ اور روح مردہ ہو جاتی ہے۔ جس طرح پرسیس اپنی ڈھال میں سے میڈوسا کا عکس دیکھ کر اس سے لڑا اور اس پر غالب آیا اسی طرح بدی کی ان مہیب صورتوں کی حقیقت سمجھنے اور ان پر فتح پانے کے لئے کوئی نہ کوئی واسطہ ضروری ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے صلحاء و انبیاء کی کتابوں کے صفحات وہ آئینے ہیں جو ہمیں ان مکروہ اور خوفناک غلطیوں کی صورت دکھاتے ہیں جن سے نہ بچنا جسمانی و روحانی ہلاکت کا مترادف ہے +

(حامد علی خان)

ذرّوں کا وجد

کمرہ بند ہے وہ دھوپ جو حکیم ویوجانس کلبی کو بھی سکندر سے زیادہ محبوب تھی کمرہ کے باہر ہے۔ اندر تو بس اس کی شعاع روشندان سے آرہی ہے۔ لکھ رہا ہوں۔ یکایک اس شعاع کی لکیر کو دیکھا جو روشندان سے لیکر قلمدان تک نورانی تار کی طرح قایم ہے۔ اور اس شعاع میں بیشمار ذرّے قلابازیاں کھاتے ہوئے اوپر سے نیچے آتے ہیں اور نیچے سے اوپر جاتے ہیں۔ دائیں طرف بھی ان کی دوڑ ہے بائیں جانب بھی ان کا میلان ہے یہ ذرّے کیا ہیں اس کا حال سورج کو معلوم ہوگا کہ شاعر سب سے بڑا سورج کو اور سب سے چھوٹا ذرہ کو کہتے ہیں۔ کچھ نہ کچھ تو نسبت ہو گی جو سورج کے ساتھ ذرہ کا نام لیا جاتا ہے +

یہ بھی کہتے ہیں ذرہ بھی ایک چھوٹی دنیا ہے۔ ہمارے مقابلہ میں ایک ناچیز کائنات ہے اور اسکے اندر بھی ایسی ہی آبادی ہے جیسی آبادی ہم انسانوں کے وجود کے اندر ہے کہ ہر قطرۂ خون میں بیشمار جانیں ہیں اور ہر جان میں لاتعداد اور ان گنت ارمان ہیں اور ہر ارمان میں ایک وجد ہے۔ ایک حیرت ہے اور ایک خلجان و خلفشار ہے۔ اگر یہ سچ ہوا اور ان ذروں کے اندر بھی آبادیاں ہوئیں تو یورپ و امریکہ کو خبر نہ دینا وہ مریخ کی تحقیقات ترک کر کے ذروں کی اقلیم کی جغرافیہ پیمائی شروع کر دینگے +

ذرا دیکھنا ایک ذرہ پر نظر جاتا۔ وہ اوپر سے نیچے کی طرف کس مستی کے عالم میں جھومتا اور نشہ کی سی حالت میں لڑکھڑاتا ہوا چلا آتا ہے۔ یہ کچھ مخمور ہے! یا کوئی اور بھید اسکی اس مستانہ چال میں مستور ہے؟ اس کو کون جنبش دے رہا ہے۔ یہ کیوں

رقص کرتا ہوا اوپر نیچے ہو رہا ہے اسکو کس نے سنبھال رکھا ہے۔ اسکا مرکز ثقل کہاں ہے۔ اسکے وجود کا وزن اگر کچھ ہے تو زمین پر کیوں نہیں گرتا۔ اور اگر یہ محض ہوائی پیکر لطیف ہے تو ہوا سے الگ ہے یا اسمیں شامل ہے۔ کیا فضا میں قوالی ہو رہی ہے۔ کیا ان ذرات کو کسی نغمۂ غیب کی صدا آرہی ہے۔ کیا انکے سامنے کوئی داخط قوال گا رہا ہے۔ کیا انکے دل و دماغ پر کسی سریلے باجے نے وجد کا خمار پیدا کر دیا ہے کوئی بات تو ہے جو یہ سب وجد میں ہیں۔ اور ان سب پر رقص کی حالت طاری ہے۔ اور میرا پیش نظر ذرہ جو دوسروں سے ذرا چھوٹا ہے۔ اپنے ہمجنس ذرات سے کچھ زیادہ بیقرار ہے معلوم ہوتا ہے اسکو ابھی شباب میسر آیا ہے۔ اس نے آج ہی جوانی کے میدان میں قدم رکھا ہے۔ عمر کم ہے۔ قد و جسامت کم ہے مگر ولولے اور جوش و خروش زیادہ ہیں۔ سعدی نے سچ کہا تھا در ایام جوانی چنانکہ افتد دانی۔ کچھ کمسنی کے جذبات ہیں کچھ جوانی کی امنگیں ہیں یا صوت سرمدی اور نغمہ لاہوتی کی آج کوئی خاص مجلس سماع ہے کہ اس غریب کی ننھی سی جان پر قیامت آگئی ہے۔ ناچ رہا ہے۔ آہ۔ اُف۔ کہنا چاہتا ہے مگر قدرت نے زبان نہیں دی۔ اندر ہی اندر گھٹ رہا ہے۔ بلبلا رہا ہے۔ قلا بازیاں کھا رہا ہے۔ اوہ نغمۂ غیب اس ہستی بے وجود پر کیسا غضب ڈھا رہا ہے۔

کیوں میاں ذرہ۔ کیا تمہارے اندر بھی ہندو مسلمان آباد ہیں اور کیا انکے اندر بھی اختلافات ہیں۔ اور کیا انکے اختلافات میں بھی شورش ہے۔ اور کیا اس شورش میں بھی غلط رفتاریاں ہیں اور کیا ان غلط رفتاریوں سے تم کو بھی حزن و ملال ہے۔

سچ بتاؤ تم کسی غیبی قوالی سے جھوم رہے ہو۔ یا کسی افسوس نے تمہارے وجود کو مضطرب کیا ہے یا محض مجھے اپنی زندگی اور موجودگی کا ثبوت دینے کیلئے تم جگمگاتے۔ تھرتھراتے۔ تلملاتے۔ شعاع نور کے جھولے میں جھونٹے لیتے میری نگاہوں کو اپنا جلوہ دکھانے آئے ہو؟ تم ایک آفتاب سمائی کے مدمقابل ہو۔ اور انسان بھی ایک شمس حقیقت کا عکس امتیازی ہے۔ تمہارا ظہور جس آسمانی سورج کے سبب اس حجرہ تاریک میں ہوا ہے آدمی کا ظہور بھی ایک نور اعظم کے پرتوہ سے کائنات ظلماتی میں ہویدا ہوا ہے اگر تم مجسم رقص و اضطراب ہو تو بشر بھی کسی وقت رقص بیقراری سے خالی نہیں۔ تم شعاع میں رقص کر رہے ہو میں اندھیرے میں رقص کر رہا ہوں۔ تم بھی ایک جنون حق کے دیوانے ہو میں بھی ایک جنون حقانی کا دیوانہ ہوں۔ آؤ ہم تم ذرا قریب آئیں ہاتھ بڑھائیں۔ ان کو ملائیں اور مل کر رقص کریں۔ تم کہو میں نے کچھ سنا تو رقص کرتا ہوں۔ میں کہوں مجھے کچھ سننے کی طلب ہے۔ اور تلاش ہے اس لئے رقص کناں ہوں۔ اور باہو الے ہنس ہنس کر طعنے دیں اور کہیں۔ ع

می کند دیوانہ با دیوانہ رقص

(حسن نظامی)

دنیا کی معاشرتی و مذہبی تاریخ پر اک نظر

۳

یہودیت و عیسائیت

آریائی و منگولی مذاہب پر ہم ایک نظر ڈال چکے ہیں۔ اب ہم سامی مذاہب کی طرف متوجہ ہوتے ہیں ؛

موجودہ سامی مذاہب میں سب سے قدیم مذہب یہودیت ہے ۔ یہودیوں کی تاریخ عیسائی اور اسلامی مقدس کتابوں میں بھی مذکور ہے ۔ حضرت ابراہیمؑ کا زمانہ غالباً دو ہزار سال ق م کا ہے۔ اُن کے کچھ عرصے بعد حضرت یعقوبؑ کے بیٹے حضرت یوسفؑ جب مصر کے والی ہوئے تو اُنہوں نے اپنے قحط زدہ ہم قوموں کو مصر میں آنے کی دعوت دی۔ جہاں یہودی ڈھائی سو یا شاید چار سو برس تک مقیم رہے۔ پہلے سو برس تک تو ترقی یافتہ مصر پر انہوں نے اپنا رعب جمائے رکھا۔ مگر اس کے بعد مصریوں نے ان پر ظلم کرنے شروع کئے اور آہستہ آہستہ اُنہیں غلام بنا لیا ۔ مصری حیوان پرست تھے بیل، کُتے، بِلّی اور سانپ کی پوجا کرتے تھے (وہ زمانہ گذر چکا تھا کہ وہ آسیرس کو کائنات کا زبردست عادل حاکم ٹھہراتے تھے)۔ وہ لذات پرست تھے اور نفسانیت میں منہمک رہتے تھے ۔ یہودی جو کثرت پرست دنیا میں خدائے واحد کے نام لیوا تھے بتدریج مصریوں کی اشیاء پرستی اور عیش و مستی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اور غلام بن کر اپنی مذہبی و عقلی آزادی کو کھو بیٹھے ۔ وہ اپنے خدا کو بھول گئے اور بیل بکرے کی پوجا کرتے لگے۔ عورت اُن کے ہاں ذلیل ہوگئی اور وہ مختلف فرقوں میں منقسم ہوگئے ۔ اس تاریک ساعت میں ان کے ہاں ایک ایسی شخصیت پیدا ہوئی جس نے نہ صرف اُن کی بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ دُنیا کی مذہبی تاریخ میں اک انقلاب برپا کر دیا ۔ یہ موسٰی تھے جنہوں نے اک ذلیل و پسماندہ غلام قوم کو اپنی حکمت و شجاعت سے فرعون بے سامان کے خونیں پنجے سے رہائی دلائی اور اُن میں وہ اوصاف پیدا کر دئے۔ کہ تھوڑے ہی عرصہ میں چار دانگ عالم میں اُن کے نام کا ڈنکا بجنے لگا ۔ موسٰیؑ اور اُن کے بھائی ہارون نے فرعون کو ترغیب دے کر اپنی قوم کی جلا وطنی حاصل کی جس کی سختیوں کے بغیر موسٰیؑ کے خیال میں ان کی قوم قعر مذلت سے نکل نہ سکتی تھی ۔ قوم کے بیشتر حصے نے بہت شور و غل مچایا کہ ہم اپنی حالت پر قانع ہیں تم ہم کو تباہی کی طرف نہ لے جاؤ مگر موسٰی نے انہیں سمجھا بجھا کر مصر چھوڑنے پر آمادہ کر لیا۔ اُدھر فرعون نے پہلے تو ان طاعون زدہ غلاموں کو خس کم جہاں پاک کہہ کر رخصت کیا۔ پھر جب خیال آیا کہ اتنے لاکھوں غلاموں کا کھو دینا اک بڑے قومی خسارے کا موجب ہوگا تو ان کا تعاقب کیا اور بحرِ قلزم کے ساحل پر اُن کو جا لیا ۔ خدا کی قدرت سے جب یہودی گذر چکے

اور مصری گذر رہے تھے تو ایک ہیبت ناک طوفانِ باد و باراں نے اُن کو آلیا اور وہ بحرِ ذخار کی موجوں میں غرق ہونے سے نہ بچ سکے + اس معجزہ نمائی سے موسیٰ اپنی قوم میں ہر دلعزیز ہو گیا۔ لیکن ایسی پست اخلاق قوم کی تہذیب کچھ آسان نہ تھی۔ چالیس سال تک وہ جزیرہ نمائے سینا کے صحراؤں میں سرگرداں رہے یہاں تک کہ کوہ طور کی بلندیوں پر خدا نے موسیٰ کو وہ کتاب وہ احکام عنایت کئے جو گویا یہودی قوم کے دینی و دنیاوی نظم و نسق کے ضامن ہو گئے + دنیا کی قوموں میں سے خدا نے یہودیوں کو انتخاب کر لیا۔ کہ وہ اہلِ دنیا کے رُوحانی اُستاد بنیں۔ اور اُن میں دینِ خدا کی اشاعت کریں +

۱۲۷۰ ق م میں یشوع کی سرکردگی میں اُنہوں نے ارضِ موعودہ یعنی فلسطین کو فتح کیا۔ جہاں تھوڑے عرصے کے اندر اُنہوں نے دو سلطنتیں شمال میں سلطنتِ اسرائیلیہ اور جنوب میں سلطنتِ یہودیہ قائم کیں + اسرائیلیہ کے پہلے تین بادشاہ ساؤل داؤدؑ اور سلیمانؑ تھے جن کی قوت و فراست کا دُور دُور تک شہرہ ہو گیا۔ لیکن تھوڑی مُدت کے بعد بنی اسرائیل عیش و جہالت میں مبتلا ہو گئے۔ اور سنہری بچھڑے کی عبادت شروع ہو گئی۔ شلمانذر شاہِ اشور نے ان پر حملہ کیا اور وہ ساری قوم کو غلام بنا کر لے گیا + یہودیہ میں داؤد کے جانشینوں میں بعض بُت پرست اور بعض مصلحین تھے۔ اس سلطنت کو (شمالی سلطنت کی سی) ترقی نصیب نہ ہوئی۔ اور آخر ایک طویل جنگ کے بعد جس میں اشوری مصری اور کلدانی ان پر سب طرف سے آپڑے شاہ بنوشدنزر ۵۸۶ ق م میں یہودیوں کو غلام بنا کر بابل لے گیا جہاں وہ عرصے تک اس مشہور "بابلی قید" میں رہے +

اس قید کے زمانے میں اُن کے ساتھ خاصا سلوک ہُوا۔ یہودیت کا اثر بابلی مذہب پر ہُوا۔ بابلیت کا یہودیت پر (جس کا ذکر ہم کر چکے ہیں) + ۵۳۹ء میں یہودی ایرانیوں کے زیرِ اثر آئے تو سائرس اعظم نے ان کو اپنے وطن واپس چلے جانے کی اجازت دیدی۔ اُنہوں نے یروشلیم میں پھر اپنی مجلسِ بزرگان قائم کر لی اور اپنی شریعت کا مطالعہ شروع کر دیا۔ اسکندر اعظم نے ۳۳۲ ق م میں یروشلیم فتح کیا۔ اور یونانیوں کے عہدِ حکومت میں یہودی کچھ دیر خوشحال کچھ دیر پامال ہوا کئے + ۶۳ ق م میں رومیوں نے یروشلیم کو اپنی وسیع سلطنت میں شامل کر لیا۔ اور اُن کے عامل پونٹیس پائی لیٹ کے وقت میں حضرتِ عیسےٰ کو یہودیوں نے سولی پر چڑھا دیا + اس کے بعد یہودیوں کے ساتھ بُرا سلوک ہُوا۔ رومیوں نے ان پر ظلم کرنے شروع کئے یہاں تک کہ ۷۰ء میں یروشلیم کو قطعی طور پر منہدم کر دیا گیا۔ اور بیچارے یہودیوں کو دُور دراز ملکوں قبرس، مصر، اطالیہ، ہسپانیہ وغیرہ میں پناہ لینی پڑی + لیکن عجیب بات یہ ہے کہ یہودیوں پر جتنی سختیاں ہوئیں۔ اتنی ہی ان کی خوشحالی بڑھتی گئی + قسطنطنین کے عہد سے عیسائیوں نے انہیں برابر ہر جگہ مارا پیٹا۔ اور نارواداری میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ لیکن یہودی کہتے "اپنے خدا کے فضل سے سونا" چاندی کھا کھا کر روز بروز موٹے تازے ہوتے گئے + ربا تا آشی نے ۵۰۰ء کے قریب ان کے "قوانین" از سرِ نو مرتب کئے اور اُن کا مذہب اپنی اصلی پاکیزگی پر آتا چلا گیا + عیسائی ممالک میں اُنہوں نے زر اندوزی و تجارت میں اک خاص ملکہ دکھایا۔ اور اسلامی ملکوں میں

اُن کے ساتھ ایسی مہربانیاں ہوئیں کہ اُن کی چھپی ہوئی خوبیاں مدتوں کے بعد پھر بروئے کار آگئیں۔ اندلس میں بالخصوص انکے ہاں ایسے
ایسے قابل مصنف شاعر اور قانون دان پیدا ہوئے۔ کہ قرونِ وسطیٰ کی تاریکی اُن کے علوم و فنون کی روشنی سے دُور ہونے لگی۔ مگر
عیسائی دنیا نے پھر بھی صدیوں بعد تک اُن کے ساتھ وہ سلوک روا رکھا جس کی ناروا داری کی شرمناک مثال دنیا کی تاریخ میں ڈھونڈے
سے نہیں ملتی + یہ درست ہے کہ یہودی سود خواری اور زر اندوزی میں یکتائے روزگار تھے لیکن یہ بھی درست ہے کہ قرونِ وسطیٰ میں یورپ کے
بنیے اور یورپ کے بادشاہوں کے مالی مددگار رہی تھے + یونانی حکمت اور اپنی ادویات سے جس میں وہ اور مسلمان برابر کے حصہ دار
اور باہم شریک تھے انہوں نے عیسائی ملکوں میں نہایت مفید کام سرانجام دیئے + لیکن یورپ کا تعصب پھر بھی بجائے کم ہونے کے روز
بروز بڑھتا ہی گیا + اور یہ ظلم و ستم برابر اٹھارھویں اور انیسویں صدی تک جاری رہے + نپولین نے ۱۸۰۶ء میں اُن کی ایک مجلس مشاہدین
مدعو کی جس میں ان کو فرانسیسی قومیت میں داخل ہونے اور کثرتِ ازدواج بند کرنے کی تحریک ہوئی + انیسویں صدی میں اُن
کو بتدریج پُرانی بندشوں سے رہا کیا گیا۔ یہاں تک کہ آج یورپ کے مختلف ممالک میں بعض بڑے بڑے سرکاری عہدہ دار
مقنن قانون دان اور دیگر عمائد شہری یہودی ہیں۔ اگرچہ تعجب ہے کہ اس بالشوی جمہوریت کے زمانے میں بھی روس میں جہاں انکی
تعداد تیس لاکھ سے کم نہیں اُن کو کسی قدر حقارت اور خوف کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے + دنیا میں اُن کی آبادی کے متعلق
مختلف اندازے ہیں۔ ایک بیان کے مطابق اُن کی تعداد ستر لاکھ دوسرے کے مطابق ایک کروڑ چالیس لاکھ ہے + یہودی
مذہب دنیا کا سب سے پہلا وحدانیت پرست مذہب ہے + یہ درست ہے کہ اس کی ربانیت میں انسانیت کا عنصر شامل ہے
لیکن انسانی عقل کے لئے عقل کُل رُوح کائنات یا ربانیت کے جوہر یا ذات کا جائزہ لینا عملی طور پر ناممکن ہے جب تک وہ
اس کا اپنی نیم مادّی عینک سے نظارہ نہ کرے۔ اگر خدا غیر محدود ہے۔ تو ایک محدود ہستی کے لئے اس کی ذات کا نظری
طور پر احاطہ کر لینا بھی کس طرح ممکن ہے + یہودیت پہلا مذہب تھا۔ جس نے بُت پرستی کو انسان اور خدا کے تعلقات کے سمجھنے
کے لئے واسطہ ٹھہرانا کُفر قرار دیا + یہودیوں کے نزدیک خدا ہر چیز پر قادر، ہر جگہ موجود اور ہر بات کا عالم ہے۔ وہ ازلی ہے
رحیم ہے غیر فانی ہے اور ناممکن الفہم ہے۔ اُسے اور چھوٹے خداؤں کی ضرورت نہیں جو اُس کے ماتحت کام کریں۔ البتہ فرشتے
اس کے نیچے اپنے اپنے شعبۂ عمل میں مصروفِ کار ہیں۔ اُس نے زمین و آسمان کو چھ روز میں بنایا (عقل دوست یہودی
کہتے ہیں کہ اس سے صرف ارتقائے کائنات کی طرف اشارہ مقصود ہے) اور انسان کو اشرف المخلوقات کا درجہ دیا۔ خدا نے
یہودیوں پر قربانی (جو ابراہیمی ایثار کی یادگار ہے) اور نماز فرض کیں۔ غلامی اور کثرتِ ازدواج کے رواج یہودیوں سے پہلے
موجود تھے یہ خاص ان کے مذہب کے احکام نہ تھے۔ بعض نہایت قابلِ نفرت رسوم کو یہودیت نے قطعی طور پر موقوف کر دیا۔
اور اخلاق و معاشرت کے متعلق نہایت صریح قواعد بیان کر دیئے + سب سے بڑی بات یہ حکم تھا۔ کہ اپنے دشمنوں سے بھی

بھلائی کرو۔ طاعون پھیلنا، سمندر میں سے گذرنا، اشوریوں اور بابلیوں کا یہودیوں پر پے درپے حملے کرنا، مصر کی ذلت، یہودیوں کا ممالک دنیا میں چاروں طرف منتشر ہو جانا۔ یہودیوں کا دعوٰے ہے کہ مصر کی پیشینگوئیاں پوری ہو کے رہیں اور یہ امر یہودی مذہب کی صداقت پر دلالت کرتا ہے +

غرض یہودیوں نے دنیا کے سامنے ایک نیا مذہب پیش کیا جس کے اصول و قواعد بالکل صریح اور سریع الفہم تھے۔ اور خدا اور اس کی وحدانیت کا خیال اس مذہب کا اصل الاصول تھا + یہودی اس بات میں یگانہ روزگار ہیں کہ غالباً وہ سبھی ایک فرد یعنی حضرت ابراہیمؑ کی اولاد میں سے ہیں۔ اور اگرچہ دنیا میں دو ہزار سال سے ان کی کوئی سلطنت قائم نہیں رہی - وہ اور ان کا مذہب اب تک برقرار ہیں + حال ہی میں یورپ۔ اور بالخصوص انگلستان کے یہودیوں کی متفقہ خفیہ کوششوں سے فلسطین کا علاقہ اُن کے لئے علیحدہ کر دیا گیا ہے لیکن عربوں اور مقامی عیسائیوں کی مخالفت ابھی اُن کے مشکوک حقوق کے جواز کا اقرار کرنے پر آمادہ نظر نہیں آتی۔ یہودیوں نے دُنیا کے مذہبی تمدنی و اخلاقی ارتقا میں ایک معتدبہ حصہ لیا ہے۔ اور اب جبکہ مذہبی رواداری کے دروازے اُن کے لئے کُھل گئے ہیں۔ وہ مُلک مُلک میں دولت کمانے کے طریقے اور ترقی کرنے کی راہیں تلاش کر رہے ہیں !

عیسائیت جس کے اس وقت دُنیا میں اکثر عیسائیوں کے خیال کے مطابق سب سے زیادہ (یعنی پچاس کروڑ) پیرو ہیں - انہیں یہودیوں کے علاقہ یہودیہ میں جہاں ۸ اور ۴ سال ق م میں یسوع مسیح پیدا ہؤا ظہور پذیر ہوئی مسیح کی اصلیت اور تاریخی ماہیت کے متعلق علماء میں اختلاف رہا ہے - لیکن اب عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے - کہ وہ واقعی ایک شریف مزاج اور پاکباز انسان تھا جس نے رومی سلطنت میں یہودیوں کے درمیان ایک زبردست مذہبی تحریک کی بنیاد ڈالی عیسائی کہتے ہیں کہ مریم نے جو یوسف کی اچھوتی عفیف بیوی تھی اُسے جنا اور اس لئے وہ بغیر کسی انسانی باپ کے پیدا ہؤا + جب وہ آٹھ دن کا تھا تو یہودی قاعدے کے مطابق اُس کا ختنہ کیا گیا اور چالیسویں دن اُسے مندر میں پہنچایا گیا۔ تیس برس کی عمر میں یُوحنّا کی تلقین کے بعد اُس نے عوام میں پیغام ربّانی کی اشاعت شروع کی + اُس نے بہت سے کرامات و معجزات دکھائے اور اس معاشرتی ظلم و ستم اور مذہبی تذلیل کے زمانے میں اُس نے دُنیا کو ایک نیا اخلاقی اور رُوحانی رستہ دکھا دیا۔ اس نے غریبوں کی حمایت کی اور مذہب میں عمل پر زور دیا - وہ کمزوروں کا مددگار اور گنہگاروں کا معاون بنا + اُس نے اس بات پر زور دیا کہ "ربّانی سلطنت" کے قیام کا وقت قریب ہے اور پھر خود یہودیوں کے مسیح موعود ہونے کا عام اعلان کیا۔ اس نے (عیسائی عقیدے کے مطابق) دُنیا کے سامنے یہ دعوٰے پیش کیا کہ میں خدا کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ اور مجھے اس نے دُنیا والوں کے گناہوں کا کفّارہ کر کے بھیجا ہے - جو مجھ پر ایمان لائیگا وہ "ربّانی سلطنت" میں داخل ہوگا اور

سیدھا بہشت میں جا پہنچے گا + اُسے اپنی موت کا علم تھا لیکن چونکہ وہ ایک روحانی نصب العین کے لئے اپنی زندگی وقف
کرچکا تھا یا دجود تمام خطروں کے وہ یروشلیم پہنچا جہاں یہودیوں نے اُسے مُلزم قرار دے کر رومیوں کے حوالے کردیا اور اُنہوں
نے اُسے سولی پر چڑھا دیا + مسیح کی تعلیم پہاڑی کے وعظ سے ظاہر ہوتی ہے جب اس نے کہا کہ "میں تم سے جو میری بات
سُن رہے ہو کہتا ہوں کہ اپنے دشمنوں سے محبت کرو۔ تم ان کا بھلا کرو جو تم سے نفرت رکھتے ہیں۔ جو تم پر لعنت بھیجیں اُنکے لئے
دُعا مانگو اور خدا سے اُن کا بھلا چاہو جو تمہیں دھوکا دیں + اور جو تمہارے ایک گال پر تھپڑ مارے دوسرا بھی اُس کے آگے کردو اور
جو تمہاری عبا چھین لے لے اپنی قبا لیجانے سے بھی منع نہ کرو + جو آدمی بھی تم سے مانگے اُسے دو اور جو تمہاری چیزیں خود ہی لیجائے
اُن کی نسبت تم کچھ نہ پُوچھو + اور جیسا تم چاہتے ہو کہ لوگ تم سے سلوک کریں تم بھی ویسا ہی سلوک اُن سے کرو۔ کیونکہ اگر تم نے
اُن سے محبت کی جو تم سے محبت کریں تو تم کس شکریے کے مستحق ہو کیونکہ گنہگار بھی اُس سے محبت رکھتے ہیں جو ان سے محبت
رکھے اور اگر تم ان کا بھلا کرو جو تمہارا بھلا کرتے ہیں تو تم نے کیا کیا کہ نابکار بھی ایسا ہی کرتے ہیں اور اگر تم اُن کو دو جن سے کچھ ملنے
کی تمہیں اُمید ہے تو تم نے کیا دیا کہ بُرے بھی بُروں کو دیا کرتے ہیں تاکہ اپنی باری پر پھر اُن سے لیں + نہیں بلکہ تم اپنے دشمنوں سے محبت
کرو اور اُن کا بھلا کرو اور ان کو واپس لینے کے خیال کے بغیر دیا کرو۔ ان کاموں کی تمہیں بڑی جزا ملیگی۔ اور تم اُس اعلےٰ ترین
(خدا) کے بچے بن جاؤ گے جو ناشکروں پر بھی مہربانی کرتا ہے اور بُرائی پر نظرِ عنایت رکھتا ہے + سو تم بھی رحم و کرم کرو جس طرح
تمہارا باپ (خدا) تم پر رحم و کرم کرتا ہے" + مسیح کی تعلیمات چار انجیلوں میں درج ہیں اور یہی عیسائیوں کی خاص مقدس کتاب کا اہم ترین جزو ہیں

عیسائیت کے چار بڑے عقاید یہ ہیں :- (اوّل) تثلیث جس سے یہ مراد ہے کہ خدا کی فطرت میں وحدت مگر شخصیت میں
تثلیث ہے اور یہ تثلیث خدا (باپ) مسیح (بیٹے) اور روح القدس پر مشتمل ہے + عیسائی ایک خدا کے پرستار ہیں بلحاظ اُس کی فطرت
کے مگر تینوں کے معتقد ہیں بلحاظ اُن کی ربانی شخصیتوں کے" + ان تینوں میں سے ہر ایک میں ربانی فطرت بدرجہ اتم موجود ہے + چونکہ
اخلاقی صفات صرف دو یا دو سے زائد شخصوں کے درمیان ہی پیدا ہو سکتی ہیں اس لئے خدا کے واحد میں بھی بغیر کسی اور شخصیت
کی شمولیت کے ان صفات کا اظہار نہیں ہو سکتا اور اس لئے تثلیث لازم ہے + (دوم) تجسّم جس کے یہ معنی ہیں کہ خدائیت
انسانیت کے جسم میں در آئی۔ خدا انسان بن گیا تاکہ انسان سے براہ راست تعلق پیدا کر سکے تاکہ اُس کے روبرو آ جائے + خدا کا
بیٹا مکمل خدا اور مکمل انسان تھا۔ وہ ایک معمولی آدمی نہ تھا بلکہ "انسان" تھا + تجسّم سے مدعا یہ ہے کہ چونکہ خدا انسان سے محبت رکھتا
ہے اور چونکہ اس نے اُسے آزاد بھی چھوڑ دیا ہے لہٰذا وہ انسان بن کر اس کے سامنے آئے اور اُس کی محبت میں ہمہ تن ایثار ہو کر
اسے بھی اپنے (یعنی خدا) سے محبت کرنے کی عملی ترغیب دے + خدا انسان کے قریب آ گیا" خدا انسان بن گیا تاکہ انسان جس قدر
ممکن ہو خدا کی مانند ہو جائے" + "مسیح کی زندگی مکمل زندگی تھی" اُس نے خدا کی بہترین مخلوق انسان کی فلاح کی خاطر اپنے نفس کو

تکلیف میں ڈالا + انسانیت کی ساری تاریخ تیاری تھی اس تجسیم کے لئے "انسان مخلوقات کی زنجیر کی آخری کڑی ہے تجسم اس کڑی کا" آخری سرا بن گیا + (سوم) کفارہ جس سے یہ مراد ہے کہ انسان گنہگار تھا خدا نے اپنا بیٹا زمین پر بھیجا اور وہ عام انسانوں کے گناہوں کا کفارہ بن گیا۔ اس نے انسانوں کے گناہ اپنے سر لے لئے اپنی جان دے کر ان کی سزا بھگت لی اور انہیں تباہی سے بچالیا۔ اس سے خدا اور انسان کا آپس میں سمجھوتا ہوگیا + یہ لازم تھا کہ گنہگار انسان اپنے گناہ کا قرض ادا کرے لیکن وہ بخوبی ادا نہ کرسکتا تھا سو مسیح نے ادا کردیا + مسیح نے انسانوں کے بجائے نہیں انسانوں کی خاطر یہ بار اُٹھایا۔ اسی لئے اگر وہ اپنے گناہوں کی معافی چاہتے ہیں تو ضروری ہے کہ وہ ان گناہوں پر نادم ہوں ورنہ عفو ممکن نہیں + دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ گناہ کا نہ صرف کفارہ لازم ہے بلکہ اُس کے لئے ندامت بھی لابدی ہے" + خدا کو دنیا سے اس قدر محبت تھی کہ اُس نے اپنا اکلوتا بیٹا مسیح اس کے گناہوں کے کفارے میں دے دیا + کفارے کو عیسائی اپنے لئے سرچشمۂ راحت سمجھتے ہیں + (چہارم) رستخیز جس کے یہ معنی ہیں کہ مسیح سولی پر چڑھائے جانے کے تین روز بعد قبر سے اُٹھ بیٹھا اور اپنے حواریوں سے ملا اور بعد میں آسمان کی طرف صعود کرگیا + اسی طرح سب لوگ مرکر پھر اُٹھیں گے۔ اس کا نام قیامت ہے + ایک عیسائی مصنف لکھتا ہے کہ چاروں عقائد کے ماننے میں کسی طرح کی دقت نہیں پڑتی۔ اگرچہ عقلاً وہ غیر غالب ضرور معلوم ہوتے ہیں لیکن ہم ان پر اس طرح حکم نہیں لگا سکتے کیونکہ اُن کی صداقت کا انحصار عقل پر نہیں بلکہ محض الہام پر ہے" + "جس طرح خدا کی ہستی کا ہماری عقل احاطہ نہیں کرسکتی اسی طرح یہ عقائد بھی اُس کی گرفت سے بعید ہیں" + ان چاروں عقائد میں باہمی تطابق ہے + نپولین کا قول ہے کہ "اگر ایک بار ہم مسیح کی ربانی سیرت کا اعتراف کرلیں تو مسیحی عقائد میں انجیر کی صراحت و وضاحت رونما ہوجاتی ہے" غیر مسیحیوں کے لئے اس اگر ہی میں مشکلوں کا سامنا ہے +

عیسائی تورات و انجیل دونوں پر ایمان رکھتے ہیں تورات یہودیوں کی مقدس کتاب ہے "انجیل" کا اہم ترین حصہ وہ چار انجیلیں ہیں جن میں مسیح کے حواری اپنے آقا کی سیرت و حالات زندگی کا الگ الگ خاکہ کھینچتے ہیں۔ عیسائی کہتے ہیں کہ یہ انجیلیں بالکل اصلی اور سچی ہیں ان میں مسیح کے جو معجزات مذکور ہیں وہ بالکل سچے اور پکے عیسائیوں کے خیال کے مطابق ہو بہو اصلی واقعات ہیں۔ مسیح کے متعلق جو پیشین گوئیاں یہودی کتب میں ہوتی چلی آئی تھیں مسیح نے انہیں اپنے نفس و زندگی میں پورا کر دکھایا۔ عیسائی کہتے ہیں مسیح کی تعلیمات اور اس کا دعوے کہ وہ ایک ربانی آسمانی انسان ہے اس کی صداقت کا ثبوت ہے کیونکہ اگر اس نے جھوٹا دعوے کیا تو گویا وہ ایک کاذب شہرت پرست شخص تھا اور کوئی غیر عیسائی بھی اس کی زندگی کے حالات سن کر انکار نہیں کرسکتا کہ مسیح فی الحقیقت دُنیا کی عظیم ترین شخصیتوں میں شمار ہونے کے قابل ہے + اس صورت میں عیسائی مذہب کی سچائی اظہر من الشمس ہے!

عیسائیت نے غریبوں عورتوں اور بچوں کا ساتھ دیا وہ کمزوروں اور بیماروں کا سہارا بنی۔ اس نے حقوقِ انسانی پر زور دیا۔ اور کہا کہ سب آدمی برابر ہیں + عیسائیت خدا کا ظہور ہے انسان کے لئے اور پھر انسان کا بذریعہ ایمان اپنے تئیں اس ظہور

میں منہمک ہو جانا" ایک عیسائی کے نزدیک گناہ وہ مصیبت ہے جو ساری انسانیت کے سر پر سوار ہے۔ اس سے نجات صرف مسیح پر ایمان لانے سے مل سکتی ہے۔ عیسائیت انسانی زندگی ہے اک ایسی ربانی زندگی سے محیط و متاثر جو مسیح میں جلوہ پاش تھی +

عیسائیت کی آمد کے وقت دنیا ایک سیاسی معاشرتی اور مذہبی انقلاب کے لئے تیار ہو چکی تھی + اوپر بیان ہو چکا ہے کہ سیاست میں رومی سلطنت کی وسعت معاشرت میں رومی حق شہریت اور مذہب میں قدیم کفر کی روحانی ناکامی ان سب نے عیسائیت کی اشاعت کے لئے گویا میدان صاف کر دیا تھا + یہودیت کے فوائد صرف یہودیوں کے لئے مخصوص تھے لیکن عیسائیوں نے کہا کہ یہودی غیر یہودی جو مسیح پر ایمان لائے خواہ وہ کسی نسل یا قوم سے ہو نجات پائے گا + عیسائیت کے مسائل ربانیت و گناہ و نجات عیسائیوں کی پاکیزہ زندگیاں اور خلقتِ کائنات کی سیدھی سادی کہانی ان سب نے کافروں کے دل موہ لئے + یہودیت رومی سلطنت فلسفۂ یونانی اوہام کا فرانہ عیش پسندی پہلے پہل ان کی طرف سے عیسائیت پر پے در پے وار ہوئے لیکن عیسائیت کی جمہوریت اس کے اولین پیروؤں کا ایثار اس کی سادگی اس کی روحانیت اور اس کی گہری اخلاقیت نے حملہ آوروں کا ترکی بترکی جواب دیا + ہاں یہ ضرور ہوا کہ اپنے ان دشمنوں پر فتح پاکر عیسائیت نے بتدریج ان کے بعض طرز طریقے اختیار کر لئے۔ کلیسا کو اہلِ کلیسا نے مذہبی بندشوں سے جکڑ دیا۔ "ربانی سلطنت" ایک دنیاوی سلطنت بن گئی۔ جس میں اولیاء وسیع قطعات کے مالک ہو گئے۔ روحانیت نے بگڑ کر جسمانی شکلیں اختیار کرنی شروع کیں ایمان میں ایمان ضروری اور عمل غیر ضروری ہوتا گیا۔ کافرانہ فلسفے کے اثر سے الحاد پھیلا مسیح کا قول فراموش ہوا گرجا کی رسمیں رہ گئیں۔ اور کلیسا اور حکومت دونوں میں اک اتحاد قائم ہو گیا۔ جس سے عوام کی روحانی و جسمانی آزادی کا جلد قلع قمع ہو گیا + لیکن انصاف یہ ہے کہ عیسائیت کے قیام کے اچھے اثرات بھی یورپ کی زندگی میں نمایاں تھے۔ رومی و غیر رومی کفار کے ہاں اخلاق کا معیار پست ہو چکا تھا اس پر عیسائی زہد و تقدس نے صیقل کی۔ غلامی طلاق "مرد و عورت" کے تعلقات میں حدود قائم ہوئیں۔ اخلاق و معاشرت میں ایک رائے عامہ وضع ہوئی غرباء کے لئے خیرات گاہیں اور اقامت گاہیں بنیں اور عام طور پر ایک زیادہ پاک صاف زندگی ہر سو نظر آنے لگی۔ سیاست میں ایک متفقہ آوازِ عامہ اور حکومتِ نیابیہ کی بنیاد پڑی اور شاہی و مذہبی اتحاد کا ایک اتنا اچھا نتیجہ ضرور نکلا کہ عیسائیت کی دنیا بری بھلی طرح سہی لیکن مستحکم و منتظم ضرور ہو گئی + فلسفے سے پہلے جنگ تھی لیکن تھوڑے عرصے میں جیسا کہ سینٹ آگسٹاین کی تصنیفات سے ظاہر ہے فلسفہ و مذہب میں مصالحت ہو گئی + عیسائی "وحدانیت" و یکسانیت کے خیالات نے طبیعیات کے لئے کسی قدر رستہ صاف کیا +

پہلی صدی عیسوی کے بعد ایک زبردست نظام کلیسائی نے اپنے ہاتھ پاؤں پھیلانے شروع کئے۔ عیسائیت ایک عقیدہ تھا لیکن اس کے نشر و اشاعت کے لئے مبلغین اور اس کی تاسیس و استحکام کے لئے پادریوں کی ضرورت پیش آئی + پہلی صدی میں مسیح کے حواری مسیح اور عوام الناس کے درمیان ایک روحانی رشتہ قائم کئے رہے۔ لیکن ان کے جانے کے بعد ایک خلا پیدا

ہوا۔ جیسے اسقفوں اور پادریوں نے یہ کہکر رکھ دیا کہ ہم حواریوں کے مذہبی نمائندے ہیں۔ مسیح کا مذہب جو اول اول مسیحیت تھا اب عیسائی پادریوں کی عیسائیت بن گیا۔ مذہب انسان کی اخلاقی بہبود کا براہ راست مددگار نہ رہا بلکہ صرف کلیسا کے ذریعے سے اس کا ذمہ دار ٹھہرا۔ پاپاؤں کیئے کہ کلیسا خود خدا اور انسان کے درمیان حائل ہوگیا اور دونوں کا مشترک ترجمان بن بیٹھا۔ عیسائی توہمات کا شکار ہوتے گئے۔ بندشوں میں گرفتار ہوتے گئے۔ جو اُن کے پادری کہتے وہ کرتے یعنی مذہب پادریوں کا شعبہ اور گویا انہیں کا مضمونِ خاص بن گیا۔

جب اسلام کے علمبردار یورپ میں پہنچے اُس وقت یورپ کی جو حالت تھی اُسے خود اہلِ یورپ نے "تاریکی" سے تعبیر کیا ہے غلاموں کی حالت ناگفتہ بہ تھی یہودیوں کے ساتھ جانوروں سے زیادہ بُرا سلوک کیا جاتا تھا۔ بادشاہ اُمرا اور بڑے پادریوں کے آگے رعایا ہیچ تھی اور محض اُن کی خدمت گذاری کا ایک ذریعہ تھی۔ مذہب و معاشرت کے متعلق ڈریپر اپنی مشہور تصنیف "یورپ کی دماغی ترقی" میں لکھتا ہے کہ جنوبی یورپ کی اقوام میں پرانے بُت پرستانہ توہمات اس طرح چھائے ہوئے تھے کہ انہوں نے نہ صرف خود ترقی نہ کی تھی بلکہ اپنے ساتھ اپنے مقدس مذہب کو بھی مسلمانوں اور یہودیوں کے طعنوں کا ہدف بنا رکھا تھا۔ وہ خود تو ڈوبے تھے ہی عیسائیت کو بھی اپنے ساتھ لے ڈوبے۔ بُت پرستی کا اس قدر چرچا تھا کہ شہر شہر کا بُت جُدا تھا۔ مقدس پرندے ہوائی شہدا چراگاہوں میں مویشیوں کے ساتھ چرنے والے راہب غاروں میں درندوں کے ساتھ پناہ لینے والے خدا پرست ان سب نے عیسائیت کو دنیا کا سب سے زیادہ توہم پرست مذہب بنا دیا تھا۔ اسلام کی افریقی، شامی فتوحات سے عیسائیوں پر یہ بات روشن ہوگئی کہ وہ بُت جو مسیحی شہروں کے محافظ تھے اپنے فرض کی کارکردگی میں محض ناکارہ اور بودے نکلے۔ وہ شہر فتح ہوگئے اور وہ بُت ٹوٹ پھوٹ گئے۔ اسلام کے ایک خدا کے آگے عیسائیت کے ہزاروں دیوتا اس طرح بھاگ نکلے جیسے آندھی کے آگے کوے۔ اسلام کے اثر سے قسطنطنیہ کے عیسائیوں نے بُت پرستی چھوڑی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پاپائے روما نے قیصر کے خلاف کُفر کا فتوے صادر کیا اور خود بُت پرستوں کا سردار بن گیا۔ مسلمانوں کی رواداری سے یورپ نے کچھ سبق نہ سیکھا۔ مسلمانوں نے کبھی کسی عیسائی یا یہودی کو عیسائی یا یہودی ہونے کی وجہ سے سزا نہ دی ان کا عقیدہ تھا کہ ذمی کا خون مسلم کا خون ہے لیکن خود عیسائی عیسائیوں کے خون کے پیاسے تھے۔ کوئی عیسائی پاپائے روما کے عقائد سے اختلاف نہ کرسکتا تھا۔ کوئی بادشاہ بھی اُس کے احکام پر چون چرا نہ کرسکتا تھا۔ فلپ شاہِ فرانس پاپائی استبداد سے تنگ آکر چلا اُٹھا کہ "وائے صلاح الدین! تو کس قدر خوش قسمت ہے ترے سر پر کوئی پوپ سوار نہیں۔ بس اب تو میں بھی مسلمان ہو جاوں گا"۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عیسائی دنیا صدیوں تک خونریز لڑائیوں کی جلوہ گاہ بنی رہی۔ حضرت مسیح کو وفات پائے ایک ہزار سال ہونے کو تھے کہ اُن کے مسخ شدہ مذہب پر جس کی جائے پناہ روما تھا تین سخت حملے ہو رہے تھے ایک تو وہ علمی و ادبی حملہ جو مغرب کی طرف سے مسلمانانِ ہسپانیہ کر رہے تھے۔ اور اس کے علاوہ وہ اخلاقی حملے جو مشرق کی طرف سے مسلمانانِ شام اور شمال کی طرف سے جرمن قومیں کر رہی تھیں۔ حسن اتفاق سے اس وقت پاپائیت

کی کرسی پر ایک ایسا پوپ (جربرٹ) جلوہ افروز ہوا جس نے اپنی تعلیم مسلمانوں کے دارالعلوم قرطبہ میں پائی تھی۔ یورپ کی تاریخ میں وہ اک عجیب وقت تھا قریب تھا کہ تحریکِ اصلاحِ کلیسا یورپ میں صدیوں پہلے شروع ہو جائے اور یورپ ظلم اور جہالت کی اُن بلیاتِ بے انتہا سے بچ جائے جو مدتوں سے اس کا طغرائے امتیاز تھیں۔ لیکن اہلِ یورپ کی راست بازی کو راہبی اک نظر نہ بھاتی تھی جربرٹ کو زہر دے دیا گیا تاکہ بُت پرستی ریاکاری اور توہمات زندہ رہیں + ایرجبینہ، پیٹر ابیی لرڈ اور پیٹر "مغرز" اور دیگر مذہبی مصلحین نے بغاوت کا جھنڈا بلند کیا مگر کچھ بن نہ آیا صلیبی لڑائیوں کے آغاز نے پاپا کے اقتدار کو بہت تقویت دی۔ ان لڑائیوں میں جو یورپ کی مذہبی دیوانگی کا اک جیتا جاگتا نمونہ تھیں اہلِ یورپ اسلامی فرزانگی و سلامت روی سے دوچار ہوئے اور بالآخر اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے + مسلمانوں کے ہسپانوی تمدن نے عیسائی دنیا پر علاوہ اپنے علمی اثر کے اک مخفی مذہبی اثر اور اک کھلا اخلاقی و معاشرتی اثر بھی چھوڑا تھا + طبقہ اناث کی آزادی کا سبق پہلے پہل یورپ نے اندلس کے مسلمانوں سے سیکھا۔ عرب کی عورتیں چار دیواری میں بند نہ رہتی تھیں بلکہ بازاروں، باغوں، انجمنوں اور درسگاہوں میں وہ بے تکلف آتی جاتی اور مردوں کے ساتھ تمدنی زندگی میں حصہ لیتی تھیں + دیاردو اور رینو کہتے ہیں کہ وہ جسے یورپ میں (Chivalry) بہادرانہ برتاؤ کہا جاتا ہے (جسے آج یورپ نے اپنی ایجاد اور فقط اپنی میراث سمجھ رکھا ہے) پہلے پہل قرطبہ کے مسلمانوں میں نمودار ہوا + سپاہ گری (Knighthood) کے قواعد اور اُس کی دس مشہور خصلتیں یورپ نے سپین ہی سے سیکھیں + مسلمانِ شام و اندلس کی زندگی نہایت پاکیزہ اور اخلاق و تمدن کی حیثیت سے بہت بلند پایہ تھی + اُن کی مجالس میں شراب کا استعمال مطلق نہ تھا۔ اسی لئے وہ صدیوں تک عیش و عشرت کی تحریصوں سے بچے رہے + علمِ حفظِ صحت اُن کی گھٹی میں موجود تھا غسل اور وضو کی عادات نے گویا اُن کے نزدیک صفائی اور عبادت کو ہم پلہ قرار دے دیا تھا + شام میں صلیبی لڑائیوں کے دوران میں عیسائی جنگجو مسلمانوں کی عادات و اخلاق کو دیکھ دیکھ کر حیران ہوتے تھے کہ کیا یہی وہ نابکار کافر ہیں جنکو ہمارے پادری قابلِ نفرین اور جہنمی پکارتے آئے ہیں + عیسائی سرداروں نے اپنے لباس اور گھر بار کو مشرقی طریق پر سنوارا اور مسلمانوں سے اچھی عادتیں اور نیک خصلتیں سیکھیں۔ اہلِ صلیب نے شام میں ایک اور نتیجہ خیز سبق سیکھا۔ کہ یونہی سُنے سُنائے کسی شخص یا کسی بات کے متعلق اپنی رائے قائم کر لینا پرلے درجے کی حماقت اور سفلہ پن ہے انسان کو ہر وقت اپنے مشاہدے اور تجربے سے کام لینا چاہیئے نہ کہ نام نہاد عقلمندوں کی سمجھائی ہوئی باتوں سے یہ بات بظاہر دور از کار معلوم ہوگی لیکن حقیقت یہی ہے کہ اسلام نے سب سے زیادہ یورپ کے مذہب پر اثر ڈالا خوارق عادات کا خبط جو اہلِ یورپ کے دلوں پر اک بلا کی طرح سوار تھا عربوں اور اُن کے یہودی شاگردوں کے عملی سبقوں اور بالخصوص طبّی تعلیم کی وجہ سے کمزور ہوا۔ بھوت پریت کا ڈر اور اولیاء کی کرامات پر اعتقاد تنزل ہونے لگا۔ تمام یورپ کے سنجیدہ و متین لوگ جو اس علمی و معاشرتی تحریک سے متاثر ہوگئے تھے اس امر کا احساس کرنے لگے کہ اگر عیسائیت زندہ رہ سکتی ہے تو محض اک ایسے علم دینیات

کی مدد سے جو جدید علوم و فنون کے اکتشافات سے مستفید ہو کر اپنے پرانے لایعنی اعتقادات کو ترک دے - ڈاکٹر ڈریپر اسلام کو جنوب کی اصلاحی تحریک" کے نام سے یاد کرتے ہیں یعنی اصلاح کلیسا کے واقعہ سے آٹھ صدیاں پیشتر ایک مذہبی اخلاقی تحریک یورپ میں شروع ہوئی تھی جس کے علمبردار مسلمان تھے - اسی تحریک نے ایسے ایسے حکما و فلسفی پیدا کئے جن کا اثر یورپ کی دماغی ترقی پر دوام کا حکم رکھتا ہے - اُن کے فلسفیانہ خیالات نے اہل یورپ کے اعتقادات و توہمات کو باطل ثابت کر کے اک نئے نظام مذہبی کی بنیاد ڈالی جو اول اول تو علم پرستوں کے دلوں میں جا گزیں رہا لیکن بتدریج گویا یورپ کے رگ و پے میں سرایت کر گیا اور اس نے مغرب کی معاشرتی و روحانی زندگی کو قطعی اور کا اور بنا دیا - جس طرح نشاۃ الثانیہ کی علمی تحریک کے بانی مبانی عرب تھے ! اسی طرح تحریک اصلاح کلیسا کا سب سے بڑا سبب اسلام کا ہسپانی تمدن تھا - یورپ کی قوموں نے جو پاپائے روما کی بے اعتدالی اور حکمرانی سے تنگ آ چکی تھیں بغاوت کا جھنڈا بلند کیا "پوپ سا خوش قسمت" "پوپ سا بدمعاش" یہ فقرے یورپ میں زبان زد خلائق تھے اب اس خوش قسمتی اور گنہگاری کے خلاف نصف یورپ اُٹھ کھڑا ہوا - عیسائیت دو بڑے مذہبی گروہوں میں منقسم ہو گئی - ایک اصلاح شدہ کلیسا کا گروہ جس میں پراٹسٹنٹ اور "غیر مطابقین" کی بہت سی مختلف العقائد جماعتیں شامل ہیں اور دوسرا پاپا کا حکم بردار گروہ جس میں رومن کیتھلک یونانی ارمنی وغیرہ لوگ ہیں - بعض مصنفین پہلے گروہ کو "روحانی" اور دوسرے گروہ کو "رسمی" کہتے ہیں - "روحانی" کہتے ہیں کہ مسیح کا کام "روح القدس" کے ذریعے سے برقرار رہتا ہے اور عیسائیت کا اظہار مسیحی "قول" "عشائے ربانی" اور دعا کے ذریعے سے ہوتا ہے لیکن "فضل ربانی" کا اولین و مستحکم ترین ذریعہ "روح القدس" ہے - مسیح کا کام ربانی اور انسانی قوت ارادی کے باہمی تعلق کو تبدیل کرنا تھا - انجیل خدا کی جلوہ گاہ ہے سو انجیل ہی پر کلیسا کی بنیاد ہونی چاہیئے - کلیسا کا کام صرف انجیل کی تفسیر پیش کرتا ہے - ورنہ انجیل ہی حقیقی ذریعہ فضل ربانی کا ہے - "رسمی" (جنہیں پاپائی کہنا شاید زیادہ موزوں ہوتا) کہتے ہیں کہ "روح القدس" صرف "عشائے ربانی اور" "استحالہ" وغیرہ کے ذریعے سے عامل ہے اور عیسائیت کا لب لباب ان مذہبی رسوم کو درست طور پر ادا کرتا ہے - مسیح کا کام ایک عمل تھا انسانی فطرت کے اندر مسیح کی فطرت انسانی فطرت میں سرایت کر چکی ہے اور یہ ہے تسلسل اُس کے "تجسم" کا اس لئے با ایمان و باوفاء عیسائیوں کا فرض ہے کہ وہ مسیح کو "عشائے ربانی" اور "استحالہ" وغیرہ کے واسطہ سے بدستور "مجسم" رکھیں یعنی ان رسموں کو کلیسا کی ہدایت کے موافق ادا کرتے رہیں - انجیل صرف دینی ہدایات کا خزانہ ہے - اور کلیسا عیسائیت کے ربط ضبط کے لئے بلکہ خود تعلیم انجیل کی اشاعت و نشر کے لئے انجیل سے زیادہ مذہب میں مختار کل ہے - (عشائے ربانی کی رسم اُس "آخری طعام شام" کی یاد میں منائی جاتی ہے جو مسیح نے اپنے حواریوں کے ساتھ مل کر نوش کیا - "استحالہ" کے یہ معنی ہیں کہ عشائے ربانی کے نان و شراب میں مسیح بذات خود موجود ہوتا ہے اور نان و شراب اس کے گوشت اور خون میں تبدیل ہو جاتے ہیں)

رومن کیتھلک لوگ پاپائے روما کی حکمرانی اور مطلق العنانی کے قائل ہیں۔ وہ ان کا مذہبی و معاشرتی سرکردہ بلکہ یوں کہئے کہ اُن کے دلوں کا شاہنشاہ ہے جس کے احکام کی فرماں برداری اُن کے لئے از بس ضروری اور بہبود روحانی کا لابدی ذریعہ ہے + پاپا نے یہ مکمل وہمہ گیر اختیارات پیٹر ولی سے گویا خود مسیح سے پائے اور اب اسقف روما عیسائی دنیا کے مفاد کے لئے اُن کو استعمال میں لاتا ہے + رومن کیتھلک زیادہ رسوم پرست اور حکم بردار عیسائی ہیں وہ مسیح کے علاوہ مریمؑ کی ربّانیت کے بھی ایک حد تک قائل ہیں اور اپنے گرجاؤں ہیں دونوں کے بتوں کے سامنے جھکتے ہیں + انجیل اور احکامِ مذہبی کو وہ صرف پاپا اور اُس کے اسقفوں اور پادریوں کی گذشتہ و موجودہ ہدایات کے مطابق جاننے اور ماننے کے حق دار ہیں اور اپنی مرضی کو اس میں دخل نہیں دے سکتے + وہ "سات رسموں" پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور "استحالہ" کو جسمانی طور پر مانتے ہیں + وہ اولیا کا درجہ پہچانتے ہیں مسیح مریم اور اولیا کی تصویریں اور مُورتیں اپنے پاس رکھتے ہیں اور وقتاً فوقتاً اپنے گرجا میں جاکر "اعترافِ گناہ" کا فرض پورا کرتے ہیں + نماز روزہ رسوم کے یہ لوگ سختی کے ساتھ پابند ہیں + اُن کی نماز لاطینی زبان میں دہرائی جاتی ہے اور وہ بغیر کلیسا کی اجازت کے ہر قسم کی بدعت اور جدت طرازی سے پرہیز کرتے ہیں۔ ان کا یقین ہے کہ کلیسا متحدِ کلیسا سے کسی معاملے میں غلطی سرزد نہیں ہوسکتی کیونکہ کلیسا کو خدا نے خاص اپنی مشیت کا آلہ قرار دیا ہے +

رومن کیتھلک لوگ بمقابلہ دوسروں کے اپنے مذہب کے زیادہ پابند اپنے عقائد کے زیادہ معتقد اور اپنی رسوم میں زیادہ قدامت پرست ہیں کلیسا اور پاپائے روما کی یکسانیت اور یکسوئی اُنہیں جادۂ مذہب سے بھٹکنے نہیں دیتی۔ اور ان سب کو ایک ہی سرئی رشتے میں منسلک رکھتی ہے + تحریکِ اصلاحی نے کروڑوں عیسائیوں کو پاپا سے منحرف کر دیا۔ لیکن اپنے پُرجوش مقلّدین کی اعانت سے پاپائی کلیسا نے اپنا کھویا ہوا رعب پھر دُنیا پر بہت کچھ جما لیا + "یسوعی" [illegible] فرقے کے مبلّغین نے دُنیا کے کونے کونے میں پاپائی مذہب کی اشاعت میں سرتوڑ کوششیں دکھائیں۔ وہ چین اور جاپان میں پہنچے افریقہ میں گھُس گئے۔ اور جنوبی امریکہ کو تو اُنہوں نے اپنے فرقے کے لئے مخصوص کر لیا + اس وقت دُنیا میں رومن کیتھلک زیادہ اور پراٹسٹنٹ کم ہیں + مقدم الذکر کی تعداد اکیس کروڑ سے زائد ہے جن میں سے ساڑھے چودہ کروڑ کے قریب صرف یورپ میں ہیں چنانچہ فرانس، اطالیہ، ہسپانیہ، ہنگری، یونان جنوبی جرمنی آئرلینڈ میں زیادہ تر رومن کیتھلک فرقے کے پیرو ہیں +

پراٹسٹنٹ اور دیگر اصلاح شدہ فرقوں کی بِنا سولھویں صدی کے شروع میں پڑی۔ ۱۹۔ اپریل ۱۵۲۹ء کو بمقام سپائرز ([illegible]) مملکتِ جرمنی کی مجلس میں بعض اراکین نے مذہبی تجاویز سے اختلاف ظاہر کیا۔ یہ تھی شمالی یورپ میں تحریک اصلاحی کی ابتدا وائی کلِف ہس، جیروم، سیونرولا اور بعض بادشاہوں نے بھی چودھویں اور پندرھویں صدی میں کلیسا کے استبداد

کے خلاف اپنی آوازیں بلند کیں لیکن سب سے زبردست آواز مارٹن لوتھر (۱۴۸۳ء تا ۱۵۴۶ء) جرمن مصلح کی تھی جس نے ۱۵۱۷ء میں پاپا کی "مراعات" کے علی الاعلان نیلام ہونے پر صدائے احتجاج بلند کی اور کہا کہ صرف انجیل ہماری رہبر ہے اور صرف ایمان ہی سے نجات حاصل ہو سکتی ہے اور ہم پاپا کا حکم ماننے پر مجبور نہیں گرجاؤں کی ناپاک زندگی اہل کلیسا کی کثیر دولت حسد اور دنیاوی حرص وحکومت اور کلیسائی بدعنوانیوں اور مذہبی بندشوں نے ہزاروں لاکھوں کو کلیسا کی مخالفت میں یکجا کر دیا ادھر ترکوں کے قسطنطنیہ فتح کر لینے پر جو ہزاروں یونانی علما اپنے قدیم علوم وفنون لے کر یورپ بھر میں پھیلے اُن کے علوم کی اشاعت وترویج سے اہل یورپ کے آگے مقفل اسرار کے دروازے کھل گئے اور اُن میں حصول علم وآزادی کی اک تحریک پیدا ہوئی۔ "تحریک اصلاح کلیسا" نے اس علمی "نشاۃ الثانیہ" سے اَور زور پکڑا ۔ یورپ دو فرقوں میں منقسم ہو گیا پاپائی اور غیر پاپائی۔ غیر پاپائیوں کے رہبروں میں جرمنی میں لوتھر، ذیورکھ میں ذونگلی جنوا میں کیلون سکوٹستان میں نوکس نے اپنا اپنا اصلاحی کام شروع کیا۔ اُن کے خیالات میں کچھ اختلاف تھا مگر وہ سب متفق تھے کہ مذہب کے بارے میں فرمانِ انسانی بے حقیقت ہے اور صرف انجیل ہی عیسائیوں کے لئے اصول ایمان وحیات ہے ۔ وہ پاپا سے باغی ہو گئے انہوں نے ولی پرستی بت پرستی تصویر پرستی چھوڑ دی اور چڑھاوے چڑھانا پادریوں کی فرماں بری "استحالہ" میں اعتقاد یہ سب باتیں ترک کر دیں ۔

لیکن یہ پہلے زمانے کے پراٹسٹنٹ اکثر موجودہ پراٹسٹنٹوں کی طرح ڈھلمل یقین نہ تھے بلکہ اپنے اعتقاد کے پکے اور اپنے عمل میں پورے تھے ۔ اور لطف یہ ہے کہ وہ جو پاپا سے منحرف ہو کر انسانی آزادی کے لئے نعرہ زن ہوئے خود دوسروں کو مذہبی آزادی دینے کے حامی نہ تھے ۔ نوکس اور کیلون اس قسم کی آزادی کے قطعی مخالف تھے اور چاہتے تھے کہ جو بات وہ کہہ دیں اور جس بات پر اُن کے پیرو چلیں اُن باتوں کے مخالفین کی طرف رواداری ظاہر نہ کرنی چاہئے ۔ رواداری کا سبق یورپ نے ڈیڑھ صدی کی مذہبی لڑائیوں کے بعد بھی جو صلح نامہ ویسٹ فیلیا (۱۶۴۸ء) پر ختم ہوئیں نہ سیکھا اور صرف انیسویں صدی میں آ کر عملی رواداری کا ثبوت دیا ۔ پراٹسٹنٹوں نے پاپا کے استبداد کے مقابل میں انجیل کا استبداد قائم کر دیا اور جس جس ملک (مثلاً انگلستان) میں اُن کا قدم جم گیا وہاں انہوں نے نہ صرف رومن کیتھلک لوگوں کی زندگی کو جہنم کا نمونہ بنا دیا بلکہ اُن اصلاح شدہ عیسائیوں کو بھی جن کے عقیدے ان کے عقیدوں سے کسی قدر مختلف تھے مذہبی بندش کی آہنی بیڑیاں پہنا دیں ۔ صدیوں تک عیسائی دنیا کی یہ حالت رہی کہ جب حکومت پراٹسٹنٹ ہوتی تو وہ رومن کیتھلک کو سولی پر چڑھا دیتی اور جب پھر رومن کیتھلک حکمران سریر آرائے سلطنت ہوتا (جیسے میری ملکہ انگلستان کے عہد میں ہوا) تو پراٹسٹنٹ لوگ آگ میں جھونک دیئے جاتے ۔ مشرق میں باوجود مذہبیت کے زور کے کبھی اتنی طویل مدت تک مذہبی ظلم وستم کے بازار یوں گرم نہیں ہوئے ۔

پراٹسٹنٹ مسلک نے یورپ کی زندگی کے مختلف شعبوں پر اپنے اثرات چھوڑے ہیں - لوگوں کی مذہبی اور روزمرہ

کی زندگی اس عرصہ کے لئے نہایت با اصول ہوگئی اور بعض نہایت مفید قوانین و ادارات جاری ہوئے۔ علم ادب میں قدیم یونانی و لاطینی ادب کا مطالعہ شروع ہوا۔ علم و ہنر کی راہیں نکل آئیں۔ ایجادات و اختراعات کا شوق دامنگیر ہوگیا اور باہمت شخصوں نے نئی دنیائیں دریافت کرلیں۔ سیاست میں آزادی اور نیابت کے اصولوں کی بنیاد رکھی گئی اور ہر ملک میں مذہبی زندگی کو ملّی زندگی سے علیحدہ دیکھنے اور علیحدہ بسر کرنے کی روش اختیار کی جانے لگی۔ ملکی حکومتیں مضبوط ہوئیں اور قومیت کی قوت نے طاقت حاصل کی۔ رومن کیتھلک کلیسا بھی اپنے خوابِ غفلت سے بیدار ہوا اور اصلاحات پیدا کرکے باغیوں سے یوں طعنہ زن ہوا کہ جب کلیسا ہی اصلاح پذیر ہوگیا تو اس کے چھوڑنے کے کیا معنی؟ مگر اُن میں سے اکثر دور نکل گئے تھے آزادی کا مزہ چکھ چکے تھے چین سے خود مختاری کے رستے پر چل رہے تھے۔ اب یہ اپنا راگ الاپے گئے اور وہ اپنی مجلس جمائے رہے۔

پراٹسٹنٹ لوگ آزاد تو ہوگئے لیکن اس کے ساتھ اُن میں سے بعض آزاد خیال بھی ہوتے گئے۔ پہلے یہ کلیسائے پاپائی سے منحرف ہوئے تھے اب مذہب عیسائی سے بھی منحرف ہونے لگے "مادیت اور دہریت" نے جتنی ترقی گذشتہ صدی میں اس فرقے کے پیروؤں کے اندر کی اتنی قدامت پسند فرقے میں نہیں کی۔ اور یہ ایک قدرتی بات تھی کہ جہاں آزادی ہوتی ہے وہاں زیادتی بھی اپنا سر بلند کرتی ہے اعتدال پر رہنا بہت کم "باغیوں" کا کام ہے۔ رومن کیتھلک اسے "اصلاحیت" کی ناکامی سے تعبیر کرتے ہیں۔ لیکن پراٹسٹنٹ اس نام نہاد "ناکامی" کو مستعار کامرانی سے بہتر جانتے ہیں۔

علاوہ پراٹسٹنٹ کے اور بھی بہت سے فرقے عیسائیوں میں رونما ہوئے۔ میتھاڈسٹ یعنی قواعد پرست۔ یونی ٹیرین یعنی وحدانیت پرست، کویکرز، پرسبیٹیرین وغیرہ بیسیوں مذہبی فرقوں نے اپنا ڈیڑھ اینٹ کا گرجا بنا لیا ان کے مشترک اصولِ مذہبی کی طرف اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے۔

پانچ صدیوں تک یورپ میں ان اصلاحی تحریکوں کے لئے میدان خالی رہا۔ کیونکہ قومیت کی آندھی اور سیاست کی بارش نے الحاد و آزادگی کے لئے رستہ صاف کر دیا تھا ہم دیکھ چکے ہیں کہ پندرھویں صدی میں لوتھر نے مذہبی اصلاح کی مشعل بلند کی اور یورپ بھر میں اک آگ لگادی۔

سولھویں اور سترھویں صدی میں ادھر یورپ مذہبی لڑائیوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا ادھر بین قومی سیاسیات اور ملکی ہوسیں قوموں اور ملکوں کو اک دوسرے کے ساتھ برسرِ پیکار ہونے کے لئے برانگیختہ کر رہی تھیں۔ یورپ نے دینی جنگ سے اسی طرح رہائی پائی کہ وہ دنیوی جنگ میں مبتلا ہوگیا۔ سیاسیات کے سامنے مذہب کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔

چنانچہ اٹھارھویں صدی میں مغربی قومیں جو مذہبی مناقشات سے فارغ ہو چکی تھیں اُس سیاسی استبداد کے خلاف صف آرا ہوئیں جو صدیوں سے اُن کے جسم و جان پر مسلط تھا۔ انقلاب فرانس مظلوم جمہور کی آواز تھی جس سے یورپ کے گنبد میں اک گہری اور

ہیبت ناک گونج پیدا ہوئی + مزارعین جن سے جرمنی اور فرانس میں اب تک غلامی کی یاد تازہ ہوتی تھی شہری جنہیں سلطنت کے کاروبار میں مطلق اختیار نہ تھا طالبانِ علم جنہوں نے کتابوں سے باہر ابھی تک آزادی کی شکل نہ دیکھی تھی سب متحد ہو کر مطلق العنانی اور ظلم و تعدی پر ٹوٹ پڑے +

انیسویں صدی میں اس انقلاب نے ملک ملک میں قومیت کی روح پھونک دی - جا بجا بغاوتیں ہوئیں ہر سو انقلاب کا علم لہرانے لگا + بلجیم اور ہالینڈ ظہور میں آئے - فرانس میں یکے بعد دیگرے انقلابات و تغیرات کے زلزلے اُٹھے - جرمنی نے آسٹریا کے گلے سے موتیوں کا ہار نوچا اور اپنے بکھرے ہوئے موتیوں کو اکٹھا کر کے ایک قومی گلوبند تیار کیا - اطالیہ نے اجنبی اور مذہبی اقتدار پرداز یوں کا قلع قمع کر کے قومیت اور یکسانیت کو سربر آرا کیا +

یورپ کے لوگ یورپ کی قومیں بن گئے - اور یورپ کی قومیں جا کر دُنیا کے لوگوں کا گھر بار سنبھالنے لگیں علوم و فنون نے ترقی پائی دریافتیں ہوئیں، ایجادیں ہوئیں تیز رفتاری نے قدم پکڑے فاصلے نے ہتھیار ڈال دئے دنیا کو چھان مارا جہاں جا پہنچ گئے جو چاہا لے لیا + کلوں نے آدمیوں کی طرح کام کر دکھایا - آدمیوں کی قدر جاتی رہی - مادی ترقی کے شہسواروں نے اخلاقی و روحانی فضا کو گرد آلود کر دیا + اہلِ مغرب نے بھاپ کو بند کر لیا بجلی کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی - وہ ہوا پر سوار ہو گئے اور تباہی و بربادی کے شیطانوں پر حکومت کرنے لگے + لیکن اس تسخیرِ عناصر کے ساتھ وہ تہذیبِ نفس اور تزکیۂ روح کا کام بھول گئے - اپنے زور کے شور میں اُنہوں نے اپنی رُوح کی آواز نہ سُنی ربانی ہدایتوں سے بے پروا ہو گئے - اور صرف خود ستائی اور زر پرستی کے نام لیوا بن گئے +

نتیجہ کیا ہوا ؟ ایک ایسی تباہ کن جنگ جس کے زلزلوں نے دُنیا بھر کو ہلا دیا جس سے مادیت کے ہولناک معرکوں کا نظارہ پیشِ نظر ہو گیا - انسانیت اپنی ہلاکت و بربادی کا ڈنکا بجانے لگی - حیوانیت نے انسانی عقل کا جامہ اُتار پھینکا چھپی ہوئی عداوتیں طشت از بام ہوئیں علمی اکتشافات نے مل کر کئی شیطانی چرخے تیار کئے - یورپ کے مادی تمدن نے جوش میں آکر خودکشی کر لی اور دم توڑنے لگا بعض کہتے ہیں کہ اس نے جان بھی دے دی ! ان پانچ صدیوں میں ادھر سیاسیات کے زور و شور میں مذہب کی آواز سنائی نہ دی اور طبعیات اور فلسفے نے مل کر اُس پر چپ و راست سے حملہ کیا +

کوپرنیکس نے سولھویں اور گیلیلیو نے سترھویں صدی میں جن طبیعی اصولوں کی تلقین کی تھی - وہ صدیوں سے گھُن کی طرح عیسائی مذہب کی بنیاد کو کمزور کر رہے تھے - کلیسا نے ان کے اس اصُول کی کہ زمین کائنات کا مرکز نہیں بلکہ آفتاب نظامِ شمسی کا مرکز ہے اور سورج زمین کے گرد گردش نہیں کرتا بلکہ زمین سُورج کے گرد گردش کرتی ہے سخت مخالفت کی کیونکہ ان کے زعم میں یہ خیال عیسائیت کے عقائد کو متزلزل کرنے والا تھا - اس مخالفت سے بجائے مذہبی نقطۂ نگاہ کی محافظت کے اس کی کمزوری اور غلطی دُنیا پر واضح ہوتی رہی - اب اکثر اہلِ کلیسا نے اس قسم کے

دقیانوسی اعتقادات کے بودے پن کا اعتراف کر کے طبیعی نقطۂ نگاہ کو تسلیم کر لیا ہے + ڈیکارٹ اور نیوٹن نے جن فلسفیانہ طبیعی اصولوں کو قائم کیا ان سے فلسفہ میں اولیات اور طبعیات میں قانون کی ہمہ گیری کے خیال علمی دنیا میں عام طور پر مان لئے گئے + فلسفہ و طبیعیات نے انیسویں صدی میں دن دونی اور رات چوگنی ترقی کی لیکن مادیت پرستی کی رو دونوں میں سرایت کر گئی جس سے فلسفیوں اور طبیعیات والوں کے خیالات کا توازن قائم نہ رہ سکا اور وہ سمجھ بیٹھے کہ کائنات اور اس کی حقیقت اگر کچھ ہے تو ان کے قوانین و مسائل سے حل ہو کے رہیگی۔ انہوں نے کائنات کو اصول مادیت کی زبان میں سمجھنا اور سمجھانا چاہا۔ روحانیت کو انہوں نے وہم و گمان کہہ کر خارج از بحث کر دیا یا اُس کا ذکر نہ کرنا اپنا علمی حق سمجھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کے نتائج نامکمل اور غیر تسلی بخش رہے اور دنیا نے جتنی مادی و دماغی ترقی کی اتنا ہی روحانی انحطاط کی طرف بھی قدم بڑھایا + جنگِ عالمگیر نے جہاں مادیت کو اُبھارا۔ وہیں بالآخر روحانیت کو بھی جنبش دی۔ برسوں کے ساتھی چھٹ گئے۔ جگر کے ٹکڑے ہمیشہ کے لئے رخصت ہوئے۔ کئی عقلمند بھی سرگرداں ہوئے کہ آخر یہ کیا ماجرا ہے زندگی کیا ہے موت کیا ہے اور موت کے بعد جو کچھ ہے وہ کیا ہے؟

انیسویں صدی کے نصف آخر میں مادہ پرستی اور طبیعیات آرائی کی شورشوں میں چنمکم و بیش پُرزور و پُرخلوص روحانی آوازیں بلند ہوئیں اور انہوں نے بعض لوگوں کو اپنے حلقۂ اثر میں لے لیا +

مسیحی تصوف تو ایک قدیم مسلک تھا جو موجودہ زمانے میں اپنی رہبانیت اور معجزہ نمائیوں کے ساتھ زود اعتقادوں کے ہاں بھی زیادہ ہر دلعزیز نہ ہو سکتا تھا + سینٹ کیتھرائن اور دیگر اولیا کی سیرت کو بجز زیادہ مذہبی لوگوں کے اور کوئی قصہ کہانی سے زیادہ اہمیت نہ دیتا تھا۔ ہاں ٹامس آکمپس کے سے صوفی مسلک مصنفین کی روحانی تصانیف کی پھر مانگ پیدا ہوئی اور اس کی شہرۂ آفاق کتاب "مسیح کے رنگ میں" (جس کے صدہا ایڈیشن نکل چکے ہیں اور جو دنیا کی مؤثر ترین کتابوں میں شمار ہونے کے قابل ہے) روز بروز زیادہ مقبول ہوتی گئی + زمانہ حال کی خلوص پسندی نے زمانہ قدیم و وسطیٰ کی تمام اُن اشیاء کو اپنا محبوب بنا لیا جن میں خلوص کا جوہر ضیاء ریز تھا + لیکن اگر تصوف بالعموم ہر دلعزیز نہ رہا تو اُس نے نئے نئے قالب اختیار کر کے پھر وہ ہر دلعزیزی حاصل کرنے کی کوشش کی جو اس عقل و مشاہدہ کے زمانے میں اُسے اُن قدیم اعتقاد و ایمان کے طریقوں سے میسر نہ آسکتی تھی +

Spiritualism "روحانیت" کے مسلک کی ابتدا ۱۸۴۸ء کے قریب ہوئی۔ "روحانیوں" کا خیال ہے۔ کہ "دوسری" دنیا سے خاص روحانی طریقوں کے ساتھ گفتگو کی جا سکتی ہے اور دنیا میں بعض ایسے "روحانی مظاہر" ہیں جن کا حل خالص طبیعی قوانین کے ذریعے سے ممکن نہیں + بعض شخصوں میں جو "معمول" کہلاتے ہیں روحانی وساطت کی قوت مرکوز ہوتی ہے چنانچہ "روحانی" اپنی "نشستوں" میں ان اشخاص کے ذریعے سے "دوسری دنیا" کے رہنے والوں سے بات چیت کرتے ہیں + علاوہ بریں بعض جسمانی مظاہر بھی ہیں مثلاً میز کا خود بخود اُٹھنا یا جھکنا یا روحانی آدمی کے اندر سے ایک خاص مرئی مادہ کا اخراج لیکن ان کی صداقت میں غیر روحانیوں

کو بہت کچھ شبہ ہے۔ ان تمام مظاہر کی تفتیش و دریافت کے لئے ایک انجمن "تحقیق روحانی" ۱۸۸۲ء میں انگلستان میں قائم ہوئی اور دیگر ممالک میں بھی اس قسم کی انجمنیں قائم ہیں جن کا کام "روحانی" صداقتوں کو طبیعی اصولوں سے پرکھنا اور ان کی اشاعت کرنا ہے۔ روحانی مصنف مائرز کی تصنیف "انسانی شخصیت اور حیات بعد الموت" مشہور ہے۔ حال میں سر آرتھر کانن ڈائل اور شہرہ آفاق طبیعیات دان سر آلیور لاج نے دنیا کے سامنے بعض حیرت انگیز روحانی مظاہر کو پیش کیا ہے۔

مسز ایڈی ایک امریکن خاتون نے ۱۸۶۶ء میں (Christian Science) "مسیحی طبیعیات" کی بنا ڈالی جس کے پیرووں کا عقیدہ ہے کہ چونکہ انسان کی فطرت روحانی ہے۔ اور چونکہ اس کا جسم محض اس کے نفس کا صحیح اظہار ہوتا ہے اس لئے خدا کی فطرت اور اس کے جوہر کے کامل علم سے ہماری جسمانی بیماریاں دور ہوسکتی ہیں اور انسانی جسم ہمیشہ کامل صحت سے فیضیاب رہ سکتا ہے۔ مسز ایڈی کی تصنیف "طبیعیات وصحت مع مفتاح الانجیل" (جو ۱۸۷۵ء میں شائع ہوئی) کے صدہا ایڈیشن آج نکل چکے ہیں۔ اور اس وقت سے لیکر "مسیحی طبیعیات" کے صدہا گرجا عیسائی ملکوں میں بن گئے ہیں۔ "مسیحی طبیعیوں" نے خصوصاً اعصابی امراض کی شفایابی کی بعض حیرت انگیز مثالیں دنیا کے سامنے پیش کی ہیں۔

"تھیاسفیت" ایک قسم کا عقلی تصوف ہے جس میں بعض مسیحی اصولوں کے علاوہ ۱۸۷۵ء کے بعد (جب تھیاسفی انجمن قائم ہوئی) رفتہ رفتہ بہت سے بودھی اور ہندی مذہبی نظریات بھی شامل ہوگئے۔ اول اول مادام بلاوسکی نے اس کی نشر و اشاعت میں حصہ لیا اور "مخفی قوتوں" کے حصول کا دعوےٰ کیا۔ حال میں ہندوستان میں مسز اینی بسنٹ تھیاسفیوں کی سرکردہ ہیں۔ تھیاسفیوں کے قول کے مطابق تھیاسفیت ایک مذہب نہیں بلکہ وہ صداقت ہے جو سب مذاہب کی اصل ہے۔ وہ فلسفہ مذہب اور طبیعیات سب کچھ ہے۔ وہ ایک راہ ارتقا بتاتی ہے اس لئے ایک فلسفہ ہے اس راہ کو جلد طے کرسکنے کا راز سمجھاتی ہے اس لئے ایک مذہب ہے اس کے نزدیک ہر انسان براہ راست اپنے ذاتی علم سے حقیقت کو جان سکتا ہے۔ لہٰذا وہ ایک نوع کی طبیعیات بھی ہے۔ تھیاسفیت کا قول ہے کہ انسان ایک روح ہے جسے ایک جسم دیا گیا ہے۔ وہ بیشمار صدیوں سے ارتقا کی منزلیں طے کرتا چلا آیا ہے۔ اور اس کے آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر ہمیں ان مکمل انسانوں کی زندگیوں میں نظر آتی ہے جو اس دنیا سے پرے ایک انجمن کی صورت میں ایک عظیم ترین قوت کے تحت میں ہماری ترقی کے رہنما بنے ہوئے ہیں۔ "زندگی" کے اصول عام فہم ہیں مشیت ایزدی قوانین قدرت کے سوا اور کچھ نہیں۔

تھیاسفیت اپنے پیرو کو اپنا خاص مذہب ترک کرنے کو نہیں کہتی نہ اس سے خاص باتوں پر اعتقاد طلب کرتی ہے بلکہ چاہتی ہے کہ وہ خود اپنے مشاہدے اور تجربے سے علم معرفت حاصل کرے۔

تھیاسفی تین باتوں پر یقین رکھتے ہیں۔ اول یہ کہ انسانی روح غیر فانی ہے۔ دوم یہ کہ وہ اصول یا قوت جو ہمیں زندگی بخشتی ہے

ہمیشہ رحیم و کریم ہے اور اُس کا قوتِ مدرکہ سے ادراک کیا جا سکتا ہے۔ سوم یہ کہ ہر شخص آپ اپنا رہبر اور آپ اپنی قسمت کا مالک ہے۔ عام لفظوں میں یوں کہیئے کہ خدا نیک ہے انسان غیر فانی ہے اور ہم جو کرتے ہیں سو بھرتے ہیں ؂

"دنیائیں سات ہیں جسمانی، جذباتی، عقلی، وجدانی، روحانی، وحدانی اور ربانی۔ اور یہ سب ایک دوسری کے ساتھ ساتھ ایک دوسری کے اندر اور باہر واقع ہیں۔ موت کے بعد ہم بہشت یا اعراف میں جاتے ہیں جو محض خاص قلبی کیفیتیں ہیں۔ تھیاسفی تناسخ کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ انسان اپنے کئے سے بنتا یا بگڑتا ہے۔ سب کا بھلا اس کا بھلا ہے۔ سو اُسے چاہیئے کہ وہ ہر طرح سے اپنی روحانی بہبود اور ترقی میں مصروف و منہمک ہے اور نہ صرف نیکی حاصل کرے بلکہ روحانی قوت بھی پائے۔ غم و فکر بے سود ہے کیونکہ انجام ہر بات کا اچھا ہی ہے۔ موت صرف جسم کا مرجھانا ہے اور روح ہمیشہ ایک ہی طریقے پر زندہ رہتی ہے۔ انسان کو چاہیئے کہ اپنے ہم جنسوں سے محبت کرے اور کام کرتے وقت یہ سوچے کہ کیا میری اور سب کی ترقی کے لئے یہ کام مفید ہے یا مضر کیا اس میں میری بہتری اور دوسروں کی سچی خوشی کا سامان موجود ہے کہ نہیں؟" ہم نے تھیاسفیت کی تعلیم کو تفصیل سے بیان کیا ہے تا کہ ظاہر ہو کہ دنیا کے مذاہب کس طرح ایک دوسرے سے متاثر ہو رہے ہیں۔ مادی عروج کے مالک کس طرح روحانی ترقی کی خاطر مختلف مذاہب کی کانیں کھود کھود کر ان کے جواہر رخشندہ سے اپنا دامن بھر رہے ہیں۔ مذہبی تعصب کس طرح دور ہو رہا ہے۔ فلسفہ کس طرح معرفت بن رہا ہے اور تصوف کس طرح طبیعیات سے سبق لے رہا ہے؟

انسانی زندگی کے سمندر میں کمال و زوال کی موجیں اُٹھتی اور گرتی پڑتی رہتی ہیں۔ اور اس کے کنارے پر مدوجزر کا وہ تماشا ظاہر ہوتا ہے جو شائد ازل سے ہے اور ابد تک رہیگا ؂

مذہبی یورپ لامذہب ہو گیا تھا کیا لامذہب یورپ اور امریکہ اب پھر مذہب کی طرف مائل ہیں؟

موجودہ عیسائی دنیا میں ایک خاموش انقلاب عظیم مذہب کے متعلق واقع ہو رہا ہے گو کچھ بہت لوگ گرجاؤں کا رُخ نہیں کرتے لیکن اب منکرین اور دہریوں کی تعداد بھی کم ہو گئی ہے۔ ایک علمی جماعت ہنوز مذہب کی طرف سے بے پروا ہے اور عوام کی بھی ایک خاصی جماعت ایسی ہے جو برائے نام ہی عیسائی ہے لیکن ان کے پہلو بہ پہلو علاوہ مذہبی لوگوں کے ایسے لوگ بھی ہیں اور اُن کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے جو انجیل کو الگ اور اپنے علوم کو اس سے بالکل الگ رکھتے ہیں اُن کا قول ہے کہ اگر انجیل کی بعض باتیں علوم حاضرہ کے خلاف ہیں تو ہمیں ان پر ناک بھوں نہ چڑھانی چاہیئے۔ انجیل ایک اخلاقی و مذہبی رہبر ہے اُس سے علمی نکات کے متعلق استفسار کرنا لا حاصل ہو نہ ہو لیکن قطعی لغو ضرور ہے۔ مادیت اور روحانیت دو جدا جدا شعبے ہیں ہمیں اُن کو خلط ملط نہ کرنا چاہیئے۔ اور دونوں کی طرف الگ الگ اپنی توجہ منعطف کرنی چاہیئے۔ لارڈ بالفور لکھتا ہے کہ ہم روحانی ہستیاں ہیں۔ ہمیں روحانی احساسات سے کنارہ نہ کرنا چاہیئے"۔ ایک اور جماعت کا عقیدہ

ہے کہ ربّانیت اور انسانیت جُدا جُدا نہیں ہیں دونوں مل کر کام کرتی ہیں۔ اِسی طرح رُوحانیت اور مادیت بھی ایک دوسرے سے ہمکنار ہیں۔ مذہب کو لوگ اس لئے نہیں سمجھتے کہ وہ اُس میں دلچسپی نہیں لیتے + وہ کہتے ہیں کہ گذشتہ صدی میں مادی حدانیت کا دور دورہ تھا اس صدی میں رُوحانی وحدانیت کا ڈنکا بجنے کو ہے +اُن کے خیال کے مطابق پچھلے بیس ہزار سال سے انسانیت نے کوئی حقیقی ترقی نہیں کی + وہ سائنس کے فوائد سے انکار نہیں کرتے صرف یہ کہتے ہیں کہ سائنس کبھی مذہب کو جھوٹا ثابت نہیں کرسکتی۔ کیونکہ کسی مذہب کے جھوٹ سچ ہونے کا ثبوت صرف تجربے سے ملتا ہے اور یہ تجربہ صدیوں بلکہ ہزاروں سال میں جاکر اختتام کو پہنچتا ہے +

سینٹ پال کا موجودہ اسقف کہتا ہے کہ "وہ سائنس جسے مذہب سے واسطہ نہیں فضول ہے جیسے وہ مذہب جسے سائنس سے سروکار نہیں ناکمل ہے"۔ اُس کے خیال کے مطابق دُنیا کے تین عظیم ترین مذہب بدھ مت عیسائیت اور اسلام اُس ہزار سال میں ظہور میں آئے جس کا خاتمہ پیغمبر عرب کی حیات دنیوی کے ساتھ ہوا + وہ لکھتا ہے کہ ممکن ہے کہ مذہبی ذہنیت اس دور کے ساتھ دُنیا میں ختم ہوچکی ہو + ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صدیوں کی علمی و طبیعی ترقیوں نے مذہبی وجدان میں ذرہ برابر بھی اضافہ نہیں کیا + اور اس حصولِ علوم کی قیمت ہمارے قوا کی تخریب و تذلیل ہے + مشہور تازہ تصنیف "سائنس مذہب اور حقیقت" میں جس کا ہر باب یورپ کے ایک مسلم علامہ کا لکھا ہوا ہے۔ آخری باب اسقفِ موصوف کے تراوشِ طبع کا نتیجہ ہے۔ اس کے اخیر میں وہ لکھتا ہے کہ "تھوڑا علم ہمیں مذہب سے بیزار کر دیتا ہے لیکن زیادہ علم ہمیں پھر مذہب کی طرف واپس لے آتا ہے اگرچہ وہ مذہب جس کی طرف ہم واپس آئیں گے مختلف ہوگا اس مذہب سے جس سے ہم نے گریز کیا تھا + دیباچہ میں لارڈ بالفور لکھتا ہے کہ غیر متغیر قانون کی ہمہ گیری کا خیال لغو ہے دنیا محض اسباب و نتائج کے ایک سلسلے سے زیادہ دشوار طلب معما ہے۔ ہم مسئلہ حقیقت کو صرف جسمانی و مادی نقطے سے جانچتے ہیں۔ انکار میں حد سے گذر جانا اتنا ہی بے معنی ہے جتنا اعتقاد میں حد سے گذر جانا۔ انسان کی داستان فقط مادے کی داستان کا تسلسل نہیں کیونکہ انسانی شخصیت ایک حیرت انگیز ناقابل الفہم معجزہ ہے +

شہرہ آفاق مصنف ایچ جی ولز اپنی کتاب "تاریخ عالم پر اک نظر" کے اخیر میں گذشتہ واقعات پر تبصرہ اور آئندہ حالات پہ رائے زنی کرتے ہوئے لکھتا ہے۔ کہ دیکھو ہماری دنیا نے کیسے جدید زمانہ حجریہ کے چھوٹے چھوٹے قبیلوں کی جماعتوں سے زمانہ حال کی وسیع و منتظم حکومتوں تک ترقی کی ہے۔ جبر و غلامی کی جگہ اب مشترک آزادی، استبداد و مطلق العنانی کے بجائے اب قوتِ جمہور کا بول بالا ہے + تعلیم و مذہب کی تحریکات انسانی تاریخ میں اسفل و مادی چیزوں سے برسرِ پیکار رہی ہیں۔ اور انہوں نے انسانی معاشرتوں کے ارتقا کو آج اس معراج ترقی پر پہنچا دیا ہے۔ قابل مصنف اس امر کا اعتراف کرتا ہے کہ انیسویں صدی میں مادیت کا شتر بے مہار ہمیں دلدل کے صحرا و تمیں لے گیا۔ لیکن ہمیں یقین دلاتا ہے کہ بہت جلد ہم صحیح مذہب اور صالح تعلیم کے اس گلشنِ ارم میں

پھر محوِ گلگشت ہوں گے جہاں سچے انسانی کمال کا پھول بہار کی آغوش میں شگفتہ ہوتا ہے - قومیت کے متعلق ہمارے خیالات روز بروز تبدیل ہوتے چلے جارہے ہیں لہٰذا ہمارے لئے یہ اک دشوار امر ہے کہ ہم افراد کی تعلیم کا معیار سریع السیر وقت میں قائم کریں کیونکہ تعلیم فقط اک تیاری ہے جو فرد جزو قوم بننے کے لئے کرتا ہے لیکن وہ وقت جلد آنے والا ہے جب یہ تبدیلیاں ایک سانچے میں ڈھل جائیں گی اور مذہب کی نسیم پھر زندگی کی بانسری میں سے ہو کر سلامتی کا نغمہ پیدا کرے گی ۔

(بشیر احمد)

آ مری جاں آ!

(۱)

خورشید بھی ڈوبا
برسات کے ڈر سے
ذرے ہوئے بیخود — جرعات جو برسے
گردوں کے ستارے — دیدار کو ترسے
میں دیکھ رہا ہوں — بیتاب نظر سے
وہ ماہِ محبت — اٹھتا ہے کدھر سے
دل ٹوٹ گیا ہے — بیٹھا ہوں سحر سے
برسات کے ڈر سے
خورشید بھی ڈوبا
آ آ مری جاں آ!

(۲)

خاموش ہے دنیا
ساکت ہیں فضائیں
سنسان ہے صحرا — گم سم ہیں ہوائیں
بڑھتا ہے اندھیرا — جلوے نہ ضیائیں
ہیں نیند میں بھیگی — تاروں کی قبائیں
بے ہوش ہیں پتے — سوتی ہیں ہوائیں
چھائی ہے خموشی — نغمے نہ نوائیں
ساکت ہیں فضائیں
خاموش ہے دنیا
آ آ مری جاں آ

(۳)

ہوتا ہے سویرا
تحریک ضیا ہے
لرزش میں ہیں پتے — لرزش میں ہوا ہے
سوتا ہوا سبزہ — بیدار ہوا ہے
ہیجان سحر ہے — پُرجوش فضا ہے
غنچے ہیں صبا میں — غنچوں میں صبا ہے
آغوشِ فضا میں — کوئل کی نوا ہے
تحریک ضیا ہے
ہوتا ہے سویرا
آ آ مری جاں آ

(۴)

ہے حسرت جلوہ
جذبات میں لرزاں
اک مستیٔ سیمیں — برسات میں لرزاں
اک کیفِ مجسم — رشحات میں لرزاں
اک نشۂ پیہم — قطرات میں لرزاں
اک جنبشِ زریں — جرعات میں لرزاں
موسیقیٔ رنگیں — نغمات میں لرزاں
جذبات میں لرزاں

ہے حسرت جلوہ!
آ آ مری جاں آ

(۵)

ہے شوقِ نظارہ
اے جلوۂ پنہاں
ہے وجد کی حسرت اے مستیٔ رقصاں
مستانہ بنادے اے کیف بداماں
کر روح نوازی اے سازِ خراماں
آنکھوں سے بہادے اک جوئے خمستاں
ذرے کو بنادے خورشید بداماں
اے جلوۂ پنہاں
ہے شوق نظارہ
آ آ مری جاں آ

(۶)

کب تک ہے یہ پردہ
اے جانِ محبت
آنکھوں کو بنادے حیرانِ محبت
سینے میں اٹھادے ہیجانِ محبت
کانوں کو سنادے الحانِ محبت
امید سے بھردے دامانِ محبت
برسادے نظر سے نیسانِ محبت
اے جانِ محبت
کب تک ہے یہ پردہ
آ آ مری جاں آ

(۷)

اے کیف سراپا
مستانہ بنادے
گلشن کی بھی سن لے مینانہ بنادے
بیتاب ہیں غنچے پیمانہ بنادے
فرقت کو مٹا کر افسانہ بنادے
اے لیلیٔ الفت دیوانہ بنادے
دنیا کی ہوس سے بیگانہ بنادے
مستانہ بنادے
اے کیف سراپا
آ آ مری جاں آ

(۸)

ہے تیری تمنا
فطرت کی قسم ہے
میں ہوں ترا شیدا الفت کی قسم ہے
میں تیرے لئے ہوں فرقت کی قسم ہے
اب کر نہ تغافل غفلت کی قسم ہے
آ! تجھ کو مری جاں عصمت کی قسم ہے
آ! آ! تجھ کو روش کی حسرت کی قسم ہے
فطرت کی قسم ہے
ہے تیری تمنا
آ! آ مری جاں آ!!!

(روش صدیقی)

مقصد زندگی

جب تک کہ ایک خاص مقصد پیشِ نظر نہ ہو زندگی میں کوئی لطف نہیں ملتا اور نہ ہم کو اپنے انسان ہونے کا احساس نصیب ہو سکتا ہے۔ جو لوگ زندگی سے بیزار ہو کر موت کے متمنی رہتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ وہی لوگ ہوتے ہیں جن کے پیشِ نظر کوئی خاص مقصد زندگی نہیں ہوتا اگر ہم اپنی زندگی کا ایک مقصد قائم کر لیں اور پھر اپنی انتہائی جدوجہد کے ساتھ اس کے حاصل کرنے کی کوشش کریں تو ہم کو زندگی کی قدر و قیمت معلوم ہوتی ہے طلسمات زندگی کے راز ہائے سربستہ ہم پر منکشف ہوتے ہیں جب ہم اپنی روح میں احساس زندگی پیدا کرتے ہیں۔

زندگی بہت مختصر ہے اور صد درجہ بے ثبات۔ پھر بھی کچھ ایسے غفلت کے پردے آنکھوں پر پڑے رہتے ہیں اور دنیا کی ترغیبات اور ہوس نے ہم کو کچھ اس طرح اپنے آپ میں محو کر لیتے ہیں کہ ہم دن رات انہیں میں منہمک رہ کر اعلیٰ مقاصدِ زندگی کے حصول سے محروم رہ جاتے ہیں۔ بجائے اس کے کہ ہمارے اعلیٰ ترین جوہر جو قدرت نے ہماری فطرت میں ودیعت کئے ہیں اور ہماری روح میں بالیدگی پیدا ہو ہم کسی مقصد زندگی کے پیش نظر نہ ہونے کے باعث ہمیشہ تنزل کی طرف گرتے جاتے ہیں اور دنیا میں ہمارا وجود محض ننگِ زندگی ہوتا ہے۔

ہم میں بہت سے لوگ صرف اس لئے جیتے ہیں کہ وہ زندہ ہیں مگر انھیں کبھی نہیں معلوم ہوتا اور نہ کبھی وہ اس کے معلوم کرنے کی طرف توجہ کرتے ہیں کہ آخر وہ کس واسطے زندہ ہیں۔ ہر چیز کا ایک مصرف ہوتا ہے۔ اُن کی زندگی کا کیا مصرف ہے؟ اکتساب معاش یا تکمیلِ خواہشات عامہ ہی محض مقصودِ زندگی نہیں۔ ان معاملات میں تو حیوان بھی ایک حد تک ہمارے شریک ہیں۔ بحیثیت اشرف المخلوقات ہونے کے ہماری زندگی کے مقاصد کو بھی نہایت بلند اور اعلیٰ ہونا چاہئے۔ جاہ و منصب شہرت و عزت کا طالب ہونا اور اس میں نمایاں کامیابی حاصل کرنا ممکن ہے کہ بادی النظر میں قابل ستائش ہو لیکن یہ کوئی حقیقی مقصد زندگی نہیں۔ جب تک ہم اپنی زندگی کو اپنے لئے اور اپنے ابنائے جنس کے لئے مفید ثابت نہ کریں ہماری زندگی کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔ زندگی کی جدوجہد میں وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو ضروریات زندگی کے حصول کے علاوہ اور بھی اعلیٰ جذبات اپنے دل میں رکھتے ہیں ایسے لوگوں کی نظر ہر چیز کی حقیقت پر پڑتی ہے اور وہ اس سے ایک خاص سبق حاصل کرتے ہیں اور اپنے مشاہدات اور تجربات کی رہنمائی سے منزلِ مقصود پر پہنچکر اپنی زندگی کے کارناموں کی زندہ مثال دُنیا میں چھوڑ جاتے ہیں۔

ہماری ترقی اور کامیابی کے بہت سے اسباب ہو سکتے ہیں۔ منجملہ اُن کے یہ عزم کہ جو کچھ ہمارے پیشِ نظر ہے اس کو ہم حتی الوسع اپنی قابلیت کے ساتھ بحسن و خوبی انجام دیں۔ اور اس سے جو کچھ فوائد حاصل ہوں۔ اُن کو اپنی زندگی پر مترتب کریں۔ تمناؤں کے باب زریں کی تنہا کلید ہے۔ ایسا علم حاصل کرنا جو ہمارے ہر شعبۂ زندگی میں کام آسکے۔ جس کی بدولت

ہر چیز کی اہمیت اور حقیقت ہم پر روشن ہونے لگے۔ کوئی حقیر چیز ہماری نظر میں حقیر نہ رہے کسی مہم اور دشواری کے وقت ہم ہمت نہ ہاریں ہمارے لئے زبردست تقویت کا سبب ہوتا ہے اور شاید اعلیٰ ترین مقصد زندگی ہے۔

ایک خاص مقصدِ زندگی کا پیش نظر ہونا جو ہمارے حیطۂ امکان میں سب سے زیادہ بلند تر ہو حقیقت یہ ہے کہ زندگی کی اصل روح ہے۔ اُس انتہا کا تعین جس کی طرف پہنچنے کے لئے ہم جد و جہد کرتے ہیں ہماری زندگی کی رفتار کو استوار کر دیتا ہے۔ اگر ہمارا مطمح نظر بلند ہے تو ہماری دماغی اور جسمانی حالت بھی بلند اور بہتر ہو جاتی ہے اور اگر پست ہے تو ہماری روح اور اعضا میں بھی انحطاط پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ جب تک ہماری نظر انتہا پر نہیں ہوتی ابتدا کبھی اچھی نہیں ہو سکتی۔ سب سے زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ ابتدا درست ہو اور ابتدا میں انتہا کا خیال کر لیا جائے اور پھر پورے وثوق اور استقلال کے ساتھ اس کی طرف قدم اُٹھایا جائے۔ جب ہمارے سامنے ایک اعلےٰ مطمح نظر ہوتا ہے۔ تو ہماری تمام حرکات و سکنات۔ خیالات و احساسات بلندی کی طرف ترقی کرتے رہتے ہیں۔ رُوح کی اُس غیر فانی طاقت پر اعتماد رکھنا چاہیئے۔ جو ہر انسان میں پوشیدہ ہے اور جو اس کی ترقی اور علویت نفس کا سبب ہوتی ہے تمام رُکاوٹوں کے دروازے اس کے سامنے اپنے آپ کھُل جاتے ہیں علوم و حقائق کے تمام مخفی خزینے خود بخود ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ جو لوگ اپنی روحانیت کو زندہ کر لیتے ہیں۔ وہ اپنے نفس اور اپنے ماحول پر غالب آجاتے ہیں اور اُن میں ایک ایسی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے جس سے وہ ہر چیز مسخر کر سکتے ہیں۔ دنیا میں اس کی ہزاروں مثالیں موجود ہیں ہر وہ جد و جہد جو کسی خاص تہیّہ کے ساتھ کی جاتی ہے کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ اُس دماغ کو کبھی شکست نہیں ہوتی جو ظاہری ناکامیوں پر غالب آجاتا ہے +

دماغی یا جسمانی نااہلیت کبھی کسی عزم بالجزم کے لئے رُکاوٹ پیدا نہیں کر سکتی۔ اور کسی جاہ و منصب یا تعلیم و دولت کا فقدان کبھی حصول مقاصد کے لئے مانع نہیں ہوتا۔ ہماری محرومیاں محض ہماری کم ہمتی کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ قدرت نے انسان کو ایک ہی فطرت پر خلق کیا ہے۔ ہر انسان میں روحانیت کی زبردست طاقت موجود ہے جو محض بے کاری اور بے استعمالی کے سبب سے زنگ آلود اور بے مصرف معلوم ہوتی ہے یا ہم کو اس کی طرف سے اس قدر بے توجہی ہوتی ہے کہ ہم کو اس کے وجود کا احساس ہی نہیں ہوتا ورنہ اگر ہم اس کے احساس کو زندہ کر لیں اور اُس طاقت کو عمل میں لائیں تو دُنیا میں ہم کو کمال انسانیت حاصل کرنے کے لئے اور اپنا مقصد زندگی پورا کرنے کے لئے کوئی بات سدِ راہ نہیں ہو سکتی انسان جد و جہد کی ایک تخلیق ہے۔ بے حسی اور بے کاری ہمیشہ اُس کی تباہی کا موجب ہوتی ہے ہماری ہستی ہماری رُوحانی اور دماغی حالت کا مظہر ہے۔ جیسا ہم خیال کرتے ہیں ویسے ہی ہم ہو جاتے ہیں +

محمد عبد الحی صدیقی بی۔ اے (علیگ)

شمع

اے شمع تو نورِ انجمن ہے — تو رونقِ محفلِ سخن ہے
تاریکیٔ شب کی تو عدو ہے — اور بزمِ جہاں کی آبرو ہے
تو شعلۂ حسنِ آتشیں ہے — تو شوخیٔ رنگِ مہ جبیں ہے
تو سوز و گدازِ دل کی محرم — تو آتشِ سوختہ کی ہمدم
تو طرزِ کلامِ بیہشی ہے — تو نغمۂ سازِ بیخودی ہے
ہے آہ میں تیری کیسی تاثیر — پروانہ ہوا ہے پا بہ زنجیر
کیوں محوِ سرودِ خامشی ہے — کیوں مائلِ طرزِ خود کشی ہے
چہرہ سے ٹپک رہی ہے وحشت — آنکھوں سے برس رہی ہے حسرت
تو کس کے فراق میں تپاں ہے — کیوں مائلِ گریہ و فغاں ہے
کیا مقصدِ زندگی ہے تیرا — دل محوِ بیکسی ہے تیرا
ہستی کو مٹا رہی ہے ہردم — کیا عشق جتا رہی ہے ہردم
سینہ سے نکل رہی فغاں ہے — یا آتشِ درد کا دھواں ہے
اوروں کو جلاکے جل رہی ہے — آتش کے ثمر سے پھل رہی ہے
کیوں جان پہ تیرے آ بنی ہے — کیا جرم کیا جو کشتنی ہے
ساتھ اپنے مجھے بھی تو جلا دے — اور صفحۂ دہر سے مٹا دے
کیا سوز ہے تیری داستاں میں — کیا غم ہے بھرا ترے بیاں میں
گر یوں ہی رہی یہ بیقراری — کیونکر یہ کٹیگی رات ساری
خاموش اے شمع رات کم ہے — اب وقتِ نسیمِ صبحدم ہے

رام پرشاد ـ ناشاد

لکسر کا مندر

"سُستی کے مارو ذرا سُرعت سے کام کرو" یہ الفاظ عبداللہ نے خالص عربی لہجے میں پکار کر ان مزدوروں سے کہے جو نشیب میں کھدائی کا کام کر رہے تھے۔ اور پھر موعودہ کہانی سُنانے کے لئے سفید رنگ سیاح کے قریب ٹیلے کی ڈھلوان سطح پر بیٹھ گیا۔ ٹیلے کے دامن سے جہاں مزدور کام کر رہے تھے گرد و غبار کا بادل آگے سے زیادہ گہرا ہو کر اُٹھا۔ اور مصری آفتاب کی روشن شعاعوں نے اس کے کناروں پر سنہری گوٹا ٹانک دی۔ کدالوں اور پھاؤڑوں کی آوازیں جلد جلد آنے لگیں۔ مزدوروں نے ایک ساتھ مل کر یہ عربی گیت گانا شروع کیا :-

"دن کی گرمی نے میرے دل کی آگ کو اور بھڑکا دیا"

"میرا محبوب! آہ اُس نے مجھے چھوڑ دیا"

"مشقت کے بار گراں نے میرے دل کو پیس ڈالا"

آہ! میرے محبوب نے مجھے چھوڑ دیا"

عبداللہ نے ابھی کہانی شروع نہ کی تھی کہ مزدوروں کی آواز سُن کر اس کی تیز عقاب کی سی آنکھوں میں ایک خواب آلود کیف اور ایک عمیق تخیل کا رنگ جھلکنے لگا۔ جزائر برطانیہ کا سیاح سر چارلس فلکین نہایت دلچسپی کے ساتھ اس کی طرف دیکھ رہا تھا کیونکہ عبداللہ وہ شخص تھا جس نے کم و بیش پندرہ سال مصر کی کھدائی کے کام میں گزارے تھے۔ وہ یہاں مزدوروں کے جماعت دار کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ سر چارلس اپنے دل میں سوچ رہا تھا۔ کہ ایسا شخص کسی سیاح کو تحقیق و تفتیش کے سلسلے میں بیسیوں دلچسپ کہانیاں سُنا سکتا ہے۔ لیکن ایسا موقع بہت ہی کم ہوتا تھا۔ کہ عبداللہ ان لوگوں کے تجسّس کے جواب میں جو آئے دن لکسر کو دیکھنے کے لئے آتے تھے کھل کر باتیں کرے۔ لوگ اکثر اس سے واقفیت پیدا کرنے کے خواہشمند رہتے تھے۔ وہ قدیم بادشاہوں کی ممیوں اور پتھر کی مورتوں کو زمین کی تہ سے نکالنے کے متعلق اس کے سالہا سال کے تجربات معلوم کرنے کے بےحد شائق ہوتے تھے۔ مگر صرف کبھی کبھی کوئی اجنبی اس کے دل تک رسائی کر کے اسے آزادی سے باتیں کرنے پر آمادہ کر سکتا تھا۔ سر چارلس کے دل میں یہ وہم بھی جاگزیں تھا کہ قدیم مصر کے دیوتا مختلف طاقتوں کے مظہر تھے۔ اس کے علاوہ اسے ہر مصری چیز سے ایک طرح کی ہمدردی تھی یہی وہ باتیں تھیں جنہوں نے عبداللہ کو یہ وعدہ کرنے پر مجبور کر دیا۔ کہ وہ سر چارلس کو ایک کہانی سنائے گا۔ جو یقیناً اس کے لئے دلچسپی کا موجب ہوگی ٭

(۳)

عبداللہ نے ایک بڑا سا سگار سلگاتے ہوئے سلسلۂ گفتگو کو یوں شروع کیا :-

کوئی بارہ سال کا واقعہ ہے کہ ایک اور جماعت دار جو مزدوروں کی ایک دوسری ٹولی پر متعین تھا میرے ساتھ یہاں کام کیا کرتا تھا۔ اس کا نام تو میں بھول ہی چکا ہے لیکن اگر تم پسند کرو۔ تو گفتگو میں آسانی پیدا کرنے کے لئے میں اسے حسین کہہ لوں گا۔ وہ کھدائی کے کام اور اس کی روز افزوں ترقیات کے نسبت کما حقہٗ واقف تھا۔ اور اسے زمین کے اندر دبے ہوئے مندروں۔ غاروں اور ان سے دستیاب شدہ اشیاء کے متعلق کافی علم حاصل تھا۔ وہ ہم جیسا ہی ایک شخص تھا۔ اس کا قد بلند اور اس کا جسم مضبوط تھا۔ وہ ان عورتوں سے اکثر رسم و راہ پیدا کر لیتا تھا۔ جو اس مقام کو دیکھنے کی غرض سے آتی تھیں۔ اور اکثر ہوٹل میں جہاں آج کل تم مقیم ہو ٹھیرا کرتی تھیں۔

اسی زمانے میں ایک سراپا حسن ایک خوبی مجسم خاتون اس ہوٹل میں آئی۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں۔ کہ ان ممالک میں اس درجہ خوبصورت عورت ہم نے آج تک نہیں دیکھی۔ اگر میں تم سے یہ کہوں کہ میں اس کا نام بھول چکا ہوں۔ تو یہ میرا ایمان ہے۔ لیکن اگر میں اپنی گفتگو میں اسکو مسز میری۔ کے نام سے پکاروں تو اس میں حرج ہی کیا ہے ؟

اس کی شادی ہو چکی تھی لیکن اس کا خاوند یہاں اس کے ساتھ نہ آیا تھا۔ وہ اپنے وطن ہی میں تھا۔ اور میرا خیال ہے کہ وہ وہاں سرکاری ہنڈی کی دلالی کا کام کرتا تھا۔ وہ یقیناً بہت امیر آدمی ہوگا کیونکہ میری کا لباس ہمیشہ نہایت اعلیٰ درجہ کا ہوا کرتا تھا۔ اور جو لباس وہ شام کے وقت زیب بدن کرتی تھی۔ اس میں صرف وہ ہار جو اس کی سفید نورانی گردن کو زینت دیتا تھا۔ چار ہزار پونڈ کی مالیت کا تھا ٭

دس سال کا عرصہ ایک آدمی کی زندگی کا معتد بہ حصہ ہوتا ہے۔ لیکن آج بھی میں یہاں بیٹھ کر میری کا تصور کرتا ہوں تو اس کی صورت مجھے اتنی صاف نظر آتی ہے۔ جیسے تم میرے سامنے بیٹھے ہوئے ہو۔ اس کی طبیعت تمہارے ملک کی چلبلی اور عشوہ طراز عورتوں سے بالکل مختلف تھی۔ اسے تنہائی اور سکون پسند تھا۔ اسے آفتاب کی گرمی اور روشنی میں پھولوں کے رنگ و بو میں اور دریائے نیل کی اس تمام زندگی میں جو ہوٹل کے باغ میں سنگترے کے درختوں کے نیچے بیٹھ کر نظر آتی تھی بے انتہا لطف آتا تھا۔

اس کے بال نہایت خوبصورت۔ نرم۔ گھنے اور سنہری رنگ کے تھے۔ اور وہ انہیں نہایت سادگی سے اپنے سر کے قریب گوندھ لیا کرتی تھی ...... ہاں اور ابھی اس وقت تک تمہاری عورتوں نے اپنی وضع و قطع لڑکوں کی سی بنانے کی دھن میں اپنے بالوں کو ترشوانا شروع نہیں کیا تھا ...... اور اس کی آنکھوں میں ایک حیا پرور سکون جھلکتا تھا ٭

یوں تو لکسر میں اسے سب چاہتے تھے۔ لیکن حسین کو اس کی ہر ادا پسند تھی میری کے پاس کتابوں کا جتنا ذخیرہ موجود تھا۔ تمام کا تمام مصریات پر مشتمل تھا۔ اور ہر روز حسین ...... میں شاید تمہیں بتا چکا ہوں کہ حسین بھی میری طرح مصریات میں کافی دستگاہ

رکھتا تھا۔ اور ہم دونوں اکثر ان دنوں ہوٹل میں جایا کرتے تھے......ہاں میں کہہ رہا تھا۔ کہ ہر روز حسین اُسے ہوٹل کی کشتی میں بٹھا کر دریا کے پار لے جاتا تھا۔ اور وہاں سے یہ دونوں کرایہ کے گدھے لے کر اس طرف روانہ ہو جاتے تھے جہاں سلاطین کے مقابر واقع ہیں حسین ایک سمجھدار آدمی تھا۔ اور اگر ایک عورت کو بجائے کسی ایسے نااہل ترجمان کے جسے انگریزی زبان کے ایک آدھ درجن ٹوٹے پھوٹے الفاظ یاد ہوں۔ اور جس کی ہتھیلی چند ٹکوں کی خاطر ہر وقت کھُجلاتی رہتی ہو۔ کوئی ایسا رہبر مل جائے۔ جو قابل خوبصورت اور نوجوان ہونے کے علاوہ اُس کے مضمون سے بھی مس رکھتا ہو تو کیا وہ اُس کو ہاتھ سے جانے دیگی ؟

یہاں ایک بڈھا پروفیسر بھی رہا کرتا تھا یہ وہی شخص ہے جس نے "پیپے پائرس آف دی ہائی پریسٹ سنے بیب" کے عنوان سے ایک کتاب بھی لکھی تھی......وہ ان دنوں یہاں قرنا کے چٹانی مقبروں کے کتبے نقل کیا کرتا تھا۔ اسی نے پہلی مرتبہ میری توجہ کو اس طرف پھیرا کہ واقعات کچھ اور رنگ اختیار کر رہے ہیں۔ میری پروفیسر اور میں ایک شام کو غروب آفتاب کے قریب ہوٹل کے باغ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اور مصر کے قدیم دیوتاؤں کی طاقت و قدرت کے متعلق باتیں کر رہے تھے۔

میری نے کہا "معلوم ہوتا ہے کہ قدیم مصری بڑے مذہبی لوگ تھے۔ دیکھو اُنہوں نے آموں را۔ آتور اور دوسرے دیوتاؤں کے مندر کس قدر عظیم الشان بنا رکھے ہیں"۔

پروفیسر نے کہا "مذہب سے تو ان کو کچھ واسطہ ہی نہ تھا۔ یہ سب کچھ جو تم دیکھ رہے ہو۔ انہوں نے محض نمائش کے لئے بنا رکھا تھا۔ جو دیوتا اُنہوں نے منتخب کر رکھے تھے۔ اُن کا مرتبہ دنیائے الوہیت میں کچھ بلند نہ تھا۔ اُن کی توجہ زیادہ تر صرف انہیں دیوتاؤں کی طرف تھی جو بدی کے مظہر تھے۔ اور وہ صرف اُن کے خوف سے متاثر ہو کر ان کو مانتے تھے۔ مثلاً سخمت۔ یہ وہ دیوی ہے جس کا سر شیرنی کا ہے۔ اور جسے لڑائی فساد کا مظہر سمجھتے ہیں۔ تم اس پر یقین کرو یا نہ کرو۔ لیکن آج تک فلاحین کی عورتیں اپنی تکالیف کو سخمت دیوی کی طرف منسوب کرتی ہیں"۔

اس سخمت کے متعلق جس کے ہاتھ میں مرد اور عورت کی ازدواجی زندگی کو کامیاب یا ناکام بنانے اور اُن کے درمیان محبت یا نفرت قائم کرنے کا اختیار تسلیم کیا جاتا ہے شاید تمہیں کچھ زیادہ معلومات حاصل نہیں۔ قصبہ کارنک تو تم نے دیکھا ہے۔ وہیں پٹاہ کے مندر کے ایک سنسان گوشہ میں ایک اور چھوٹا سا مندر ہے۔ اسی مندر میں بھورے رنگ کے پتھر سے بنی ہوئی سخمت دیوی کی مہیب مورت رکھی ہے۔ یہ ایک نہایت تاریک اور بھیانک جگہ ہے جہاں روشنی کا کبھی گذر نہیں ہوا۔ مگر چودھویں رات کو جب چاند اپنی پوری تابانی سے جلوہ گر ہوتا ہے۔ چاندنی کی کچھ کرنیں چھت کے ایک سوراخ سے چھن کر اندر آجاتی ہیں فلاحین مصر کی عورتیں اب بھی اس مندر میں آتی ہیں۔ اور سخمت دیوی سے کبھی بیٹا مانگتی ہیں۔ اور کبھی اپنے شوہر کے دل کو اسیر محبت کرنے کے لئے دعائیں کرتی ہیں۔

پروفیسر نے کہا "خدا بچائے۔ اس جگہ جاکر تو انسان خوف وہراس سے کانپ جاتا ہے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ اور ان دنوں میں ابھی جوان ہی تھا۔ کہ میں اپنی ایک عورت دوست کے ساتھ وہاں چلا گیا۔ چاندنی کی کرنیں چھت میں سے چھن چھن کر دیوی کی مورت پر پڑ رہی تھیں۔ اور اس کی مہیب وحشیانہ آنکھیں نہایت درشتی سے ہمیں گھور رہی تھیں جنہیں دیکھ کر وہ اس قدر خوف زدہ ہوئی کہ اُسے غش آگیا"۔

یہ سُن کر میری کے سمندِ شوق پر ایک اور تازیانہ لگا۔ تمہیں معلوم ہی ہے۔ کہ تمہاری گوری عورتیں جب سنسنی پیدا کرنیوالی کوئی نئی بات سنتی ہیں تو بے طرح اُس کے دیکھنے کے درپے ہو جاتی ہیں +

میری نے کہا "اوہ! عجب منظر ہوگا۔ لیکن اس کے تصور سے بدن میں خون سرسرانے لگتا ہے"۔

پروفیسر کی باتیں سُن کر اس کا شوق انتہا تک پہنچ چکا تھا۔ اور اس وقت اس کے دل میں اس خواہش کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ کوئی اسے قصبۂ کارنک میں سخمت کا مندر دکھانے کے لئے اپنے ساتھ لے جائے "اُس نے کہا" دو دن میں چاند پورا ہو جائیگا۔ اور اگر ہم اُس رات وہاں جائیں۔ تو کتنا پُر لطف منظر دیکھنے میں آئے۔ پروفیسر! مجھ سے وعدہ کرو۔ کہ تم مجھے ضرور وہاں لے چلوگے +

بوڑھے پروفیسر نے کہا "نہیں میں ایسی بات ہرگز نہ کروں گا۔ کیونکہ مجھ کو معلوم ہے کہ تم بھی وہاں جاکر یہی دُعا کروگی کہ دیوی مجھے مسحور کردے اور جس طرح اب ہوٹل میں ہر شخص تمہارا مشتاق نظر آتا ہے۔ میں بھی تمہاری محبت میں گرفتار ہو جاؤں گا"+

پروفیسر کی گفتگو کے دوران میں میری نظر میری پر جمی ہوئی تھی۔ یکایک اس کے چہرے پر ایک تغیر نمایاں ہوا۔ اور ایسا معلوم ہونے لگا۔ جیسے اس کے دل میں مسرت کا ایک طوفان اُمنڈ پڑا ہے۔ اس کے ہونٹوں پہ ایک جنبش سی ظاہر ہوئی۔ اُس کی آنکھوں میں ایک چمک سی پیدا ہوگئی۔ اُس کے تنفس میں بھی تیزی محسوس ہونے لگی۔ میں نے مڑ کر پیچھے کو دیکھا کہ یہ انقلاب کیوں پیدا ہوگیا۔ تو میں نے اپنی کرسی کے پیچھے حسین کو کھڑا پایا +

حسین نے کہا۔ خاتون صاحبہ مجھے آپ کے لئے ایک نہایت اعلیٰ درجہ کا گلدان مل گیا ہے اور میں اُسے بوڑھے محاسب کے پاس چھوڑ آیا ہوں۔ آپ ذرا دوکان پر چل کر دیکھ لیجئے"+

دن کی روشنی ہر لحظہ مدہم ہو رہی تھی۔ لیکن غروب ہوتے ہوتے سُورج کی کرنوں میں میں نے دیکھ لیا۔ کہ میری نے حسین کی طرف کن نظروں سے دیکھا ہے۔ وہ دونوں وہاں سے چلے گئے۔ اور ہمیں کھجور کے درختوں میں سے دُور تک میری کا فراک چمک چمک کر نظر آتا رہا۔ ابھی وہ ہماری نظروں سے بالکل غائب نہ ہوئے تھے۔ کہ میری نے اپنا بازو حسین کے بازو میں ڈال دیا +

"یہ مصر ہے" بوڑھا پروفیسر جس نے اس ملک کو تیس سال تک خوب دیکھا تھا۔ اپنے سفید سر کو جنبش دے کر بولا "مجھ کو ہواؤں میں سے فسوں کاری کی بُو آتی ہے"+

اُسی رات جب حسین اور میں لکسر کے مندر کے سامنے ٹہل رہے تھے۔ اس نے مجھ سے اپنے دل کی بات کہی۔ وقت آدھی رات سے کچھ زیادہ گزر چکا تھا۔ میں نے حسین سے کہا "آئیے اب کیمپ کو چلیں۔ نیند بہت ستا رہی ہے"۔

حسین نے کہا "آہ! جس کی آنکھیں کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی بند نہ ہوئی ہوں اسے نیند سے کیا واسطہ ہے"۔ یہ الفاظ اس نے کچھ اس طرح کہے گویا کوئی دم میں اُس کی آواز اس کے گلے میں بند ہو کر رہ جائے گی۔ اس نے کہا "عبداللہ میں تم کو کچھ زیادہ عرصہ سے نہیں جانتا۔ مگر مجھے تم سے ایک طرح کا اُنس ہے۔ اور میں مجبور بھی ہوں کہ میں اپنا راز کسی نہ کسی کو ضرور بتاؤں۔ مجھے بتاؤ! ایسا آدمی کیا کرے جو کسی بیاہی ہوئی عورت کی محبت میں اسیر ہو گیا ہو؟"

اگر یہی بات وہ مجھ سے دس سال کے بعد بھی آج پوچھتا تو غالباً میں اس کو اس کا علاج بتا سکتا لیکن اُن دنوں میں نوجوان اور ناتجربہ کار تھا۔ میں نے جواب دیا "میرا خیال ہے کہ سب کچھ عورت کی مرضی پر منحصر ہے" +

اس نے کہا "وہ اپنی پہلی شادی میں خوش ہے۔ کیونکہ وہ اکثر مجھ سے اپنے خاوند اور بچّوں کی باتیں کیا کرتی ہے۔ اُس نے مجھ سے یہ بھی کہا ہے کہ اُسے مجھ سے ایک طرح کا اُنس ہے۔ لیکن ایسا جو ایک دوست کو دوسرے دوست سے ہوتا ہے۔ بتاؤ! ایسی محبت مجھے کیا نفع دے سکتی ہے؟ اُس کی اس محبت نے جو میرے دل میں ہے میری صبح اور میری شام کو بے چینی اور اضطراب سے مامور کر رکھا ہے۔ اس کی دلربا صورت ہر وقت میرے سامنے رہتی ہے۔ لیکن آہ اُس کی یہ دل رُبائی مجھے کسی وقت چین نہیں لینے دیتی۔ وہ ایک ایسی مہک میں لپٹی ہوئی ہوتی ہے۔ جو جنگل کی اُس تازگی اور شگفتگی میں سے آئے جس پر مینہ برس کر کھل چکا ہو۔ اور یہ مہک میرے مشامِ جاں کو مسرّت سے لبریز کر دیتی ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ ہر وہ گھڑی اور ہر وہ لمحہ جس میں ہم دونوں یہاں کھڑے ہو کر ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہیں ہمیں اُس دن سے قریب تر لا رہا ہے۔ جب ہمیں ایک دوسرے سے جدا ہونا پڑے گا۔ وہ دن جب اُسے اپنے خاوند کی آغوش میں واپس جانا ہو گا۔ اور میں آہ میں . . . . ."

اس کی گفتگو کا سلسلہ یہاں منقطع ہو گیا۔ اور اس کی نظر تاروں بھرے آسمان کے نیچے تمام ظلمتوں کو چیرتی ہوئی دریا اور پہاڑیوں کے پار پہنچ گئی ❊

میں نے پوچھا "کیا تم نے کبھی اپنی محبت کا ذکر اُس سے کیا ہے"

حسین نے اپنا سر ہلا کر کہا "نہیں"۔

میں نے کہا "تو پھر تمہیں اُس سے پہلوتہی کر لینا چاہئے"۔

حسین نے کہا "ہاں میرا بھی یہی خیال ہے"۔ اُس کے بعد ہم وہاں سے واپس آ گئے +

تم جانتے ہی ہو کہ اچھی نصیحت کا کیا حشر ہُوا کرتا ہے۔ دوسرے ہی دن میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ کہ حسین اور وہ خاتون

ایک گاڑی میں بیٹھ کر کارنک روڈ سے گزر رہے ہیں +

(۳)

گرم ہوا کا ایک طوفانی جھونکا اُٹھا - اور تمام وادی کا گرد وغبار سمیٹتا ہُوا ہماری طرف بڑھا - اور پھر کھدائی کرنے والے مزدوروں پر اس طرح چھا گیا کہ ان کی شکلیں مشکل سے نظر آتی تھیں - لیکن اُن کی آوازیں گرد وغبار کے اِس بادل کو چیر چیر کر اب بھی ہم تک پہنچ رہی تھیں +

"میں دل فتگی اور درماندگی کی حالت میں مشقت سے اُکتا گیا ہوں"۔

"آہ! میرے محبوب نے مجھے چھوڑ دیا"

عبداللہ اب خاموش تھا - اُس کی نگاہ اُس ندی پر جمی ہوئی تھی - جو وادی کے سرسبز دامن میں نیلے رنگ کی ڈور کی طرح لہراتی ہوئی چلی گئی تھی +

سر چارلس نے پوچھا "اور پھر"؟

عبداللہ نے اپنی کہانی پھر شروع کی: حسین میری نصیحت پر عمل کرنے کے لئے آمادہ تھا - وہ مجھ سے اس بات کا وعدہ کر چکا تھا لیکن دیکھو - تقدیر غریب انسان کے ساتھ کیا کیا داؤں کھیلتی ہے - دوسرے دن ہیری خود اُس کے ہاں آ گئی اور بصد منت اُس سے کہنے لگی کہ وہ اُسے سخت کے مندر میں لے چلے - حسین نے عذر کیا کہ اُس کو قاہرہ جانا ہے - اور اس لئے وہ اس کے ساتھ نہیں جا سکتا لیکن ہیری نے ایک نہ مانی - اور کہا کہ جس طرح بھی ہو سکے تم چوبیس گھنٹے کے لئے اپنی روانگی کو ملتوی کر دو کیونکہ تمہارے سوا میں کسی کے ساتھ وہاں نہیں جانا چاہتی +

پھر بھی حسین نے نہایت استقلال کے ساتھ اپنے آپ کو ہیری کے ہاں جانے سے روکے رکھا اور تمام دن وہ ایک دوسرے سے نہ ملے لیکن وہ قاہرہ بھی نہ گیا - دوسری شام کو وہ پھر اُس کے پاس آئی - ابھی کھانے کا وقت نہ ہوا تھا حسین بیٹھا سگرٹ پی رہا تھا - ہیری نے پوچھا کہ آخر مجھ سے کیا خطا سرزد ہوئی - کہ تم مجھ سے یوں اجتناب کر رہے ہو - بس اس فقرے نے قیامت کر دی حسین سب کچھ بھول گیا - اُس کے دل میں اب اس کے سوا اور کوئی آرزو نہ تھی - کہ ہیری اپنے رنج کو بھول جائے - اُس نے اُس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا - اور کہنے لگا - کہ اگر تم چاہو - تو آج رات میں تمہیں کارنک لے جانے کے لئے تیار ہوں - ہیری نے اپنے ہاتھوں کو اُس کے ہاتھوں میں ڈھیلا چھوڑ دیا - گویا وہ یہ ظاہر کرنا چاہتی تھی - کہ اُس نے اُس کے قصور کو معاف کر دیا - اس کے بعد وہ واپس چلی گئی اور ہوٹل والوں کو اُس نے حکم دیا - کہ فوراً ایک گاڑی تیار کی جائے - اور اس کے اندر کھانا اور ایک نائدہ میں برف لگا کر پانی کی چند بوتلیں رکھ دی جائیں - چاند مشرق سے طلوع ہو رہا تھا - کہ وہ دونوں کارنک کی سیر کے لئے چل کھڑے ہوئے -

ر سے گیدڑوں کے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ جو مقدس جھیل کے کناروں پر چیخ رہے تھے۔

اُس رات وہ اُس کے ساتھ بڑی ملاطفت اور مہربانی کے ساتھ پیش آئی۔ بلکہ اُس رات اُس نے اپنے خاوند اور بچوں کا
ر بھی نہ کیا۔ وہ حسین کو اس ڈھب پر لے آئی۔ کہ وہ اُسے اپنی ذات کے متعلق باتیں سُنائے۔ اور اُن عورتوں کی نسبت کچھ بتائے جن سے
ں نے اپنی زندگی میں محبت کی ہے۔ وہ زندگی کی حقیقت اور محبت کے فلسفے پر بحث کرتے رہے۔ وہ اپنے اپنے خیال کے مطابق
لاتے رہے کہ سچی خوشی کہاں میسر آسکتی ہے۔ غرض کہ جو مہمل اور لغو بحث دو مختلف قوموں کی دو نادان ہستیاں جن کی دنیا کو پیدا
وئے ابھی بمشکل بیس برس گزرے ہوں گے ایک خوشگوار سہانی رات سے متاثر ہو کر جس میں چاند کا سنہری فانوس بھی
ر پر لٹک رہا ہو کر سکتی ہیں۔ اُنہوں نے فروگزاشت نہ کیں۔

حسین نے مجھے بتایا کہ ہم دونوں نے بالائی دون پر بیٹھ کر اپنا مختصر سا کھانا کھایا۔ اور ایک دوسرے سے اس طرح باتیں کرتے رہے
س طرح دو پرانے دوست کرتے ہیں۔ کیونکہ حسین ہیری سے اپنے دل کو چھپانے کا تہیہ کر چکا تھا۔ جب کھانا ختم ہو چکا۔ تو اس نے
ری کا بازو پکڑ لیا۔ اور ٹوٹی پھوٹی سیڑھیوں سے جن پر عظیم الشان دروازے کے سائے نے اندھیرا ڈال رکھا تھا۔ اُترنا شروع کیا۔
ند اپنی پوری تابانی سے جلوہ گر تھا۔ اور اس میں ہپوسٹائل ہال کے رفیع و عظیم ستون دل پر ہیبت طاری کر رہے تھے۔ اسی لئے وہ اُن
ـ بوس ستونوں میں سے خاموشی کے ساتھ گزرتے چلے گئے جن کے اوپر ستاروں بھرا آسمان ایک زرنگار چتر کی طرح چمک رہا تھا۔

جب وہ آمون کے مندر سے گزر رہے تھے۔ اُس وقت حسین کے جسم میں خون نے ایک ہیجان برپا کر رکھا تھا۔ اس کا دل ہیری
لبت سے سینے میں بلیوں اُچھل رہا تھا۔ شاید اسی لئے ہیری نے اپنا بازو اُس کی گرفت سے نہ چھڑایا۔ اس وقت حسین کی زبان میں
لنے کی طاقت نہ تھی۔ اور نہ اُسے اتنی جرأت ہوتی تھی۔ کہ وہ اس کی طرف دیکھ ہی سکے ہیری کے بازو کی گرمی نے اُس کے خون کو
لا دیا تھا۔ اور وہ بے اختیار اُسے اپنی آغوش میں لے کر اپنے دل میں بٹھا لینا چاہتا تھا۔

اسی حالت میں وہ سخمت کے مندر تک آ پہنچے۔ جو ایک چھوٹے سے صحن سے گزر کر پتاہ کے معبد کے ساتھ ہی واقع ہے
رکا ایک محافظ چراغ لے کر جھٹ وہاں آ پہنچا۔ لیکن ہیری نے اسے پانچ پیاسٹر کا ایک سکہ دے کر رخصت کر دیا۔ ستونوں
سایوں نے اسے جلد ہی نظروں سے اوجھل کر دیا۔ اور وہ دونوں اکیلے سخمت کے مندر میں داخل ہو گئے۔

پروفیسر نے درست کہا تھا۔ یہ واقعی ایک نہایت دہشت انگیز جگہ ہے۔ ایک چھوٹا سا تاریک کمرہ ہے جس کی
ریں پتھر کی بنی ہوئی ہیں۔ اور چھت بہت اونچی ہے۔ داخل ہوتے ہی مقابل کی دیوار کے سامنے دیوی کی گھورتی ہوئی مورت
ر آتی ہے۔ چھت میں چار سوراخ ایک چوکور کی شکل میں بنائے گئے ہیں۔ جو چاند کی کرنوں کا انعکاس کرنے کے لئے دم کا کام دیتے
اُس رات دیوی کے چہرے کو ایک چمکتی ہوئی شعاع پڑ کر نمایاں کر رہی تھی۔ دیوی شیرنی کی طرح اپنا سر اُٹھائے کھڑی تھی

جس پر قرص آفتاب کا تاج رکھا تھا۔ اس کے دونوں نوکیلے کانوں کے درمیان ایک ناگن اپنا پھن پھیلا کر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی دو چھوٹی چھوٹی بے رحم آنکھیں۔ اُس کی بے ڈھب چوڑی ناک اور اس کا گلپچھوں والا خوفناک منہ جس میں سے اس کے پھاڑ کھانے والے تیز دانت چمک رہے تھے جسم پر لرزہ طاری کر دیتے تھے۔ اس کا قد حسین کے قد سے نکلتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اور حسین کا قد چھ فٹ تین انچ سے کسی طرح بھی کم نہ تھا۔ بھوری چٹان کی طرح دیوی کا رنگ بھی بھورا تھا اور چاند کی کرنیں اس کی خونخوار پتھریلی آنکھوں پر پڑ پڑ کر ان میں جان ڈال رہی تھیں ۔

میری نے جب بت کی شکل دیکھی تو زور سے ایک مرتبہ سانس لیا۔ پھر اس نے حسین کا بازو چھوڑ دیا۔ اور دیوی کے پاس جا کر اپنا ہاتھ اس کے اُس سرد ہاتھ پر رکھ دیا جس میں اس نے ایک نیزہ تھام رکھا تھا۔ چھت کے سوراخ میں سے جو شعاع اندر آ رہی تھی۔ اب اس کے چہرے پر بھی پڑنے لگی۔ حسین میری کے پیچھے کھڑا تھا۔ اس نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں چاند کی کرنوں میں چمک رہی ہیں۔ وہ ذرا کانپ کر پیچھے ہٹی۔ پھر اُس نے حسین کی طرف دیکھا۔ دونوں کی نظریں ایک دوسرے سے ملیں ۔

میری نے کہا "میں..... میں ڈر گئی ہوں"۔ اُس نے اپنا ہاتھ حسین کی طرف پھیلایا۔ حسین نے جوش کے ساتھ اُسے پکڑ لیا اور اسے اپنی آغوش میں لیا ہی چاہتا تھا کہ یکایک حسین کی گرفت ڈھیلی ہو گئی اُس نے زور کے ساتھ اپنے ہاتھ کو جھٹکا دیا۔ میری نے پریشانی کے عالم میں اس کی طرف دیکھا۔ حسین کی آنکھوں میں درد و کرب کا نہایت گہرا اثر نظر آ رہا تھا۔ اور وہ اُس ہاتھ سے جسے اُس نے جھٹک کر علیحدہ کر لیا تھا۔ دیوی کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ میری نے جلدی سے مڑ کر دیکھا تو اُسے ایک لمبا سیاہ جسم دیوی کی پشت کی طرف سرکتا ہوا نظر آیا ۔

میری نے کہا "حسین۔ میرے پیارے حسین یہ کیا تھا؟"

حسین نے جواب دیا "سانپ" اور اپنا بایاں ہاتھ باہر نکال کر دکھایا۔ ہتھیلی کے کنارے پر چھوٹی انگلی کے عین نیچے لہو کے دو رتانی قطرے لٹک رہے تھے۔ حسین نے بلند بھری آواز میں کہا۔ اگر کوئی سنے تو یہی کہے کہ میری تمہیں مجھ سے بچانے کے لئے قسمت نے اس سانپ کو بھیجا تھا" زہر کے اثر سے بے ہوشی حسین پر غلبہ پا رہی تھی۔ اُس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ میری چیخیں مارتی ہوئی اُسے گھسیٹ کر باہر تازہ ہوا میں لے آئی۔ اُن کے پیچھے دیوی کی خونخوار آنکھیں مندر کی تاریکی کو چیر چیر کر ان کو گھور رہی تھیں ۔

(۴)

عبداللہ یہاں ٹھیر گیا۔ اس کا سگار بجھ گیا تھا۔ اس لئے اس نے اُسے اپنے گرد آلود کوٹ کی جیب میں ڈال لیا ۔

سر چارلس نے جس کی پیشانی پر ہراس آمیز خیالات نے ایک گرہ سی ڈال دی تھی۔ پوچھا "تو کیا پھر حسین مر گیا"۔

عبداللہ نے کہا "نہیں وہ مرا نہیں۔ بلکہ پاس ہی کھنڈروں میں کچھ امریکن کھانا کھا رہے تھے۔ جو اُسے فوراً ہوٹل میں واپس لے گئے۔ اور ڈاکٹر نے اس کے زخم پر عمل جراحی کیا۔ بات تو بہت خطرناک تھی لیکن حسین نوجوان اور تنومند تھا۔ اس لئے وہ اس پر غالب آ گیا۔

سر چارلس نے پوچھا "اور وہ عورت؟"

عبداللہ نے کچھ دیر تامل کیا۔ پھر بولا "اُس نے اُس نصیحت پر عمل کیا جو مَیں نے حسین کو کی تھی۔ جب حسین کی زندگی کو کوئی خطرہ نہ رہا۔ اور اس کا علم اسے دوسرے ہی دن ہو گیا تھا۔ کیونکہ ایسے حالات میں موت و زیست کا فیصلہ بہت جلد ہو جایا کرتا ہے۔ اُس نے حسین سے ملے بغیر ہوٹل کو چھوڑ دیا۔ اور جہاں تک مجھے علم ہے حسین نے بھی اُسے پھر کبھی نہ دیکھا"

عبداللہ نے ایک سرد آہ بھری۔ اور اپنے سر کو ایک یاس آمیز انداز سے ہلایا۔ پھر خیالات کے ہجوم میں کچھ کھو سا گیا۔ اور اپنی نرم اور شیریں عربی زبان میں اُس نے یہ الفاظ کہے :۔

"غریب حسین! آہ اُس کی زندگی اُس کے لئے ایک بارِ گراں ہو گئی"

اس کے بعد وہ پھر خیالات میں گم ہو گیا۔ نشیب سے کھدائی کرنے والے مزدوروں کے گانے کی آواز برابر آ رہی تھی :۔

"میرا دل میرے سینے میں مُردہ ہو چکا ہے"

"آہ میرے محبوب نے مجھے چھوڑ دیا"

"میں اس کی شعاع ریز آنکھیں پھر کبھی نہ دیکھ سکوں گا"

"آہ! میرے محبوب نے مجھے چھوڑ دیا"

عبداللہ نے تھکے ہوئے انداز میں سہارا لیکر اُٹھنے کے لئے اپنا بڑا سیاہ ہاتھ زمین پر ٹیک دیا۔ سر چارلس نے دیکھا کہ اُس کی ہتھیلی کے کنارے پر چھوٹی اُنگلی کے نیچے اودے رنگ کے دو نشان پڑے ہوئے ہیں۔ اور دو نشانوں کو ایک لکیر آپس میں ملا رہی ہے +

سر چارلس کے ماتھے پر جو بادل چھا رہے تھے وہ چھٹ گئے۔ اور اُس کی آنکھوں میں مسرت کی روشنی جھلکنے لگی۔ مصری جماعت دار کے ساتھ مصافحہ کرنے کے لئے جو اب پھر مزدوروں کو ڈانٹ بتا رہا تھا۔ وہ بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور کہنے لگا "میرے دوست! میں نے یہ کہانی آج دوسری مرتبہ سُنی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ میری جس کا تم نے ذکر کیا ہے۔ میری بیوی کی ایک ایسی ہی سہیلی ہے۔ جیسے حسین تمہارا دوست تھا۔ اور مَیں اُس خاتون کے خاوند کو جو جزائر برطانیہ میں سرکاری ہنڈی کا دلال ہے۔ اور جو اتفاق سے میرا بڑا گہرا دوست ہے بتا دوں گا کہ جو کچھ ہوا بہتر ہوا۔ اور اس کے لئے اُسے خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے۔

اس کے بعد اُس نے نہایت خوش اخلاقی کے ساتھ سلام کے لئے اپنے سر کو جھکایا۔ اور پھر ٹیلے سے نیچے اُترنا شروع کر دیا +

ترجمہ (منصور احمد)

نواہائے راز

ری نوائے مست کے نشے میں کھو گیا ہوں میں — بس ایک گونج رہ گئی ہے خود نہیں رہا ہوں میں

زل سے غم نصیب ہوں بجا ہے قیدِ غم مجھے — خدا کرے نہ تیرے غم سے حشر تک رہا ہوں میں

مرا خمیر عشق ہے سرشت ہے وفا مری — ازل کا مبتدا ہوں میں ابد کا منتہےٰ ہوں میں

ریصِ اضطرابِ دل شہیدِ اضطراب میں — تپش ہے دل کا مُدعا اور اُس کا مُدعا ہوں میں

نہ دل میں آہ رہ سکی نہ لب پہ نالہ رک سکا — بجا ہے بے شعور ہوں - درست نارسا ہوں میں

تجھے بھلا رہا ہوں میں یہ کیا خیال ہے مجھے — غضب کا سنگدل ہوں میں عجیب بے وفا ہوں میں

شمیمِ گُل کو چھوڑ کر بھی گل سے کیوں الگ نہیں — جُدا ہیں تجھ سے کس لئے ہوں آہ اگر ترا ہوں میں؟

مری صدا پہنچ سکی نہ اُس کے بام تک کبھی
وہ پادشاہِ حُسن ہے گدائے بے نوا ہوں میں

حامد علی خاں

تکمیلِ جنوں

کاش نہ ہوں منکشف مجھ پہ یہ اسرارِ غیب

اے دل و جاں! طاقتِ سوزشِ پنہاں نہیں

دنیا کی تقریباً سب نعمتیں اُسے میسّر تھیں۔ اور اُس کا بے لوث دل شاید رنج و الم کے نام سے بھی آشنا نہیں تھا۔ بایں ہمہ وہ عجیب و غریب سودا جو اُس کے سر میں سما چکا تھا اُسے ہمیشہ بے چین رکھتا۔ اُسے ہر وقت یہی دھن تھی۔ اور اس کے دل میں صرف یہی خواہش تھی "کاش! میرے دل پر تمام دُنیا کے مخفی حالات۔ دلوں کے پوشیدہ راز اور جذبات جن سے میں ناواقف ہوں عیاں ہو جائیں"۔ وہ ملک کا فرماں روا تھا۔ اور اُس جنوں کو تکمیل تک پہنچانے کے لئے اپنے سب خزانے خالی کر دینے کو تیار تھا۔ لیکن یہ بات نہ تو خود اُس کے بس کی تھی اور نہ کسی دوسرے انسان کے بس کی۔ وہ قانونِ قدرت کے خلاف ایک علم حاصل کرنے پر تُلا ہُوا تھا۔ اور اس خوفناک حقیقت سے ناآشنا تھا جو اس علم کے حصول کے بعد اُس پر ظاہر ہونے والی تھی ٭

اُس نے کئی دور و دراز کے سفر کئے۔ اور بڑے بڑے اولیاؤں سے ملاقات کی۔ لیکن کوئی فردِ بشر اُس کی دلی آرزو کو پورا نہ کر سکا۔ بالآخر اُسے اپنے ہی دل کی گہرائیوں کے اندر ایک نامعلوم سی آواز سنائی دی ٭

"کوئی شے ایسی نہیں جو خلوصِ نیّت کے ساتھ خالقِ حقیقی سے مانگی جائے اور وہ نہ دے"!

ایک مُدت تک وہ یہ آواز سنتا رہا۔ اور اب وہ قادرِ مطلق کی طرف رجوع کر چکا تھا۔ وہ دن کو اپنی رعایا کی خدمت میں مصروف رہتا۔ اور اپنی راتوں کو اسی تمنا کے حصول کی دُعاؤں اور اپنے پروردگار کی حمد و ثنا میں ختم کر دیتا ٭

اُس کی پیہم التجائیں اور متواتر دعائیں آخر بکار آئیں اگرچہ اس کی مثال ایسی ہی تھی جیسے ایک نادان بچہ دہکتے ہوئے انگارے کو ہاتھ میں لینے کی کوشش میں کامیاب ہو جائے اور اُس کی زندگی میں وہ دن بھی آگیا جس کی تمنا میں وہ ایک عمر سے بیتاب تھا۔ لیکن وہ صرف ایک لمحہ کے لئے مسرور ہوا۔ ایسا مسرور جیسا وہ پہلے کبھی نہ ہُوا تھا ٭

اُس کے خیالات دُنیا کے اندرونی حالات کی طرف مُنعطف ہوئے اور اُس کا دل سینے میں لرز گیا۔ اُس کے دل پر تمام دُنیا کے مخفی حالات دلوں کے پوشیدہ راز اور جذبات جن سے وہ ناواقف تھا عیاں ہو چکے تھے۔ لیکن کس صورت میں؟ یہ اسی کا دل جانتا تھا ٭

وہ ایک خوش اعتقاد انسان تھا۔ سچائی۔ خلوص محبت، ایثار، رحم اور بے ریائی کو وہ دنیا میں ارزاں سمجھتا تھا لیکن اب اُس نے دیکھا کہ

دُنیا میں زیادہ تر اسی جنس کا قحط ہے۔ اب اُس کے سامنے کذب و افترا۔ ریاکاری۔ فریب و دغا اور جور و جفا کا بازار گرم تھا معصوم دلوں کو پامال کیا جا رہا تھا اور ہر شخص اپنی اندھا دُھند خواہشات کی پیروی میں مصروف تھا وہ لوگ جن کے خلوصِ نیت پر اُسے دل سے اعتقاد تھا۔ آہ! اُن کی اصل حقیقت کس قدر رنج دہ تھی۔ اُس نے دیکھا کہ چاروں طرف سے بدی کی قوتیں اُمڈ اُمڈ کر نیکی کو مٹانے پر تلی ہوئی ہیں۔ اب اُسے اپنا ملک جسے وہ امن و اماں اور اپنے حسنِ انتظام کا نمونہ سمجھے ہوئے تھا۔ اصل شکل میں نظر آیا۔ اُس نے حتی المقدور ملک والوں کو ہدایت کی۔ لیکن وہ لوگوں کے دِل کیونکر بدل دیتا۔ دنیا بھر میں صرف گنتی کے چند انسان انسان کہلانے کے مستحق تھے۔ اور وہ بھی بدی کے ہاتھوں نالاں۔ اُس نے دنیا کے بیشتر حصّہ کو اسی رنگ میں ڈوبا ہوا پایا۔ اور اُس پر ایک عجیب مایوسی چھا گئی۔ اُس نے سینکڑوں میل دُور اُس مرجھائے ہوئے چہرے والی شکستہ دل عورت کو دیکھا جس کا شوہر لڑائی میں کام آ چکا تھا اور اس کے بے کس ننھے بچوں کی آہ و بکا بھی سُنی۔ وہ معصوم فاقوں پر فاقے کھینچ رہے تھے اور ان کے ننگے بدن سردی میں ٹھٹھر رہے تھے۔ وہ بدن جو پھول سے بھی زیادہ نازک تھے اور وہ غریب دنیا کی گوناگوں نعمتوں کو بھول کر صرف سوکھے ٹکڑوں کے لئے رو رہے تھے۔ قریب ہی وہ لوگ جن کی کبھی ختم نہ ہونے والی خواہشات پر دنیا بھر کی دولت قربان ہو رہی تھی عیش و عشرت میں ڈوبے ہوئے اپنے انجام سے بے خبر خوشیاں منا رہے تھے +

وہ بوڑھی عورت جس کا اکلوتا بیٹا اسکی تمام خوشیوں کا مرکز۔ اُسکے ٹوٹے ہوئے دل کی ڈھارس، اس خوفناک جنگ کی نذر ہو چکا تھا۔ اور جس کے انجام سے ابھی تک وہ بے خبر تھی اُسے ایک جھونپڑی کے دروازے میں کھڑی نظر آئی۔ وہ اپنے بیٹے کے انتظار میں تھی۔ اُسی بیٹے کے انتظار میں جس کی لاش اُس سے کوسوں دُور بے گور و کفن کھلے میدان میں پڑی تھی۔ وہ اُس سے ہمیشہ کے لئے بچھڑ چکا تھا لیکن اُس کا دل اِس قسم کے خیال سے بھی لرزتا تھا۔ اور وہ خلوصِ دل سے اُس کی سلامتی کی دُعائیں مانگ رہی تھی +

اور اُن نوجوانوں کے جذبات جو اپنی ماؤں اپنی بیویوں اپنے بہن بھائیوں اور بچوں سے دُور میدانِ جنگ میں دم توڑ رہے تھے کس قدر درد انگیز تھے۔ وہ لوگ جنہیں اُن کی ذراسی تکلیف پر اپنی تمام راحتیں قربان کر دینے میں ذرا دریغ نہ تھا۔ آج نزع کی حالت میں پانی کی ایک بُوند سے اُن کا حلق بھی تر نہ کر سکے +

ادھر تو یہ حالت تھی اور اُدھر اُن لوگوں کا رویہ کس قدر سنگدلانہ تھا جن کے لئے یہ سب قربانیاں ہو رہی تھیں +

اُس نے تخت و تاج اور جاہ و حشم پر ایک نفرت کی نگاہ ڈالی کیا اسی حقیر شے کے لئے انسان لڑ لڑ کر مرتا ہے اور ہزاروں بے گناہ بندگانِ خدا کا خون بہاتا ہے۔ آخر اس کا نتیجہ کیا ہے؟ بدی کو فروغ دینا زبردست کی طاقت کو بڑھانا اور عاجز و کمزور کو مصیبت میں ڈالنا!

اُس نے خیال کیا کہ میرے ملک میں بھی ایسے ہی واقعات گذر چکے ہیں۔ اور میں بھی لوگوں کے لئے اسی قدر رنج و تکلیف کا باعث ہوں۔ اگرچہ بذاتِ خود اُس نے کبھی کسی کو دُکھ نہیں پہنچایا تھا لیکن اُس پر عجیب خوف و ہراس طاری ہو گیا۔ اب وہ جدھر اپنے خیالات

کر رہے جاتا رہیں۔ اُس کے دل کی جراحت کا سامان موجود تھا۔ ہر طرف لوگ ایک دوسرے کو فریب اور دھوکے میں مبتلا کر رہے تھے۔ اُف! ظاہری محبت بناوٹی باتیں کتنی نفرت انگیز تھیں۔ اُن کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف کس قدر زہر پوشیدہ تھا۔ لیکن ہر شخص اپنی مقصد براری کے لئے دوسرے کو دھوکا دے رہا تھا۔ اپنی ذرا ذرا سی خواہشات کے لئے انسان انسان کے خون کا پیاسا تھا۔

ہر طرف نفسا نفسی کا شور بپا تھا۔ نہ کہیں سچی محبت تھی اور نہ رتی بھر ایثار۔

سیاہ راتوں کی مہیب تاریکی میں شقی القلب انسان اپنے دامن کو اور زیادہ گناہوں سے آلودہ کرنے کے لئے اپنے ہی بھائی بندوں کو لوٹ رہے تھے۔ نہ تو اُن کے دل میں رحم تھا نہ اپنے انجام کی پروا۔ اور وہ دل کھول کر سنگدلی کا ثبوت دے رہے تھے۔

اُس نے ظالم کی تیز تلواروں کی جھنکار اور مظلوموں کی آہ و فغاں سُنی اور اِس تمام شور و غل کے طوفان میں اُس کا دِل ہمیشہ کے لئے ڈوب گیا۔

ظاہری خوشامد کرنے والے اس کی تعریفوں میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتے۔ وہ سب کچھ سنتا اور نفرت سے اپنا مُنہ دوسری طرف پھیر لیتا۔ وہ دلوں کے پوشیدہ راز جانتا تھا۔ اب وہ کیونکر کسی کے فریب میں آتا۔

ہاں۔ اب وہ بُرے اور بھلے میں تمیز کر سکتا تھا۔ اُس کے دِل میں فقط عاجز دبے کس لوگوں کے لئے محبت تھی۔ اور سنگ دلوں کے لئے نفرت۔

وہ نہ تو اپنے آپ کو اور نہ کسی اور اپنے جیسے انسان کو تعریف کا مستحق سمجھتا۔ اُس کے خیال میں سب تعریف اُسی بزرگ و برتر ہستی کے لئے تھی جو ہزار پردوں میں نہاں ہونے کے باوجود عیاں تھی۔

وہ ایک خود مختار بادشاہ تھا۔ لیکن اب اُسے اپنی ہستی ایک ذرّہ ناچیز سے زیادہ معلوم نہ ہوئی۔ کبھی اُس کا خیال تھا کہ میں نے دنیا میں بہت کچھ کیا اور بہت کچھ کر سکتا ہوں۔ لیکن اب وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ اُس نے کچھ بھی نہیں کیا۔ اُس نے اپنا تمام مال و زر غریب اور محتاج لوگوں میں تقسیم کر دیا اور اُس کے خزانے اب خالی تھے۔ لیکن اُس کی نظر کے سامنے ابھی اس قدر حاجتمند موجود تھے کہ اگر ایسے ایسے بے شمار خزانے خالی کر دئے جاتے تو پھر بھی اُن کی حاجتیں پوری نہ ہو سکتی تھیں۔ اور وہ سب حالات سے باخبر ہونے کے باوجود معذور تھا۔ اب وہ دُنیا میں صرف اُس قیدی کی حیثیت سے تھا جو اپنی کال کوٹھری میں سلاخوں کی راہ سے باہر کا سب حال دیکھ سکتا ہو۔ اُس کا دل رنج و الم میں ڈوب چکا تھا۔ وہی دل جو کبھی قید غم سے آزاد تھا۔ اب اُس کے لئے ایک جہان کا غم تھا۔ دُنیا اُس کے لئے بیگانگی سے معمور تھی اور خود وہ تمام دُنیا سے بیگانہ۔ کوئی شخص دُنیا میں اُس کا ہم خیال نہ تھا۔ اور

نہ وہ خود دنیا میں کسی کا ہم خیال تھا ۔

حکومت اور تخت و تاج اُس سے چھن چکے تھے ۔ کیونکہ ظاہر بین نظروں میں اب وہ اس کا اہل نہیں تھا ۔ اُسے مجنون اور دیوانے کے نام سے یاد کیا جاتا ۔

لیکن خود اُس کی نظر کو اس قدر وسعت حاصل ہو چکی تھی کہ اُسے ان سب باتوں کی حقیقت بچوں کے کھیل سے زیادہ معلوم نہ ہوئی ۔

اب اس کے سامنے دنیا صرف ایک آزمائش گاہ تھی جہاں نیکی اور بدی کو یکجا چھوڑ دیا گیا تھا ۔ وہ اُس طالب علم کی طرح جو امتحان کے بعد بے صبری کے ساتھ نتیجہ کا منتظر ہو فیصلہ کے دن کا منتظر تھا ۔ اس علم کے حاصل کرنے سے پہلے اُس کا خیال تھا کہ جو شخص زندگی کی تلخ کامیوں سے گھبرا کر موت کی طرف رجوع کرے ۔ وہ دُنیا کا سب سے بزدل شخص ہے ۔ لیکن اب وہ خود موت کو ترستا تھا ۔ ہاں اب وہ امتحان دے چکا تھا اور جلد سے جلد نتیجہ دیکھنے کا متمنی تھا ۔ جس دن سے یہ عجیب و غریب علم اُسے حاصل ہؤا تھا نہ تو سوتے اور نہ جاگتے اُسے کبھی چین نصیب نہ ہؤا ۔ لیکن اب وہ اس علم کو بھول نہیں سکتا تھا اور نہ بھولنا چاہتا تھا ۔ وہ بار بار کیوں اپنے آپ کو فریب میں مبتلا کرتا جبکہ ایک دفعہ اُس کی آنکھوں کے سامنے سے پردہ اٹھ چکا تھا ۔ وہ دُنیا کے ناپاک شور و شر سے الگ ایک عافیت کی جگہ چاہتا تھا لیکن اُسے یقین تھا کہ اس دنیا میں کوئی ایسی جگہ موجود نہیں ۔ اُس کے لئے دُنیا میں ہر طرف مایوسی اور ناکامیاں ہی تھیں ۔ اور فرطِ یاس سے اُس کی زبان بند ہو چکی تھی مدت گزر گئی اور اُس نے کسی سے بات چیت نہ کی ۔ لوگوں کے خیالات اُس کی نسبت عجیب و غریب تھے لیکن وہ ان سب باتوں سے بے نیاز دُنیا کے ایک گوشے میں زندگی کے دن پورے کر رہا تھا ۔

ایک شب جبکہ وہ بے چینی کے ساتھ اپنے بستر پر کروٹیں بدل رہا تھا ۔ اُس پر ایک لطیف نیند طاری ہو گئی ۔ اور آج مُدتوں کے بعد اُس نے اچھا خواب دیکھا ۔

وہ دُشوار گذار سفر کے بعد ایک خوبصورت باغ میں داخل ہؤا ۔ جہاں ہر وقت بہار ہی بہار رہتی تھی ۔ اور جو خزاں کے خوف سے آزاد تھا ۔ خوشنما شگوفوں اور خوش رنگ پھولوں سے لدے ہوئے درخت عجیب کیف کے ساتھ جھوم رہے ۔ اور عجیب و غریب قسم کے خوبصورت پرند ایک انداز مسرت کے ساتھ چہچہا رہے ۔ باغ کی ساری زمین پر سبزے اور پھولوں کا فرش تھا ۔ اس باغ کی ہر چیز کو قدرت نے اس قدر حسن عطا کیا تھا ۔ کہ وہ دیکھ کر مبہوت و ششدر رہ گیا ۔ کئی لوگ اس سے پہلے یہاں موجود تھے ہر ایک نے سچی خوشی اور خلوصِ دل کے ساتھ اس کا خیر مقدم کیا ۔ اُن کے دل بے لوث محبت ۔ خلوص اور بے ریائی سے مملو تھے ۔ اور اُن کے

پاکیزہ دلوں میں دنیوی حرص وہوا کا نام ونشان نہ تھا۔ وہ اپنے مالک کی تعریف میں رطب اللسان تھے۔ اور اس جگہ بے انتہا مسرور تھے۔ ہر طرف مسرت ہی مسرت تھی۔ جیسے رنج وغم گناہ اور دیگر کثافتوں کو اس جگہ داخل ہونے کی اجازت ہی نہیں۔

اس باغ میں داخل ہوتے ہی اُس کی ساری کوفت دُور ہوگئی۔ اُس کا بے قرار دل اب مطمئن تھا۔ وہ دُنیا کے تمام افکار وآلام بھول گیا۔ اس وقت اس کے دل میں صرف ایک جذبہ تھا اور وہ اپنے مالک کی محبّت کا جذبہ تھا۔

وہ ایک بلند درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ جس کی شاخیں زمین پر جُھک جُھک کر اپنے مالکِ حقیقی کو سجدہ کر رہی تھیں۔ اور جس کے طیور بھی اُسی ذاتِ واحد کی تعریف میں نغمہ سنج تھے۔

اس وقت جو کیفیت اُس کے دِل پر طاری تھی آج سے پہلے وہ اُس سے آشنا ہی نہ تھا۔ اور وہ خوبصورت درخت کے سایہ میں بیٹھ کر اپنے پروردگار کی تعریف وتوصیف کے گیت گانے لگا۔

رات کی سیاہی غائب ہوچکی تھی۔ اور ہر طرف سپیدۂ سحر کا نور جلوہ گر تھا۔ شاید تمام دنیا کو ایک نئی زندگی مل رہی تھی۔ آفتابِ خاوری بھی آہستہ آہستہ اپنی آرام گاہ سے اُٹھا۔ اور اُفق سے اپنا نُور پاش چہرہ دکھا کر اپنی سنہری کرنوں کے نور سے ایک عالم کو منوّر کرنے لگا۔

تمام دُنیا بیدار ہوگئی۔ لیکن وہ جو موت کی پُرامن سرزمین میں داخل ہوچکا تھا پھر کبھی دُنیا کے شور وشر اور ہنگاموں کے درمیان اپنے بستر پر بیدار نہ ہُوا۔

ز۔ ب

پیمانِ الست

کیا ہے اپنے احسانوں کا ہم کو نغمہ خواں تو نے
دلِ بشکستہ اپنا لے لیا ہے ارمغاں تو نے

دلِ پروانہ خو ہے مضطرب قرباں ہونے کو
رُخِ روشن دکھا اے شمعِ تاباں کیوں نہاں تو نے

دکھا کر اک جھلک صبحِ ازل پنہاں وہ ہو جانا
قیامت خیز تھا مجھ سے لیا جو امتحاں تو نے

مثالِ ماہیِ بے آب دل رہتا ہے فرقت میں
گرا یا کیوں مجھے ساحل پہ بحرِ بے کراں تو نے

یہ کیسا سلسلہ تھا ہر بُنِ مُو جس نے باندھا ہے
محبّت کی مجھے پہنائیں بھاری بیڑیاں تو نے

(ح - ب)

خط کا مضمون اس طرح شروع ہوتا تھا:-

"ہر انسان خواہ وہ مرد ہو یا عورت کسی ایسی چیز کا مالک ہوتا ہے جو اُس کو نہایت ہی عزیز ہوتی ہے وہ اس کی ملکیت میں اور کسی شخص کی شرکت گوارا نہیں کر سکتا کہ مبادا اُس کی قدر و قیمت کم ہو جائے۔ میرے پاس بھی ایک ایسی ہی چیز ہے اور وہ میرا غم ہے میں کسی کو اپنا شریک غم بنانا نہیں چاہتی، میرے پاس اور کوئی ایسی چیز نہیں جس کی ملکیت اس قدر صحیح طور پر میری ذات خاص سے وابستہ ہو کہ میں کبھی ایک لمحہ کے لئے اُس کی جدائی گوارا نہ کر سکوں۔ اُسے دیوانہ وار چاہوں اور اپنے نہاں خانۂ دل کے عمیق ترین گوشوں میں چھپائے رکھوں۔ لیکن وہ وقت آنیوالا ہے جب میں نہ رہوں گی۔ اس وقت سے پہلے میں اپنی اس امانت کو جو مجھے جان سے بھی عزیز ہے تمہارے سپرد کر دینا چاہتی ہوں۔ میں کسی اور کو اس کا حامل نہیں بنا سکتی۔ خدا نے اپنے ہاتھوں سے میرے دل کو اس امانت کا گنجینہ دار بنایا اور کوئی دوسرا متنفس اس راز سے واقف نہ ہو سکا۔ میں نے آج تک اس امانت میں خیانت نہیں کی۔ میں غم کی اس متاع عزیز کو ہنسی کے پردے میں اس طرح چھپائے رکھتی ہوں جس طرح سبز گھاس زمین کے اندرونی خزانوں کو ڈھانپے رہتی ہے۔ تم نے بھی جب کبھی میرے چہرہ کو دیکھا اُس پر ہنسی کی نقاب پڑی ہوتی، اس لئے ممکن ہے کہ تمہیں اس افسوؤں کی کہانی کا یقین نہ آئے۔

بچہ جب اس دنیا میں آتا ہے مسرت و شادمانی اُس کا خیر مقدم کرتی ہے لیکن میں جس دنیا میں پیدا ہوئی اس میں میرے خیر مقدم کا کوئی بھی سامان نہ ہوا۔ وہ ایک متنفس جس نے مجھے اپنی آغوش میں لیا۔ اُس کی آنکھوں میں بھی آنسو بھرے ہوئے تھے۔ میری دنیا میری ماں کی گود تھی اور اُسی کی محبت کا رشتہ تھا جو مجھے اس دُنیا سے وابستہ کئے ہوئے تھا۔ بچہ کی دنیا ہوا خواہوں اور دوستوں سے بھری ہوتی ہے۔ کوئی خون کے جوش سے مجبور ہو کر آتا ہے اور کسی کو دل کا تعلق کھینچ لاتا ہے۔ دنیا بچہ کی درم ناخریدہ غلام ہوتی ہے اُس شخص سے زیادہ بدبخت کوئی نہیں ہوتا جس پر بچہ کی چھوٹی چھوٹی نرم و نازک اُنگلیاں حکمرانی نہ کرتی ہوں لیکن میرے پیدا ہوتے ہی دُنیا نے اپنے سالخوردہ چہرہ پر بل ڈال لئے مجھے مطلق علم نہ ہوا کہ خون کے تعلق نے مجھے کس سے وابستہ کر رکھا ہے۔ اور جذب محبت بھی کسی کو میرے پاس نہ لایا۔

میرے دل پر بچپن کی یاد کے نہایت مبہم اور دھندلے سے نقوش باقی ہیں۔ بچپن کے کسی رنج کی یاد یا اُس زمانے کے واقعات جو ان نقوش کو آب و رنگ دیکر زیادہ نمایاں اور روشن کر دیں میرے ذہن سے بالکل اُتر چکے ہیں۔ اُس زمانے کی یاد میری چشم تصویر کے سامنے صرف ایک تصویر کھینچ لاتی ہے اور وہ میری ماں کی صورت ہے۔

میری لوح زندگی کا وہ سب سے پہلا نقش جو کچھ زیادہ روشن اور نمایاں ہے بجز گریہ و اشک کے اور کچھ نہیں میں اپنی ماں کے گلے سے چمٹی ہوئی تھی میرا سر اُس کے کندھے پر تھا اور روتے روتے میری ہچکی بندھ گئی تھی۔ اُس کی آنکھوں سے بھی آنسو رواں تھے۔ اور اُس کا اشک آلودہ چہرہ شبنم میں ڈوبے ہوئے کنول کے سفید پھول کی طرح معلوم ہوتا تھا۔ میری ماں کے قریب ایک معمر شخص کھڑا تھا لمبے لمبے بال جو سمندر کے جھاگ کی طرح سفید تھے اُس کے شریفانہ چہرہ کے گرد ہالہ کھینچے ہوئے تھے میری ماں اُس سے کہہ رہی تھی "میں اس بدقسمت

بچی کو آپ کے حوالے کرتی ہوں۔ آہ میں کس قدر بدنصیب ماں ہوں کہ کسی صورت میں اپنی بچی کو اپنے پاس نہیں رکھ سکتی۔ بڈھے آدمی نے مجھے لینے کے لئے اپنے ہاتھ پھیلائے۔ میں اپنی ماں کے ساتھ زیادہ زور سے چمٹ گئی۔ اُس کی آنکھیں آنسوؤں کی بارش سے میرے بالوں کو تر کرنے لگیں۔ میں اس سے پہلے تمہیں بتا چکی ہوں کہ اس وقت میری دُنیا میری ماں کی آغوش تھی۔ مجھے یوں معلوم ہوتا تھا کہ دنیا رو رو کر مجھ سے رخصت ہو رہی ہے۔ بڈھے آدمی کے ہاتھ مجھے پھسلانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ میں اُس کو مشتبہ نظروں سے دیکھتی تھی۔ کمسنی کے تقاضے سے میں یہ تو اچھی طرح نہ سمجھ سکتی تھی کہ کیا ہو رہا ہے لیکن اپنی ماں کے آنسوؤں کو دیکھ کر مجھے کسی خوفناک انجام کا آغاز نظر آ رہا تھا۔ مجھے یاد نہیں کہ آہ و فغاں اور اشک باری کا یہ سلسلہ کب تک رہا لیکن اتنا یاد ہے کہ بالآخر جب بڈھے آدمی کے سخت گیر ہاتھوں نے مجھے میری ماں کی گود سے چھین لیا رات کی تاریکی پھیل چکی تھی اور ہر طرف خاموشی چھا رہی تھی۔ میری ماں بہ سرعت تمام دروازہ کی طرف لپکی۔ اس سے قبل کہ اُس کے پائے ثبات میں لغزش آتی یا اُس کا عزم متزلزل ہوتا وہ مجھ سے جُدا ہو جانا چاہتی تھی۔ دروازہ پر پہنچ کر اس نے مجھ پر ایک نگاہِ واپسیں ڈالی اور چند مجہول الصوت دعائیہ الفاظ کہے۔ اس کے بعد وہ ہمیشہ کے لئے میری آنکھوں سے اوجھل ہو گئی ۔

اُس دن میں نے اپنی ماں کو آخری دفعہ دیکھا۔ مجھے مطلق علم نہیں۔ کہ وہ کون تھی۔ اُس کے آخری الفاظ میں بالکل بھول چکی ہوں ہاں وہ آنسو مجھے یاد ہیں جو رخصت کے وقت جب اُس نے میرے مُنہ پر بوسوں کا تار باندھ رکھا تھا میرے بالوں کو تر کر رہے تھے۔ دنیا بھر میں وہ ایک متنفس جس پر مجھے کسی قسم کا دعوٰے ہو سکتا تھا میری ماں تھی۔ اور وہ ایک چیز جو اُس کی طرف سے مجھے ترکہ میں ملی اُس کے آنسو تھے۔ اسی گنج گراں مایہ کو میں اپنی زندگی کا سرمایہ سمجھی اور زمانہ اس میں آج تک پیہم اضافہ کرتا رہا ہے ۔

میں ایک محبت بھرا دل لیکر پیدا ہوئی تھی لیکن اس ستارہ کی طرح جو طلوعِ آفتاب کے وقت نظروں سے غائب ہو جاتا ہے میں نے اُسی کو اپنی صبحِ زندگی میں کھو دیا جس سے میں قدرتی طور پر محبت کر سکتی تھی۔ میں سمجھ گئی کہ زندگی میں میرے لئے آنسو مقدر ہو چکے ہیں۔ محبت کا لُطف اور مسرت کے قہقہے میری قسمت میں نہیں۔ لیکن میں نے قدرت کے اس فیصلے کو بہت بُرا مانا میں اپنے خالق سے روگرداں ہو گئی اور میں نے اس کے فیصلہ کے خلاف جہاد کا عزم کر لیا۔ اُس دن کے بعد جب میرا سنگیں مزاج محسن مجھے میری ماں کی آغوش سے چھین کر اپنے گھر لایا میں نے آنسوؤں کو اپنی آنکھوں سے رخصت کر دیا ۔

اس نئی قیامگاہ میں پہلے چند دنوں تک میں بالکل چُپ سادھے رہی میں اُس بستر سے نہ اُٹھتی تھی جس پر اپنی ماں کی آغوش سے جُدا ہونے کے بعد میں نے پناہ لی تھی۔ میں نے کھانا پینا چھوڑ دیا۔ بڈھا آدمی میرے اس طرزِ عمل کو صبر و تحمل سے برداشت کرتا تھا۔ وہ مجھے اپنے ہاتھ سے کھانا کھلانے کے لئے آتا لیکن میں طیش میں آ کر اُس کا ہاتھ پرے ہٹا دیتی اور اپنا مُنہ نہ کھولتی۔ میں اپنے ہونٹ اپنے دانتوں میں زور سے دبا لیتی کہ مبادا وہ میری خواہش کے خلاف کھُل جائیں۔ وہ میرا کھانا لئے پہروں انتظار کیا کرتا۔ یہاں تک کہ بعض اوقات شام ہو جاتی وہ خود بھی اس خیال سے دن بھر بھوکا رہتا کہ جو بچی اُس کی حفاظت میں دی گئی ہے اُس نے کچھ نہیں کھایا ۔

اپنی خُردسال مہمان کی رضاجوئی کے لئے اس نے اپنی تمام کوششیں صرف کردیں۔ رفتہ رفتہ میرا کمرہ کھلونوں کی ایک دُکان کی صورت اختیار کرنے لگا۔ باغ کی تمام دولت میرے لئے لوٹ لی گئی۔ میں ہر وقت چھوٹے چھوٹے لڑکوں اور لڑکیوں سے گھری رہتی۔ شریف النفس بُڈھا میرا دل بہلانے کے لئے انہیں لالچ دے دے کر بلاتا۔ مجھے کبھی کسی رفیق کی صحبت میسر نہ ہوئی تھی اس لئے مَیں نے پُراضطراب دل کے ساتھ ان کا خیر مقدم کیا۔ اب میرے محسن کو اطمینان نصیب ہُوا تبسّم پھر میرے لبوں پر کھیلنے لگا۔

رفتہ رفتہ وہ سنسان اور بُرا نا مکان مجھے اپنا گھر معلوم ہونے لگا۔ اب میں بُڈھے آدمی کو دادا جان کہہ کر پکارنے لگی۔ وہ مجھے سندرا کہتا تھا۔ مجھے اپنا یہی ایک نام یاد ہے۔

جب میں ذرا بڑی ہوئی دادا جان نے مجھے شِو دیوتا کی پرستش کا طریقہ سکھایا۔ میری روح کو اس میں انتہائی مسرت حاصل ہوتی تھی۔ دادا جان نے مجھے بتایا کہ دیوتا کے سامنے ہم اپنی دلی تمناؤں کا اظہار کرسکتے ہیں۔ وہ ہر بات پر قادر ہے۔ وہ بڑے سے بڑے رنج کو راحت سے بدل سکتا ہے۔ مَیں نے دادا جان کی باتوں پر مضطربانہ شوق کے ساتھ اعتبار کیا۔ ہر شام اپنا سر نیاز خم کئے ہوئے میں دیوتا کے سامنے اپنے دل کے تمام جذبات کا اظہار کیا کرتی۔ لیکن میں نے کبھی کسی انسان کو اپنے دل کی کیفیات سے واقف ہونے کا موقع نہ دیا میں لوگوں کو اس قابل نہ سمجھتی تھی۔ وہ صرف میرے تبسم سے آشنا تھے لیکن آنسوؤں کے اُس دریا کا حال جسے میں اپنا دل کہتی ہوں صرف میرے معبود کو معلوم تھا۔

میں دادا جان کے گھر میں ناز ونعمت سے پرورش پا رہی تھی لیکن اس کے باوجود میں اس حقیقت کو فراموش نہ کرسکتی تھی کہ مجھ میں اور دوسرے بچوں میں ایک بہت بڑا فرق ہے۔ کمسنی کے دنوں میں جب میں خود اپنا کام کرنے سے معذور تھی دادا جان مجھے اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاتے اور اپنے ہاتھ سے نہلاتے لیکن اس کے باوجود عبادت سے پہلے اگر کبھی میں اُن سے چھو جاتی تو کڑکتے جاڑوں میں بھی وہ طہارت کے لئے دوبارہ غسل کرلیا کرتے۔ وہ اپنے اس طرز عمل کو مجھ سے چھپانے کی کوشش کرتے تھے کہ مبادا میری خودداری کو صدمہ پہنچے لیکن مجھے جس کو زندگی کے تلخ تجربوں نے اس حُسنِ ظن سے محروم کردیا تھا جو محبت ہر بچہ کے دل میں پیدا کردیتی ہے فریب دینا محال تھا جب کبھی میں انہیں دیکھ [illegible] وہ مجھ سے آنکھیں چُراتے اور کترا کر نکل جاتے کہ کہیں ان کے اس طرز عمل کے متعلق میں اُن سے کوئی سوال نہ کر بیٹھوں لیکن مجھ بدنصیب کو انسان سے کسی قسم کا گلہ کرنے کا کیا حق حاصل تھا۔ میں اپنا دُکھڑا اُس کے سامنے روتی تھی جس نے مجھے پیدا کیا۔ دادا جان کے سامنے میں ہمیشہ ہنستی کھیلتی رہتی، اور انہیں مطلق اس بات کا علم نہ ہونے دیتی کہ میں کسی بات سے واقف ہوں۔ میرے متعلق لوگ ان سے مختلف قسم کے سوال کیا کرتے تھے۔ لیکن اُنہوں نے میری موجودگی میں کبھی اس قسم کے سوالات کا جواب نہ دیا۔ میں خود دادا جان کو اس کشمکش سے نجات دلانے کے لئے لوگوں کو جواب دے دیا کرتی کہ میں اُن کی مُنہ بولی پوتی ہوں۔

عمر کے تقاضے سے دادا جان روز بروز ضعیف ہو رہے تھے۔ وقت جاتے نظر نہیں آتا۔ مہینے اور سال آنکھوں میں گزر گئے آخر ایک دن مجھے بتایا گیا کہ ہم مادھب پور جا رہے ہیں۔ دادا جان کی خواہش تھی کہ وہ اپنے وطن کو اپنا آخری مسکن بنائیں چنانچہ ہم اس سُرخ عمارت میں پہنچے۔ باغ میں درخت برگ و بار سے لدے ہوئے تھے اور موسم بہار کی آمد آمد کا پیغام دے رہے تھے۔ ہمارا مکان بالکل غیر آباد اور سنسان تھا۔ میں نے سنا ہے کہ کسی زمانے میں یہاں بہت پُر رونق محفلیں ہوا کرتی تھیں لیکن اب وہ باتیں خواب و خیال ہو چکی تھیں۔ ہاں پوجا کے وقت شوجی کے مندر میں خوب چہل پہل ہو جایا کرتی تھی +

دادا جان ایک زمانے میں امیر کبیر تھے۔ آرام و آسائش کے تمام سامان میسر تھے۔ خدا نے اولاد بھی دے رکھی تھی لیکن دولت ڈھلتی پھرتی چھاؤں ہے جس طرح اس نے دغا کی اسی طرح اولاد بھی ایک ایک کر کے اس دار ناپائدار سے رخصت ہوئی۔ ہاں ایک پوتا تھا جو اجل کی دستبرد سے بچ گیا لیکن شدت الم میں دادا جان نے نہ صرف اپنے وطن کو خیرباد کہی بلکہ اپنے پوتے سے بھی علیحدگی اختیار کرلی + وہ دُنیا سے اپنے تمام تعلقات منقطع کر لینا چاہتے تھے کیونکہ اس دار فنا میں کسی چیز کو قرار نہیں لیکن اپنی عمر کے آخری ایام گزارنے کے لئے اُنہوں نے اپنے اسی پرانے ویران گھر کو منتخب کیا وہ کہا کرتے تھے کہ اسی مقام پر مجھ سے میری زندگی کے کئی رفیق بچھڑ چکے ہیں موت کے بعد میں اُن سے جُدا نہیں رہوں گا بس چاہتا ہوں کہ مرنے کے بعد میری خاک اُنہیں کی خاک میں مل جائے +

اسی جگہ میں تم سے پہلے پہل ملی اور میرے دل کا ظلمت کدہ تمہاری صورت دیکھتے ہی منور ہو گیا۔ اس بات کو آج ایک زمانہ گزر چکا ہے۔ شاید وہ دن تمہیں یاد نہ رہا ہو +

میرا خیال ہے کہ جب یہ سیڑھیاں جن سے اُتر کر ہم دریا کی طرف جاتے ہیں بنی ہونگی، دریا تمہارے مکان کے قریب بہتا ہوگا۔ اور پانی کی لہریں آکر دیواروں کے ساتھ ٹکراتی ہونگی۔ اب دریا کا رُخ کچھ بدل چکا ہے۔ اور دریا تک پہنچنے کے لئے زینہ سے اُتر کر کچھ فاصلہ طے کرنا پڑتا ہے برگد کا ایک بہت بڑا اور پرانا درخت معلوم نہیں کب سے یہاں کھڑا سامنے گہرے نیلے رنگ کے پانی میں اپنا عکس دیکھ رہا ہے۔ پانی کی رَو اُس کی جڑوں پر سے مٹی بہا کر لے گئی ہے۔ اس درخت کے نیچے دو بڑے بڑے پتھر رکھے ہیں۔ اب یہ جگہ گاؤں والوں کے نہانے کا گھاٹ بن چکی ہے مجھے یاد ہے کہ اُس دن صبح کے وقت میں گھر سے نکل کر ان پتھروں میں سے ایک پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ابھی آفتاب نمودار نہ ہوا تھا۔ دریا خاموش میرے سامنے بہ رہا تھا۔ پرندے صبح کے خیر مقدم کے لئے چہچہا رہے تھے۔ ان کے شیریں نغموں نے فضا میں ایک گونج پیدا کر رکھی تھی اور میں اپنی قسمت کو رو رہی تھی۔ مجھے علم نہ تھا کہ دُنیا میں میرا کوئی عزیز زندہ موجود ہے یا نہیں اور وہ جس کی آغوش میں کارفرمایان قضا نے مجھے پناہ دے رکھی تھی اپنی زندگی کے آخری دن گزار رہا تھا۔ اُس وقت میں نے کسی کے پاؤں کی آہٹ سنی اور میری نظر اُوپر کی طرف اُٹھی۔ تم خراماں خراماں دریا کی طرف جا رہے تھے۔ اس وقت آفتاب دریچۂ مشرق سے جھانکا لیکن تمہاری صورت کو دیکھتے ہی میرے دل میں ایک اَور

آفتاب کی نمود ہوئی جو دُنیا کے آفتاب سے کہیں زیادہ روشن اور کہیں زیادہ منور تھا ۔ صبح کی پیاری پیاری روشنی میں ہم دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا، یہ لمحہ میری زندگی کا سب سے زیادہ مبارک اور اُس کے ساتھ ہی سب سے زیادہ نامبارک لمحہ تھا ۔

اِنسان کا دل فطرتًا محبت کا خوگر ہے پھر کیا تعجب ہے جو مَیں نے تمہیں اور تم نے مجھے اپنی رفاقت کے لئے منتخب کر لیا میرا مجازی تبسم اس زمانے میں حقیقی بن گیا اور جب تک مجھے تمہاری رفاقت میسر رہی ہیں نے اندوہ والم کو اپنے دل سے رخصت کئے رکھا ۔ اِن دنوں مجھے تمام دُنیا نورِ مسرت سے منور نظر آتی تھی ۔ آہ وہ دن کس طرح گذر گئے یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ زمانہ ایک خواب تھا جو دن کی تمنا اور ناگوار روشنی کی تاب نہ لا سکا اور معدوم ہو گیا ۔ ہاں اس زمانہ کی یاد عالم خواب کی کسی پری کے اُس سنہرے پر کی طرح جو اس کے پھڑپھڑاتے بازوؤں سے جھڑ گیا ہو چشم تصوّر کے لئے ابھی تک باقی ہے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ میں انہیں چند دنوں میں اپنی عمر بھر کی سیاہ بختیوں کی تلافی کر لینا چاہتی تھی ۔ میرا سازِ حیات اِن دنوں مسرت و ابتہاج کے بلند اور رُوح پرور نغموں کا گہوارہ بن رہا تھا لیکن شاید اپنے جذبۂ شوق سے بے اختیار ہو کر مَیں نے اس ساز کو اس زور سے چھیڑا کہ ایک دن اس کا تار ٹوٹ گیا ۔ اُس دن سے یہ ساز خاموش پڑا ہے ۔

انہیں دنوں میں جب ہماری زندگی کا ہر لمحہ کیف مسرت سے لبریز رہتا تھا ہمارے گھر میں موت کا پیام بر داخل ہوا دادا جان دفعتًہ علیل ہو کر بستر مرگ پر لیٹے ۔ میرا تمام دن تو ہنسی خوشی میں گزر جاتا تھا لیکن صبح اور شام دو دفعہ مَیں اُن کے کمرہ میں جاتی اور اُن کے پاس بیٹھا کرتی تھی ۔ وہ میری طرف رحم اور محبت کی نظروں سے دیکھتے اور بہ غایت شفقت اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے میرے بالوں کو سلجھاتے ۔ مجھے معلوم تھا کہ اُن کا دل میرے لئے متفکر ہے ۔ وہ سوچتے تھے کہ جس لاوارث لڑکی کو انہوں نے اتنے عرصہ تک اپنے پاس پناہ دے رکھی اب بے سروسامانی اور کس مپرسی کی حالت میں رہ جائیگی ۔ یہ روح فرسا فکر اُن کی موت کو روز بروز قریب تر لا رہی تھی محبت اور شرافت میں اُن کی مثال مشکل سے مل سکتی ہے لیکن اس کے باوجود مجھ سے چھونے کے بعد انہیں طہارت کے لئے نہانا پڑتا تھا، پھر مجھے کسی اور سے کیا توقع ہو سکتی ہے ؟

لیکن یہ خیالات بعد میں پیدا ہوئے اُن دنوں اس قسم کے دردانگیز افکار کے لئے میرے دل میں گنجائش ہی نہ تھی ۔ دادا جان کبھی کبھی مجھ سے کچھ کہنے کی کوشش کرتے لیکن کہہ نہ سکتے تھے ۔ انہوں نے مجھ سے ہزاروں مروتیں کی تھیں اور اب وہ مجھ سے ایک مروت کے خواستگار معلوم ہوتے تھے لیکن مَیں نے یہ معلوم کرنے کی کوشش بھی نہ کی کہ وہ مروت کیا ہے ۔ اس زمانہ میں ایک سال خوردہ بوڑھے کی اشک آلود آنکھوں کی زبان سمجھنے کے لئے میرے پاس وقت موجود نہ تھا ۔

تمہاری سیاہ اور روشن آنکھیں ہر صبح مجھے ایک نئی داستان سناتی تھیں اور میری آنکھیں بجز اس کے اور کچھ نہ چاہتی تھیں ۔ بس میں متبسم چہرہ کے ساتھ جلد جلد چند الفاظ کہہ کر دادا جان کے کمرے سے چلی آتی ۔ ایک ٹوٹے ہوئے دل کی بے شمار آہیں میرا تعاقب کرتیں لیکن میں اِن باتوں پر توجہ صرف نہ کر سکتی تھی ۔ یہ باتیں سمجھنے کا موقع تو مجھے اب ملا ہے ۔

تمہیں وہ دن یاد ہے جب ہم دونوں نے دریا کے کنارے گھاس کے فرش پر بیٹھ کر کنول کے پھولوں کا ایک بہت بڑا ہار تیار کیا تھا؛ ہار کے دھاگے کا ایک سرا تمہارے ہاتھ میں تھا اور دوسرا میرے ہاتھ میں اور ہم دونوں ایک ساتھ پھول پرو رہے تھے۔ اُس ہار کے درمیان ایک بہت بڑا اور تازہ کنول کا پھول تھا۔ دادا جان کو کنول کے پھولوں سے خاص وابستگی تھی اس لئے میں وہ ہار اٹھا کر اُن کے پاس لے گئی میں نے چلا کر کہا "دادا جان دیکھئے کتنا خوبصورت ہار ہے جب میں اسے پہنتی ہوں تو یہ میرے قدموں تک پہنچ جاتا ہے"۔ اُنہوں نے جواب دیا "ہاں سنندا تم تو پھولوں سے اس قدر لد گئی ہو کہ تم پر سرستی دیبی کا گمان ہوتا ہے۔ تمہیں یہ ہار کس نے دیا ہے ؟

میں نے تمہارا نام لیا! اس وقت ان کے زرد چہرہ کا رنگ اور زیادہ زرد ہو گیا پھر اُنہوں نے کہا "سنندا تم تمام دن ہنسی اور کھیل میں گزار دیتی ہو، لیکن یاد رکھو کہ زندگی میں ہنسی کے ساتھ آنسو بھی ہیں۔ انسان کو دونوں کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ ورنہ رنج زیادہ اذیت کا باعث ہوتا ہے خدا کرے رنج تمہاری قسمت میں نہ ہو لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ پردۂ غیب میں کیا ہے ؟

میں نے ہار دیوار کے ساتھ لٹکا دیا اور خاموش باہر چلی آئی ہمارے مسرت افزا قہقہوں نے دادا جان کے کمرے میں بھی پہنچ کر اپنی داستان کہہ دی تھی لیکن وہاں ان قہقہوں کو جواب میں بجز حسرت و یاس کے اور کچھ نہ ملا۔

میں نے وہ تمام دن خاموشی اور تنہائی میں گزارا میرے سر پر کسی آنے والی مصیبت کا تاریک بادل چھا گیا، لیکن میں نہ جانتی تھی کہ یہ مصیبت کس صورت میں آئے گی۔ مجھے بوڑھے دادا نے آنسوؤں کے لئے تیار رہنے کی نصیحت کی تھی مگر کیوں ؟ مجھے خیال آیا کہ شاید تم نے میرے خلاف اُن سے کچھ کہا ہو لیکن یہ خیال میرے دل میں نہ ٹھہر سکا میں نے تمہیں کبھی کوئی تکلیف نہ پہنچائی تھی۔ پھر میں نے سوچا کہ شاید میری ماں کا انتقال ہو گیا ہو شاید دادا جان مجھے اس کی موت کی خبر سنانے کے لئے تیار کر رہے ہیں۔ جب میں نے اُسے آخری دفعہ دیکھا تھا اس وقت میں بالکل ایک نادان بچی تھی میں اپنے تصور کی آنکھوں کے سامنے اس کے اشک بھرے چہرہ کی تصویر کھینچتی لیکن میری آنکھیں خشک رہتیں میں ایک ایسی ماں کے لئے کس طرح رو سکتی تھی جس نے مجھ سے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ گلی میں بھیک مانگنے والے گدا بھی اپنے بچوں کو اپنی شفقت سے محروم نہیں کرتے لیکن میری ماں سے یہ بھی نہ ہو سکا۔ میں نے اپنا دل سخت بنا لیا۔ مجھے کیا ضرورت تھی کہ کسی کے لئے روتی یا کڑھتی۔

با ایں ہمہ اسی دن سے خوشی نے میرے دل کو چھوڑ دیا اور سستی اور افسردگی نے مجھ پر قابو پا لیا میں نے گھر سے باہر جانا ترک کر دیا میں اپنے وقت کو فضول اور بے سود کاموں میں گزار دیا کرتی تم میرے اس طرز عمل سے پریشان نظر آتے تھے، اور مجھ سے اس کا سبب دریافت کرتے تھے لیکن میں ہنس کر ٹال دیتی تھی۔

اسی طرح کچھ دن گزرے۔ آخر ایک دن صبح کے وقت تم دادا جان کے کمرہ میں داخل ہوئے اور بہت دیر تک بیٹھے رہے مجھے معلوم نہیں کہ تم نے آپس میں کیا گفتگو کی، لیکن یہ خوب یاد ہے کہ جس وقت تم باہر نکلے اُسی وقت میں اندر بلائی گئی جب میں کمرہ میں داخل ہوئی دادا جان نے مجھ سے کہا "میری پیاری بچی میری عمر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے، لیکن اس سے قبل کہ میں اس دنیا سے رخصت ہوں میں تم سے اور شنکر سے

کچھ کہنا چاہتا ہوں اسے میں سب کچھ سمجھا چکا ہوں۔ اس کے علاوہ وہ مرد ہے اور اپنی حفاظت خود کرسکتا ہے لیکن پیاری سنند! مجھے تمہارا زیادہ خیال ہے۔
اس کے بعد کچھ عرصے کے لئے وہ خاموش ہوگئے اور بغور میرے چہرہ کی طرف دیکھنے لگے۔

میرا دل دھڑک رہا تھا۔ کچھ دیر کے بعد اُنہوں نے پھر سلسلۂ کلام جاری کیا اور کہا "سنند! شاید تمہیں معلوم نہ ہو کہ مجھے تم سے کس قدر محبت ہے، مجھے تم میرے پوتے شنکر کی طرح عزیز ہو۔ جب میں نے یہ گھر چھوڑا تھا، میں نے اپنے دل سے عہد کرلیا تھا کہ آئندہ اس دنیا سے تمام تعلقات منقطع کرلوں گا۔ محبت سرچشمۂ رنج والم ہے آئندہ اس دُنیا میں کسی سے محبت نہ کروں گا لیکن تمہاری پیاری صورت دیکھتے ہی میرا یہ عہد ٹوٹ گیا۔ انسان کا دل کبھی دیر تک خالی نہیں رہ سکتا۔ کوئی نہ کوئی چپکے سے اس میں اپنے لئے راہ نکال لیتا ہے اور اس میں داخل ہوکر اس پر حکمرانی کرنے لگتا ہے۔ قدرت کا قانون یہی ہے۔ پس تم میرے دل کی ننھی ملکہ بنیں۔ شنکر اُن دنوں اپنے ننھیال میں تھا، میں نے خود اسے وہاں چھوڑ دیا تھا کیونکہ میں اب کسی سے دل نہ لگانا چاہتا تھا لیکن محبت کا دام دنیا میں چپہ چپہ پر بچھا ہوا ہے میں اس سے کس طرح بچ سکتا تھا جس محبت اور چاہ سے میں نے تمہیں پالا ہے اس سے تم واقف ہو۔ تمہیں رنج والم اور گناہ سے بچانے کے لئے جہاں تک مجھ سے ہوسکا میں نے کوشش کی لیکن آہ قسمت کسی کے بس کی نہیں۔ تقدیر میں یہی لکھا تھا کہ دُنیا میں سب سے پہلا رنج تمہیں مجھی سے پہنچے۔ میں یہ بات ظاہر نہ کرنا چاہتا تھا لیکن بجز اس کے چارہ بھی نہیں۔

میں خاموش بیٹھی سنتی رہی، میرا دل بیٹھا جارہا تھا۔ جو کچھ میں نے سُنا اس سے مجھ پر خوف وہراس چھا گیا۔ میں نہ جانتی تھی گناہ کیا ہے لیکن اتنا میں جان گئی کہ میری پیدائش ایک گناہ کا نتیجہ ہے۔ اب میں سمجھی کہ کیوں میری ماں مجھ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہوگئی۔ وہ پشیمان تھی اور مجھے گناہ سے بچانا چاہتی تھی اس نے مجھے اس خیال سے اس پاک منش انسان کے سپرد کیا تھا کہ شاید اس کی پارسائی میرے سراپا معصیت وجود کو اس ابدی لعنت سے پاک کرسکے جو ازل سے میرے لئے مقدر ہوچکی تھی لیکن میرا وجود ہی ایک گناہ تھا۔ میں کس طرح پاک ہوسکتی تھی؟ کہیں کوئلہ بھی دھونے سے سفید ہوا ہے؟

دادا جان نے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا "میں نے تم سے بہت محبت کی ہے میں تمہیں اپنی اولاد کی طرح سمجھتا ہوں مگر انسان خطاؤں کا پتلا ہے۔ ممکن ہے میرے طرزِ عمل سے تمہیں بعض دفعہ رنج پہنچا ہو۔ پھر بھی میں تم سے ہمیشہ اپنی اولاد کی طرح محبت کرتا رہا ہوں اور آج جبکہ میں اس دنیا سے رخصت ہو رہا ہوں تم سے صرف ایک عنایت کی التجا کرتا ہوں۔ شاید تمہیں معلوم نہ ہو لیکن مجھے مدت سے معلوم ہے کہ تم شنکر کی آنکھوں کا تارا ہو۔ میری پیاری بچی آج اس نے میرے سامنے اس بات کا اقرار بھی کرلیا ہے میں یہ جانتا ہوں کہ تمہارا دل گنگا کے پانی کی طرح بے لوث ہے لیکن دنیا کا رسم ورواج اسے نہیں مانتا۔ دُنیا کے قانون کے مطابق تمہاری حیثیت ایک اچھوت کی سی ہے میری پیاری بچی میرے سفید بالوں پر ہاتھ رکھ کر مجھ سے وعدہ کرو کہ تمہارا وجود شنکر کو اس کے ہم چشموں میں ذلیل کرنے کا باعث نہ ہوگا۔ اور تم میرے خاندان کے اس آخری فرد کو اس کی شان کے شایاں عزت وآبرو کی زندگی بسر کرنے دوگی۔ اگر تم اُس سے سنگدلی اور بے رُخی

سے ساتھ پیش آؤگی، تو وہ بھی تمہاری یاد کو اپنے دل سے محو کردے گا۔ بے اعتنائی رفتہ رفتہ محبت کو مٹا دیتی ہے۔ یہی انسان کی فطرت کا تقاضا ہے۔ میرے بعد تم آرام و اطمینان سے زندگی بسر کرسکو گی کیونکہ میری جائداد کی وارث تمہیں ہوگی "۔

جائداد کا ذکر سن کر مجھے یوں محسوس ہوا گویا کسی نے میرے جسم میں سینکڑوں سوئیاں چبھودی ہیں لیکن میں نے دادا جان کی خواہش کے مطابق بے چون و چرا وہ حلف اُٹھا لیا۔ اُس وقت مجھے محسوس ہوا کہ میں نے کتنی بڑی ذمہ داری اُٹھالی ہے۔

اس کے بعد میں کمرے سے باہر چلی آئی مگر اس تھوڑے سے عرصہ میں ایک عظیم الشان تغیر رونما ہو چکا تھا چند لمحے قبل ایک لڑکی اس کمرہ میں داخل ہوئی تھی، مگر اس گفتگو کے بعد ایک عورت باہر نکلی۔ مجھے اس وقت محسوس ہوا کہ میں اپنا سب کچھ تم پر نثار کر چکی ہوں۔ دُنیا کی کوئی چیز مجھے تم سے زیادہ عزیز نہ تھی اور اس لئے میں تمہیں بھول جانا چاہتی تھی لیکن دل کس کے اختیار میں ہے؟ تم مسرت کے دنوں میں تو میرے ایک رفیق تھے لیکن ان ایام غم میں میرے دل کی دنیا کے تنہا مالک تمہیں ہو گئے میں تمہیں بھلا سکتی تھی، البتہ مجھے تمہارے دل سے اپنی یاد محو کرنی تھی۔

رفتہ رفتہ میں تم سے الگ الگ رہنے لگی میں تمہارے سوالات کا جواب بے اعتنائی سے دیتی میں تم پر یوں ظاہر کرتی گویا مجھے گھر کے کام سے ایک لمحہ کی فرصت بھی نہیں ہوتی کہ اپنے وقت کو بچوں کی سی باتوں میں ضائع کرسکوں۔ بلکہ میں اپنے دل کو بھی یقین دلاتی کہ تمہاری حیثیت میرے لئے محض ایک اتفاقی شناسا کی سی ہے۔

اس سے قبل میں نے تم سے کبھی تمہاری شادی کا ذکر نہ کیا تھا۔ لیکن اب میں تم سے عموماً تمہاری شادی اور تمہاری بی بی کے متعلق مذاق کے طور پر سوالات کیا کرتی اور جس قدر تمہیں یہ باتیں ناگوار گزرتیں۔ اسی قدر میں ان کا زیادہ ذکر کرتی میرا مقصد ہی یہی تھا۔ اُس دن پوس کے مہینے کی آخری تاریخ تھی، جب تم نے پھولوں کا ایک ہار لاکر مجھے دیا۔ تم کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن میں تمہاری بات ٹکر دی، "تم کیسے نادان ہو اور کیسی فضول باتوں میں مشغول رہتے ہو میں تمہارے پھولوں کو کیا کروں۔ یہ پھول اسے دو جس کے دل میں ان کی قدر ہو"۔

تم نے مجھ پر ایک سراپا درد نگاہ ڈالی۔ میرے الفاظ تمہاری توقع کے بالکل خلاف تھے اس کے بعد میں تم سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگی گویا میں کچھ کہی ہی نہیں۔ آہ! تمہیں کیا معلوم ہے کہ یہ الفاظ کہتے وقت میرے دل پر کیا گزر گئی۔ تم میرے دل کو پتھر سمجھتے ہوگے لیکن اسی پتھریلی چٹان میں سے آنسوؤں کے چشمے اُبل چکے ہیں۔

تم کچھ کہنے آئے تھے لیکن کہہ نہ سکے۔ آخر میں نے نگاہ پھیرلی اور تم مایوس ہوکر چلے گئے۔ اس وقت میں نے منداکو بلایا اور اس کے ساتھ مل کر بلند آواز سے ہنسنے اور باتیں کرنے لگی۔ تم نے بھی سنا ہوگا اور میرا مقصد بھی یہی تھا کہ تم سن لو۔

تمہاری محبت مجھ سے یہ سب کچھ کرا رہی تھی میں نے اپنے دل کو پتھر بنالیا تھا میں نہ چاہتی تھی کہ تمہارے نام نیک پر کسی قسم کا حرف آئے۔ اس کے علاوہ مجھ پر اپنے عہد کی پابندی بھی فرض تھی۔

میرا وجود سراپا ذلّت تھا اور میں چاہتی تھی کہ میری وجہ سے تمہارے دامن عزّت پر کوئی دھبا آئے۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر میں ایک دفعہ بھی تم پر اپنا راز آشکار کر دیتی تو تم بخوشی میری ذلّت کا حصّہ دار بننا قبول کر لیتے لیکن تم ایک شریف اور معزز گھرانے کے آخری چشم و چراغ تھے اور میں ایک قابل نفرت اچھوت جس کو خدا اور انسان دونوں نے دھتکار دیا تھا۔ دو ایسے شخص کس طرح مل سکتے ہیں ؟

ایک دفعہ مجھے خیال آیا کہ میں تم پر تمام حقیقت منکشف کر دوں جو تم کہنا چاہتے ہو سنوں اور جو میرے دل میں ہے کہوں۔ میں تمہیں بتا دینا چاہتی تھی کہ وہ کیا وجوہ ہیں جو مجھے اس سنگدلی اور بے وفائی پر مجبور کرتی ہیں۔ لیکن پھر یہ خیال میں نے دل سے محو کر دیا۔ میں تمہیں آگاہ کر کے اور زیادہ پریشانی میں کیوں مبتلا کرتی۔ میں تو تمہارے دل سے اپنی یاد محو کرانا چاہتی تھی۔ ایسی حالت میں ان باتوں کا ذکر بیکار تھا۔ اب مجھے خیال آتا ہے کہ کاش میں نے تمہیں سب کچھ بتا دیا ہوتا۔

کنول کے پھولوں کے پاس ایک دفعہ پھر ہماری ملاقات ہوئی۔ آنکھوں میں پہلی ملاقات کا نقشہ پھر گیا۔ میں نے نگاہ پھیر لی کہ کہیں میرا راز آشکار نہ ہو جائے اور کہا اس سال پھولوں کی کتنی کثرت ہے!

تم نے کہا "تمہیں یاد نہیں گزشتہ سال بھی تو اسی قدر پھول تھے اور ہم نے اسی جگہ بیٹھ کر کنول کے پھولوں کا ایک بہت بڑا ہار گوندھا تھا۔"

میں نے جواب دیا "بچپن کے زمانے کی چھوٹی چھوٹی باتیں انسان کو یاد نہیں رہ سکتیں۔"

تم نے تعجب سے کہا "یہ تو گزشتہ سال کا واقعہ ہے تم اس قدر جلد بھول گئیں!"

میں نے بے پروائی سے جواب دیا "مجھے ایسی فضول باتیں یاد نہیں رہتیں"

تمہاری آواز بھرا گئی اور تم نے کہا "دیکھئے تو اس سے بھی چھوٹی چھوٹی کئی باتیں یاد ہیں"۔

اگر اب تم مجھ سے ملو تو میں تمہیں بتاؤں کہ مجھے کتنے چھوٹے چھوٹے واقعات یاد ہیں۔ تمہاری ہر بات، تمہاری ہر نگاہ، تمہاری ہر حرکت، تمہاری ہر عادت میرے دل پر نقش ہے۔ میں ظاہری بے پروائی کے پردے میں ہر طرح سے تمہارے آرام کا خیال رکھتی تھی۔ لیکن میں تمہیں فریب میں مبتلا رکھنا چاہتی تھی۔ آہ تم کیوں اس قدر آسانی سے میرے فریب میں آگئے۔ تم نے حقیقت کو کیوں نہ سمجھ لیا۔

آخر میں تم سے الگ الگ رہنے لگی اور کبھی تم سے مل کر میں بالکل گفتگو کا کرنے کا وقت نہ نکالتی اس ظاہری بے التفاتی کے زمانے میں میرا دل پہلے سے بھی زیادہ تم سے ملنے کے لئے مضطرب رہنے لگا۔ اور میں ہر وقت تمہارے ہی خیال میں سرگرداں رہتی تھی۔ تمہارے لئے کام کرنے میں مجھے ایک خاص خوشی حاصل ہوتی تھی۔ اب میرے لئے دنیا میں صرف یہی ایک خوشی باقی رہ گئی تھی۔ کہ مجھے تمہاری خدمت کا موقع حاصل ہے لیکن تمہیں اس کا علم بھی نہ ہوتا۔

میں ہر صبح مندر میں جاتی اور دیوتا کی مورت کے سامنے جھک کر اپنا دردِ دل کہتی اور اس بات کا اعتراف کرتی کہ میں نے

تمہیں فریب دے رکھا ہے لیکن اس سے مجھے تسکین حاصل نہ ہوتی تھی کیونکہ تمہاری وجہ سے میں نے دیوتا کو بھی دھوکا دے رکھا تھا جس وقت میں اس کے سامنے سر جھکائے کھڑی ہوتی میرے دل میں اپنے معبود کا خیال نہ ہوتا تھا میرے جسم کا ذرہ ذرہ تمہاری نگاہ کی گرمی محسوس کرتا تھا۔ مجھے یوں معلوم ہوتا گویا کسی مقدس چشمہ کے پاک پانیوں میں میرا سراپا گناہ جسم دھل کر پاک ہو رہا ہے۔ مجھے یقین ہو جاتا کہ تمہاری پاک نگاہ میرے جسم کو اس زندگی میں پاک کر دیگی اور دوسرے جنم میں تمہیں میں فخر کے ساتھ اپنا کہہ سکوں گی۔ سنکھ برابر بلند بلند آہنگ سے بجتا چلا جاتا اور چاندی کے دیوں کی روشنی سے مندر کے در و دیوار جگمگ جگمگ کرنے لگتے لیکن نہ میرے کان سنتے اور نہ میری آنکھیں دیکھتیں۔ میرے لئے مندر میں بجز تمہارے اور کچھ نہ تھا۔ اب تک بھی ہر شام مجھے اسی طرح محسوس ہوتا ہے گویا تم بھی مندر میں موجود ہو اور میرا دل ایک خاص کیفیت میں ڈوب جاتا ہے +

لیکن جب میں مندر سے باہر نکلتی میرے دل پر ایک خوف سا چھایا ہوتا میں سوچتی کہ اگر میں عبادت میں غفلت کرتی ہوں تو کہیں اس کا وبال تم پر تو نہ پڑیگا۔ کیونکہ میں نے سنا ہے کہ عورت کو اپنے اعمال کی سزا اکثر اپنے محبوب کی تکلیف کی صورت میں ملتی ہے۔ اور تمہارا ایمان بھی تو اس موقع پر نہ تھا۔ تم بھی مندر میں اُس کے لئے نہ آتے تھے۔ اس لئے ہم دونوں گنہگار تھے۔ مگر تم میری ہی وجہ سے گناہ میں مبتلا ہوتے۔ میں دیوتا کے سامنے شرمساری سے جھک کر عفو کے لئے استدعا کرتی تھی بلکہ یہ کہتی تھی کہ اس گناہ کا وبال صرف میری جان پر پڑے +

دادا جان نے مجھے اپنے معبود سے لو لگانے کی نصیحت کی تھی اور میں نے بھی یہی فیصلہ کیا تھا کہ اس نصیحت پر عمل کروں گی میں اس جائداد میں سے کچھ نہ لینا چاہتی تھی جس کے حقیقی وارث تمہیں ہو میری دلی آرزو تھی کہ یہ سب کچھ تمہارے سپرد کردوں۔ اپنے مستقبل کے متعلق میں یہ سوچتی کہ میں مندر کے نزدیک ایک چھوٹی سی جھونپڑی بنا کر اس میں رہوں گی اور وہاں سے کسی خوش قسمت عورت کے ساتھ تمہاری کامیاب اور پُر مسرت خانگی زندگی کو دیکھوں گی لیکن ایسے خوابوں کی تعبیریں بھی کہیں سچ ہوا کرتی ہیں۔ اب اس کا کوئی امکان نظر نہیں آتا لیکن پھر بھی میں اپنے خواب کو فراموش نہیں کر سکتی میں آخر دم تک تمہارے لئے جائداد کی حفاظت کروں گی اور یہ سمجھوں گی کہ ایک دن مجھے یہ سب کچھ تمہارے سپرد کرنا ہے +

ایک زمانہ گزر گیا ہے جب میں نے پہلے پہل مندر کی سیڑھیوں کو دھو کر صاف اور پھولوں سے آراستہ کرنے کا فرض اپنے ذمہ لیا تھا اگرچہ میں خدا کی مخلوق میں سب سے زیادہ حقیر ہوں لیکن مجھے اس خدمت کی اجازت حاصل ہے۔ شام کے وقت میں اپنے بالوں کے ساتھ مندر کی سیڑھیوں کو دن بھر کی گرد سے صاف کرتی ہوں۔ اب تو یہ محض ایک قدیم عادت کی پاسداری رہ گئی ہے کیونکہ میں جانتی ہوں کہ تمہارے قدموں کی پاک اور پیاری گرد کا ایک ذرہ بھی اب وہاں باقی نہیں رہا ہوگا آندھیوں نے اُڑا کر اُسے کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہوگا +

اب مندر میں وہ پہلی سی رونق نہیں ہوتی۔ چند بوڑھی عورتیں اب تک آتی ہیں لیکن نوجوانوں نے جن کے ہجوم کی وجہ سے مندر میں داخل ہونا مشکل ہوتا تھا اب آنا چھوڑ دیا ہے +

اُس سال باد و باراں کے طوفان نے کئی گاؤں تباہ کر دیئے۔ طوفان کے دن شام سے پہلے ہی تاریکی چھا گئی۔ رات بھر ہوا کے زور سے بڑے بڑے درخت جڑ سے اُکھڑ اُکھڑ کر گرتے رہے کئی کشتیاں ڈوب گئیں ساحل کے بڑے بڑے تودے ٹوٹ ٹوٹ کر دریا میں گر رہے تھے۔ اور خوفناک آوازیں بلند ہوتی تھیں

عناصر دیوانہ وار رقص کر رہے تھے جنہیں دیکھ کر انسان کا زہرہ آب ہوتا تھا۔

شام سے پہلے پہلے پوجا ختم کی گئی اور لوگ جلد جلد گھروں کو چلے گئے میں اپنے روزانہ فرائض انجام دینے کے لئے پیچھے رہ گئی۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ تم بھی وہیں ہو۔ چاندی کے دیوں کو صاف کرنے کے بعد میں زمین پر جھکی اور سنگ مرمر کی سیڑھیوں کو اپنے بالوں سے صاف کرنے لگی میں نے یہ کام کبھی کسی متنفس کے سامنے نہ کیا تھا۔ تمہیں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی ہوگی چنانچہ تم نے سامنے آکر پوچھا:۔

"سنندا تمہیں کیا چیز پتھر کی اس مورت کے سامنے جھکنے پر مجبور کرتی ہے"؟

ایک بات میرے لبوں پر آتے آتے رہ گئی میں یہ راز مرنے کے وقت سے پہلے تمہیں نہ بتانا چاہتی تھی پس میں نے جواب دیا "مجھے اپنے دیوتا کا حکم ہے"۔

پھر یکایک تم نے سوال کیا۔ "یہ کیا ہے؟ تم سیڑھیوں کو اپنے بالوں سے کیوں صاف کرتی ہو؟ یہ کس کے پاؤں کی خاک ہے جس کو اس قدر عزت نصیب ہے"؟

میں نے ہنس کر جواب دیا "کیا تمہیں معلوم نہیں عورت کے لئے اس کا محبوب خدا سے بھی برتر ہے"؟

میں تاریکی میں تمہارا چہرہ اچھی طرح سے نہ دیکھ سکتی تھی لیکن تمہاری آواز تھرا گئی تھی جب تم نے پوچھا "اس نے تمہیں اس کے بدلہ میں کیا دیا ہے"؟

میں نے جواب دیا "مجھے کسی بدلے کی ضرورت نہیں میں اس پر اپنا سب کچھ نثار کر دینا ہی کافی بدلہ سمجھتی ہوں۔"

پھر تم نے کہا "کیا تم نے سب کچھ اس پر نثار کر دیا ہے، کسی دوسرے کے لئے کوئی گنجائش نہیں رہی"؟

میں نے جواب دیا "ہاں عورت جب محبت کرتی ہے تو اپنی ہر چیز اس کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیتی ہے"۔

تم نے کہا "سنندا کیا اب مجھے بالکل ناامید ہو جانا چاہئے"؟

میں نے جواب دیا "یقیناً تم مجھ سے کیا چاہتے ہو"؟

یہ سن کر تم بالکل مایوس ہو گئے اور ایک لفظ کہے بغیر چلے گئے میں بھی اس کے بعد جلد ہی گھر کو روانہ ہوئی۔

میں نے تمام رات آنکھوں میں کاٹی طوفان کا شور لمحہ بہ لمحہ بلند سے بلند تر ہوتا چلا جا رہا تھا۔ بارش موسلا دھار ہو رہی تھی۔ ہوا کے زور سے کبھی کبھی کوئی بڑا درخت گرتا تو اس کی آواز سے میرے کمرے میں بھی گونج پیدا ہو جاتی۔

صبح کے وقت اٹھ کر جب میں نے باہر دیکھا تو طوفان کی بربادی نے دنیا کا نقشہ بدل دیا تھا۔ پرانے آثار و نشان مٹ چکے تھے کئی عمارتیں گر گئی تھیں اور بہت سی جانیں تلف ہو چکی تھیں مگر یہ تمام ویرانی میرے دل کی ویرانی سے زیادہ نہ تھی کیونکہ اس دن میں اپنا سب کچھ کھو چکی تھی۔

اس دن سے میں نے تمہیں نہیں دیکھا لیکن میں آج تک تمہارے انتظار میں ہوں مرنے سے پہلے ایک دفعہ میں تمہیں اپنی داستان سنا لینا چاہتی ہوں لیکن اگر یہ میری قسمت میں نہیں تو پھر اس خط سے تمہیں سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔

میں ایک دفعہ پھر تمہارا پیارا چہرہ، تمہاری پیاری آنکھیں جو ہنستے وقت چمک اٹھتی تھیں دیکھنا چاہتی ہوں اور ایک دفعہ پھر تمہارے ساتھ مل کر اسی طرح خوب ہنس لینا چاہتی ہوں۔ آنسوؤں کے اس دریا کی خاموش سطح پر جسے میں اپنی زندگی کہتی ہوں، اس آخری ملاقات کی یاد ایک سفید شگفتہ کنول کی طرح تیرتی رہے گی! اور بس پھر میں اطمینان کی موت مروں گی۔

(ملخص) حامد علی خاں

انتظار

خدا جانے تو کہاں چلا گیا۔

میں مُدت سے تیرے انتظار میں چشم براہ ہوں مگر تو نہیں آتا۔ صبح سے شام تک میں تیرے انتظار میں رہتی ہوں حتیٰ کہ آفتاب اُفقِ مغرب میں اپنا جگمگاتا چہرہ چھپا لیتا ہے اور مہ زرد رُو تمام دُنیا پر اپنی روپہلی کرنیں پھیلا دیتا ہے۔ میں پھر بھی تیرے انتظار میں رہتی ہوں۔

خدا جانے تو کہاں چلا گیا

صبح صادق نمودار ہوتی ہے ستارے چاند کی طرف رقیبانہ نظر ڈالتے ہوئے غائب ہوجاتے ہیں، آفتاب پھر جلوہ ریز ہوتا ہے، تمام عالم جگمگا اُٹھتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں "دیوانی لڑکی! تو کس کا انتظار کرتی ہے؟ وہ ایک نامعلوم سرزمین کو چلا گیا ہے اور کبھی نہیں آئیگا"

میں حیرانی سے اُن کو دیکھتی ہوں کہ یہ کیا کہتے ہیں، مگر میں پھر بھی تیرے انتظار میں رہتی ہوں۔

خدا جانے تو کہاں چلا گیا۔

میری پیاری سُن، میں ہمیشہ خوش رہنا چاہتی ہوں۔

کامیابی ناکامی کا پیش خیمہ ہے، مجھے وہ قبول نہیں۔

آرام پیش خیمۂ ادبار ہے، اُسے بھی پسند نہیں کرتی۔

دولت نجس ہے، میں اسے بھی نہیں چاہتی۔

مگر میں پھر بھی خوش رہنا چاہتی ہوں۔ تو شاید حیران ہوگی کہ یہ عجیب طرح کی باتیں کرتی ہے" میں دیر تک تجھے حیرت میں رکھنا نہیں چاہتی۔ غور سے سُن۔ مجھے اُس خوشی کی تمنا ہے۔ جو دل کے ٹوٹ جانے سے پیدا ہوتی ہے اور آنسوؤں کی تہ میں مُسکراتی ہے۔

"ناکام"

شعر اور حقیقت

ہلکی ہلکی ـــ دھیمی دھیمی ـــ روشنی کی ایک لہر معلوم نہیں کہاں سے اُٹھتی ہے اور آہستہ سے اُبھرتی ہوئی آگے کو تیرتی آتی ہے۔ ایک سنہرا غبار، پھیلتا اور چمکتا ہوا، چپکے چپکے روح پر چھانے لگ جاتا ہے۔ گزرے دنوں کے سال خوردہ پردے دفعتہً جل کر گر جاتے ہیں اور بچپن کا بہشت جگمگ جگمگ کرتا آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ یہ نظارہ تم نے کبھی دیکھا ہے؟

میں اپنے مکان کی چھت پر کھڑا تھا۔ سورج کی کمزور زرد کرنیں مجھ پر پڑ رہی تھیں، اور مکانوں اور درختوں کے لمبے لمبے سائے ہر گھڑی زیادہ لمبے ہوتے جاتے تھے۔ صبح سے میں اپنے مطالعہ کے کمرے کے اندر بیٹھا رہا تھا۔ ایک پُرحسرت ماضی کی یاد اور ایک دھندلے، ناقابلِ اعتماد مستقبل کی امید نے (جو نا اُمیدی سے بدتر ہوتی ہے) دن بھر کے مطالعہ کی کلفت بہت زیادہ بڑھا دی تھی۔ اب میں نے ایک لمبا سانس لیا اور کتاب کو آہستہ سے بند کر کے تھکا ہوا اور پژمردہ باہر چھت پر نکل آیا۔

میں نے اپنی افسردہ آنکھیں آسمان کی طرف اُٹھائیں اور پھر نیچے زمین پر ڈالیں۔ میری سُست رگوں میں یکایک میرے خون کو جنبش ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ قدرت کے عناصر ـــ نہیں، کائنات کی رُوح مُسکرا کر میری طرف دیکھ رہی ہے۔ سو سو طرح کی شکلیں بناتے اور بگاڑتے ہوئے، ابر کے قرمزی اور ارغوانی ٹکڑے، شوخ بچوں کی طرح آسمان کے نیلے بلّور پر پھسلتے پھرتے تھے اور پیپل کی پتیوں میں سے ہوا ہلکی سی سنسناہٹ کے ساتھ گزر رہی تھی۔

جس طرح ماں اپنے بلکتے ہوئے بیمار بچہ کے سر پر شفقت سے اپنا ہاتھ رکھ دیتی ہے اور اس کا رونا بند ہو جاتا ہے، اسی طرح ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا جو رحمت کے پر لگا کر خدا جانے کن دور دراز فاصلوں سے پرواز کرتا ہوا آیا تھا، میری تپتی ہوئی پیشانی پر ایک نرم، ایک نامحسوس تھپکی کا نقش چھوڑتا ہوا چلا گیا۔ میں چونک کر بے اختیار ایک قدم آگے بڑھا اور مُسکرایا۔

نیچے سڑک پر جو شہر کا سینہ چیرتی ہوئی، پُر رونق محلوں کا دامن جھٹکتی اور ہجوم کی شورش کو پیچھے چھوڑتی، بیسیوں پیچ و خم کھا کر میرے مکان تک پہنچی تھی، تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد ایک ایک دو دو راہگیر گزرتے تھے۔ مکان کے سامنے کے ناکے پر پہرے کا جوان کھڑا تھا جس نے اپنے آپ کو بے کار پا کر، محبت اور فراق کا ایک دہاتی گیت گنگنانا شروع کر دیا تھا ـــ شاید اُس لڑکی کی یاد میں جسے وہ اپنے گاؤں میں چھوڑ آیا تھا۔

میں نے ان سب چیزوں کو دیکھا اور ایک دفعہ پھر مُسکرایا۔

سڑک کی طرف مکان کی جو دیوار تھی اس پر پھولوں کی ایک بیل چڑھی ہوئی تھی۔ لہراتا ہوا ایک سانپ زمین سے اُٹھا تھا

اور دیوار کے اوپر پہنچتے پہنچتے اس کے ہزار سانپ بن گئے تھے جو دیوار کے ایک سرے سے لیکر دوسرے سرے تک مستی سے جھومتے جھولتے تھے۔ ہرے ہرے پتے کسی بُنتی کی رسیلی تانوں کے مانند چکر کھاتے ہوئے پیچ در پیچ زمین سے بلند ہوتے تھے اور ایک بے صدا نغمہ بن کر پوری دیوار پر منتشر ہو گئے تھے۔ پھیکے گلابی رنگ کے چھوٹے چھوٹے حسین شگوفے پتوں کی اس بھول بھلیاں میں سے معصوم چہروں کی طرح جھانک رہے تھے۔ میں نے ان ہنستے ہوئے فرشتوں کو دیکھا اور میں بھول گیا کہ میرے مطالعہ خانہ میں منطق اور ریاضی کی بہت سی ضخیم جلدیں میز پر پڑی ہیں۔

ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا، بیل میں کھڑکھڑاہٹ سی پیدا ہوئی، بے شمار شگوفے ستاروں کی طرح پتوں میں سے نکل آئے اور زور زور سے اپنا سر ہلانے لگے۔ ننھی ننھی کونپلوں کے باریک ریشوں میں ان کا میٹھا رس مجھے اچھلتا ہوا نظر آیا۔ ایک نازک شاخ بے قرار ہو کر اٹھی اور چھت پر میرے قدموں میں آ رہی۔ میں نے آگے بڑھ کر محبت سے اسے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ خدا جانے کیوں؟ اور اب مجھے معلوم ہوا کہ دیوار پر جتنے پھول ہیں سب کی آنکھیں میری طرف اٹھی ہوئی ہیں وہ قہقہے لگا رہے ہیں، ہنسی سے لوٹ پوٹے جاتے ہیں، اور مجھے اشاروں سے بلاتے ہیں کہ تم کیوں رونی صورت بنائے کھڑے ہو؟ آؤ ہمارے ساتھ کھیلو!

اس کے بعد جو کچھ ہوا کس طرح اور کن لفظوں میں بیان کروں؟

بیل اور اس کے پتے اور پھول یکایک نگاہ سے غائب ہو گئے۔ ایک نیا منظر آنکھوں کے سامنے تھا۔

اے آفتاب! اے زمین! اے آسمان! یہ کیا سحر ہے ——— مجھے بتاؤ وہ کیا طلسم ہے جو میرے بچپن کے ہمجولیوں کو اس وقت میرے سامنے لے آیا ہے؟

میرا پہلا اور آخری دوست اور میرے بچپن کا رفیق، جو مدت ہوئی مجھ سے بچھڑ گیا تھا اور اب ہزاروں کوس دور ایک چھوٹے سے گاؤں میں خاک کے نیچے سو رہا تھا، اپنی بڑی بڑی طفلانہ آنکھیں مجھ پر جمائے کھڑا تھا۔ وہ اپنے ہاتھ میں ایک گیند اچھال رہا تھا شاید مجھ سے کہنا چاہتا تھا کہ چلو باہر چل کر کھیلیں۔

میری چھوٹی بہن بڑے سلیقہ سے اپنی گڑیوں کو سنبھالے بیٹھی تھی۔ اس نے مجھے دیکھا اور کہا۔ بھائی! تم کیوں رو رہے ہو؟ دیکھو میں اچھے بچوں کی طرح کھیل رہی ہوں۔ اچھے بچے تو نہیں روتے۔ کیا تم اچھے بچے نہیں ہو؟ آؤ میں نے تمہارے لئے کھانا پکایا ہے نرم نرم راکھ کا آٹا لے کر روٹی بنائی ہے اور اس میں بیر کنز کریں نے پستہ بھرا ہے۔ جتنے بیر طوطوں نے بیری کے درخت سے آج صبح نیچے پھینکے، سب میں نے چن لئے تھے۔"

اس پر میرے بڑے بھائی نے جو لکڑی کے ایک گھوڑے پر سوار تھا اس سے کہا "چپ رہو! تمہیں ان باتوں میں دخل دینے کی ضرورت نہیں۔ یہ تو روئے ہی جائیگا۔ تم کیا جانو، جب اس نے بات کرنا بھی نہیں سیکھا تھا۔ تو پنگوڑے میں لیٹا لیٹا اس طرح رویا کرتا

تھا کہ سارے محلہ والے چیخ اٹھے تھے۔ اس کو تو رونے میں مزہ آتا ہے۔ سالہا سال گزرے تھے کہ میرے بھائی نے کاٹھ کا یہ گھوڑا ایک چپت لگا کر مجھ سے چھین لیا تھا۔ اب اس نے اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھ اٹھا کر زور سے اسے چابک لگایا اور میری طرف دیکھ کر کہا: "تم جیسے ننھے سواری کا ڈھنگ کیا جانیں؟ دیکھو ہم اس گھوڑے پر چڑھ کر مدرسے جایا کریں گے!" میں اس نظارہ کی تاب نہ لا سکا اور اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ میری آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں لیکن میرے لبوں پر تبسم تھا۔

افق پر کالی بدلیوں کے سامنے بگلوں کی ڈاریں کسی نامعلوم سمت کو جا رہی تھیں۔ قریب ہی نیم کے پیڑ پر بیٹھا ہوا ایک کوا کبھی کبھی کائیں کائیں کرتا تھا اور پھر خاموشی چھا جاتی تھی۔ اس خاموشی میں دور بہت دور سے ایک گرفتار پرندے کے قفس میں پھڑپھڑانے کی صدا آتی تھی۔ شاید یہ میرے دل کی آواز تھی۔

آسمان محبت سے مجھ پر جھکا ہوا تھا۔ ہوا کے جھونکے بیتاب ہو کر مجھ سے لپٹ رہے تھے اور بلبلے ملبے درخت میری طرف اپنی بانہیں پھیلا رہے تھے۔ ساری فضا موسیقی سے لرزتی ہوئی ایک زندہ شعر، ایک روح میں اتر جانے والا نغمہ بنی ہوئی تھی۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ مجھ پر کسی بڑے راز کا انکشاف ہونے والا ہے۔ میں کس چیز کے موہوم انتظار میں تھا؟

چھت کی منڈیر پر کھڑا کھڑا میں اور آگے کو جھک گیا۔

پانچ یا چھ برس کی ایک چھوٹی بچی اپنی انا کے ساتھ مدرسہ سے آ رہی تھی۔ انا نے کتابوں کا جزدان اٹھا رکھا تھا۔ اور وہ خود ایک رنگین تیتری کی طرح ہوا میں اڑتی ہوئی نظر آتی تھی۔ پاکیزگی کی ایک فضا اس کے گرد ہالہ کھینچے معلوم ہو رہی تھی۔ وہ قریب اور زیادہ قریب آ گئی اور اسے دیکھ کر میرا دل ایک بے پایاں مسرت سے لبریز ہو گیا۔ بجلی کی چمک کی طرح، ایک گھڑی ——— صرف ایک گھڑی کے لئے مجھے یہ معلوم ہوا کہ میں خود بھی ایک خوردسال بچہ ہوں اور بیس برس پہلے کی دنیا میں کھڑا ہوں۔ میرا بچپن مجھے دوبارہ مل گیا۔

لڑکی دیوار کے پاس آ کر رکی۔ اس نے بیل کو دیکھا اور اس کی طرف ہاتھ پھیلا کر کہا "انا! پھول!"

ناگہاں مجھے یہ محسوس ہوا کہ مکان کی چھت پر میں بالکل ایک اجنبی کی حیثیت سے کھڑا ہوں۔ پھولوں کی اس بیل، اس دیوار، اس مکان کا مالک میں نہیں ہوں، بلکہ وہ ننھی بچی، جس نے اپنی اس ایک ادائے معصومیت کے ساتھ ان سب چیزوں کو اپنا بنا لیا تھا۔ انا نے پھول توڑنے کو ہاتھ بڑھایا۔ اس نے مجھے اوپر کھڑے نہیں دیکھا تھا ورنہ اسے شاید تامل ہوتا۔ میں تیزی سے پیچھے ہٹا کہ جتنے پھول وہ توڑ کر لے جا سکتی ہے بے کھٹکے لے جائے۔

لیکن ابھی میں دو ہی قدم چلا ہوں گا کہ ایک کرخت آواز سنائی دی "ارے ہوت! پھولوں کو ہاتھ نہ لگائیو!"

کائنات کی موسیقی یک بیک خاموش ہو گئی۔ شعر ختم ہو گیا اور نغمہ ٹوٹ گیا۔ میں غصہ سے پیچھے کو مڑا۔ وہ چھوٹی بچی، ہلکے ہلکے قدم اٹھاتی ہوئی سڑک کے دوسرے سرے پر اداسی سے جا رہی تھی اور پہرے کا سپاہی ایک داد طلب فتح مندانہ نگاہ سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

آہ اس پہرہ دار نے مجھے خوش کرنا چاہا تھا۔

حمید احمد خاں۔ کرم آباد

انسان

حسن نے رنگینیاں لی ہیں مری تصویر سے ‌ ‌ عشق سوزاں ہے مرے جذباتِ آتش گیر سے
ذرہ ہوں ظاہر میں لیکن آفتاب آشام ہوں ‌ ‌ کسبِ ضو کرتا ہے اک عالم مری تنویر سے
جلوہ لُٹے حسن کے اندازِ پنہاں کا اثر ہوں ‌ ‌ آشکارا ہے مرے سوزِ جنوں تاثیر سے
ذرے ذرے ہیں پریشاں ہے مرے جلووں کا عکس ‌ ‌ چشم کن روشن ہے مری شمع کی تنویر سے
منتہائے ہمتِ ہستی مری فکرِ بلند ‌ ‌ حسنِ فطرت نے نمو پائی مری تعمیر سے
دار و بستِ عقل میں ہیں انتشار آثاریاں ‌ ‌ ربط ہے گویا مجھے عشقِ جنوں تاثیر سے
رازدارِ شوکتِ بے تابیٔ فطرت ہوں میں ‌ ‌ بزم قائم ہے تو میرے جذبۂ تسخیر سے
میں تلوّن آشنا ہوں پیکرِ احساس و درد ‌ ‌ میری فطرت ہے گریزاں عقل کی زنجیر سے
نغمہ زارِ زندگی میں ہوں تپش آہنگ میں ‌ ‌ رونقِ محفل ہے میری گرمیٔ تقریر سے
بندہ کر لیتی ہے اک دم میں نگاہِ التفات ‌ ‌ دب نہیں سکتا نمودِ خنجر و شمشیر سے
میری صہبا کی کوئی دیکھے ذرا شانِ گداز ‌ ‌ خود پگھل جاتی ہے مینا تابشِ تاثیر سے
رستخیزِ زندگی میں موت ہے پیغامِ عیش ‌ ‌ زندہ رہتا ہوں مگر آبِ دمِ شمشیر سے
میری ہستی کو سمجھ رکھا ہے خوابِ دلپذیر ‌ ‌ بے خبر ہیں سب مگر اس خواب کی تعبیر سے
پردۂ رازِ پرستش ہے نقابِ عارضی ‌ ‌ جلوے تیرے سی درخشاں ہیں مری تصویر سے
میری فطرت ہے امینِ شانِ نیرنگِ خیال ‌ ‌ نازِ حسنِ لم یزل پیدا مری تصویر سے

میرے نالوں سے جہاں میں عشق کا چرچا ہوا
میری آہوں سے مذاقِ آرزو پیدا ہوا

تصدق حسین خالد ایم۔ اے

عورت اور پردار بھوت

ایک عورت اپنے خیالات میں ہمہ تن محو تھی۔ اُس کی خوبصورت آنکھیں خیالات کے غیر محدود سمندر میں غوطہ زن تھیں مگر اُس کا دماغ پورے سکون کی حالت میں تھا۔ اچانک اُس کی ہستی کے سمندر میں محسوسات کی ایک لہر چلی اور اُس نے محسوس کیا کہ وُہ تنہا نہیں رہی بلکہ ایک اور شخص اُس برقع کو پارہ پارہ کر رہا ہے۔ جو اُسکے خیالات نے اوڑھ رکھا تھا۔

وہ مُڑی اور اُس ناگہانی دخل در معقولات کرنے والے شخص کے مقابل ہوئی لیکن قبل اس کے کہ وُہ کوئی لفظ زبان سے نکالتی وُہ شخص جُھکا۔ اور اُس کے کان میں کوئی بات چُپکے سے کہہ دی۔ جس کے سنتے ہی وُہ ایک دہشت ناک چیخ مار کر ایک جائے پناہ کی طرف لپکی۔ مگر پھر سنبھلی۔ کیونکہ اب اُس نے دیکھا کہ آنے والے خطرے سے اُسے عین وقت پر باخبر کر دیا گیا ہے لیکن دل بلیوں اُچھل رہا تھا جب وُہ اپنے نجات دہندہ کو دیکھتی تھی کہ دشمن سے مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو رہا ہے۔ اُسکے بدن میں خوشی کی ایک لہر دوڑ جاتی جب دیکھتی کہ وُہ شخص آنے والے مقابلے کے لئے تیار اور مستعد ہوا چاہتا ہے۔ آخر جو بُرا بھلا ہتھیار اُسکے ہاتھ آیا اُس نے اُٹھایا اور سامنے کے دشمن پر پے در پے کئی وار کئے۔ مگر بھوت پردار تھا بچ بچ جاتا۔ وُہ اِس عالم مایوسی میں چاہتا تھا کہ کوئی ایسا مہلک ہتھیار ملے جس سے دشمن کا کام تمام ہو جائے۔ اچانک اُس کے دل میں اُمید کی ایک جھلک پیدا ہوئی۔ وہ کُودا اور ایک چھلانگ میں اُس پردے کو پکڑ لیا جو دروازے پر آویزاں تھا۔ سر کے گرد اُسے چکر دیا اور بڑھ کر دشمن پر وار کیا۔ ایسے اڑے وقت میں عورت کو کیا پروا تھی۔ اگر اُسکے قیمتی گلدان نفیس برتن اور بیش قیمت عطر کی شیشیاں اُلٹ پلٹ یا تباہ و برباد ہو جائیں۔ کیا اُس کا ناجی غیر محفوظ عورت ذات کو اُسکے سخت ترین دشمن کے حملے سے بچا نہیں رہا تھا۔

وُہ دست بستہ تھی۔ اُسکے دل میں دُعائیں تھیں۔ اور وُہ اس غیر مساوی مقابلے کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی ایک حملہ ہُوا پھر دُوسرا جب وار کاری آئے۔ تو صرف اتنا ہُوا کہ بھوت اپنی اُڑان میں ذرا ڈگمگا گیا۔ جنگ ہو رہی تھی۔ جوں جوں وار کاری بیٹھتے تھے۔ وُہ اپنے پہلوان کا دل بڑھاتی تھی۔ مگر لمحے سال ہو رہے تھے۔ اُسکے پہلوان کا سانس چڑھا ہُوا تھا اور اب اُسکے حملوں میں وُہ زور اور طراری باقی نہ رہی تھی جو پہلے تھی۔ مگر اُس نے حوصلہ کیا اور ایک آخری کوشش سے دشمن کو دریچے کی طرف بھگا دیا۔ دشمن نے دو دفعہ پھر آنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا اور آخر ایک مایوسانہ چیخ سے چمگاڈر کمرے سے باہر نکل گئی عورت نے ایک دلربایانہ انداز سے اپنے خاوند کو اجازت دی۔ کہ وُہ اسے مسہری سے باہر نکال لے۔

(ع - ک)

غزل

آئے تھے جہاں میں کس لئے ہم — یہ بھی نہ کھلا کہ چل دیئے ہم
تم نے پوچھا تو جی بھر آیا — کچھ کہہ نہ سکے تو رو دیئے ہم
آنسو سینے میں کیا رُکے ہیں — گویا بیٹھے ہیں مٹے پیئے ہم
مر مر کے کٹی ہے زندگانی — یوں تو کہنے کو ہاں جیئے ہم
کام آئے گی کچھ بھی کیا نہ غیرت — جاتے تو ہیں التجا لئے ہم

ساقی سے جگر یہ جا کے کہدو
در سے نہ اُٹھیں گے بے پیئے ہم

نرگس

ایک دن میں اپنے خیالات میں مست ایک مقبرے کے آس پاس چکر لگا رہا تھا کہ نرگس کے ایک ہرے بھرے پودے پر نظر پڑ گئی۔ جس کے خوشنما پھول ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھ رہے تھے۔

میں حیران ہو کر ان سے یوں مخاطب ہوا۔ "اے نازک اور شرمگین پھولو! تم اِس ویرانے میں کیوں کِھلے جبکہ ہر چمن تمہارے لئے آغوشِ شوق کھولے ہُوئے ہے"!

اُن میں سے ایک نے جواب دیا "اے شفیق! میں پھول نہیں ہوں۔ غور تو کر کتنا ملول و دل گرفتہ ہوں۔ میں عاشق نامراد کی چشم حسرت بار ہوں۔ جسے خاک میں مل جانے کے بعد بھی محبوب کا انتظار ہے....... اور اپنی شومیِ قسمت پر خون کے آنسو بہا رہی ہے"!

"میں نے نادانی سے جوشِ وفا میں ایک بدعہد کے وعدۂ فردا کو سچ جانا تھا اب فنا کی منزل میں اُس محبت کے ساتھ وقفِ انتظار ہوں جو کشتگان چشم کو دوبارہ حیات تازہ بخشتی ہے۔ میرا دل وُہ سازِ غم ہے۔ جسکے تار حافظہ ہی کی اُنگلیوں سے چھیڑے جائینگے...... اور مجھے ایک نامحدود مدت تک فردائے قیامت کا منتظر رہنا ہوگا"........!!!

"میری رُوح کو علم ہے کہ محبت غیر فانی شے ہے چنانچہ اُس نے مجھے بھی عاشقانِ صادق کی طرح حیاتِ جاوید عطا کر دی"......!!!

عزیز احمد

عنایت خاں

حدیثِ شوق

پھر رُو بہ رُو وُہ چشمِ فسوں ساز ہے مجھے
پھر ہر نگاہ خانہ بر انداز ہے مجھے

تیری اِسی ادا پہ ازل سے نثار ہوں
تیرا وجود سر بہ سر اک راز ہے مجھے

ہمّت بلند تر ہے بہ اندازۂ شکست
بالِ شکستہ جوہرِ پرواز ہے مجھے

جو داغ دل میں ہے وہی دلدار ہے مرا
جو آہ لب پہ ہے وہی دمساز ہے مجھے

مقبول ہو رہا ہوں تری بارگاہ میں
اب اپنے حرف حرف پہ سو ناز ہے مجھے

ٹپکے جو حرف خامۂ معجز نگار سے
حرفِ چکیدۂ لبِ اعجاز ہے مجھے

حامد علی خاں

محفلِ ادب

بچپن کے دِن

لے ..... بچپن کے دن بچپن کی راتیں یاد ہیں
بیٹھ کر کرتے تھے جو باتیں وُہ باتیں یاد ہیں

اب نہیں آراستہ ہوتی خیالوں کی وُہ بزم
ہائے وہ بچپن کے منصوبے وُہ تجویزیں وُہ عزم

وُہ دُعائیں اتحادِ باہمی کے واسطے
گفتگوئیں وُہ وطن کی بہتری کے واسطے

سادگی کے بے غمی کے اور بھولے پن کے دن
ہائے وُہ بچپن کی راتیں اور وُہ بچپن کے دن

چاندنی اب بھی ہے لیکن وُہ زمانہ اب کہاں
وُہ مرا بےچین ہونا اور وُہ گانا اب کہاں

ہائے وُہ گرمی کا موسم وُہ مئی کی دوپہر
ہائے وُہ فیضی کی گیتا اور وُہ اس کا اثر

مَیں بھی ہوں، دیوانِ حافظ بھی ہے لیکن ہمنشیں
وُہ سکونِ دل وُہ راحت اور وُہ بےفکری نہیں

اب نہ وُہ باتیں نہ وُہ راتیں نہ وُہ ناز و نعم
اب تو افسرؔ زندگی کی کشمکش ہے اور ہم

"مرقع"

افسرؔ میرٹھی

امرء القیس اور شاعری

گو اِس پر اتفاق نہیں ہے کہ شعرائے جاہلیت میں بہتر شاعر کون ہے مگر عام طور پر اہلِ ذوق نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ قابلِ ترجیح امرء القیس بن حجر بن حارث کندی ہے۔ عرب کے مشاہیر شعرا میں سب سے زیادہ نمایاں اسی کا نام ہے۔ یونس بن حبیب کا قول ہے کہ علمائے بصرہ کے نزدیک امرء القیس سب میں بہتر اور قابلِ ترجیح ہے۔ اہلِ کوفہ نے اعشیٰ کو قابلِ ترجیح بنایا ہے اور اہلِ حجاز اہلِ بادیہ زہیرؔ اور نابغہ کو بہتر بتاتے ہیں کسی نے فرزدق شاعر سے پوچھا کہ "اے ابو الفرس! سب سے بڑا شاعر کون ہے؟" کہا "ذو القروح یعنی امرء القیس"۔ امرء القیس کی کنیت ذو القروح بھی تھی۔ مرنے کے کچھ دنوں پہلے تمام بدن زخموں سے بھر گیا تھا۔ زہر کی وجہ سے تمام بدن پر دانے نکل آئے تھے قسطنطنیہ سے واپسی پر اسی میں مبتلا رہ کر انگورہ میں مر گیا۔ اپنے پھوڑے پھنسیوں کا ذکر امرء القیس نے اس شعر میں کیا ہے ؎

وبدّلت قرحاً دامیاً بعد صحۃ فیا لک من بوسی تحولن ابوسا

اِس شعر کی وجہ سے بعد کو ذو القروح کے لقب سے مشہور ہوا۔ فرزدق سے یہ بھی پوچھا گیا کہ امرء القیس کے ترجیح پر کیا دلیل ہے۔ فرزدق نے امرء القیس کا یہ شعر پڑھا۔ ؎

وقاھم جدھم ببنی ابیھم وبالاشقین ما کان العقاب

(ترجمہ) ان کو کوشش نے اُن کی اعلاوپدر کی وجہ سے بچا دیا اور اشقیا پر عذاب نہ آیا!

جب لبیدؔ شاعر کوفہ میں قبیلہ بنو نجد میں اُترا تو لوگوں نے ایک شخص کو بھیجکر دریافت کیا کہ سب سے بڑا شاعر کون ہے؟ کہا "الملک الضلیل" یعنی امرء القیس۔ اُس شخص کو دوبارہ بھیجا اور پوچھا پھر کون؟ کہا مقتول لڑکا یعنی طرفہ۔ پوچھا پھر کون؛ کہا بوڑھا ابو عقیل یعنی خود یہ اُن لوگوں کے خیالات ہیں جن کو کلام کی تنقید کا صحیح ذوق حاصل تھا اور بلاغت کے معیار سے واقف تھے۔ جو کلام کے نشیب و فراز، جودت اور رکاکت سے باخبر تھے۔ اگر ان راؤں کو علیحدہ کر دیا جائے اور امرء القیس کا کلام پڑھا جائے تو چند خوبیاں ہر جگہ نمایاں ہونگی۔"

۱۔ امرء القیس پہلا شخص ہے جس نے جید اشعار اور حسنِ تشبیہہ کی بنیاد ڈالی ہے۔ بشار بن برد کا قول ہے جب امرء القیس کا یہ شعر میں نے سنا ؎

کان قلوب الطیر رطباً ویابساً لدی وکرھا العناب والحشف البالی

تو بیحد پسند آیا اور اسی وقت سے برابر سوچتا رہا کہ اس پایہ کا کوئی شعر میں بھی کہوں۔ ایک عرصہ کے بعد بشار نے یہ شعر کہا ؎

کان مثار النقع فوق رؤوسنا واسیافنا لیل تھاوی کواکبہ

بشّار مادر زاد اندھا تھا جب اُس نے یہ شعر کہا تو کسی نے اُس سے کہا کہ اب تک کسی نے اتنی عمدہ تشبیہ نہیں دی تھی تم نے کبھی دُنیا دیکھی نہیں پھر یہ تشبیہہ کیونکر پیدا کرلی۔ بشّار نے کہا کہ بصارت کا فقدان قلب کے ذکا کو قوی کر دیتا ہے اور چونکہ محسوسات سے اُسکو روک دیتا ہے اس وجہ سے اُس کی حِس بڑھ جاتی ہے اور طبیعت روشن ہو جاتی ہے یہ قول اپنی جگہ پر صحیح ہے۔ مگر بشّار کو اس کا اقرار ہے کہ یہ تشبیہہ امرا القیس کے تشبیہ کا نتیجہ ہے۔ اور اُس کی آب و تاب اور رونق بشّار کی تشبیہہ میں موجود ہے۔ امرا القیس کا دُوسرا شعر یہ ہے جس میں وحشی گاؤں کے شکار کا تذکرہ ہے اور یہ دکھلایا ہے کہ خیمہ کے اردگرد گاؤں کی آنکھیں الگ پڑی ہیں ؎

کان عیون الوحش حول خباءنا وارحلنا الجزع الذی لم یثقب

اور اس طرح کے اشعار جن میں تشبیہہ نہایت پُر رونق ہو امرا القیس کے کلام میں بکثرت ملیں گے۔

۲۔ امرا القیس کے پہلے جو عرب میں شعراء گزرے ہیں اُن کا کلام زیادہ تر رُوکھا اور بھونڈا ملیگا۔ لطیف معنی اوّل اوّل امرا القیس نے پیدا کئے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ امرا القیس کے قبل جو شعراء گزرے ہیں اُنکے کلام میں لطف، رونق اور شادابی نہیں ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ کلام نازک خیالات سے پُر اگر کسی شاعر کا ملیگا تو وہ امرا القیس ہے۔ امرا القیس کا شعر ہے ؎

سموت الیھا بعد نام اھلھا سمو حباب الماء حالا علی حال

اپنی ادبی چال اور پوشیدہ آمد و رفت کو نہایت ہی خوبصورتی سے ادا کیا ہے بعد کے کسی شاعر نے اسی مضمون کو دوسرے نہج سے ادا کیا ہے مگر وُہ خوبی پیدا نہ ہو سکی۔ ؎

ادب الیھا دبیب الکری واسمو الیھا سمو النفس

وضاح یمن شاعر نے بھی اسی مضمون کو ادا کیا ہے۔ اُس کا شعر ہے کہ ؎

اسقط علینا کسقوط الندی لیلۃ لا ناہ و لا زاجر

ان دونوں شعروں کو پڑھئے تو دونوں میں فرق معلوم ہوتا ہے جو شوکت اور آب و تاب امرا القیس کے شعر میں ہے وُہ وضاح یمن کے شعر میں قطعًا نہیں ہے۔ "سموت" کا لفظ اور "بعد ما نام اہلہا" خاص لطف رکھتا ہے۔ وہ خوبی و چستی اور انسانی جذبہ دوسرے شعر میں بالکل نہیں ہے۔

امرا القیس کا دُوسرا شعر ہے ؎ یضئی الفراش وجھھا لضجیعھا + کمصباح زیت فی قنادیل ذبال

چہرہ کی خوبصورتی اور رونق کو جس پیرایہ سے ادا کیا ہے وُہ عجب پُر لطف ہے اسی مضمون کو متنبی نے اخذ کر کے کہا ہے ؎

امن ازدیارک فی الدجی الرقباء اذ حیث کنت من الظلام ضیاء

اس کے مقابلہ میں متنبی کا شعر بالکل پھیکا پڑ جاتا ہے۔ گو متنبی نے اس معنی کو امرا القیس سے لیا ہے مگر اضافہ تو در کنار اُتنی عمدگی اور لطافت پیدا نہ کر سکا جو امرا القیس کے شعر میں نمایاں ہے۔

(علی گڈھ میگزین)

تبصرہ

پس پردہ: مرتبہ مولوی عبدالباسط صاحب ایم۔ اے علیگ۔ یہ آغا حیدر حسن صاحب دہلوی کا مجموعۂ مضامین ہے۔ آغا صاحب موصوف کو نسوانی ادب نگاری میں کمال حاصل ہے۔ وہ جو کچھ لکھتے ہیں اس میں نسوانی رنگ کی جھلک بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ اُن کا اندازِ بیان نہایت صاف اور شستہ ہے اور اُن کی زبان مستند کہی جاسکتی ہے۔ کتابت، کاغذ، لکھائی چھپائی نہایت نفیس ہے۔ حجم ۲۱۸ صفحہ قیمت ایک روپیہ چار آنے (عہ)

مولوی عبدالباسط صاحب ایم اے فیلو مسلم یونیورسٹی علیگڈھ سے طلب فرمائیے

اقبال کیلنڈر: یہ خوبصورت کیلنڈر علامہ اقبال کی عکسی تصویر سے مزین ہے۔ اس میں تعطیل کے دن خاص طور پر ظاہر کئے گئے ہیں۔ اور ہر مہینے کے صفحہ پر علامہ اقبال کا کوئی نہ کوئی سبق آموز شعر درج ہے۔ شیخ غلام مصطفیٰ صاحب کتب فروش رنگ محل لاہور سے طلب فرمائیے +

خطوطِ شبلی: یہ کتاب علامہ شبلی نعمانی کے ان خطوط کا مجموعہ ہے جو انہوں نے وقتاً فوقتاً محترمہ زہرا خانم فیضی اور عطیہ بیگم فیضی کے نام لکھے ان خطوط کی حیثیت در اصل پرائیویٹ تھی لیکن علامہ شبلی جیسی جلیل القدر شخصیت کے لوگوں کی زندگی کا کوئی پہلو ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ مجموعہ نہایت دلچسپ اور ادبیات اُردو میں ایک گرانقدر اضافہ ہے۔ شروع میں مولوی عبدالحق صاحب سیکرٹری انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد (دکن) کا ایک عالمانہ مقدمہ درج ہے۔ قیمت صرف ایک روپیہ ہے۔ ظل السلطان بک ایجنسی بھوپال سے طلب فرمائیے +

چمن: یہ چھوٹی تقطیع کی ایک خوبصورت مجلد کتاب ہے جس میں اُردو شاعری کے عناصر اربعہ یعنی میرؔ مصحفیؔ غالبؔ اور امیرؔ کا چیدہ چیدہ کلام جمع کیا گیا ہے اور آخر میں جدید قومی شاعری کے علمبرداروں یعنی حالیؔ۔ شبلیؔ۔ اکبرؔ اور اقبالؔ کا کلام بطور مشتے نمونہ از خروارے جمع کیا گیا ہے۔ کاغذ لکھائی چھپائی عمدہ۔ حجم ۹۴ صفحے۔ قیمت ۵؍ ناظم صاحب شرکت ادبیہ علیگڈھ سے طلب فرمائیے +

پپیہا اور پی کہاں: یہ نظم جناب شام موہن لال صاحب جگر بریلوی کی تازہ تصنیف ہے۔ ہمایوں میں جگر صاحب کا کلام اکثر شایع ہوتا رہتا ہے اور وہ کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ اس نظم کا ایک ایک شعر دلکش ہے اور سرا پا درد میں ڈوبی ہوئی ہے۔ حجم ۱۶ صفحے قیمت درج نہیں +

جناب شام موہن لال صاحب جگر تحصیل دھام پور ضلع بجنور سے طلب فرمائیے +

صبحِ وطن: پنڈت برج نرائن صاحب چکبست لکھنوی کا مجموعۂ کلام اس نام سے باہتمام خاص شایع ہوا ہے۔ چکبست کی شاعری محتاج تعارف نہیں۔ امید ہے کہ اس کتاب کو شائقین ہاتھوں ہاتھ لینگے۔ کتاب مجلد ہے اور اس میں چکبست کی تصویر شامل ہے۔ کتابت طباعت اور کاغذ نہایت نفیس ہے۔ بڑی تقطیع پر شایع ہوئی ہے۔ حجم ۲۰۹ صفحہ قیمت درج نہیں۔ کالی کے ستر صاحب پبلشر صبحِ وطن انڈین پریس الہ آباد سے طلب فرمائیے +

مخزن کا دوبارہ اجراء: ہمیں یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی ہے کہ لاہور کا قدیم اور مشہور رسالہ مخزن اس وقت کے سب سے زیادہ مقبول عام شاعر حضرت حفیظ جالندھری کی ادارت میں دوبارہ اشاعت پذیر ہونے لگا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ حضرت حفیظ کی خداداد قابلیت اس رسالہ کی ترقی کا باعث ہوگی اور یہ رسالہ بہت جلد دوبارہ اپنی پرانی عظمت حاصل کر لیگا

فہرست مضامین

جلد ۱۱ | بابت ماہ اپریل ۱۹۲۷ء | نمبر ۴

صلائے عام

"ہمایوں" سال بھر کیلئے صرف تین روپے میں

فروری کے "ہمایوں" میں ہم نے غیر مستطیع طلبہ کو "ہمایوں" مفت بہم پہنچانے کا اعلان کیا تھا، لیکن چونکہ وہ رقم جو ہمیں اس غرض کے لئے موصول ہوئی تھی محدود تھی۔ ہم بہت سی فرمائشوں کی تعمیل سے قاصر رہے۔

اب ہم عام شائقین کے فائدہ کیلئے اعلان کرتے ہیں کہ اپریل کے مہینے کے اندر جو اصحاب "ہمایوں" کے خریدار بنیں گے، اُن سے **پانچ روپے کی بجائے صرف تین روپے سالانہ چندہ لیا جائے گا**

اس عظیم الشان رعایت سے فائدہ اُٹھانے کیلئے آج ہی اپنی اور اپنے دوستوں کی فرمائشیں بھجوا دیجیئے۔ ۳۰۔ اپریل کے بعد کسی فرمائش کی طرف توجہ نہ کی جائے گی۔

مینیجر "ہمایوں" ۳۰۔ مزنگ روڈ لاہور

جہاں نما

دنیا کی آبادی - سرچارلس کلوز نے رائل جیوگرافیکل سوسائٹی کے خطبۂ صدارت میں دنیا کی آبادی کے متعلق جو اعداد و شمار پیش کئے ہیں اُن کا اقتباس حسب ذیل ہے۔

سنہ ۱۹۲۲ء میں کرۂ ارض کی آبادی ۱۸۵۹ ملین تھی اور اس میں ۲۰ ملین فی سال کے حساب سے اضافہ ہو رہا تھا چنانچہ سنہ ۱۹۲۷ء کے آخر میں آبادی تقریباً ۱۹۵۷ ملین ہو جائے گی۔ صحرا اور منجمد خطوں کو چھوڑ کر دنیا کی آبادی ۳۸ فی مربع میل یا ۱۴٫۶ فی مربع کیلومیٹر ہے۔ مختلف ممالک میں آبادی کی وسعت مختلف ہے۔ انگلستان اور ویلز میں ۲۵۱ بلجیم میں ۲۴۵- اٹلی میں ۱۳۰! جرمنی میں ۱۲۷ فرانس میں ۷۱ سکاٹلینڈ میں ۶۳ آئرش فری سٹیٹ میں ۴۴ سپین میں ۴۲ روس میں ۲۴ اور ناروے میں ۹ نفوس فی مربع کلومیٹر آباد ہیں۔

انسان کے قویٰ پر نرم اور سخت بستر کا اثر - ڈاکٹر ڈونالڈ لیرڈ نے جو کالگیٹ یونیورسٹی میں نفسیات کے پروفیسر ہیں متعدد تجربوں سے ثابت کیا ہے کہ جو لوگ دماغی کام کرتے ہیں اگر وہ نرم بستر پر سوئیں تو اُنکے تھکے ہوئے اعضا بہت جلد دوبارہ تازگی حاصل کر لیتے ہیں۔

سخت اور نرم بستر پر سونے والے طلبہ کے دماغی قویٰ کا امتحان کرنے پر معلوم ہوا کہ نرم بستر پر سونے والے آدمی کا دماغ چھ گھنٹے میں اسی قدر قوت اور تازگی حاصل کر لیتا ہے جتنا سخت بستر پر سونے والے آدمی کا دماغ آٹھ گھنٹے میں۔ گویا نرم بستر پر سونے سے انسان کو کام کے لئے دو گھنٹے کی بچت ہو سکتی ہے۔

موت کا درخت - بمبئی کرانیکل راوی ہے کہ چند لوگ وسط افریقہ کو ایک ایسے درخت کی تلاش میں جا رہے ہیں جس کو وہاں کے لوگ "موت کا درخت" کہتے ہیں۔ جو شخص اس درخت کے سایہ میں بیٹھے اس پر بے ہوشی سی چھا جاتی ہے اور اگر وہ مناسب وقت پر وہاں سے اٹھا نہ دیا جائے تو اسکی جان نکل جاتی ہے اس علاقہ میں جس مجرم کیلئے موت کی سزا تجویز ہو، اسکو مشکیں کس کر اس درخت کی شاخوں کے نیچے ڈال دیتے ہیں۔

"موت کے درخت کا خیال بہت پرانا ہے دیکھئے تحقیق سے یہ خیال کہاں تک درست ثابت ہوتا ہے جاوا کے ایک درخت

کے متعلق اس سے بھی زیادہ خوفناک روایت منسوب تھی، وہ یہ کہ جو شخص اس درخت سے دس بارہ میل کے فاصلہ میں بھی آ جائے اسکا مرنا یقینی ہے اب معلوم ہوا کہ اس روایت کی بنیاد بہت کمزور تھی حقیقت صرف یہ تھی کہ اس درخت سے وہاں کے لوگ ایک قسم کا زہریلا رس حاصل کرتے تھے جس سے وہ اپنے تیروں کو بھگو کر مسموم کیا کرتے تھے۔ اس قدر تو حقیقت تھی۔ باقی سب روایات بے بنیاد تھیں۔

مختلف جانوروں کی عمر۔ کچھ عرصہ ہوا جب ایک بلی ۲۵ سال کی عمر میں مری، تو حیوانات کے ایک طبیب نے بتایا کہ عام طور پر بلی کی عمر ۱۴ سال کی ہوتی ہے، گویا انسان کی جوانی بلی کا بڑھاپا ہے

مختلف کیڑوں، مکوڑوں، مچھلیوں، پرندوں، درندوں اور انسانوں کی عمر کی تحقیق ایک دلچسپ موضوع ہے بعض کیڑوں کی عمر صرف ایک گھنٹہ اور بعض وقت زیادہ سے زیادہ ایک یا دو دن ہوتی ہے اسی قلیل عرصہ میں وہ بڑھ کر جوان ہوتے ہیں۔ پہلے دوسرے اور تیسرے جھول میں انڈے دیتے ہیں اور اس کے بعد مرجاتے ہیں۔ سرجان لبک نے تحقیق کی تھی کہ اگر چیونٹی کی حفاظت کی جائے تو یہ ۱۴ سال تک زندہ رہ سکتی ہے یہاں کم عمر والے جانوروں کا مختصر ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ پھد کی بمشکل دو سال تک زندہ رہتی ہے خرگوش چار یا پانچ سال۔ طوطی ۱۰ سال۔ بھیڑ اور کستورا ۱۲ سال۔ بلی اور مرغی ۱۴ سال تیتر چکور، کتا، اور بکری ۱۵ سال اور بلبل اور چنڈول اٹھارہ سال تک زندہ رہتے ہیں

اس سے زیادہ دیر تک زندہ رہنے والے جانوروں میں سے کبوتر ۲۰ سال۔ سارس، پیرولا اور مور ۲۴ سال۔ گائے اور سؤر ۲۵ سال اور گھوڑا ۲۷ سال زندہ رہتا ہے۔ رچکاوک کی عمر ۴۰ سال کو پہنچتی ہے۔ انسان کی عمر بالعموم ساٹھ ستر سال کی سمجھی جاتی ہے لیکن اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی عمر کا اوسط تقریباً چالیس سال ہے۔ اتنی ہی عمر چڑیا۔ اونٹ اور شیر کی ہوتی ہے ہنس اور حواصل کی انتہائی عمر ۵۰ سال اور طوطے اور بگلے کی ۶۰ سال ہوتی ہے لیکن کوا، قاز، اور باز سو سال کی عمر کو پہنچ کر جوان ہوتے ہیں۔ بعض آبی جانوروں کی عمریں بھی بہت لمبی ہوتی ہیں۔

تپ محرقہ کیلئے حفظ ماتقدم۔ "پاسچیور انسٹیٹیوٹ" پیرس کے ایک حاذق طبیب نے تپ محرقہ سے بچنے کیلئے ایک عجیب طریقہ ایجاد کیا ہے اسکا دعویٰ ہے کہ اس بیماری کے مرے ہوئے جراثیم نگلنے سے ہر شخص آیندہ اس سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ پولینڈ کے ایک شہر لوڈز میں جسکی آبادی پانچ لاکھ کے قریب ہے، صفائی کی غیر موجودگی اور مکانوں کی خرابی کی وجہ سے یہ وبا عام طور پر پھیلی رہتی ہے وہاں کے ۱۹۶۳۴ باشندوں کو یہ جراثیم نگلوائے گئے۔ اسکے بعد شہر کے سب سے زیادہ خراب حصہ کی صحت کا معائنہ کیا گیا جہاں ۲۳۹۱۸

باشندے آباد تھے ان میں سے ۲۰۸۶۶ آدمی تپ محرقہ کے جراثیم نگل چکے تھے معلوم ہوا کہ حفظ ماتقدم کے بعد کل ۹۴ آدمی تپ محرقہ میں مبتلا ہوئے ان میں سے ۷۴ ایسے تھے جنہوں نے جراثیم کا استعمال نہیں کیا تھا۔

طیور محبت - جاپانی نوجوانوں میں یہ رسم عام رواج پا رہی ہے کہ منگنی کے اعلان کے بعد وہ اپنی منگیتر کو تحفہ کے طور پر "محبت کے پرندوں" کا ایک جوڑا پنجرہ میں ڈال کر پیش کرتے ہیں۔ یہ رسم جس قدر ہمہ گیر ہو رہی ہے اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ لندن کے ایک تاجر نے حال ہی میں ایک ملاقات کے دوران میں ذکر کیا کہ جاپانی تاجروں نے اسکی دوکان سے ۵۰۰۰ طیور محبت کی درآمد کی ہے اس سے قبل وہ ۸۰۰۰ پرندوں کی برآمد کر چکا تھا۔ یہ پرندے آسٹریلیا اور فرانس کے جنوب کی طرف ایک علاقہ میں پائے جاتے ہیں۔ اور ایک ایک جوڑے کی قیمت ۲۵۰ اور ۳۵۰ پاونڈ تک ہوتی ہے

دنیا کا دولتمند ترین بازار - نیویارک کی "پارک ایونیو ایسوسی ایشن" کا دعویٰ ہے کہ دنیا کا سب سے زیادہ دولتمند بازار "پارک ایونیو" ہے جہاں ۴۰۰۰ کروڑپتی آباد ہیں۔ اگرچہ اس بازار کی عمر صرف دس سال کی ہے۔ کیونکہ اس کے اکثر سربفلک قصر اسی مدت کے اندر تعمیر ہوئے ہیں۔ لیکن اب اس کی دولت "ففتھ ایونیو" سے بدرجہا زیادہ ہے جو اس سے قبل نیویارک کا سب سے زیادہ شاندار اور پررونق حصہ سمجھا جاتا تھا۔ پارک ایونیو ایسوسی ایشن کی تصریح کے مطابق وہاں کے مصارف کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ جو شخص وہاں ۱۰۰۰۰ پاونڈ سالانہ کی رقم میں گزارا کرنا چاہے وہ اپنے آپ کو مفلس محسوس کرتا ہے مکانوں کی ایک ایک منزل کا کرایہ ۱۵۰۰۰ پاونڈ سے لیکر ۱۰۰۰۰۰ پاونڈ تک ہے۔ عمارتوں کی ایک ہی لنگ میں بعض اوقات پچاس پچاس۔ ساٹھ ساٹھ کروڑپتی بلکہ ارب پتی بستے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ ان کے روزانہ مصارف کا اندازہ یوں ہو سکتا ہے۔

پھول ۳۰۰۰ پاونڈ، بجرے ۵۰۰، ۵ پاونڈ، عورتوں کے ملبوسات ۴۰۰۰ پاونڈ۔

ان کے سالانہ مصارف کی تفصیل یوں ہے :-

تھیئٹروں کے ٹکٹ اور سیر و تفریح ۱۰۰۰۰۰۰ پاونڈ۔ ہوٹلوں کا خرچ ۲۰۰۰۰۰ پاونڈ۔ موٹر کار ۲۰۰۰۰۰ پاونڈ۔ سمور کے کپڑے ۳۰۰۰۰۰ پاونڈ اور گھر میں کھانے کا خرچ ۴۰۰۰۰ پاونڈ ہے۔

ایسوسی ایشن کا اندازہ ہے کہ پارک ایونیو میں رہنے والے ۱۶۰۰۰ مردوں اور عورتوں کا سالانہ خرچ ۳۶۰۰۰۰۰۰ پاونڈ تک پہنچتا ہے۔

ناکام شادیاں - کاؤنٹ ہرمان کیرلنگ کے قول کے مطابق ناکام شادیاں باعث فلاح ہوتی ہیں اس نے اس بیان کی تائید میں حسب ذیل استدلال پیش کیا ہے۔

اکثر بڑے بڑے آدمیوں کی پیدائش ناکام شادیوں کا نتیجہ ہوتی ہے۔ ناکام شادی میں طرفین کامیاب شادی والوں کے مقابلہ میں اپنی روح کو کم نقصان پہنچاتے ہیں۔ ناکام شادی میں ذاتی ترقی کا موقعہ ملتا ہے بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو کامیاب زندگی کی مسرتوں کے نشے میں بیوقوف نہیں بن جاتے جو شادیاں تجربہ کار رشتہ داروں یا دوستوں کے توسط سے ہوتی ہیں بالعموم معاشقہ کی شادیوں سے زیادہ خوشی کا سرچشمہ ثابت ہوتی ہیں جہاں اقتصادی مفاد زندگی کا مقصد ہو مثلاً کاشتکاروں اور تاجروں وغیرہ میں "دولت کی شادی" محبت کی شادی سے زیادہ کامیاب ہوتی ہیں۔ محبت کی شادیاں بہت خطرناک ہوتی ہیں کیونکہ بجز اُن لوگوں کے جن کے دل و دماغ غیر معمولی طور پہ تربیت یافتہ ہوں، خالص جذبات کی پاسداری کوئی شخص نہیں کرسکتا نہ انکو اہمیت دے سکتا ہے۔ دوستوں کو آپس میں شادی نہیں کرنی چاہئے۔ کیونکہ دو دوستوں کی شادی بہت کم کامیاب ہوتی ہے اس سے زیادہ حماقت اور کوئی نہیں ہوسکتی کہ کوئی ماہر فن مرد کسی ماہر فن عورت سے شادی کرلے ہر شخص کو اپنے سے بلند مرتبہ کے لوگوں میں شادی کی کوشش کرنی چاہیئے

جب کاونٹ ہرمان کیرلنگ نے برنارڈشا سے درخواست کی کہ "کتاب ازدواج" کیلئے جس سے مندرجہ بالا اقتباس لیا گیا ہے کچھ لکھے، تو اس نے جواب دیا کہ اپنی بی بی کی زندگی میں کوئی شخص اس وقت تک شادی کے متعلق اپنی صحیح رائے کے اظہار کی جرأت نہیں کرسکتا جب تک کہ اسے اپنی بیوی سے نفرت نہ ہو جو مجھے نہیں۔

ہر مہینے کے اٹھائیس دن - "انٹرنیشنل فکسڈ کیلنڈر لیگ" کوشش کررہی ہے کہ یکم جنوری ۱۹۲۹ء سے سال کے تمام مہینوں کے اٹھائیس دن مقرر ہوجائیں - یہ لیگ اب تک شمالی یورپ کے اٹھارہ دار السلطنتوں کا دورہ کرچکی ہے۔ اس دورہ کا مقصد یہ ہے کہ اس مسئلہ پر غور کرنے کیلئے مختلف ممالک میں کمیٹیاں بنائی جائیں۔ تجارتی حلقوں اور مزدوروں اور سرمایہ داروں کی انجمنوں کی طرف سے لیگ کو کافی تائید حاصل ہوئی ہے۔ اور امید ہے کہ آئندہ اگست میں جب انٹرنیشنل کانفرنس کا انعقاد عمل میں آئے گا اس مسئلہ کی متفقہ طور پر پوری پوری تائید ہو جائے گی۔

مجوزہ کیلنڈر میں سال کے تمام مہینوں کے ۲۸ دن مقرر ہونگے۔ ہر مہینے کا پہلا دن ہمیشہ اتوار اور آخری

دن ہفتہ ہؤا کرے گا۔ اسی طرح مثال کے طور پر ہمیشہ ہر مہینے کی چوتھی گیارھویں اٹھارھویں اور پچیسویں تاریخ کو بدھ کا دن ہؤا کرے گا۔ اور دن اور تاریخ دونوں کا حساب گھڑیوں اور گھنٹوں پر صحیح صحیح درج ہو سکے گا۔

اس طریقہ سے وقت میں بہت کچھ بچت ہو جائے گی اور اس باقاعدگی کی وجہ سے خانگی اور کاروباری زندگی میں بہت سی آسانیاں پیدا ہو جائیں گی۔ اگر سال کی لمبائی میں کچھ کمی نہ کی گئی تو ایک نیا مہینہ شامل کیا جائے گا جس میں سے بالعموم ایک دن اور لیپ کے سال میں دو دن چھوڑ دیئے جائیں گے۔

سینما کا رواج ۔ آج کل متحرک تصاویر بہ شاغل تفریح میں خاص اہمیت حاصل کر رہی ہیں۔ اس بات کا اس بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ صرف امریکا نے آجکل متحرک تصویر کیلئے ۳۰۰،۰۰۰،۰۰۰ پاؤنڈ کا سرمایہ وقف کر رکھا ہے اور متحرک تصاویر پیدا کرنے والی تمام بڑی بڑی کمپنیاں ابھی اس سرمایہ میں برابر اضافہ کئے جا رہی ہیں۔ یہ حال صرف امریکا ہی کا نہیں، بلکہ اس شوق کی لہر دنیا بھر میں دوڑ چکی ہے۔ انگلستان، فرانس، جرمنی، اٹلی غرضکہ تمام ملک متحرک تصاویر پر بیش از بیش روپیہ صرف کر رہے ہیں۔ آسٹریلیا اور جاپان بھی اس شوق میں دوسروں سے پیچھے نہیں۔ بلکہ ہندوستان میں بھی متحرک تصاویر پر روز بروز زیادہ سرمایہ صرف ہو رہا ہے اور امید ہے کہ آہستہ آہستہ یہاں بھی اعلیٰ درجہ کی فلمیں تیار ہونے لگیں گی۔

بہروں کیلئے خاموش ہسپتال لندن میں ثقل سماعت کے مریضوں کے لئے ایک نیا ہسپتال کھلا ہے۔ اس ہسپتال میں ایک "خاموش کمرہ" بنایا گیا ہے جہاں اس قدر خاموشی طاری رہتی ہے کہ اگر زور سے آنکھیں بند کی جائیں، تو پلکوں کی جھپک کی آواز بھی سنائی دیتی ہے۔ اس کمرے کی دیواریں، فرش اور چھت اس طرح بنائی گئی ہے کہ بیرونی آوازیں ان میں سے کسی طرح گزر کر اندر داخل نہیں ہو سکتیں۔ یہاں ثقل سماعت کے مختلف مدارج کی غیر معمولی طور پر صحیح تشخیص بہ آسانی ہو سکے گی۔

ہسپتال میں بیک وقت چالیس مریضوں کے رہنے کی گنجائش ہے۔ اس کے قیام کیلئے لندن کے ایک تاجر نے ۵۰،۰۰۰ پاؤنڈ کا عطیہ دیا ہے۔

سانپ کے زہر کا علاج - لنکا میں زہریلے سانپ کا علاج عام طور پر کیلے کے درخت کے رس سے کیا جاتا ہے۔ کیلے کے درخت کی گدی کو نچوڑتے ہیں۔ اور اس میں سے رس کے ایک یا دو پیالے حاصل کر کے اس شخص کو پینے کے لئے دئیے جاتے ہیں جسے سانپ نے کاٹا ہو۔ کہتے ہیں کہ اس سے ۹۴ فی صدی مار گزیدہ شفا پا جاتے ہیں۔ یہ بھی مشہور ہے کہ کیلے کے درختوں کے آس پاس سانپ نہیں پائے جاتے۔

گانجھا پینے والوں کے حقہ کی تہ میں سیاہ رنگ کی ایک ٹکیہ بن جاتی ہے۔ اگر اس کو پتھر پر گھس کر اس کا پانی سانپ کے زخم کے اندر داخل کیا جائے تو بہت مفید ثابت ہوتا ہے۔ زخم سے سرخ خون نکالکر اس میں ٹکیا کا پانی داخل کرنا چاہئے۔ بعض اوقات زخم میں سے سُرخ خون نہیں نکلتا اس وقت سرخ خون نکالنے کیلئے زخم کے قریب ادھر اُدھر پچھنے لگانے پڑتے ہیں۔ سانپ کے کاٹنے کے بعد اس قسم کا ٹیکا لگانے میں جس قدر توقف زیادہ ہو اُسی قدر سرخ خون زخم سے دور نکلتا ہے۔

تصاویر

بابر باغ لگا رہا ہے یہ تصویر عہدِ مغلیہ کی مصوری کا ایک دلکش نمونہ اور اکبر کے دربار کے دو مصوروں کے موقلم کا کارنامہ ہے۔ مصوروں میں سے ایک ننھا تھا جس نے انسانی تصویریں بنائیں اور دوسرا بشن داس جس نے باقی تمام مرقع تیار کیا۔

تصویر میں ایک باغ لگایا جا رہا ہے۔ اور شہنشاہ بابر اس کی نگرانی کر رہا ہے۔

امید اور خیرات یہ دونوں تصویریں دراصل سر جوشوا رینلڈز کے ایک مشہور سلسلۂ تصاویر سے اخذ کی گئی ہیں۔ اس سلسلے کی اور تصویریں، ایمان، انصاف، دانائی، اعتدال، حلم وغیرہ ہیں رینلڈز نے یہ تصاویر اٹلی کے بعض مصوروں اور بالخصوص ریفیل اور کاریجیو کے مقابلہ میں بنائی تھیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس کی تصویروں کی صفائی پاکیزگی اور دلکشی سے انکار نہیں ہو سکتا۔ اصل تصاویر کے رنگ نہایت دلکش ہیں اور ان کو غیر معمولی شہرت حاصل ہو چکی ہے۔
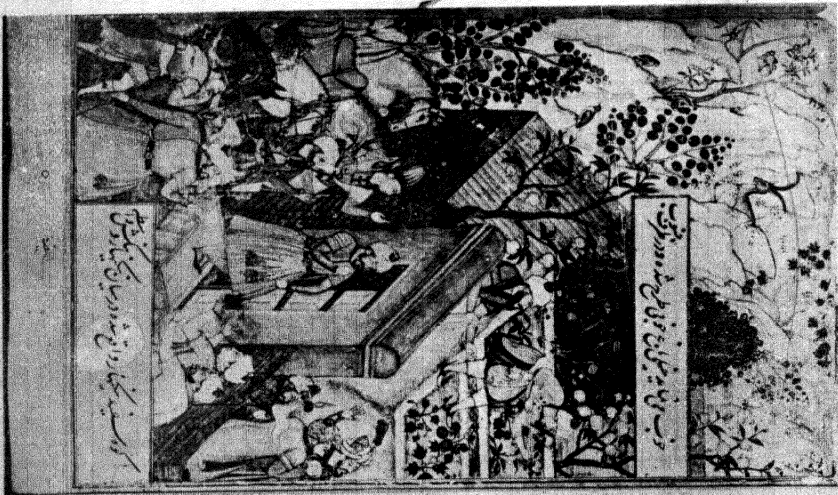
بابر باغ لگا رہا ہے

امید ۲ خیرات ۳
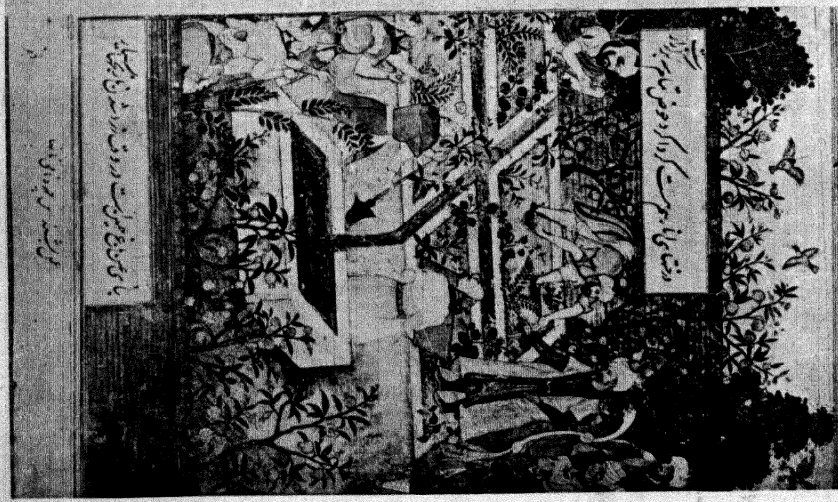
عقلمند انگریزو!

میں ایک "بیوقوف" ہندوستانی ہوں۔ انتہا پسند نہیں۔ اعتدال پسند نہیں۔ گرم نہیں۔ نرم نہیں۔ تمہارا دلدادہ نہیں۔ تمہارا دشمن نہیں!

میں صرف دیکھ رہا ہوں کہ تم پردیسی رسے چل کے اس ملک میں آئے ہو۔ تم کہتے ہو ہم اس ملک کے فائدے کیلئے یہاں آئے ہیں۔ ہندی کہتے ہیں نہیں اپنے نفع کے لئے آئے ہو! میں دیکھتا ہوں کہ تمہارے اپنے نفع میں کبھی کبھی ان کا نفع بھی ہے۔ اور جب ان کو نقصان پہنچتا ہے تو دراصل وہ تمہارا گھاٹا بھی ہے تم جو یہاں آئے ہو!

یہ لوگ تو صدیوں سے ایسے ہی رہتے آئے ہیں تمہارا آنا اور یہاں رہنا انہیں شاق نہیں۔ تمہارا آنا اور چپ چاپ بیٹھے رہنا انہیں برا معلوم ہوتا ہے۔ ان سے بولو، ہنسو، کھیلو، اٹھو بیٹھو جب یہ سمجھیں کہ تم بھی انہیں کی طرح کے آدم زاد ہو۔ لیکن تم نے تو کچھ ایسی چپ سادھی ہے کہ ان کو شور مچاتے ہی بنتی ہے۔

یہ خوش نہ ہوں، نہ ہوں لیکن اگر تم منہ سے کچھ بولو محض منہ سے سگریٹ کا دھواں نکالنا نہیں فقط پاؤں سے چھڑی کا ٹھکرانا نہیں تو میرا ذمہ کہ کم از کم میں تو تمہارا دلدادہ ہو جاؤں +

میں ان لوگوں کو یقین دلاؤں کہ تم بول بھی سکتے ہو، باتیں بھی کرتے ہو، ہنستے بھی ہو، موقع آئے تو رونے پر بھی آمادہ ہو دو چار آنسو بہانے کو بھی تیار رہو پھر کیا؟ سب غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی! تم اس گھر میں آئے ہو اور گھر والوں سے نہیں بولتے! یہ ٹھیک نہیں + ہمارے گھر آئے ہو تو کبھی ہم کو بھی اپنے گھر بلا بھیجو۔ یا ہم آ جائیں تو ہمارا خیر مقدم کرو بھائیو! دنیا کا کام اسی طرح چلتا ہے!

"بیوقوف" ہندوستانی

راگنیاں

میں تجھے کچھ دینا چاہتی ہوں۔ میرے بچّے کیونکہ ہم دنیا کی ندی میں بہے چلے جا رہے ہیں! ہماری زندگیاں الگ الگ ہو جائیں گی اور ہماری محبت بھول جائے گی۔

لیکن میں ایسی نادان نہیں کہ سمجھوں کہ تیرے دل کو اپنے تحائف سے خرید لوں گی۔ تو ابھی نوعمر ہے۔ اور تیرا رستہ طویل ہے اور تو اس محبت کو جو ہم تجھے دیتے ہیں ایک گھونٹ کر کے پی جاتا ہے اور منہ موڑ کر ہم سے دُور بھاگ جاتا ہے۔

تیرے کھیل ہم سے جدا ہیں۔ تیرے ساتھی جُدا۔ پھر کیا حرج ہے اگر تیرے پاس ہمارے لئے وقت نہیں اگر تجھے ہمارا خیال نہیں۔ ہمیں تو بڑھاپے میں کافی فرصت ہے کہ گذرے ہوئے دنوں کو گنا کریں اور دل میں یاد کیا کریں کہ ہم نے اپنے ہاتھوں کیا کچھ کھو دیا۔

دریا سب رکاوٹوں کو توڑ کر تیز بہے جاتا ہے اک گیت گاتا ہوُا۔ لیکن پہاڑ کھڑا رہتا ہے اور یاد رکھتا ہے اور اپنی محبت کیساتھ گویا اس کے ساتھ ساتھ چلتا ہے!

"میں کہاں سے آیا ہوں مجھے تم نے کہاں سے اٹھا لیا ہے؟" ———— بچّے نے اپنی ماں سے سوال کیا۔

اس نے کچھ روتے کچھ ہنستے ہوئے اور بچّے کو سینے سے لگاتے ہوئے جواب دیا کہ تو میرے دل میں دل کی تمنا بن کر مستور تھا۔ میرے پیارے! تو میرے بچپن کے کھیلوں میں تو میری گڑیوں میں چھپا تھا۔ میری ساری امیدوں میں میری الفتوں میں میری تمام زندگی میں میری ماں کی زندگی میں بھی تو ہی تھا۔ اس غیر فانی ہستی کی آغوش میں جو ہمارے گھر کی نگہبان ہے تو نے مدتوں پرورش پائی۔

جب لڑکپن کے دنوں میں میرا دل اپنی پنکھڑیاں کھول رہا تھا تو تو اسکے پس و پیش اک خوشبو کی طرح منڈلاتا تھا۔ تری لطیف نزاکت میری جوانی کے اعضا میں شگفتہ ہوئی جس طرح آسمان پر طلوع آفتاب سے قبل شفق پھولتی ہے۔

آسمان کا پہلا دلبر صبح کی روشنی کے ساتھ زائیدہ تو تھا کہ تو حیاتِ عالم کی آبجو میں بہتا ہوُا آیا اور آخر میرے دل پر آکر لنگر انداز ہو گیا۔ جب میں تیرے چہرہ کو دیکھتی ہُوں حیرت مجھ پر قابو پا لیتی ہے۔ تو جو سب کا تھا

اب میرا بن گیا ہے۔

میں تجھے کھینچ کر اپنے سینہ سے لگا لیتی ہوں مبادا میں تجھے کھو بیٹھوں۔ میری ان پتلی باہوں میں کونسا طلسم دنیا بھر کا خزانہ سمیٹ کر لے آیا ہے؟"

تیری آنکھوں میں یہ آنسو کیوں ہیں میرے بچّے؟

کتنے برے ہیں یہ لوگ کہ ہر وقت تجھے جھڑکتے رہتے ہیں؟

تو نے لکھتے وقت اپنی انگلیوں اور چہرے کو سیاہی سے خراب کر لیا ـــــ کیا وہ اس لئے تجھے غلیظ کہتے ہیں؟

تف ہے اُن پر ـــــ کیا وہ چودہویں کے چاند کو غلیظ کہیں گے کیونکہ اس نے اپنے چہرے پر سیاہی مل لی؟

تجھے وہ ہر چھوٹی سی بات پر الزام دینے لگتے ہیں میرے بچّے!

وہ ہمیشہ بلا وجہ تیرے قصور گنواتے رہتے ہیں۔

تو نے کھیلتے ہوئے اپنے کپڑے پھاڑ لئے۔ کیا اسی لئے وہ تجھے ناصاف کہتے ہیں؟

تف ہے ان پر ـــــ وہ خزاں کی اک صبح کو کیا کہیں گے جو اپنے بادلوں کے ہزاروں ٹکڑوں میں سے مسکراتی ہو؟

تو اُن کے کہنے کی مطلق پروا نہ کر میرے بچّے! وہ ناحق تیری شرارتیں گنتے رہتے ہیں۔

ہر شخص جانتا ہے کہ تجھے میٹھی چیزیں پیاری ہیں۔

کیا اسی لئے وہ تجھے طامع کہتے ہیں؟

تف ہے اُن پر ـــــ تو پھر وہ ہمیں کیا کہیں گے جو تجھے اتنا پیار کرتے ہیں؟

گلچیں

شکنتلا

رائے بہادر پروفیسر اے۔سی بکرجی۔ایم۔اے، آئی۔ای۔ایس نے ایک چھوٹی سی کتاب بنام "ہندو علم ادب کی ہیروئنز" لکھی ہے جس میں آپ نے نہایت خوبی اور صفائی سے۔شکنتلا۔ساوتری۔دمینتی۔اور سیتا کے زبردست کیریکٹر۔ایک نہایت نفیس اور دلچسپ طریقہ سے پیش کئے ہیں۔اردو میں جہاں تک مجھے علم ہے ایسی کتابیں کمیاب ہیں۔اگر ایسی چھوٹی چھوٹی کتابیں اردو زبان میں لکھی جائیں تو علاوہ علم ادب کا ایک بہترین ذخیرہ جمع ہونے کے یہ ملک کے اخلاق پر ایک معجزہ نما اثر ڈال سکتی ہیں۔میں نے اس کا اردو ترجمہ کیا ہے مصنف کی عرقریزی کی داد میں کما حقہٗ نہیں دے سکا حتی القدور میں نے کوشش کی ہے کہ کہیں اصل مطلب فوت نہ ہونے پائے ان میں سے پہلی کہانی نذر ناظرین ہمایوں ہے۔

ہندو علم ادب اور انگریزی علم ادب کی ہیروئنز میں ایک بین تفاوت ہے۔ہندو علم ادب کی اکثر ہیروئنز صرف شاعرانہ تخیلات کا نتیجہ ہی شمار نہیں ہوتیں۔بلکہ وہ حیا و عصمت کی آسمانی دیویاں تسلیم کی جاتی ہیں جو انسانی صورت میں اس سرزمین فانی پر کچھ دن بسر کرنے کے لئے اتریں۔یہی وجہ ہے کہ ان کا کیریکٹر بیان کرتے وقت نامعلوم طور پر خرق عادت فسانے خواہ مخواہ درمیان آجاتے ہیں۔فوق عادت داستانوں اور اصل واقعات کو آپس میں اس طرح ملایا گیا ہے۔کہ اصل کو نقل سے ممکن کو ناممکن سے اور قابل وقوع کو ناقابل وقوع سے جدا بیان کرنا بیحد دشوار ہے۔

قدیم سنسکرت کی رزمیہ نظموں میں سے رامائن اور مہابھارت کے ہیروز اور ہیروئنز سے زیادہ دل آویز جوڑے کہیں نہیں مل سکتے۔یہ دونوں نظمیں ہندوؤں کی شجاعت کا نچوڑ معلوم ہوتی ہیں۔میں نے اسی لئے اپنی ہیروئنز ان دونوں نظموں میں سے لی ہیں اور بالخصوص مہابھارت سے، کیونکہ جہاں تک کیریکٹر بیان کرنے کا تعلق ہے سنسکرت کی نظموں میں سے کوئی نظم مہابھارت سے لگا نہیں کھا سکتی میں نے بوقت انتخاب کوئی اصول اور ترتیب مضمون میں کوئی طریقہ خاص مدنظر نہیں رکھا شکنتلا کو پہلے صرف اسی لئے لیا ہے کہ اسکی کہانی مہابھارت کی پہلی جلدیں میں موجود ہے اگرچہ آجکل شکنتلا کالیداس کے مشہور ڈرامہ کی وجہ سے اور اس بھرت کی ماں ہونے کی وجہ سے زیادہ مشہور ہے جسکی اولاد نے کورو اور پانڈو کی طرف سے جنگ مہابھارت میں حصہ لیا۔

اگر ہم شکنتلا کے کیریکٹر کے ہر ایک وصف کو جداگانہ دیکھیں۔تو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں وہ تمام اوصاف پائے جاتے ہیں جن کو دیکھ کر ہم نسوانی زندگی کی اعلیٰ منزل کا ادراک کرتے ہیں سو وہ خوبصورت ہے باعصمت ہے۔باحیا ہے۔

شرمیلی ہے۔ شیریں بیان ہے۔ نازک ہے۔ وہ تکالیف کو صبر اور تحمل کے ساتھ برداشت کرتی ہے اور آسودگی میں آپے سے باہر نہیں ہو جاتی۔ صرف اسی پر اکتفا نہیں اس میں عصمت اور شرافت کے وہ عظیم ترین جوہر ہیں جو الفاظ میں بوجوہ بیان نہیں ہو سکتے۔ بسبب قلت الفاظ ہم اسے آسمانی حور کہنے پر اکتفا کرتے ہیں

اس کی پیدائش پردۂ راز میں ہوئی بچپن کے شروع ہی سے اس کی پرورش ایک رشی آشرم میں ہوئی۔ اسکو سوسائٹی کی ہوا تک نہیں لگی تصنع ایک ثانیہ کے لئے اس کے مزاج میں نہیں آیا۔ بجائے دنیاوی تکلفات کے اُسے تاثرات قدرت نے اپنے ہاتھوں عطا کئے۔ وہ جنگلی پھولوں کے مانند جنگل میں پیدا ہوئی اور پروان چڑھی وہ جنگلی پھولوں اور کلیوں کو اپنا بہن اور بھائی تصوّر کرتی ہے۔ انسان اس کو شکسپیر کی میرانڈا کے ساتھ تشبیہ دیئے بغیر نہیں رہ سکتا بلکہ اگر سچ پوچھو تو صنفِ نازک کی صف میں شکنتلا کے مقابلہ کی عورت لانا محال ہے۔

میرانڈا کی طرح وہ اِن پریوں سے ملتی جلتی ہے جنکو قدیم شعرا کا تخیل سنسان جنگل کی گہرائیوں، سرسبز وادیوں اور شفاف چشموں کے کنارے مجتمع دیکھتا ہے۔ اسکی دلربا سادگی اس کی معصوم دوشیزگی۔ اس کی سوسائٹی کی زبان سے قطعی لاعلمی۔ اور زمانے کے رسم و رواج سے بے خبری بعینہٖ ویسی ہی ہے جیسی کہ میرانڈا کی۔ کیونکہ میرانڈا کی طرح وہ دختر قدرت ہے۔ نہ کہ شہری تہذیب کی شیدا۔ ایک وصف میں وہ میرانڈا سے ممتاز نظر آتی ہے میرانڈا کی پیدائش ایسی جگہ ہوئی جہاں مقدس راگ گائے جاتے تھے۔ برخلاف اس کے شکنتلا ابتدائے پیدایش سے ایک مقدس کٹیا کی بابرکت حدود کے اندر رہی میرانڈا کی طرح شکنتلا بھی پہلی ہی ملاقات میں اپنے عاشق کو دل دینے اور اس کے ساتھ شادی کرنے میں پس و پیش نہیں کرتی بلکہ جب دشونتا اسے کہتا ہے نازنین تو ضرور کسی راجہ کی بیٹی ہے۔ تو میری چاہیتی بیگم بنے گی؟ تو وہ اپنی محبت کو ریاکاری سے نہیں چھپاتی بلکہ جواب دیتی ہے "اگر تم سچّا وعدہ کرو کہ میرا لڑکا تمہارا جانشین ہوگا تو میں تمہاری بیگم بن جاؤں۔ راجہ نے سچّا وعدہ کیا کہ ایسا ہی ہوگا۔ اور شکنتلا کو ہاتھ سے پکڑ کر بطریق گندھرو واہ شادی کر لی۔ یہ طریقہ اب تک ہندو اصول مذہب میں تسلیم شدہ ہے۔ اس واقعہ کے بعد مغربی اور مشرقی ہیروئنز کی زندگیوں میں مشابہت بتدریج زائل ہوتی گئی ہے۔ درحقیقت شکنتلا کی زندگی کا یہی دور ادبیات میں لاثانی ہے اور وہ اوصاف اور خوبیاں اسی کے حصہ میں ہیں۔ جنھوں نے اس کو ہر ایک ملک اور ہر زمانے میں معزز ممتاز اور ہر دلعزیز بنا دیا ہے۔

دارالسلطنت میں واپس آکر دشونتا نے **شکنتلا** کو فراموش کر دیا شکنتلا کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہو چکا تھا جو شکنتلا کے دھرم باپ رشی **کانوا** کی زیر نگرانی پرورش پا رہا تھا۔ شکنتلا نے اپنی تنہائی کو بہادرانہ ہمت سے برداشت کیا۔ اس نے اپنی تنہائی اور خاوند کی بے وفائی کو لمحہ بھر کے لئے محسوس نہ کیا۔ لڑکا چھ سال کا ہو گیا۔ **کانوا** نے سوچا اب

شہزادے کو راج تلک ملنے کا موقعہ ہے۔ اور ماں بیٹوں کو اپنے دو چیلوں کی معیت میں دربار کو روانہ کر دیا۔"

میں ان لوگوں کو جو کالیداس کے ڈرامہ سے واقف ہیں یاد دلانا چاہتا ہوں۔ کہ میں نے اب تک مہابھارت کی کہانی سے باہر قدم نہیں رکھا۔ جس میں راجہ دش ونتا کا کیریکٹر ذرا سبک دکھایا گیا ہے۔ بخلاف اس کے کالیداس نے بطور ایک زیرک اور تیز طبع ڈرامانویس کے تمام بار رشی درواسا کی بد دعا پر ڈال کر اس پہلو کو بچا لیا ہے۔ اس بد دعا نے راجہ کی قوت حافظہ پر غلبہ پا لیا۔ وہ شکنتلا کو اور اپنے وعدوں کو بھول گیا۔ آہنر لوگ اب تک برہمن کی بد دعا سے خائف ہیں۔ اگرچہ ان دنوں یہ اتنی باثر نہیں رہی جتنی رشی درواسا کے دنوں میں تھی۔ شکنتلا دربار میں آئی۔ اسے اندر جانے کی اجازت مل گئی۔ وہ راجہ کے روبرو پیش ہوئی اور کہنے لگی اور اجہ یہ ہے تمہارا لڑکا اب اسے راج تلک دے دو جیسا کہ تم نے پہلی ملاقات میں وعدہ کیا تھا۔" راجہ نے جواب دیا۔ "مجھے کچھ یاد نہیں"، اے جنگلی عورت تو کون ہے۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے تم سے شادی کی ہو۔ میرا تم سے کوئی تعلق نہیں۔"

وہ اپنے پریم پتی کے یہ الفاظ سُن کر رنج اور غصہ میں غرق ہو گئی۔ اس کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ اس کے ہونٹ کانپنے لگے۔ اس کی شعلہ بار آنکھیں ظاہر کرتی تھیں کہ وہ راجہ کو جلا کر راکھ کر دیں گی۔ وہ کچھ دیر چُپ رہی پھر غضب آلود آواز میں یوں گویا ہوئی۔ "او بے شرم راجہ تمہیں سب کچھ یاد ہے۔ تم یہ بہانہ کیوں کرتے ہو کہ مجھے کچھ یاد نہیں!" راجہ نے پہلے سے زیادہ بے رخی اور بے رحمی سے جواب دیا "میں تمہارے لڑکے کی نسبت کچھ نہیں جانتا۔ عورتیں کاذب ہوتی ہیں۔ تمہارا کون اعتبار کرتا ہے؟ کیا تمہیں میرے روبرو یہ ناقابل اعتبار کہانی بیان کرتے ہوئے شرم نہیں آتی؟ جاؤ چلی جاؤ"

شکنتلا نے ان الفاظ کو جس دلیری اور حسن اسلوب سے سنا الفاظ میں طاقت بیان نہیں۔ اس کی کشمکش اپنے لئے نہ تھی۔ بلکہ اس کی جدوجہد عصمت عفت اور پاکیزگی کے لئے تھی۔ علاوہ ازیں اس کی کشمکش اپنے اکلوتے فرزند کے لئے تھی۔ اس نے اسی دلیری اور بیباکی سے جواب دیا "او راجہ مقدس ہے خدا کی ذات۔ اور مقدس ہے ایک پاک وعدہ۔ وعدہ خلافی نہ کر۔ اپنے وعدے کو مقدس جان۔ اگر تو جھوٹ پر اڑا رہا تو خیر میں چلی جاؤں گی کیونکہ تجھ سے آدمی کے ساتھ تعلق رکھنا بے معنی ہے۔ لیکن تیری مدد کے بغیر بھی میرا لڑکا اس سرزمین کی چار کوٹھوں پر راج کرے گا۔"

عموماً ہندوستانی کہانیوں کا خاتمہ خوشی پر ہوتا ہے۔ ہندو مصنفوں کیلئے غم پر ختم ہونے والے فسانے منع ہیں

اس لئے مہابھارت کا شاعر بھی اپنے فسانے کو پھیر دینے کے لئے فوق الفطرت چیز کا استعمال کرتا ہے۔ شکنتلا جانے کو تیار تھی جب کہ اکاش بانی اتری اور راجہ کو اس طرح مخاطب کیا۔" اوو شونتا اپنے بیٹے کو خوش آمدید کہو شکنتلا کو نہ کوسو۔ تم لڑکے کے باپ ہو وہ سچ کہتی ہے" راجہ نے لڑکے کو خوشی سے اٹھا لیا۔ اور شکنتلا کو یہ کہکر تسلی دی کہ اے ملکہ ہماری شادی دنیا سے پوشیدہ تھی۔ اس لئے میں تمہاری عزت بچانے کے لئے پس وپیش کرتا تھا۔

اصل کہانی اسی جگہ ختم ہوتی ہے۔ کالیداس نے شکنتلا کے کیریکٹر کو اسوقت چار چاند لگا دئیے ہیں۔ جبکہ وہ راجہ کو اس کے پاؤں پر گھٹنے ٹیکے کھڑا ایش کرتا ہے۔ اور وہ صرف اس کو معاف ہی نہیں کرتی بلکہ تمام گذشتہ واقعات کا بار یہ کہکر اپنے ذمہ لیتی ہے" اٹھو میرے عزیز خاوند اٹھو یقیناً یہ تمام تکالیف میرے گذشتہ گناہوں کا ثمرہ تھیں ورنہ کس طرح آپ جیسا مہربان ایسا سلوک کر سکتا ہے۔

لطافت اور طاقت کا ایسا عالی شان اجتماع جو ہم شکنتلا کی شخصیت میں پاتے ہیں فی الحقیقت قدرت کا ایک زبردست کرشمہ ہے۔ اور بالخصوص جب کہ اس کو کالیداس جیسے زبردست ڈراما نویس کے قلم حقیقت نگار سے تحریر ہونے کا فخر ہو تو یہ فن ڈراما نویسی کا زبردست معجزہ بن جاتا ہے۔

فضل محمد جگرانوی

قدرت کا ہمہ گیر حُسن

ہم خاص نظاروں کی تعریف میں بیجا مبالغہ کرتے ہیں۔ ہر منظر میں زمین و آسمان کی جائے اتصال اک حیرت کا مقام ہے اور وہ ایک ویران اور بے آب وگیاہ ٹیلے سے اسی طرح دکھائی دیتا ہے۔ جیسے ہمالیہ کی چوٹیوں پر۔ ستارے دیہات کے میدانوں پر اسی درخشانی اور روحانی شان سے چمکتے ہیں جیسے مصر کے مرمری صحراؤں پر نرم ونازک بادل اور صبح وشام کی رنگینیاں کیکر اور پیپل کے درختوں تک کو زینت دے سکتی ہیں۔ ایک منظر اور دوسرے منظر میں فرق کم ہوتا ہے لیکن زیادہ فرق نظارہ کرنے والوں میں ہے۔ کسی خاص نظارے میں کوئی بات بھی ایسی تعجب خیز نہیں ہوتی جیسی خوبصورت یا خوش منظر ہونے کی وہ مجبوری جو ہر نظارے کو لاحق ہوتی ہے۔ قدرت کو بے خبری میں کوئی برہنہ نہیں پا سکتا!

(گلپیں)

غزل

نفس سینے میں تیرے ہر نفس فریاد کرتا ہے
رواں ہے کارواں یعنی جرس فریاد کرتا ہے

اسیرِ بے زباں ہوں نالہ و فریاد کیا جانوں
خموشی دیکھ کر میری قفس فریاد کرتا ہے

قیامت ڈھا رہا ہے نالۂ حسرت نشاں میرا
مری فریاد سے فریاد رس فریاد کرتا ہے

گل و گلزار سے کیا کام مجھ آلودہ دامن کو
کہ نزدیکی سے میری خار و خس فریاد کرتا ہے

نہ ہے عاشق سے تیرے جور کا کیا ہو سکے چارہ
جب اُس کا بس نہیں چلتا ہے بس فریاد کرتا ہے

ہوئے پہلے نہ ہم کیوں واقفِ لطفِ گرفتاری
یہ کہہ کر نوگرفتارِ قفس فریاد کرتا ہے

ہجومِ کلفت و اندوہ سے مشکل ہے دم لینا
ہماری تنگیٔ دل سے نفس فریاد کرتا ہے

کہیں دیکھی بھی ہے اس درجہ غفلت قافلے والو
کہ ہم ہیں نیند کے ماتے جرس فریاد کرتا ہے

نہ دے وحشت تو ہر محفل میں تکلیفِ سخن مجھ کو
بہت نازک ہے فکرِ نکتہ رس، فریاد کرتا ہے

رضا علی وحشت

غزل

کرے سوال جو کوئی اسے گدا کہئے
جو آپ ہی پہ تصدق ہو اس کو کیا کہئے

یہاں تو ایک نیا درد روز بڑھتا ہے
کہاں تک اُن سے تڑپنے کا ماجرا کہئے

ستم ہیں اُن کے کرم ہے کرم ہیں اُن کے ستم
زبان بند ہے کہئے اگر تو کیا کہئے

نکل ہی آتے ہیں آنسو حضور کے آگے
اب اس میں مجھ کو بُرا کہئے یا بھلا کہئے

یہاں یہ شرم کہ عرضِ سوال کیا کیجے
وہاں یہ ضد کہ جگر اپنا مدعا کہئے

جگر بریلوی

دُنیا کی مذہبی و معاشرتی تاریخ پر ایک نظر

(۴)

اِسلام

(عروج و کمال)

اسلام دُنیا کا آخری بڑا مذہب ہے !

ہم دیکھ چکے ہیں کہ ظہورِ اسلام کے وقت دُنیا کی مذہبی و معاشرتی حالت کیا تھی ؟ مغربی ایشیا، مصر، شمالی افریقہ، اور یورپ میں عیسائیت توہمات بُت پرستی اور پاپائی و اسقفی استبداد کا مثلث بن چکی تھی۔ ایران میں مجوسیت کی سادہ و صریح تعلیم مکدر ہو چکی تھی۔ ہند میں وحدانیت کا چراغ بُجھ گیا تھا اور رُوحانیت کی شمع جھلملا رہی تھی۔ چین میں بودھی کنفوشی اور تاؤی اخلاق اوہامِ باطلہ کی آمیزش سے ننگِ مذہب ہو چکے تھے۔ غرض دُنیا کے مختلف مذاہب اِس تاریک وقت میں اپنے اپنے اصُولِ صداقت سے منحرف تھے۔ خلقِ خدا خُدا سے دُور جا پڑی تھی۔ ضمیرِ انسان جادۂ خیر و صداقت سے بھٹک چکا تھا۔ کہ مشیتِ ایزدی نے جو ہمیشہ ایسے آڑے وقتوں میں اصلاحِ مخلوق کے لئے ایک برگزیدہ شخص کو انتخاب کیا کرتی ہے۔ صحرائے عرب کے ایک یتیم بچے کو اس دشوار و اہم کام کے لئے مخصُوص و متعین کیا۔

تیرہ صدیاں ہُوئیں کہ اسلام نے دُنیا کو صداقت کا پیغام دیا۔ کم و بیش چھ صدیوں تک اسلام اپنے قول پر قائم رہا۔ بعد میں چھ صدیاں اُس کے عمل اُس کے ایمان سے برسرِ پیکار رہے۔ گذشتہ صدی میں وُہ پھر اپنی اولین تعلیم کی تلاش میں سرگرداں رہا۔ آنحضرت کی زندگی اسلام کا پیغام تھا۔ خلافتِ راشدہ و عباسیہ کی تاریخ نے اس پیغام کی تشریح کی۔ پھر منگولی و ترکی شعبدہ آزمائیوں، عربوں کی تفرقہ پردازیوں، افریقی و ہندی مُسلمانوں کی وہم پرستیوں اور اکثر مُسلمانوں کی عشرت پسندی اور جہالت نمائی نے اس پیغامِ ربانی کا بُطلان کیا۔ اب کچھ عرصے سے عالمگیر بیداری کے اس زمانے میں اسلام کے نام نہاد خدا کار بھی خوابِ غفلت سے جاگ رہے ہیں۔ پھر اپنے جی سے پُوچھ رہے ہیں کہ بانیٔ اسلام نے ہمارے ذریعے سے دُنیا کو کیا پیغام دیا تھا۔ پھر سیرتِ نبوی کے زرّین صفحات کا مطالعہ کر رہے ہیں کہ وُہ شخصیت جس کی برق پاشی نے ظلمت کو

نور میں تبدیل کردیا گیا تھی؟

پیغمبرِ اسلام ۲۰ اپریل ۵۷۱ء کو مکّہ میں پیدا ہُوئے۔ عرب جس کے بعض حصّوں میں کبھی تہذیب کا بول بالا تھا اس وقت سیاسی وتمدنی مذہبی واخلاقی حیثیت سے ایک پس ماندہ ملک تھا۔ یہ درست ہے کہ ابھی تک سارے کا سارا عرب کسی اجنبی کے پائے استبداد کے نیچے روندا نہ گیا تھا۔ لیکن اب تک سارا عرب کسی وقت میں متحد ومربوط بھی نہ ہوا تھا۔ اور جنوب میں ایران کا سیاسی اثر اور شمال میں ایران اور روما دونوں کی طاقت حیرہ وغسان پر چھائی ہُوئی تھی۔ اہلِ عرب ابھی زیادہ تر بدوی تھے آزاد مہمان نواز دلیر لیکن خود غرض خونخوار اور وحشی۔ اکثر مذاہب کے پیرو عرب میں مُوجود تھے۔ لیکن عرب کی عیسائیت عرب کی یہودیت اور عرب کی صائبیت نہائیت مکدّر ہو چکی تھیں۔ بیشتر لوگوں کا مذہب بُت پرستی تھا۔ اور مکّہ جہاں آنحضرت کا قبیلہ قریش متمکن تھا بُت پرستی کا مرکز اور ایک معنی میں عرب کا مذہبی دارالخلافہ تھا۔ اگرچہ آنحضرت کا خاندان عرب میں سب سے زیادہ با اثر تھا لیکن اس اثر کی جس کی بُنیاد بُت پرستی پر تھی بیخ کنی کرنا اُنہوں نے اپنا اخلاقی و مذہبی فرض جانا اور اس لئے وُہ مدت تک اس رُوحانی معرکے میں تن تنہا سینہ سپر رہے +

اُن کا باپ اُن کی پیدائش سے پہلے وفات پا چکا تھا۔ جب وُہ چھ برس کے ہُوئے تو اُن کی ماں کا انتقال ہو گیا اور جب وُہ نو برس کے ہُوئے تو اُن کے دادا کی پُر رعب شخصیت کا سہارا اُٹھ گیا۔ "غزوات الفجار" کی تباہ کن لڑائیوں سے اُن کے سامنے اپنے اہلِ ملک کی ناگفتہ حالت پیشِ نظر ہُوئی۔ اور اُن تجارتی سفروں میں جو اُنہوں نے خدیجہ کا کارندہ بن کر شام کی طرف کئے۔ اُنہوں نے مہذب روما کی ابتر حالت کا مشاہدہ کیا۔ وہ "اُمّی" تھے۔ لیکن اخلاقی کیفیات سے اُن کا پُر خلوص دل لبریز ہو گیا۔ وُہ ایک بُت پرست قبیلے کے فرد تھے لیکن رُوحانی جوش وحمیت اُن کی شخصیت کے رُوح رواں بن گئے۔ پچیس برس کی عمر میں اُنہوں نے ایک اخلاقی وملّی معاہدہ "حلف الفضول" میں حصّہ لیا۔ جس کا مقصد رفاہِ عام اور بہبودِ خلائق تھا۔ ادھر اسی عمر میں اُنہوں نے اُس رفیقِ زندگی (حضرت خدیجہ) کا دامن پکڑا۔ جس کی محبت نے ہمیشہ اُن کی رُوحانیت کا ساتھ دیا۔

اس کے بعد پندرہ برس تک سوائے اس کے کہ اُن کا دل خاموشی کے ساتھ حقائقِ ازلی کی تلاش میں سرگرم تھا کوئی ظاہرا واقعہ اُن کی زندگی میں ظہور پذیر نہ ہُوا۔ چالیس برس کی عمر میں جب وُہ غارِ حرا کی خلوت گزینی اور صحرائے مکّہ کی تنہائیوں سے متاثر ہو کر ایک ربّانی پیغام کی تبلیغ کے لئے تیار ہو چکے تھے تو ایک رات کے آخری حصّے میں یہ آسمانی آواز اُن کے کانوں نے سُنی کہ "اپنے خدا کا نام لے اور پڑھ" یہ تھے علمِ ربّانی کے اُس پہلے پیغام کے الفاظ جس میں خدائے علم ومعرفت اور ہدائیت وتقویٰ کی تعلیم آنحضرت کے ذریعے سے اہلِ عرب کو اور اہلِ عرب کے ذریعے سے سب اہلِ دُنیا کو دی۔ پیغمبری کے اولین مراحل ہمیشہ نہائیت دشوار گزار ہوتے ہیں۔ خدیجہ اور علی زید اور ابو بکر نے اُن کی باتوں پر کان دھرا لیکن علم لوگوں نے مخالفت واستہزا کے سوا مُدّت تک

اور کوئی جواب نہ دیا۔ تین برس میں تیس آدمی اُن کے پیرو ہوئے۔ لیکن باسی پر بس نہیں۔ جب قریش نے دیکھا کہ یہ شخص بے اعتنائی سے جی نہیں چھوڑتا تو اُنہوں نے باقاعدہ طور پر سختیاں اور تکلیفیں پہنچانی شروع کیں اور نومسلموں کو قسم قسم کے عذابوں کے شکنجے میں دبایا۔ اُن کے چچا ابوطالب نے آکر ترغیب دی کہ اس مخالفت سے بچنے کے لئے وُہ کام ترک کر دیں۔ لیکن اُنہوں نے جواب دیا کہ "اگر سُورج اور چاند بھی میرے دائیں بائیں آکھڑے ہوں اور کہیں کہ یہ کام چھوڑ دے۔ تو جب تک یہ نیک و پاک کام نہ ہو لے پائے اس کی راہ میں اپنی جان تک نہ دے دوں میں باز نہ آؤں گا۔" قریش کے مظالم روز بروز بڑھتے گئے۔ چند مسلمانوں نے آنحضرت کی اجازت سے ہجرت کر کے (۶۱۵ء میں) ابی سینیا کے ملک میں پناہ لی۔ باقیماندہ کو قریش نے مکّہ کے ایک حصّے "شعب ابوطالب" میں محصُور کر لیا۔ اور ارادہ کیا کہ وُہ بنی ہاشم اور بنی مطلّب کا قلع قمع کر دیں گے۔ ۶۲۰ء میں خدیجہ اور ابوطالب وفات پا گئے۔ مصیبتیں چاروں طرف سے مُسلمانوں پر ٹوٹ پڑیں۔ لیکن اسلام کی رُوحانی تحریک کچھ ایسی کمزور نہ تھی کہ دُنیاوی طاقت کے آگے سرنگوں ہو جاتی۔ طائف اور مدینہ کے بعض باشندوں نے (۶۲۰ء اور ۶۲۲ء میں) آکر بیعت کی اور ۶۲۲ء میں جب مخالفین نے آخر کار آنحضرت کے قتل اور اسلام کو قطعی طور پر نیست و نابود کرنے کا تہیہ کر لیا تو وُہ ہجرت کر کے مدینہ میں جماعتِ انصار کے پاس چلے گئے۔ یہاں اُنہوں نے یہود و نصاریٰ سے اتحاد قایم کر کے ایک مختلف المذاہب ملّت کی بنیاد قایم کی جس میں مسلم و غیر مسلم سب کو برابر کے حقوق دیئے مگر یہودیوں کی خباثت اور قریش کی ریشہ دوانیوں نے اُنہیں امن و امان کے ساتھ اپنا کام کرنے کی مہلت نہ دی۔ جب مسلمانوں نے دیکھا کہ غیر مسلم اُن کی جان کے پیچھے پڑے ہیں اور کسی طرح اُنہیں چین سے نہ بیٹھنے دیں گے تو مجبوراً اُنہوں نے تلوار کا جواب تلوار سے دینا شروع کیا۔ لیکن اُن کا کام محض اپنی ملّت کی محافظت تھا۔ اور اس جنگ و جدل میں اُنہوں نے کبھی زیادتی نہ کی بلکہ عفو و ایثار کی کئی بے نظیر مثالیں دُنیا میں اپنی عالی ہمتی کی یادگار چھوڑیں۔ جنگِ بدر (۶۲۳ء) میں کفار کو شکست ہوئی جنگِ اُحد (۶۲۵ء) میں مسلمانوں کو۔ جنگِ خندق (۶۲۷ء) میں عرب کی مختلف قومیں مسلح ہو کر مُسلمانوں پر آپڑیں۔ لیکن ناکام ہو کر لوٹیں آنحضرت نے یہُودی قوموں بنی قینقاع اور بنی قریظہ کو جنہوں نے مُسلمانوں کے ساتھ نازک وقت میں وعدہ خلافی اور بدعہدی کی سزا دی۔ لیکن جب دشمن شکست کھا کر تتر بتر ہو گئے تو بجائے تعاقب کرنے کے اُنہوں نے اُن کو خود صُلح کا پیغام دیا۔

عیسائیوں کو اُنہوں نے ایک عہد نامے کے ذریعے سے جو علاقہ طور کی ایک خانقاہ کے راہبوں کے ساتھ ہُوا ایسے حقوق عطا کئے جو اُن کو کبھی اپنے حکمرانوں کے تحت میں بھی نہ ملے تھے یعنی اُن کو پُوری شہری و مذہبی آزادی دی گئی اور اُن کو ہر طرح کی امداد دینے کا وعدہ کیا گیا۔ لیکن قریش کی ہٹ دھرمی کم نہ ہونی تھی نہ ہوئی۔ ۶۲۸ء میں مُسلمان مکّے میں داخل ہوئے اور سارا عرب ایک ایسے فرمانروا کے تحت میں آگیا جو خود ملک و ملّت کا سب سے بڑا خادم بن گیا۔ ۶۲۹ء میں آنحضرت نے اکثر غلاموں کو آزاد کر دیا۔ اور ۶۳۰ء میں رومیوں کی جارحانہ کارروائی کا سدِّ باب کیا۔ اور عرب کی قومی آزادی اور اتحاد کو تاریخ میں پہلی بار مستحکم کر کے عرب کو

بیرونی مظالم سے بچایا۔ جب عرب ایران و روما کے گردن فرازوں کی چیرہ دستیوں سے آزاد ہوگیا۔ جب ان صحرائیوں نے پتھر اور مٹی کی مورتوں کے آگے سر جھکانا چھوڑ دیا جب اُن کے باہمی جنگ و جدل کی جگہ صلح و آشتی نے لی۔ عرب ایک ملک ہوگیا عرب ایک قوم بن گئے وُہ ایک خُدا کے ہوگئے۔ وُہ دوسرے کی بھلائی کو اپنی خوشی پر ترجیح دینے لگے۔ اُن کی طبیعت میں سختی کی جگہ نرمی۔ خود غرضی کی جگہ ایثار اور عشرت کی جگہ خدمت نے لے لی۔ وُہ کام جو مشیت ایزدی نے ایک یتیم بچّے کے سپرد کیا تھا پُورا ہوگیا۔ وُہ علم جو ایک بے علم "اُمّی" کے ذریعے سے نوعِ انسان کو حاصل ہونا تھا الم نشرح ہوگیا۔ وُہ مسائل مذہب جو صدیوں سے پیچ در پیچ اُلجھتے جارہے تھے تھوڑی مدت میں قطعی طور پر سُلجھ گئے۔ خدا نے کہا کہ "آج مَیں نے تمہارا دین تمہارے لئے مکمل کر دیا"۔ پیغمبر خدا حج کے بعد جبلِ عرفات کی چوٹی پر چڑھ کر مُسلمانوں سے یوں مخاطب ہُوئے کہ "لوگو میری بات سُن لو۔ کیونکہ مَیں نہیں جانتا کہ ایک برس بعد مَیں یہاں تمہارے درمیان زندہ رہوں گا یا نہیں۔ ایک دُوسرے کے جان و مال کا لحاظ کرو۔ اور یاد رکھو کہ ایک روز تمہیں اپنے پروردگار کے سامنے ہو کر اپنے افعال کا حساب دینا ہے۔ تمہارے اپنی بیویوں پر حقوق ہیں۔ جس طرح تمہاری بیویوں کے تم پر حقوق ہیں سو اپنی بیویوں کے ساتھ ملائمت اور محبت کا سلوک کرو۔ اپنے وعدے وفا کرو اور گناہ سے بچو۔ سُود تمہارے لئے بند ہے۔ خون کا بدلہ خون سے لینا ممنوع ہے اور اپنے غلاموں کو وُہی کھانا کھلاؤ جو تم کھاؤ اور وہی کپڑے پہناؤ جو تم پہنو اور اگر تم اُن کا قصور معاف نہ کر سکو تو اُن کو علیحدہ کر دو۔ کہ وُہ فی الحقیقت خُدا کے غلام ہیں اور اُن کے ساتھ بُرا سلوک کرنا تمہیں جائز نہیں۔ لوگو! سُنو تمام مُسلمان بھائی بھائی ہیں۔ تم سب ایک برادری ہو سو ایک دُوسرے کا مال خورد بُرد نہ کرو۔ اور بے انصافی کرنے سے بچے رہو"۔ آنحضرت نے صرف اپنے اقوال سے نہیں بلکہ بالخصوص اپنے اعمال حسنہ سے مُسلمانوں کے لئے اسلامی زندگی کا بہترین نمونہ قائم کیا۔ اُن کی زندگی اوّل سے لیکر آخر تک خدمتِ انسانی کے لئے وقف تھی۔ خدا پر ایمان لازم تھا۔ کیونکہ اس کے بغیر اُن کی رُوح کی فلاح ممکن نہ تھی۔ بُت پرستی ترک کرنا ضروری تھا۔ کیونکہ اس کے ہوتے انسانی عقل غلامی کی زنجیروں سے رہائی نہ پا سکتی تھی۔ اُنہوں نے بھٹکے ہُوئے انسان کو خدا کا راستہ دکھایا اور بتایا کہ مذہب بھی ایک علم ہے۔ فطرت اس علم کی معلم اور انسان اس معلم کا متعلم ہے۔ قرآن مجید میں سینکڑوں بار مناظرِ قدرت اور مظاہر فطرت کا ذکر آیا ہے۔ انسان کو چاہیئے کہ وُہ زمین و آسمان ابر و باد و باران بحر و بر کوہ و صحرا حیوانات و حشرات کو دیکھے کہ ان میں خدا کی قدرت کاملہ کی کیسی کیسی نشانیاں ہیں! وُہ زمین کے طول و عرض میں سرگرم سفر ہو اور مشاہدہ کرے کہ کیا حشر ہوا اُن مغرور و متکبر قوموں کا جنہوں نے اخلاق و مذہب کو بالائے طاق رکھ کر ربّ مشرق و مغرب کی حکم عدُولی کی! کفّار کو جو اپنے مذہب کو سچّا اور اسلام کو جھُوٹا کہتے ہیں کہا گیا ہے کہ "اگر تم سچّے ہو تو اپنے دلائل پیش کرو"۔ مذہب صرف اعتقاد کا کھاتہ نہیں۔ عقل و فہم کی انجمن ہے۔ قدرت کے قوانین معرفت کے رموز سب عقل و خرد پر مبنی ہیں۔ اور مذہب کا سب سے بڑا مقصد انسان کی اخلاقی تربیت ہے ◆

آنحضرت اخلاقِ حسنہ کی تصویر تھے۔ اپنے ملازموں سے اُن کا سلوک ایسا نرم تھا کہ اُن میں سے ایک کا قول ہے کہ دس برس میں پیغمبر خدا کی معیّت میں رہا لیکن اُنہوں نے مجھے اس طویل مدت میں کبھی اُف تک نہ کہا۔ بچے اُنہیں بہت پیارے تھے گلی کوچوں میں جاتے تو بچے چاروں طرف اُن کے گرد جمع ہو جاتے۔ وُہ سب بیماروں کی تیمارداری کرتے۔ ہر جنازے میں شریک ہوتے ایک غلام تک کی دعوت کو مسترد نہ کرتے۔ اپنے کپڑوں میں آپ پیوند لگاتے اور اپنی بکریوں کا آپ ہی دودھ دوہتے۔ جو کچھ اُن کے پاس ہوتا وُہ فقیروں اور محتاجوں کو دے دیتے۔ اس شاہِ عرب کے ایثار و ہمت کا یہ حال تھا کہ بعض دفعہ متواتر کئی ہفتوں تک اس کے گھر میں آگ نہ جلتی۔ اُن کی زندگی تقسیم اوقات سے منتظم تھی۔ وُہ ہمیشہ کسی نہ کسی کام میں مشغول رہتے اور اپنے ہاتھ سے کام کرنے کو انسان کے لئے باعثِ فخر جانتے تھے۔ سٹین لے لین پول ایک عیسائی مصنّف لکھتا ہے کہ "اس شخص کی سیرت میں شجاعت و دلیری کے ساتھ نرمی و نسائیت اس حد تک شامل ہو گئی ہیں کہ اس کی سیرت کا اندازہ کرتے وقت انسان کی قوتِ تنقید خود بخود عزت و احترام اور اُنس و محبّت کے جذبات سے مغلوب ہو جاتی ہے۔ یہ وُہ شخص ہے جسے برسوں اُس کی قوم نے لعنت ملامت کی لیکن یہی وُہ شخص ہے جو مصافحہ کرتے وقت کبھی اپنا ہاتھ دُوسرے کی گرفت میں سے پہلے نہیں نکالتا۔ چھوٹے بچّوں کا محبوب جو اُن کے پاس سے گذرتے وقت اپنی شیریں مسکراہٹ سے اُن کے دلوں کی کلی کھلا دیتا اور اس میٹھے لہجے میں جو خاص اُسی کا حصّہ تھا محبّت کی چند باتیں کہہ دیتا۔ اُس کی پُر خلوص محبت اُس کی وسیع دریا دلی اُس کی زبردست دلیری اور اُس کا بے نظیر صبر و حوصلہ وُہ صفات ہیں جن کے آگے نکتہ چینی اپنے ہتھیار ڈال دیتی ہے اور اُس کی شیدائی بن جاتی ہے۔"

خدا نے پیغمبر خدا کے سینے میں ایک راست رو حقیقت پسند دل رکھا تھا جو اپنے گرد و پیش کے حالات سے نہایت درجہ متاثر ہُوا۔ عرب بتوں کو پُوجتے تھے۔ لڑکیوں کو زندہ درگور گاڑ دیتے تھے۔ آپس میں لڑتے بھڑتے تھے۔ "جُوا اُن کی دن رات کی دل لگی تھی۔ شراب اُن کی گھٹی میں گویا پڑی تھی۔" عیسائیت اپنی تثلیث کے باعث گویا ایک تنگ مثلث ہو چکی تھی۔ یہودیوں کے خصائل ناپاک اور آتش پرستوں کے اخلاق حیات سوز تھے۔ اور لوگ بالعموم بجائے بامِ اخلاق پر چڑھنے کے قصرِ ہوس میں گھرے ہُوئے تھے۔ پیغمبر اسلام کا پیام ان سب کے لئے سیدھا سادہ تھا لیکن متین و پُر زور! خدا ایک ہے اُسی سے یہ کائنات ظہور میں آئی۔ وُہ اغراض سے پاک اور خواہشات سے مُبرا ہے۔ صرف نیکی اُس سے صادر ہوتی ہے۔ انسان کی ہستی کا مُدعا اپنے نفس کو پاکیزہ اور خدائے پُر جلال میں جذب ہو جانا ہے۔ اِس لئے اُسے بُرائی سے اجتناب کرنا اور نیکی میں ہمہ تن منہمک رہنا چاہیئے حصُولِ خیر کے واسطے ریاضت و محنت کی ضرورت ہے۔ اِنسان کو ہر چیز صرف کوشش سے مِل سکتی ہے جو کرے گا سو پائے گا۔ خدا کی عبادت لازم ہے اور ہم جنسوں کی خدمت۔ وحدانیت پر اعتقاد اِنسان کی طبیعت میں یکسُوئی پیدا کرتا ہے اور اُسے آوارہ و سرگردان رہنے سے بچاتا ہے۔ نماز اس کا تعلق خدا سے قائم رکھتی ہے۔ روزہ نفس کشی کا ذریعہ ہے۔ خیرات زاید دولت کے لئے

خدمت کا رستہ نکالتی ہے۔ اخوت جماعتہائے انسانی کے اختلافات کو مٹانے کی بہترین تدبیر ہے۔ مسلمان کو تعلیم ہے کہ وُہ زندگی کے خطروں میں بے باک رہے اور خدا پر بھروسا رکھے آزادی اور آزاد خیالی سے اُس کا دل معمُور ہو۔ کم مایہ ہو تو صبر و توکل سے کام لے مایہ دار ہو تو ایثار و فیاضی کا حق ادا کرے۔ غصّے کو روکے اور عفو کی عادت ڈالے اور ہر حال میں اچھی باتوں اور اچھے کاموں سے اس تاریک دُنیا کو روشن و پُر نور کر دے۔ اس پر خیال رہے کہ یہ سب کچھ محض خوشنودیٔ پروردگار کے لئے کرے اور غرض و ناموری کا گھُن اپنے جی میں نہ لگنے دے۔ حلقۂ معاشرت میں اسلام نے کمزوروں کو صریح حقوق دے کر اُنہیں گردن فرازوں کے ظلم و ستم سے بچایا۔ عورتوں کو جائداد میں معین حصّہ دیا۔ غلاموں کی آزادی کا رستہ کھول دیا۔ سُود کو ناجائز قرار دے کر سچّی اشتراکیت کی بنا ڈالی۔ خودداری اور حفاظتِ نفس پر زور دیا۔ لیکن تاکید کی کہ ہمیشہ میانہ روی اور رواداری کا دامن پکڑے رہو۔ اسلام اعتدال کا مذہب ہے اسلام کی راہ اعتدال کی راہ ہے۔ خُدا کو یاد کرو لیکن دُنیا میں رہ کر۔ دُوسروں کی خدمت کرو لیکن اپنی حفاظت بھی۔ خُدا کی دی ہوئی نعمتوں سے لطف اُٹھاؤ لیکن حد سے نہ گزرو۔ خدا تمہارا مالک و رازق ہے لیکن بغیر سعی اور جدوجہد کے تم کو کچھ نہ ملے گا۔ نیکی اور بُرائی سب خدا کی طرف سے ہے لیکن نیکی کرنا اور بُرائی نہ کرنا اس سے اجتناب اور اُس سے اتحاد یہ انسانوں کے ہاتھ میں ہے۔ دشمن سے درگذر کرو ہاں اگر دیکھو کہ وُہ حق کے استیصال پر تلا ہُوا ہے تو حق کی صیانت میں اپنی جان تک لڑا دو کہ زندگی تمہیں ایسے ہی کاموں کے لئے دی گئی ہے۔ تمہاری موت کی ساعت مقرر ہے۔ زندگی کی حرص نہ کرو۔ لیکن جب تک جیتے رہو جیو اور اپنا کام کئے جاؤ۔

اِن تعلیمات کا کیا اثر ہُوا دُنیا کی تاریخ کے بعض زرّین صفحات اس کے ذکر سے منوّر ہیں۔ وسیع بے پایاں صحرا کی جانب سے ایک انسان انسانوں کی بستیوں میں آیا اُس نے سوتوں کو جگایا۔ نیم مُردہ قوم کو زندہ اور تاریک دُنیا کو پھر تابندہ کر دیا۔ بُت پرستی حرفِ باطل کی طرح مِٹ گئی۔ جھُوٹ کی جگہ سچ نے لی۔ جسمانی طاقت رُوحانی قوت کے آگے سرنگوں ہو گئی۔ دُنیا نے علم کی درسگاہ میں پھر اخلاق کا سبق پڑھا۔ روما کے مظالم کی تلوار کُند ہوئی۔ ایران کے جہل کی آگ سرد پڑی۔ عیسائیت کے توہمات کا بھُوت دُم دبا کر بھاگ اُٹھا۔

اسلام کے اثرات مغرب و مشرق پر ایسے گہرے ہُوئے ہیں کہ اُن کا نقش آج تک نہیں مِٹا نہ مِٹ سکتا ہے۔ اگر ہم کہیں کہ اسلام نے دُنیا کے مذہب و معاشرت میں ایک عدیم النظیر انقلاب پیدا کر دیا تو غلط نہ ہو گا۔ جس طرح اسلام نے گذری ہُوئی مسخ شدہ سُنتوں کی اصلاح کر کے دُنیا کو ضیائے تہذیب سے روشن کیا اُسی طرح تمدّن حاضر نے اپنے دیئے اسلام ہی کی دی ہُوئی روشنی سے جلائے۔ پھر اسلام کی صُورت مسخ ہو گئی لیکن اُس کے اثرات آج تک ہماری دُنیا کے رُوح و رواں ہیں۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ اسلام کے سوا دُنیا کا اور کوئی مذہب سچّا نہ تھا۔ ہاں تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ اسلام کے ظہُور کے وقت دُنیا کے تمام مذاہب اپنی حقیقی صداقت سے بہت دُور جا پڑے تھے۔ اور اسلام نے آکر اُن سب میں اصلاح کی ایک زبردست تحریک پیدا کر دی۔ بلکہ اسلام کا خود یہ دعویٰ تھا کہ اسلام انسان کا ایک فطرتی مذہب ہے وُہی مذہب جو ابراہیم اور یعقوب اور یوسف اور موسیٰ اور عیسےٰ نے پیش کیا وُہی مذہب جو ہر قوم کے سامنے اُس کے پیغمبر نے پیش کیا وہی مذہب جب مرورِ زمانہ کے ساتھ مکدر ہوتا آیا ہے لیکن جس کی اصلاح و ترقی کے لئے خدا نے ہمیشہ سے دُنیا میں وقتاً فوقتاً مُصلح و پیغمبر بھیجے ہیں۔ اسلام کی بڑی خوبی یہ تھی کہ اُس کا عقیدہ مختصر اُس کا فلسفہ عام فہم اُس کی رسمیات صاف و سادہ اور اخلاق و معاشرت میں اُس کے احکام عدل و رواداری پر مبنی تھے۔ گذشتہ مذاہب کے حشو و زوائد کو پاک و صاف کر کے اسلام نے دُنیا کے سامنے ایک سادہ و مختصر مذہب پیش کیا۔

عقائد کے معاملے میں صرف یہ کہا کہ خدا ایک ہے اور وُہ مسلم و غیر مسلم ذوی العقول و غیر ذوی العقول دُنیا و عقبےٰ سب کا خدا ہے۔ غیب کے بعض معاملات کی انسان کو خبر نہیں لیکن جوں جوں وُہ رُوحانی ترقی کرے گا اُن سے باخبر ہوتا جائے گا۔ انسان کی زندگی مَوت کے ساتھ ختم نہیں ہو جاتی بلکہ جاری رہتی ہے اور آئندہ زندگی میں بتدریج ترقی ہوتی رہے گی۔ خدا اور انسان کے مابین ایک ذاتی رشتہ قائم ہے جو بغیر کسی کی وساطت کے قائم رہتا ہے۔ اور انسان کا فرض ہے کہ وُہ اپنے عمل و عبادت سے اس تعلق کو اُستوار و پائدار بنائے۔

رسمیات میں نماز روزہ زکوٰۃ اور حج ہیں۔ نماز میں کعبے کی تخصیص اِس لئے کی کہ اہلِ اسلام میں یکسانیت اور یک جہتی پیدا ہو۔ ورنہ قرآن مجید کے نزدیک "مشرق اور مغرب دونوں اللہ کے ہیں۔ تو نماز میں تم جدھر رُخ کرو اُدھر ہی خدا ہے" عبادات میں انسان کو سادہ و دلکش الفاظ سکھائے کہ "میں خدا کے نام سے شروع کرتا ہوں جو رحم والا مہربان ہے سب تعریف خدا ہی کو سزاوار ہے جو سب دنیا کا پالنے والا ہے۔ رحم والا مہربان روزِ جزا کا حاکم اے خدا ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں۔ اے خدا ہمیں سیدھے رستے لگا۔ اُن لوگوں کا رستہ جن پر تیری رحمتیں ہیں نہ اُن کا رستہ جن پر تیرا غضب نازل ہُوا۔ اور نہ گمراہوں کا۔ کہہ کہ وہ خدا ایک ہے بے نیاز، خدا جس کا نہ باپ ہے نہ بیٹا اور نہ جسے کسی کی مدد کی ضرورت ہے۔" خدا وہ جس کے سوا کوئی معبود نہیں زندہ دنیا کو سنبھالنے والا نہ اُسے اونگھ آتی ہے اور نہ نیند اُسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ کون ہے جو اس کے حکم بغیر اسکی جناب میں کوئی سفارش کرے جو کچھ لوگوں کو پیش آرہا ہے اور جو کچھ ہونے والا ہے وہ اُس کو سب معلوم ہے اور لوگ اسکے علم پر دسترس نہیں رکھتے مگر جتنی وہ چاہے۔ اس کی کرسی آسمان و زمین پر حاوی ہے۔ آسمان و زمین کی حفاظت اس پر مطلق گراں نہیں

کہ وہ بڑا عالی شان اور عظمت والا ہے۔

اسلام نے خدا کو محض باعظمت نہیں بنایا پُر محبت بھی دکھایا ہے وہ ایک رب العالمین ہے تو رحمٰن و رحیم بھی ہے۔ وہ اگر عرش پر یا اس کے پرے ہم سے بہت دُور ہے تو زمین پر انسان کے پاس اُس کی شہ رگ سے قریب تر بھی ہے۔ انسان جب اُسے بلائے وہ آتا ہے۔ جب اس سے پوچھے وہ بتاتا ہے۔ جب اس سے مانگے وہ دیتا ہے۔

سال میں ایک ماہ روزے کیلئے وقف ہے۔ روزہ اصلاح صحت ریاضت اور نفس کشی کا ذریعہ ہے جس سے انسان جسمانی لذتوں پر قابو پاتا اور روحانی کیفیتوں سے آشنا ہوتا ہے ۔

زکوٰۃ کو دنیا کے کسی اور مذہب نے مذہبی رسمیات کا جزو قرار نہیں دیا۔ یہ ایک نوع کا ایک ٹیکس ہے جو اسلام امیروں پر غریبوں کی اعانت کیلئے لگاتا ہے۔ ہر مسلمان پر فرض ہے کہ وہ ایک خاص شرح (ڈھائی فی صدی) کے حساب سے اپنی جائداد کی آمدنی کا ایک حصہ غربا و مساکین وغیرہ کے لئے وقف کرے۔ قرآن شریف میں آیا ہے کہ جو لوگ اپنے مال خدا کی راہ میں صرف کر کے کسی طرح کا احسان نہیں جتاتے نہ لینے والے کو کسی طرح کی ایذا دیتے ہیں اُنکو اُنکے دینے کا اجر اُنکے پروردگار کے ہاں ملے گا۔ حج عمر میں ایک بار سب پر فرض ہے سوائے اُن کے جو مفلوک الحال ہوں دنیا کے سب مسلمان وہ امیر ہوں یا غریب گورے ہوں یا کالے، زرد ہوں یا سرخ، عرفات کے میدان میں سادہ لباس پہنکر پہلو بہ پہلو خدائے واحد کے حضور میں حاضر ہوتے ہیں۔ اور اپنے گناہوں کی معافی چاہتے ہیں۔ انسانی اخوت اور مساوات کا یہ نظارہ قابل دید ہوتا ہے۔ جب ملک ملک اور قوم قوم کے افراد ایک لق و دق صحرا میں یوں برہنہ سر و برہنہ پا خدائے رحیم و کریم کے آگے کھڑے ہوتے ہیں۔

معاشرت میں اسلام نے یہ کہہ کر ذات پات کی تفریق مٹا دی کہ "مسلمان سب بھائی بھائی ہیں اور خدا کے نزدیک زیادہ بڑا وہ ہے جو زیادہ نیک و پرہیز گار ہو۔ غریب امیر کے فرق کو اس طرح کم کیا کہ امیروں کی دولت پر زکوٰۃ کا ٹیکس لگا دیا۔ مرد عورت کے فرق کو اس طرح گھٹایا کہ مرد کے مقابل میں عورت کو نصف حصہ جائداد میں دے دیا۔ طلاق میں مرد کے اختیار کو کم کیا۔ اور مردوں کو یہ جتا دیا کہ اگرچہ تمکو جسمانی طور پر عورتوں پر برتری حاصل ہے۔ تاہم عورتوں کے تم پر ویسے ہی حقوق ہیں۔ جیسے تمہارے عورتوں پر۔ کثرت ازدواج میں کامل عدل کی بندش لگاکر اور یہ کہکر کہ عدل کرنا دشوار ہے گویا وحدت ازدواج کا رستہ دکھا دیا۔ غلاموں کو آزاد کرنے کے ثواب دینی کا یقین دلا کر لاکھوں آدمیوں کیلئے آزادی کا پیغام دیا۔ اسلام ایک عملی مذہب تھا اس نے ان تمام دستوروں کو جو اس زمانے میں رائج پائے یک قلم صریح لفظوں میں ممنوع قرار دیکر اصلاح کرنا مناسب سمجھا۔ بعض کو مثلاً لڑکیوں کو زندہ در گور گاڑنا شراب پینا، جوا کھیلنا فال نکالنا، پانسہ ڈالنا۔ اور بہیوں اور ایسی رسوم کو تو قطعی طور پر بند کر دیا۔ لیکن باقی بعض رسوم کو جن کو نامناسب

سمجھا۔ اس طرح بند کیا کہ کثرتِ ازدواج کی طرح ان میں ناممکن العمل شرائط لگا دیں یا غلامی کی طرح ایسی شرائط نافذ کیں کہ رواج کا ہونا نہ ہونا برابر ہو گیا۔ اسلام میں بارہا آج کا غلام کل کا بادشاہ بنا۔ پیغمبرِ اسلام نے غلاموں کو آزاد کر دینے کو ایک نیک کام قرار دے دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہزاروں غلام آزاد کر دیئے گئے۔ اور جو آزاد نہ ہوئے وہ آج کل کے ملازموں سے زیادہ آرام و آسایش کی زندگی بسر کرنے لگے۔ بلال ایک حبشی غلام تھا جس نے صحابہ کا درجہ پایا۔ خاندانِ غلاماں کے رکن جنہوں نے ہندوستان میں حکومت کی ابن غلام تھے۔ اسلام نے رنگ و نسل کا امتیاز قطعی طور پر مٹا دیا۔ چنانچہ آج تک گورا مسلمان کالے مسلمان سے اور حبشی سے اس طرح میل جول رکھتا ہے گویا وہ ایک ہی گھرانے کے بچے ہیں۔

جدید ترین تصنیف "حال کی اسلامی دنیا" میں جس کے اکثر باب ان مشنریوں کے لکھے ہوئے ہیں جنہوں نے اپنی عمریں مسلمانوں کی اخلاقی اور مذہبی کمزوریوں سے فائدہ اُٹھانے کی غرض سے اُنکے درمیان گذاری ہیں۔ ڈچ پروفیسر سبرگ رائج اسلام اور نسل کے تحت میں لکھتا ہے۔ کہ "اسلام نے سب انسانی نسلوں کو ترقی کا موقع دیا۔ اور ان سب نے اپنی قابلیت کے موافق اس سے فائدہ اُٹھایا۔" مساوات مسلمانوں کے ہاں ایک خیالی اصول نہیں ایک عملی شے ہے۔ "اسلام نے نسل کے سوال کو اس طرح حل کر دیا ہے کہ دوسری ملّتوں کو اس کامیابی سے شرم آنی چاہئے۔ انسانی نسلوں کے اتحاد کا نصب العین جس قدر اسلامی ملّت میں پورا ہوا ہے آج تک کسی ملت میں پورا نہیں ہوا۔"

اخلاق کے بارے میں اسلام نے تفصیلی اور جزوی احکام جاری کئے۔ مشہور مغربی متعصب عربی دان مارگولی اتھ رقمطراز ہے کہ کسی مذہب نے اخلاقیات کو اس حد تک مذہب کا جزو قرار نہیں دیا جس حد تک اسلام نے۔ عہد کا وفا نہ کرنا اور فساد پھیلانا فاسقوں کا کام ہے۔ مومنوں کو ہدایت ہے کہ وہ سچ کو جھوٹ کا لباس نہ پہنائیں اور جان بوجھ کر حق بات کو نہ چھپائیں۔ دوسروں کو نیکی کی ہدایت کرنا اور پڑھے لکھے ہو کر بھی اپنے جی میں نیکی کو جگہ نہ دینا عقلمندی نہیں۔ خاکسار لوگ صبر و صلوٰۃ کا سہارا پکڑتے ہیں۔ وہ والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرتے ہیں اور رشتہ داروں اور یتیموں اور محتاجوں کے ساتھ نرمی سے پیش آتے اور سب سے حلم کے ساتھ گفتگو کرتے ہیں۔ خدا کے آگے سر جھکاتے اور مسکینوں میں خیرات کرتے ہیں۔" چنانچہ قرآن شریف میں مسلمانوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ "نیکی یہ نہیں کہ نماز میں تم اپنا منہ مشرق یا مغرب کیطرف کر لو۔ بلکہ اصل نیکی اُن لوگوں کی ہے جو خدا اور روزِ آخرت اور فرشتوں اور آسمانی کتابوں اور پیغمبروں پر ایمان لائے۔ اور انہوں نے مال خدا کی محبت کی راہ میں رشتہ داروں اور یتیموں اور محتاجوں اور مسافروں اور مانگنے والوں کو دیا۔ اور لوگوں کو غلامی اور دوسری مصیبتوں سے نجات دلانے میں صرف کیا۔ نماز پڑھی، اور زکوٰۃ دی جب کسی بات کا

اقرار کرلیا تو اپنے قول کو وفا کیا۔ اور تنگی اور تکلیف اور ہلاچلی کے وقت میں ثابت قدم رہے۔ بس یہی لوگ سچے ہیں اور یہی ہیں پرہیزگار" انسان کے دو قسم کے فرائض ہیں ایک خدا کی طرف اور دوسرے انسانوں کی طرف۔ خدا بے نیاز ہے لہٰذا وہ فرائض جو انسان خدا کی طرف ادا کرتا ہے دراصل اس کی اپنی ہی بہتری کے لئے ہیں۔ ان کے متعلق کوتاہی اسلام کے نزدیک قابل عفو ہے۔ لیکن وہ فرائض جو اپنے ہم جنسوں کی طرف ادا کرنے چاہئیں اور حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک مستند حدیث ہے کہ وہ شخص جو اپنے بھائی کے حقوق غصب کرتا ہے خدا کی توحید کا ماننے والا نہیں جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے اسلام کی خصوصیت ہے کہ وہ اعتدال کا مذہب ہے۔ اسلام فطرت انسانی کی کمزوریوں سے واقف ہے چنانچہ "کسی نفس کو اس کی طاقت سے بڑھ کر تکلیف نہیں دی جاتی"۔ دشمن کے مقابل میں مجبوری ہو تو تم اپنی حفاظت کر سکتے لیکن بالعموم اگر تم درگذر کرو تو تمہارے لئے بہتر ہے"۔ خدا کی تلاش کرو لیکن تارک الدنیا بن کر نہیں۔ روپیہ خرچ کرو لیکن فضول خرچی نہ کرو۔ کہ "خدا مسرفوں کو دوست نہیں رکھتا"۔ حلم اختیار کرو لیکن خودداری کو ہاتھ سے نہ دو۔ خدا کو یاد کرو لیکن روزمرہ کے کاموں سے جی نہ چراؤ۔ قصہ کوتاہ اسلام کا دریا اس ایک کوزے میں بند ہے۔ کہ خدا کو ایک جانو اور نیک کام کرو۔ جابجا قرآن شریف میں مسلمان کی یہی تعریف کی ہے۔ کہ "وہ جو خدا پر ایمان رکھتا ہے اور نیک کام کرتا ہے"۔ بغیر نیک کاموں کے ایمان لاحاصل ہے۔ خواہ وہ کتنا ہی بلند پایہ کیوں نہ ہو۔ عمل عمل عمل! اسلام سب سے زیادہ عمل پر زور دیتا ہے انسان نہ اچھا ہے نہ بُرا وہ اپنے تئیں جیسا چاہے بنا سکتا ہے ؎

عمل سے زندگی بنتی ہے جنّت بھی جہنم بھی — یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

یہاں جو ذرہ برابر نیکی کریگا وہ آیندہ زندگی میں اُسے پائیگا۔ اور جو ذرہ برابر برائی کریگا وہ بھی اُسے پالیگا" اور صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ قرآن کریم کی تعلیم ہے کہ "اگر غیر مسلم بھی" "اگر وہ خدا پر ایمان رکھتے ہوں اور نیک عمل کریں تو عقبیٰ میں اُن پر کسی قسم کا خوف طاری ہوگا۔ نہ وہ آزردہ خاطر ہونگے۔ تقدیر و تدبیر کے مسئلے میں جہاں یہ کہا کہ خدا سب چیزوں پر قادر ہے اور سب کچھ خدا کی طرف سے ہوتا ہے وہاں یہ بھی صاف کہہ دیا ہے کہ انسان بجز کوشش کے کچھ نہیں پا سکتا اور خدا کسی قوم کی حالت تبدیل نہیں کرتا جبتک وہ خود اُسے تبدیل نہ کرے۔ نیکوں کو جنت ملے گی بروں کو جہنم۔ جنت میں سب سے بڑی خوشی خدا کا دیدار ہوگا۔ جہنم وہ جائے ندامت ہے "جہاں ایندھن خود آدمی ہیں" غرض قسم قسم کی عام فہم تمثیلوں سے زندگی کے دشوار فلسفے کے مسائل کو حل کیا ہے کہ عالم و جاہل دونوں اس میں اپنے اپنے رنگ کی باتیں دیکھ سکتے ہیں +

بین قومی اور بین ملی مصالحت کی یہ کہہ کر بنیاد قایم کردی ہے کہ مذہب کے بارے میں کوئی زبردستی نہیں"۔ مسلم کو اسلام اور غیر مسلم کو اس کا اپنا مذہب مبارک ہو۔ حضرت علی کا قول ہے کہ ذمی کا خون مسلمان کا خون ہے

حضرت عمر کی وصیت میں ایک یہ ہدایت شامل تھی کہ ذمیوں کے حقوق کا خاص طور پر خیال رکھا جائے۔ بعض اعلیٰ ترین مراتب پر بغداد میں عیسائی قرطبہ میں یہودی اور دہلی میں ہندو متعدد بار فائز رہے۔

یہ تھے اسلام کے وہ اصول جو پیغمبر اسلام نے اپنے قول و عمل سے قایم کئے اور جن کے طلسمی اثر سے ایک جاہلوں کی قوم صدیوں تک دنیا والوں کی معلم اور ہادی بنی رہی۔ اسلام کو صرف مذہب اور دینیات سے واسطہ نہ تھا بلکہ اسلام میں سیاست اور اقتصاد معاشرت اور اخلاق علم اور ہنر سب مذہب کے جزو تھے جس طرح دین دنیا کے لئے تھا اسی طرح دنیا بھی دین کے لئے تھی۔ جسم اسی وقت تک بوجہ احسن اپنے فرائض ادا کرسکتا ہے جب تک روح اُسے ٹھیک رستے پر لئے جائے۔ دنیا کے کاروبار اسی صورت میں خوش اسلوبی سے پورے ہوتے ہیں۔ جب انسان دینی ہدایات کے مطابق عمل کرتا رہے۔ لہذا مسلمانوں کا عروج فی الحقیقت اسلام کا کمال ہے۔ جب تک مسلمانوں کے دل میں اُن کے مذہب کی روح باقی رہی وہ ترقی کیا کئے۔ جب انھوں نے مذہب کو روزمرہ کی زندگی سے الگ کردیا یا اسے بھولکر اس میں غفلت کے ساتھ سویا کئے وہ دین و دنیا دونوں کی نعمتوں سے محروم ہوگئے۔

آنحضرت کے بعد اُنتیس برس (۶۳۲ء سے ۶۶۱ء تک) دنیائے اسلام میں یکے بعد دیگرے خلفائے راشدین کی وہ چار شمعیں روشن رہیں جن کی ضیا شیریں کی یاد آج تک مسلمانوں کے جہل و غفلت کی تاریکی کو دور کرنے کا کام دیتی ہے۔ یہ وہ بہترین زمانہ تھا جب دنیا کے کام دین کے کام تھے۔ جب دنیا کی زندگی دین کے اصولوں پر قایم تھی لیکن اس "مذہبیت" کے باوجود مسلمانوں میں عمل و اختراع کی بہترین قوتیں جلوہ گر تھیں عمرؓ کے عہد خلافت میں حکومت کے مختلف شعبے قایم ہوئے۔ نہریں کھدیں، سڑکیں بنیں شفاخانے جاری ہوئے اور رفاہ عام کے اور سینکڑوں کام سرانجام ہوئے جن سے ایک اعلیٰ درجہ کی متمدن حکومت کے وجود کا ثبوت بہم پہنچتا ہے اس عرصے میں مدینہ مرکز اسلام رہا۔

بنی اُمیہ (۶۶۱ء تا ۷۴۹ء) کے عہد حکومت میں اگرچہ اسلام نے مادی حیثیت سے ترقی کی لیکن اُنکے آنے کے ساتھ دنیاوی جاہ و جلال کی حرص اور حکومت کی چاٹ سے ان تفرقوں کی بنا پڑی جو آج تک ننگ اسلام ہیں بنی ہاشم کے خلاف باقی ماندہ قریش نے علم بغاوت بلند کیا۔ اور آل رسول پر وہ ظلم و ستم ڈھائے جن کے ذکر سے غیر مسلم تک کانپ اُٹھتے ہیں۔ یہ خاندانی عداوت جو صدیوں سے قایم رہی ہے اسلام کے اکثر فرقوں کے ظہور و قیام کا باعث ہے۔ حضرت علی کے جانبدار بعد میں شیعہ (یعنی علی کا گروہ) کہلائے۔ اور وہ لوگ جنہوں نے اُن کی طرفداری کی لیکن جو اُن کی مصالحت جوئی سے ناراض ہوکر اُن سے الگ ہوگئے خوارج کے نام سے پکارے گئے۔

خاندانِ عباسیہ (۷۴۹ء تا ۱۲۵۸ء) نے اپنا دار الخلافہ دمشق چھوڑ کر بغداد میں قایم کر لیا جہاں پانچ صدیوں تک تمدن اسلامی نورپاش رہا۔ اگرچہ شروع میں بعض فاطمی (شیعوں) نے ان کی حکومت پر اظہار ناپسندیدگی کیا لیکن سنی مسلک کی تاسیس و تنظیم انہیں کے عہد خلافت میں ہوئی اور شیعوں نے بالعموم انہیں کبھی اپنا خلیفہ یا امام تسلیم نہ کیا۔ کیونکہ اُن کے نزدیک خلافت یا امامت صرف پیغمبر خدا کے گھرانے کیلئے مخصوص تھی۔ اور صرف انہیں کی اولاد کا حق تھا حضرت علی کے بعد شیعوں کے گیارہ اور امام ہوئے۔ بارہواں امام مہدی ۸۷۵ء میں روپوش ہو گیا اور شیعہ لوگوں کا اعتقاد ہے کہ یہ امام ابھی تک دنیا میں زندہ ہے۔ اور ایک روز ظاہر ہوگا۔ سنی خیال کے مطابق اسلامی خلافت کو خاندانِ نبوت سے کچھ تعلق نہیں بلکہ وہ جمہور کی کثرت رائے سے متعین ہوتی ہے۔ اور جسے مسلمانوں کی جماعت اکثرین منتخب کرے وہی خلیفہ قرار پا جاتا ہے۔ سو اُن کے نزدیک خلفائے راشدین کے بعد بنی امیہ۔ بنی امیہ کے بعد بنی عباس اور بنی عباس کے بعد عثمانیہ ترک خلافت کے امانت دار رہے ہیں۔ ترکوں نے ۱۹۲۴ء میں خلافت کا بوجھ اپنے سر سے اتار دیا۔

۱۲۵۸ء میں بغداد کی تباہی کے بعد دو برس تک اسلامی دنیا میں کوئی خلیفہ نہ تھا۔ ۱۲۶۱ء میں مستنصر باللہ کو قاہرہ میں سلطان بیبرس نے خلیفۂ اسلام مان کر اس کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اسوقت سے لیکر ۱۵۱۷ء تک اگرچہ خلافت سلطنت سے علیحدہ رہی مگر خلافت کا مذہبی اقتدار اور رعب بدستور سابق قایم رہا۔ چنانچہ ۱۳۴۳ء میں محمد تغلق شاہِ ہندوستان نے بڑے تپاک سے خلیفہ کے ایلچی کا استقبال کیا۔ اور اس سے اپنی بادشاہت کے لئے خلعت حاصل کیا +

۱۵۱۷ء میں آخری خلیفہ المتوکل باللہ نے اپنے حقوق خلافت ترکی سلطان سلیم کے حق میں منتقل کر دیئے اور خلافت برابر چار سو سات برس تک سلطان ترکی کے قبضے میں رہی۔

اب دو سال سے خلافت مفقود ہے۔ اور اگرچہ مختلف اسلامی جماعتیں اور بعض مسلمان حکمران اسے از سر نو زندہ کرنے کی فکر میں رہے ہیں لیکن تاحال کوئی خاص نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔

جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے پہلی صدیوں میں اسلام نے ہر میدان میں آگے کو قدم بڑھایا۔ بغداد کی آبادی بڑھتے بڑھتے بیس لاکھ ہو گئی۔ حکومت متعدد دیوانوں یا شعبوں میں تقسیم کی گئی اور ہر شعبۂ حکومت بہترین اصولوں پر منضبط ہوا دیوان الخراج (شعبۂ مالیہ) دیوان الجند (شعبۂ حربیہ) دیوان البرید (شعبۂ ڈاک) دیوان النظر فی المظالم (شعبۂ انصاف و معدلت) وغیرہ کے ناموں سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت کا نظم ونسق کس درجہ پر پہنچ چکا تھا۔ غیر مسلموں کے حقوق کے تحفظ کیلئے علیحدہ شعبہ تھا۔ حکومت اگرچہ خلافت راشدہ کے بعد جمہوری اصول پر قایم نہ رہی تھی لیکن نظام حکومت

اس قدر منتظم اور اسلام کے اصولِ معدلت اور قوانین اس قدر راسخ اور مسلم ہو چکے تھے کہ مطلق العنانی اسلامی حدود کے اندر مفقود تھی۔ خلیفۂ وقت بالعموم عدالت کے فیصلوں میں دخل نہ دیتا تھا۔ بلکہ اکثر کے متعلق مذکور ہے کہ انہوں نے باوجود اختلاف رائے کے ہمیشہ محکمۂ قضا کے سامنے جو اسلامی قانون کا امانت دار تھا خود سر تسلیم خم کیا۔ صوبے آپ اپنے معاملات طے کرتے تھے اور وہاں کی جزئیات میں مرکزی حکومت دخل نہ دیتی تھی لہذا والیوں کو اپنے اپنے علاقے میں وسیع اختیارات حاصل تھے۔

علوم و فنون میں مسلمانوں کے کارناموں کی تفصیل یہاں بے محل ہو گی مگر اتنا ذکر کر دینا ضروری ہے کہ پیغمبر اسلام نے حصولِ علم کو گویا مذہب کی طرف سے فرض کر دیا "علم کو تلاش کرو خواہ وہ چین میں ہو" مسلمانوں نے اس ہدایت نبوی کی پیروی میں جس شوق اور جانفشانی سے کام لیا تاریخ کے اوراق اس کے شاہد ہیں۔ حضرت علی جو ایک زبردست شاعر ہونے کے علاوہ ایک جید عالم اور فیلسوف تھے کہتے ہیں کہ "عالم کی سیاہی شہید کے خون سے بیش بہا ہے"۔ فاطمی بالعموم علم و ہنر کے شیدائی تھے۔ جب عرب صحراؤں سے گذر کر شہروں میں بس گئے اور تمدن و حضارت نے ان کی زندگی کو اپنے رنگ میں رنگا تو وہ علم و ادب کی طرف متوجہ ہوئے۔ خلیفہ منصور کے حکم سے مختلف اجنبی زبانوں سے بہترین تصنیفات عربی میں ترجمہ ہوئیں اور تراجم کا ایک طوفان بغداد میں امنڈ پڑا ہر ایک کو علوم کا شوق دامنگیر ہوا ہر طرف علمی انجمنیں اور کتب خانے کھل گئے والی اور امرا ایک دوسرے سے حصول علم اور جمع کتب میں سبقت لے جانے لگے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مسلمانوں کو حکم خداوندی نے حصول علم میں فلاح دینی کا رستہ دکھا دیا ہے۔ علما ایک ایک مسودے کی تلاش میں ہزاروں کوس کا سفر کرنا باعثِ فخر سمجھتے تھے۔ منگولی حملہ آور بھی جنہوں نے بغداد کو منہدم کر کے وہاں عرب تمدن کا نام تک نہ چھوڑا مسلمان ہو کر علماء کے قدردان بن بیٹھے۔ اگر عباسیہ عہد میں ہم مشرق و مغرب میں ابن یونس، ابن ہیثم، ابن رشد، ابن سینا، ابن خلدون وغیرہ کا ذکر سنتے ہیں تو اُن وحشیوں کے وقت میں طوسی المغربی النجاری وغیرہ کا نام سننے میں آتا ہے۔ تیمور کی ملکہ نے خود ایک دار العلوم کی بنیاد ڈالی۔ اور لطف یہ ہے کہ مسلمان صرف تاریخ و ادب و شعر سے آشنا نہیں ہوئے جو ان کا خاص شعبہ سمجھا گیا ہے۔ بلکہ کیمیا و طبعیات طب و تجارت، موسیقی و تعمیر فلسفہ و ریاضی کے اکتشافات سے عربی علم ادب روز بروز مالا مال ہوتا گیا۔ فن تجارت فن زراعت فنونِ صنعت و حرفت پر جدا جدا تصنیفات تھیں اور مشاہدہ و تجربہ کے شوق نے عربوں کو اس تنقید و تفتیش کی راہ پر لگا دیا جہاں وہ موجودہ تمدن مغرب کے رہبر و رہنما بنے۔ مسلمان عورتوں کا وہ حال نہ تھا جو گذشتہ چند صدیوں میں رہا ہے۔ نسوانی شائستگی اور نسوانی تعلیم کا معیار نہایت بلند تھا۔ ان کے لئے الگ مدارس تھے جہاں وہ طب

اور فلسفہ اور دینیات کی تعلیم پاتی تھیں۔ ہسپانیہ میں مرد عورت کے تعلقات میں وہ آزادی اور نفاست تھی کہ اہل مغرب نے وہاں سے اپنا بہادرانہ برتاؤ اور طبقۂ نسواں کی قدردانی سیکھی۔ غرض اسلام نے مشرق و مغرب میں عقلی و معاشرتی آزادی کا سبق دیا۔ اور اس سے ایک جہالت میں ڈوبی ہوئی دنیا کو علوم و فنون کی برکتوں سے آشنا کیا۔

خالص مذہب کے معاملے میں مسلمان شروع سے آزاد خیال تھے۔ قرآن میں جہاں خدا کی قدرت کا ذکر ہے وہاں جابجا انسانی سعی اور انسانی عقل کی فضیلت بھی مذکور ہے۔ خدا کا حکم فی الحقیقت قدرت کا قانون ہے جو مناسب وقت پر مناسب طریق میں نافذ ہوتا ہے۔ اپنے محدود دائرہ حیات میں انسان آزاد ہے۔ خدا اُسے نیکی کی راہ دکھا دیتا ہے اور پھر اُسے نیکی اور برائی میں سے صحیح انتخاب کرنے کو قطعی طور پر آزاد چھوڑ دیتا ہے۔ حضرت علی نے مسئلہ قضا و قدر کی اسی طرح تشریح کی۔ اور امام جعفر الصادق اور علی الرضا نے مسائل جبر و اختیار و تفویض پر بحث کر کے انسان کو بجائے مجبور کے مختار مانا۔ بنی امیہ چونکہ جبر کے معتقد تھے اُن کے وقت میں "جبریہ" فرقوں کا ظہور ہوا جو انسان کو محض مجبور سمجھتے تھے لیکن ان صفاتیہ و مشبہیہ لوگوں کے خلاف جلد علما کا گروہ کھڑا ہو گیا۔ علمی مرکز دمشق سے بصرہ بنا۔ جہاں حسن بصری نے جبر کے خلاف اپنی آواز بلند کی۔ بغداد میں جب جبریہ نے زور پکڑا تو واصل بن عطا نے اس زبردست عقلی تحریک کی بنیاد ڈالی جس نے اسلام کو ایک عقلی مذہب کی حیثیت میں دنیا کے سامنے پیش کیا۔ یہ معتزلہ جو یونانی فلسفے کے ماہر تھے مذہب میں عقل و منطق کے پیرو تھے۔ انہوں نے ارسطو کے فلسفے کے مقابل میں علم الکلام کی بنیاد ڈالی معتزلہ نے کہا کہ خدا صفات نہیں رکھتا علم قوت اور حیات خدا کی ذات کا جزو ہیں۔ اس کی صفات نہیں اور صرف ازلیت ہی خدا کی "صفت" ہے۔ کلام اللہ مخلوق ہے ازلی نہیں۔ ہم انسان جو صاحب صفات ہیں خدا کو جو صفات سے مبرا ہے دیکھ نہیں سکتے۔ قرآن میں خدا نے انسان کی زبان میں انسان کو سمجھانے کی غرض سے گفتگو کی ہے۔ سو قرآن کے بعض الفاظ کے وہ معنی نہیں جو الفاظ پرست بیان کرتے ہیں۔ برائی خدا سے صادر نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ عادل ہے اور انسانی فلاح اُس پر لازم ہے۔ انسانی افعال کا کوئی ازلی قانون نہیں۔ اور ربانی احکام نشو و نما اور ارتقا کا نتیجہ ہیں۔ "خدا نے ایک ایسے قانون کے ذریعہ سے اپنے احکام اوامر و نواہی نافذ کئے ہیں جو بتدریج پیدا ہوا" یہ علم عقل سے حاصل ہوتا ہے اور نیکی اور برائی میں صرف عقل تمیز کر سکتی ہے اور عقل ہی سے خدا کی ہستی کا پتہ چلتا ہے۔ معتزلہ مسئلۂ ارتقا کے معتقد تھے اور ان کا خیال تھا کہ انسان مدتے زمین پر ہزاروں لاکھوں سال سے موجود ہے۔ ابن ہیثم کا نظریہ تھا کہ جمادات سے نباتات نباتات سے حیوانات

اور حیوانات سے انسان ظاہر ہؤا۔ مولانا روم نے اپنے مشہور اشعار میں روحانیت و مادیت مذہب و طبیعیات کو کس خوبی سے یکجا کیا ہے ؎

از جمادی مردم و نامی شدم — از نما مردم بحیواں سر زدم

مردم از حیوانی و آدم شدم — پس چہ ترسم کے ز مردن کم شوم

حملہ دیگر بمیرم از بشر — تا بر آرم از ملائک بال و پر

بار دیگر از ملک پراں شوم — آنچہ اندر وہم ناید آں شوم

پس عدم گردم عدم چوں ارغنوں — گویدم کا نا الیہ راجعون

دنیائے اسلام میں چار سُو فیلسوف پیدا ہو گئے۔ الکندی۔ فارابی۔ ابن سینا۔ ابن ماجہ۔ ابن طفیل ابن رشد وہ چند شہرہ آفاق شخصیتیں ہیں جنہوں نے دنیا کی تاریخ فلسفہ پر ایک گہرا نقش چھوڑا ہے۔ مغربی مصنف کارڈن کے نزدیک الکندی ان بارہ سب سے بڑی شخصیتوں میں سے تھا جو دنیا میں سولہویں صدی تک پیدا ہوئیں۔ فارابی نے "احصا العلوم" میں تمام علوم متداولہ کا نقشہ پیش کیا اور ارسطو کے فلسفے کی تشریح کی۔ ابن سینا نے ارسطو کے فلسفی نظام کو منضبط کیا اور وہ خلا جو ارسطو خدا اور انسان کے درمیان چھوڑ گیا تھا معمور کیا۔ ابن سینا کا مدعا کائنات کا ایک ایسا منظر پیش کرنا تھا جو نفس اور مذہبی وجدان دونوں کو مطمئن کر دے۔ اور اسی لئے اس نے دو عقلوں کا نظریہ پیش کیا جس کے مطابق عقل انفعالی جو مادہ اور دنیا سے روشناس اور تغیر و موت سے آشنا ہوتی ہے۔ اپنی ریاضت نفس سے اس عقل فعال میں جا ملتی ہے جسے کبھی زوال نہیں۔ اور جو ازل سے ابد تک قایم ہے۔

یہ ریاضت صرف عقلی نہ ہوگی بلکہ اخلاقی اور روحانی بھی ہوگی۔ ابن سینا کے نزدیک انسانی روح کو انفرادی دوام حاصل ہے۔ مرنے کے بعد انسان اپنی شخصیت نہیں کھو بیٹھتا صرف اس کی زندگی بجائے جسمانی کے روحانی ہو جاتی ہے ابن رشد جو ۱۱۲۶ء میں پیدا ہؤا دنیا کے عظیم ترین علما و فلاسفہ میں شمار ہوتا ہے۔ یورپی مصنف منک کا قول ہے کہ وہ ارسطو کے بہترین نقادوں میں تھا ابن رشد کہتا ہے کہ انسان کی بہترین مساعی حصول کمال میں صرف ہونی چاہئیں اسے اپنی زندگی کو روز بروز بہتر بنانا چاہئے اور اس کا نصب العین انتہائی کمال ہونا چاہئے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ کائنات کی عقل فعال کے ساتھ قطعی طور پر متحد ہو جائے یہ کمال نرے مراقبہ سے ہاتھ نہیں آتا بلکہ صرف عمیق مطالعہ اور فکر سے حاصل ہو سکتا ہے اور تمام ان خواہشات کے ترک کرنے سے ملتا ہے جو روح کی ادنیٰ قوتوں اور حواس سے متعلق ہیں۔ وہ پیغمبروں کا معتقد تھا پیغمبروں نے نوع انسان کو ان حقایق ازلی کی راہ دکھائی

جن کی مذہب وفلسفہ دونوں نے تعلیم دی ہے ۔صرف جاہل لوگ مذہبی احکام کے لفظی معنی پر زور دیتے ہیں عقلمند ان کے صحیح مفہوم کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ جبر و اختیار کی نسبت ابن رشد کا خیال تھا کہ حقیقت ان دونوں کے بین بین ہے اَلْاَمْرُ بَیْنَ الْاَمْرَیْنِ ۔ہمارے اعمال ایک حد تک ہمارے اختیار میں ہیں اور ایک حد تک بیرونی اسباب پر منحصر ہیں۔ ہم اس بات میں آزاد ہیں کہ جیسے چاہیں کسی بات کا ارادہ کریں اور اُسے انجام دیں۔ لیکن ہمارے ارادے بیرونی اسباب کے زیر اثر ظاہر ہوتے ہیں ۔ان اسباب کا منبع قدرت کے عام قوانین ہیں جن کے نفاذ کا صحیح علم صرف خدا کو ہے۔ یہ ہے جسے علم الکلام قضا و قدر کہتا ہے سیاست میں ابن رشد استبداد کا مخالف تھا۔ اور معاشرت میں وہ عورت مرد کی مساوات کا قائل تھا۔ ابن رشد کے نظریات میں عربوں کا فلسفہ معراجِ ترقی پر پہنچا۔ ابن سینا اور ابن رشد کی علمیّت وقابلیت عربوں کی صدیوں کی تحصیل علوم کا نتیجہ تھی۔ عربوں نے اپنی محنت و توجہ سے ان علوم وفنون کا احاطہ کر لیا تھا جن میں آج دنیا منہمک نظر آتی ہے۔ اپنی آزاد خیالی اور بے تعصبی میں وہ حال کے علما و حکما سے کسی طرح پیچھے نہیں رہے لیکن یہ قابل غور ہے کہ ہمیشہ اپنے تئیں مسلمان سمجھتے اور مسلمان کہلاتے تھے۔

دسویں صدی کا آخری حصہ اسلامی دنیا کے لئے ایک نازک وقت تھا "اہل شرع" "اہل عقل" کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے اور اپنی تنگ خیالی سے اسلام کے دائرے کو تنگ کرنے لگے۔ اُس وقت بصرے میں ایک انجمن "اخوان الصفا" کے نام سے قایم ہوئی جس کے اراکین کا مقصد فلسفیانہ و اخلاقی مسائل پر آزادی اور بلند نظری کے ساتھ غور و خوض کرنا تھا۔ انہوں نے شہر شہر میں اس انجمن کی شاخیں قایم کیں اور مختلف مضامین و موضوع پر رسائل جاری کئے۔ معاشرتی و سیاسی معاملات میں ان کی رائیں صائب تھیں اور اخلاقی و روحانی مسائل میں اُنکی تعلیم قوم کے لئے بہمہ وجوہ سودمند ثابت ہوئی وہ اخلاق کو عقل سے برتر جانتے تھے۔ اور ایثار اور ضبطِ نفس سے کام لیتے تھے۔ ان کا قول تھا کہ ایمان بغیر عمل کے اور علم بغیر مصروفیت کے فضول و بے معنی ہے"۔ کائنات کے متعلق ان کا خیال تھا کہ وہ خدا سے پیدا ہوئی ہے مگر بالواسطہ نہ کہ بلا واسطہ۔ انسان کی زندگی کا نصب العین یہ ہونا چاہئے کہ وہ اپنے سرچشمۂ زندگی کی طرف عود کرے یہ ہے معاد وہ رجوع جس کا پیغمبر اسلام نے ذکر کیا ہے۔ وہ سکون و اطمینان جس کی طرف قرآن نے اشارہ کیا ہے۔

بشیر احمد

(باقی)

قوس اور شاعر

ابرِ گوہر ریز میں قوسِ قزح تھی جلوہ بار
دیکھ کر جسکو مرا دل ہوگیا بے اختیار

میں نے پوچھا اُس سے کیا تو ہالۂ خورشید ہے؟
حسنِ نور افزا ترا وجہِ فروغِ دید ہے

تو کوئی تصویر ہے نقش و نگارِ خلد کی؟
لے اُڑیں رنگینیاں جسکو بہارِ خلد کی

بحر میں جلوہ فگن ہے عکس شاخِ طور کا؟
یا فضائے چرخ میں لٹکا ہے آنچل حور کا؟

کیا تری چھپی کماں کو جستجوئے تیر ہے؟
کیا فنا کرنے کی دنیا کو یہ اِک تدبیر ہے؟

سُن لیا قوسِ قزح نے جب مری گفتار کو
طیش میں آکر چڑھایا ابروئے خمدار کو

اور کہا اے شاعرِ خوش فکر کیا کہتا ہے تو
سرزمیں وہ ننگِ عالم ہے جہاں رہتا ہے تو

مُلک تیرا صورتِ شیطاں جرائم پیشہ ہے
فتنہ خو، بیہودہ گر، مستغنیٔ اندیشہ ہے

لطف گر ملتا ہے کچھ تو چیرہ دستی میں اُسے
عیش کا ملتا ہے کچھ ساماں تو پستی میں اُسے

وقف ہے تیرِ اجل میری کماں کے واسطے
اور اب میں وقف ہوں ہندوستاں کے واسطے

اِک نئی مخلوق نکلے گی مری محراب سے
اور ہوگی منسلک اس خطۂ شاداب سے

محمود اسرائیلی

راز

(۱)

شہزادی نسرین بڑی خوبصورت تھی، اور اپنے حسن اور نزاکت کی بدولت دور دور تک شہرت حاصل کر چکی تھی اُسے اپنے حسن کی تعریف سن کر بڑا لطف آتا تھا، اور وہ اس شخص سے بیحد خوش ہوتی تھی جو اس کے حسن کی تعریف کرے۔ اور اُسے جُھک کر سلام کرے۔

ایک دن وہ اپنی کنیزوں اور غلاموں کے ہمراہ جنگل کی سیر کو نکلی۔ وہاں اس نے ایک نوجوان شخص کو دیکھا، جو ایک گرے ہوئے درخت کے تنے پر بیٹھا لکڑی کے چھوٹے سے ٹکڑے کو چاقو سے کاٹ رہا تھا، شہزادی نے اپنا گھوڑا اس کے نزدیک پہنچایا، لیکن نوجوان نے اس کی طرف دوستانہ طریق سے دیکھکر صرف سر ہلا دیا۔ اور اپنے کام میں مشغول رہا۔ شہزادی ٹھیر گئی اور اسکی طرف حقارت سے دیکھنے لگی۔ لیکن نوجوان نے ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکالا۔ اور برابر اپنے کام میں مشغول رہا، طویل انتظار کے بعد شہزادی بولی "خوب!"

نوجوان کہنے لگا "ہاں، یہ خوب ہے"

"تم جانتے ہو میں کون ہُوں؟"

اُس نے کہا "نہیں"

"میں شہزادی نسرین ہُوں"

نوجوان بولا "آہا ہا! پھر کہنے لگا "مجھے کامران کہتے ہیں"

شہزادی نے اس نوجوان کی طرف حیرت سے دیکھا، اس نے بھی اس کی طرف دیکھکر سر ہلا دیا۔ اور پھر اپنے کام میں مشغول ہو گیا، شہزادی کی کنیزیں آگے بڑھ کر عرض کرنے لگیں "یہ دیوانہ ہے، اگر آپ کی خواہش ہو کہ اسکی تکلیفوں کا خاتمہ ہو جائے تو دو غلاموں کو حکم دیں، وہ اِسے سنبھال لیں گے"

شہزادی نے کامران سے کہا "تم نے سنا؟"

اُس نے حیرت سے کہا "نہیں، کیوں کیا بات تھی؟"

"وہ مجھ سے پُوچھ رہی [illegible] کیا تمہیں قتل کر دیا جائے؟"

"تم نے کیا جواب دیا ہے؟"

"میں نے ابھی تک کوئی جواب نہیں دیا"

"اچھا تو جب تم فیصلہ کرو مجھے بتا دینا" یہ کہا اور پھر اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔

شہزادی نے طیش میں آکر کہا "اسے قتل کر دو"

اس کے ساتھ ہی دو غلام گھوڑوں سے نیچے اُترے اور تلواریں کھینچکر کھڑے ہو گئے لیکن کامران نے اُنکی طرف مطلق توجہ نہ کی، شہزادی نے کہا "ٹھیرو"! پھر کامران سے کہنے لگی "کیا تمہاری خواہش ہے کہ تم قتل کر دیئے جاؤ"

اُس نے مسکرا کر جواب دیا "کیا تمہاری خواہش ہے کہ میں قتل کر دیا جاؤں؟"

دیر تک شہزادی نے کوئی جواب نہ دیا۔ پھر گویا اپنی مرضی کے خلاف کہنے لگی "نہیں"۔

اس نے سختی سے غلاموں کو منع کیا اور اپنے گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتی جنگل سے باہر نکل گئی۔

کامران نے اپنے دل سے کہا "کس قدر حسین عورت ہے!"

(۲)

شہزادی نسرین اپنی عمر کے اٹھارہ مراحل طے کر چکی تھی، اس لئے اُس کے والد کو فکر ہوئی کہ اسکی شادی کر دینی چاہئے چنانچہ بہت سے شہزادے دارالسلطنت میں بلائے گئے۔ وہ بھی خوشی خوشی چلے آئے کیونکہ وہ شہزادی نسرین کے حسن اور اس کے والد کی دولت کا شہرہ سن چکے تھے، ہر ایک شہزادہ بڑے بڑے لمبے چوڑے عہد و پیمان کرتا، لیکن نسرین ہر ایک کی طرف نفرت سے دیکھ کر چلی جاتی۔

ایک روز تنگ آکر وہ صرف اپنی ایک کنیز کو ساتھ لئے جنگل کی سیر کو نکلی، اور تھوڑی دیر میں کامران کے پاس جا پہنچی وہ بیٹھا لکڑی کے ایک ٹکڑے کو تراش رہا تھا۔ شہزادی نے اسکی طرف نفرت سے دیکھ کر کہا "خوب!"

کامران نے سر اُٹھا کر دیکھا "آہا، تم ہو!" یہ کہہ کر پھر سر جھکا لیا۔

"کیا تم مجھے جانتے ہو؟"

"یہاں جنگل میں سینکڑوں آتے ہیں، میں کس کس کو جانوں"

"تمہیں میرا نام یاد ہے؟"

کامران نے اپنا سر ہلا کر کہا "میں کس طرح یاد رکھ سکتا ہوں؟ میرے لئے یاد کرنے کو اور تھوڑی چیزیں ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ تمہارا نام یاسمین ہے، کیوں؟ چلو یاسمین ہی سہی"، پھر کہنے لگا "میرا نام کامران ہے"

کنیز بولی "بیوقوف یہ شہزادی نسرین ہیں"
اس نے سر ہلا کر کہا "نسرین ہاں بیشک نسرین"
شہزادی نے پوچھا "تمہیں یاد ہے پچھلی مرتبہ کیا ہوا تھا؟"
"ہاں یاد ہے میں ایک بگلے کو حالتِ پرواز میں تراش رہا تھا کہ تم میرے کام میں مخل ہوئیں میں نے یہ بگلا تمہارے جانے کے بعد ختم کیا، یہ بہت عمدہ بگلا تھا"۔
شہزادی نے بڑے فخریہ لہجہ میں کہا "میں نے تمہاری زندگی بخش دی تھی"۔
"افسوس مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ تم ہو"
"کیا میں شہزادی نہیں؟"
"کیا میں کامران نہیں؟"
"تو پھر ہوا کیا"
دنیا میں شہزادیاں تو بہت سی ہیں، لیکن میں اپنے سوا کسی اور کامران کو نہیں جانتا"
"اگر میں تمہارے قتل کا حکم دے دیتی تو تم اس وقت تک زندہ نہ ہوتے"
کامران نے اسکی طرف دیکھ کر کہا "تم ہمیشہ قتل ہی کی باتیں کرتی رہتی ہو۔ کیا تمہیں اس میں بڑا لطف آتا ہے؟"
شہزادی نسرین نے اپنا نازک منہ کچھ کہنے کیلئے کھولا، لیکن اُسے کہنے کو الفاظ نہ ملے، اور وہاں کچھ عرصے تک خاموشی رہی، کامران نے اپنے ہاتھ والی لکڑی کا ٹکڑہ زمین پر رکھ دیا۔ یہ ایک تاک میں بیٹھے ہوئے چیتے کا مجسمہ تھا وہ اُسے الٹ پلٹ کر کہنے لگا "ایک خوبصورت چیتا! آہ غریب کامران میں تو اسے غراتے سنتا ہوں! نہیں نہیں!"
شہزادی نے غصّے میں آکر کہا "آہ مجھے تم سے نفرت ہے نفرت!"
اس نے اپنے گھوڑے کی لگام کھینچی اور سرپٹ دوڑا دیا، اور اپنی چابک زور سے گھماتی جنگل سے باہر نکل گئی،
کئی دن گذر گئے لیکن شہزادی نسرین کسی شہزادے کے ساتھ شادی پر رضامند نہ ہوئی، ایک دن اس نے اپنے والد سے پوچھا "کیا کوئی اور شہزادہ نہیں؟"
بادشاہ نے کہا "ہاں ایک شہزادہ کامرانِ اعظم رہ گیا ہے"
"اُسے بلاؤ"
بادشاہ نے اس کی طرف پیغام بھیجا، شہزادی نے خیال کیا کہ اُسے آخری مرتبہ جنگل سے ہو آنا چاہئیے چنانچہ

ایک دن وہ پھر جنگل میں گئی، جب کامران نے اُسے اپنی طرف آتے دیکھا، تو مسکرا کر کہنے لگا، کیا تم مجھے قتل کرنے آئی ہو؟"
اس نے بھولے پن سے کہا "نہیں!" پھر کہنے لگی "کیا میں یہ مجسمہ دیکھ لوں جو تم تراش رہے ہو؟"
شہزادی نے کہا "یہ بہت خوبصورت عورت ہے"۔
کامران نے کہا "ہاں یہ خوبصورت ہے"۔
"مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ عورت میں نے کہیں دیکھی ہے"۔
"تم نے اسے کبھی نہیں دیکھا"
"کیا یہ اس عورت کا مجسمہ ہے جس سے تمہیں محبت ہے؟"
اس نے ہنس کر کہا "نہیں مجھے اس سے محبت نہیں، وہ بہت ظالم ہے"۔
شہزادی نے دوبارہ مجسمہ کی طرف دیکھ کر پوچھا "کیا تم نے اسے دیکھا ہے؟"
"ہاں"
"اس کا نام کیا ہے؟"
وہ کہنے لگا "اس کا نام" ذرا سوچ کر "اس کا نام، ٹھیرو — میری زبان پر آرہا ہے، ہاں یاد آگیا "نسرین"۔
جوش سے شہزادی کا چہرہ سرخ ہوگیا، وہ کہنے لگی "تمہیں یہ جرأت کیونکر ہوئی؟"
"کون سی جرأت؟"
"تم یہ کہتے ہو کہ تم میری محبت میں گرفتار ہو؟"
"میں نے تمہاری محبت میں گرفتار ہونے کو نہیں کہا"۔
"یہ بہت بُری بات ہے!"
"کیا تم مجھے محبت میں گرفتار ہونے کا موقعہ دوگی؟ تم میرے ساتھ شادی کروگی؟"
اُس نے ہنس کر کہا "میں اور تم سے شادی کروں!"
اس نے اس کی طرف حیرت سے دیکھ کر کہا "خُوب! تم کیوں چاہتی ہو کہ میں ناخوش رہوں، تم عجیب لڑکی ہو، پہلے تم نے مجھے قتل کرنا چاہا، اور اب تم مجھے دل شکستہ دیکھنا چاہتی ہو، تم ہرگز مطمئن نہیں ہوتیں جب تک ایک انسان تکلیف میں مبتلا نہ ہو، تم عجیب ہو!
"یہ درست نہیں"

"کیا درست نہیں"

"وہی جو تم میرے متعلق کہتے ہو" پھر ایک بچّے کی طرح آنکھوں میں آنسو بھر کر کہنے لگی "میں کسی کو تکلیف دینا نہیں چاہتی"

تھوڑی دیر تک دونوں خاموش رہے، پھر کامران نے اسکی طرف دیکھکر سر ہلایا اور کہا "میں یہ واپس مانگ سکتا ہوں؟"

شہزادی نے وہ مجسمہ اُسے واپس دے دیا۔ کامران نے اس کی طرف دیکھ کر سر ہلایا اور کہا "یہ ابھی مکمل نہیں ہوا جب تم دوبارہ آؤگی، تو تمہیں دکھاؤں گا"

"میں اب کبھی نہ آؤں گی" +

اس نے بغیر اس کی طرف دیکھے کہا "تو پھر الوداع" +

وہ کچھ کہنا چاہتی تھی، لیکن نہ کہہ سکی، اور گھوڑا موڑ کر جنگل سے باہر نکل گئی،

(۳)

چند دنوں بعد پیغامبر واپس آیا اور کہنے لگا شہزادہ کامران دور دراز ملکوں کی سیر کو گیا ہے، اور وہ کچھ عرصے تک نہیں آسکتا۔

شہزادی نسرین نے سب کنیزیں ہٹا دیں اور اکیلی بیٹھ کر خیالات میں غرق ہوگئی، یہ شخص کامران جسے وہ تقریباً چاہتی تھی — کیا وہ چاہتی تھی؟ — یہ شخص کامران جس سے اُسے نفرت تھی، جو اُسے حقیر سمجھتا تھا، — آہ کس قدر اُسے اس سے محبت تھی لیکن وہ اس سے شادی نہ کرسکتی تھی، — یہ شخص کامران جو شاید اس سے محبت کرنے لگے — کیا وہ کریگا؟ آہ اگر وہ کرے، تو وہ ضرور اس سے شادی کرلیگی — یہ شخص کامران — یہ کون تھا؟ —

اس نے کہا تھا "میں اپنے سوا کسی اور کامران کو نہیں جانتا" ہاں یہ سچ تھا، دنیا میں صرف ایک کامران تھا، عظیم الشان اور طاقتور کامران، سوائے ایک شہزادے کے کون اتنے یقین سے کہہ سکتا ہے؟ سوائے ایک شہزادے کے کون اس سے مساوی سلوک کرسکتا ہے؟ اور شہزادہ کامران کہاں ہے؟ مختلف افواہیں مشہور تھیں لیکن یقین سے کون کہہ سکتا ہے؟ یقیناً وہی کہہ سکتی ہے! وہ جنگل میں اس کا انتظار کر رہا ہے! +

تو پھر اگر وہ جنگل میں ہے تو صرف اسی کی خاطر آیا ہے! وہ اس کی محبت جیتنا چاہتا ہے اور وہ اسے اپنی محبت میں گرفتار کرنا چاہتا ہے اس سے پہلے کہ وہ اس کا راز معلوم کرلے، یہ اس وقت تک راز رہے گا جب تک وہ اسے آشکارا نہ کرے، وہ کامران تھا وہ نسرین تھی اور دونوں ایک دوسرے پر دل و جان سے فریفتہ تھے، شروع ہی سے وہ اسے "شہزادی"

کہکر نہ پکارتا تھا، اُسے نسرین بننا تھا اور اُسے کامران، اب وہ ضرور جنگل میں کامران کے پاس جائے گی،
صبح سویرے وہ جنگل میں گئی اور کہنے لگی "میں آ گئی ہوں"۔
اس نے نسرین کا مجسمہ اس کی طرف بڑھا کر کہا "اب یہ درست ہو گیا ہے"۔
نسرین نے اس کی طرف دیکھ کر کہا "اب کوئی ظلم نہیں کوئی نفرت نہیں"،
کامران نے سر ہلا کر جواب دیا "یہ اچھا ہے یہ اس کے مشابہ ہے"،
"کیا یہ سچ ہے کامران؟"
"ہاں اب میرا اس کے متعلق ایسا ہی خیال ہے"۔
"تو پھر اس کے متعلق ہمیشہ یہی خیال کرو، خواہ یہ جھوٹ ہی ہو"۔
"جب میں نے مجسمہ میں دکھا دیا ہے تو یہ سچ ہی ہے"۔
اُس نے محبت سے کہا "تو پھر یہ سچ ہی ہوگا! میں اسے سچا ثابت کروں گی!"
کامران نے مسکرا کر پوچھا "تو اب میں زیادہ تکلیف نہ اٹھاؤں گا"
"تمہیں تکلیف اُٹھانے کی بالکل ضرورت نہیں۔
کل ــــ کل تم نے ــــ"
"شہزادی جب سے پیدا ہوئی ہے، اس نے بجز فضول باتوں کے اور کچھ نہیں کہا، لیکن نسرین ــــ"
وہ کہنے لگا "نسرین"
"نسرین اس وقت تک کچھ نہیں کہتی جب تک اُس سے کچھ پوچھا نہ جائے"۔
"تمہارا مطلب ہے کہ ــــ؟"۔
یہ کہہ کر اُس نے اپنے بازو اسکی طرف پھیلا دیئے، اور اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔
لیکن راز ابھی راز ہی رہا بہت دفعہ وہ کامران کی طرف دیکھ کر مسکراتی اور اپنے دل سے کہتی "وہ مجھے کیوں نہیں بتاتا، وہ مجھے ابھی اور آزمانا چاہتا ہے، وہ اپنے آپ کو یہ یقین دلانا چاہتا ہے، کہ اُسے میری محبت پر بھروسا ہے"
وہ ہمیشہ کامران کے کام کے متعلق گفتگو کرتے۔ کبھی یہ ذکر ہوتا کہ وہ اس سے کس قدر کما سکتا ہے، اور کبھی یہ کہ وہ شہروں میں جا کر اس کی بنائی ہوئی اشیا کے فروخت کرنے میں اس کی کس قدر مدد کر سکتی ہے،
ایک دن کامران نے اس سے کہا "دیکھو! چند دنوں تک ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔ یہاں کے لوگ پرلے

دیجے کے بیوقوف ہیں، انہیں اچھے بُرے کام کی تمیز نہیں، ہم اِدھر اُدھر مختلف مقامات میں پھریں گے، اور ہمیشہ ہمیں دو ایک شخص ایسے مل جایا کرینگے جو میرے کام کی قدر کر سکیں، یہ ہمارے لیئے اور ہماری سادہ ضروریات کیلئے کافی ہوگا"!

نسرین مسکرائی، اسے معلوم تھا کہ آیندہ کیا ہونیوالا ہے وہ ادھر اُدھر چند مقامات پھریں گے۔ یہاں تک کہ وہ اسکے ملک میں پہنچ جائینگی، وہ اس پر اپنا آپ آشکارا کر دے گا اور پھر وہ شہزادہ بن جائیگا اور وہ شہزادی، اور وہ دن کس قدر خوشگوار ہونگے۔

(۴)

یہ دن واقعی خوشگوار تھے۔ کامران کے ساتھ شادی کرنا تماشا تھا۔ خرید و فروخت تماشا تھا، گھر کا انتظام تماشا تھا۔ اور اُسے کام کرتے دیکھنا تماشا تھا۔

اور وہ راز بھی تماشا ہی تھا۔

ایک دن نسرین نے شرارت سے پوچھا "کامران تمہارا کیا مطلب تھا جب تم نے کہا تھا کہ سوائے میرے اور کوئی کامران نہیں؟" *

اس نے بھی مسکرا کر جواب دیا "یہی کہ دنیا میں اور کوئی کامران نہیں"۔

"اور وہ کون ہے؟"

"میں کامران سنگ تراش، دنیا میں اور کوئی میری طرح پتھر نہیں تراش سکتا، بادشاہ دنیا میں آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ لیکن ایک مصور اور سنگ تراش ہمیشہ زندہ رہتا ہے، آج سے ہزار سال بعد لوگ کہیں گے کہ کامران نے وہ مجسمہ تراشا" اور یہ کوئی بھی نہیں پوچھے گا کہ کونسا کامران؟ کیونکہ دنیا میں اور کوئی کامران نہیں" *

نسرین نے پوچھا "کیا تم ہمیشہ لکڑی کے ٹکڑے تراشتے رہوگے؟"

اس نے سنجیدگی سے کہا "نہیں ہمیشہ لکڑی نہیں، ایک دن شاید ہاتھی دانت اور ہڈی بھی تراشوں گا، اور شاید سنگ مرمر اور تانبا بھی"۔

نسرین نے مسکرا کر کہا "اور کیا تم ہمیشہ سنگ تراشی ہی کرتے رہوگے؟"

"تو اور کیا کروں گا"۔

نسرین نے کامران کا سر چوما اور کہا آہ کامران مجھے تم سے محبت ہے، تم کچھ کرو، میں مطمئن ہوں"۔

اس نے کچھ جواب نہ دیا اور اپنے کام میں مشغول رہا۔

انہوں نے مختلف مقامات کی سیر کی، وہ جہاں بھی جاتے شہر سے باہر جنگل میں خانہ بدوشوں کی سی زندگی بسر کرتے، وہ اپنے خیالات میں غرق رہتا، اور وہ جاکر شہر میں لکڑی کے مجسموں کو بیچتی، گھر کا انتظام کرتی کھانا پکاتی اور آیندہ حالات کے متعلق سوچتی۔

بعض دفعہ جب اُسے کسی مشکل کا سامنا ہوتا، تو وہ رونا چاہتی اور کہتی کامران، کامران، کیا میں نے اپنی محبّت ثابت نہیں کی؟ کامران اب میں آگے نہیں جا سکتی، آؤ ہم تمہارے ملک کو چلیں، اور دنیا میں اپنا نام روشن کریں۔ تم کب تک میری محبّت میں شک کرتے رہو گے؟ دیکھو میں نے تمہارے لئے کیا کچھ نہیں چھوڑا، لیکن افسوس وہ یہ باتیں کامران سے نہ کہہ سکتی تھی۔ وہ سوچتی کہ اُسے بھی کامران کی طرح بات کا پکّا ہونا چاہئے۔

وہ اس پر دل و جان سے فدا تھی، اور اس کے ساتھ رہنے میں خوش تھی، ہر مشکل کا دلیری سے مقابلہ کرنے کو سینہ سپر تھی۔

(۵)

دو سال گذر گئے وہ جنگل میں رہتے تھے، نسرین بیٹھی اپنے بچّے کو دیکھ رہی تھی اور وہ مطمئن تھی، لیکن راز ابھی تک راز تھا، جب اُسے محلّات کی زندگی یاد آتی تو وہ کہتی "کامران میں نے نسرین بننے کی بہت کوشش کی ہے میں پھر شہزادی نسرین بنوں گی، کامران ہمیں اپنے معصوم بچّے کا خیال کرنا چاہئے، اور اُسے اپنے ملک میں لے چلنا چاہئے" لیکن یہ باتیں کامران سے نہ کہہ سکتی تھی، کیونکہ وہ خوش تھی، کامران اور اس کا بچہ دونوں اس کے لئے باعثِ مسرت تھے۔

کامران جھونپڑی کے باہر بیٹھا ہاتھی دانت کا ایک مجسمہ تراش رہا تھا، اور وہ بھی خوش تھا، اپنے کام پر، اپنے بچّے اور اپنی بیوی پر، شاید ایک نہ ایک دن اس کا بچّہ بھی ایک عظیم الشان سنگ تراش ثابت ہوگا۔

دنیا میں ایک اور کامران بھی تھا، شہزادہ کامران، لیکن کامران سنگ تراش نے اس کے متعلق کچھ نہ سنا تھا، ایک کوئلہ جلانے والے کے بیٹے کو شاہی دربار سے کیا واسطہ، خواہ وہ کتنا ہی عظیم الشان سنگ تراش کیوں نہ ہو۔

(ماخوذ)

نظامی

ایقانِ خودی

میں جب سے گوشہ نشیں ہوا ہوں حدیقۂ کُنجِ آرزو میں
بہار کی شان ہے نمایاں اک ایک غنچے کے رنگ و بو میں

مری اُمیدوں کی عندلیبوں کے چہچہوں میں ہے کیفِ بادہ
ہے وجد میں باغباں کی رگ رگ وہ جوش پیدا ہوا لہو میں

مری تمنا کی قمریوں کی اُڑان میں ارتقا ہے مضمر
جوابِ "کُو کُو" ملا ہے ان کو کسی کی انگشتِ سدرہ رو میں

مری توقع کے طوطیوں کے دہن سے کوثر ٹپک رہا ہے
غضب کی دلکش ہے لوچ پیدا جو ہو گئی اُنکی گفتگو میں

نہ کیوں ہوں سیراب مثلِ جنت یہ کھیتیاں میری خواہشوں کی
کہ آبِ تسنیم بہ رہا ہے مرے تخیل کی آب جو میں

مرے ارادوں کے ابرِ نیساں سے رشک کھاتا ہے آبِ حیواں
کہ روحِ اعجازِ قُم باذنی مقیم ہے اُسکی شست و شو میں

چو عزمِ ایقانِ خویش کردم شناختم من بہائے خود را
نہ این کہ بشناختم خودی را شناختم من خدائے خود را

امین حزیں

زندہ دلی

زندہ دلی خدا کی ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ دنیا ایک مضمحل و پژمردہ انسان کیلئے تنگ ہوجاتی ہے، مگر زندہ دل اور ہر حال میں خوش رہنے والے لوگ دنیا میں ہر طرح سے کامیاب رہتے ہیں۔

زندہ دلی بہت سی طاقتوں کی خلاق ہے یہ انسان میں کام کرنے کے جوش کو ابھار دیتی ہے۔ دماغی و جسمانی قوتوں کی نشو ونما میں اس کا بہت بڑا حصّہ ہے جس شخص میں زندہ دلی نہیں ہوتی وہ دوستوں کی اعانت و دستگیری سے محروم رہتا ہے۔ لیکن ایک زندہ دل کے ساتھ ہمدردی و رفاقت کرنے والوں کی تعداد ایک لشکر سے کسی طرح کم نہیں ہوتی ہے

دنیا کے ہر شعبے میں خواہ وہ کاروباری دفتر ہو یا احباب کی مجلس، زندہ دل سے لوگ کشادہ دلی کیساتھ ملتے ہیں ایک ایسا شخص جو فطرتاً زندہ دلی کے ساتھ رہنے کا عادی ہو، اُسکے دل میں کام کرنے کا جوش عرصے تک قایم رہتا ہے، بخلاف اس کے ایک رنجیدہ اور ہر وقت پژمردہ رہنے والا آدمی بہت جلد اپنی طاقتوں کو کھو دیتا ہے۔ گویا زندہ دلی ہی ایک ایسی چیز ہے جو انسانی زندگی کی مشین میں تیل کا کام کرتی ہے۔

زندہ دلی کے علاوہ دنیا میں کوئی ایسی دوسری چیز نہیں جو انسان کو اطمینان و مسرت کے وہ بیش بہا تحائف دے سکے جن سے اسکو سخت سے سخت حالات میں بھی طمانیت حاصل رہے۔

اگر زندہ دلی پیدا کرنے کے لئے شروع ہی سے خیال رکھا جائے تو اس کے حصول میں زیادہ دقت پیش نہیں آتی بلکہ رفتہ رفتہ خوش رہنے کی عادت طبیعت ثانیہ بن جاتی ہے اور پھر ناامیدی اور پژمردگی کے آثار اس سے دُور ہو جاتے ہیں۔

بعض ایسے لوگ بھی ہیں جن سے اگر کوئی کام غلط ہو جاتا ہے تو وہ اس سے اس قدر ریدل اور مایوس ہو جاتے ہیں۔ کہ پھر اس کے صحیح کرنے یا اس پر غالب آنے کی کوشش ہی نہیں کرتے، وہ یہ نہیں سمجھتے کہ آسان اور تکلیف سے خالی کام تو ہر شخص کرسکتا ہے لیکن ایک مشکل کام کو خوبی کے ساتھ انجام دینا باہمت اور مستقل مزاج انسان ہی کا حصہ ہے۔

حقیقت پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ دنیا کی تمام بڑی سے بڑی فتوحات جو آج تک صفحات

تاریخ کی رونق ہیں، انہیں انسانوں کے کارنامے ہیں جنہوں نے مشکلات اور مخالفین کی تمام تنقیدوں اور نکتہ چینیوں کو پس پشت ڈالتے ہوئے سختیوں پر غالب آنے کی کوشش کی اور بالآخر غالب آکر رہے۔

دنیا میں ایسے صرف چند ہی لوگ ہیں جو کام کے مقابلے میں مایوسی اور تکالیف و مصائب کی پروا نہیں کرتے اور استقلال کیساتھ منزل کی طرف قدم بڑھائے چلے جاتے ہیں۔ البتہ ایسے لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہے جو کامیاب انسانوں کی ابتدائی تکالیف اور دشواریاں دیکھ کر سراسیمہ ہو جاتے ہیں اور اپنے آپ کو قسمت سے مجبور سمجھ کر اسی موجودہ حالت پر قناعت کر لیتے ہیں۔

وہ شخص جو اپنی تکالیف دور نہیں کرسکتا یا مصیبت و یاس اور ناامیدی کے ہجوم پر غالب آنے کی کوشش نہیں کرتا، وہ نہ اپنی زندگی کے مقصد کو سمجھتا ہے اور نہ اُسے دنیاوی معاملات میں کبھی کامیابی کا منہ دیکھنا نصیب ہوتا ہے وہ لوگ حقیقت میں انسان نہیں ہیں جو اپنے نقصانات و تفکرات، پریشانیوں اور مایوسیوں پر قابو حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتے، بلکہ حقیقی انسان وہی ہیں جو ان تمام باتوں کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہیں اس لئے کہ یہ استقلال اخلاق کو استوار، حوصلوں کو بلند اور زندگی کو شیریں بنا دیتا ہے، اگر تمہیں اپنی طاقتوں کے حیرت انگیز کرشموں کا اندازہ ہو جائے تو پھر تمہارے تخیلات میں پریشانیوں کا اثر باقی نہیں رہ سکتا اور یقیناً تم ان سب چیزوں کو ٹھکرا کر ان سے بلند ہونے کی کوشش کرو گے، اور دیکھنے والوں کو اپنے ہمت و استقلال کا گرویدہ بنا لو گے۔

ہر شخص کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اس امر پر غور کرتا رہے کہ میری فطرت کس طرح کی واقع ہوئی ہے۔ آیا میں بدمزاج اور رنجیدہ خاطر رہا کرتا ہوں یا مسرت امید اور زندہ دلی کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہوں یعنی میرے دوست مجھے دیکھ کر خوش ہوتے ہیں، یا اُن کے چہروں پر میری سی شکنیں پڑ جاتی ہیں، اگر ہم اس کا پورے طور پر احساس کرنے لگیں گے تو یقیناً ایک کامیاب زندگی بسر کرنا زیادہ مشکل نہیں ہے۔

میں ایک ایسے تاجر کو جانتا ہوں جو انتہائی غصے کی حالت میں بھی مسکراتا رہتا تھا، یہاں تک کہ اس کا جسم خواہ اندرونی آتشکدہ سے پھُک ہی کیوں نہ جائے مگر اس کا اظہار ناممکن تھا وہ اپنے منہ کو ایک خاص تبسم کے ساتھ کچھ اس طرح کھولے رہتا تھا کہ گویا وہ انتہائی مسرت اور خوشی کا مژدہ سنانے والا ہے، لوگ اس کی کامیاب تجارت پر تعجب کیا کرتے تھے، لیکن وہ یہ نہ جانتے تھے کہ اس کامیابی کا راز وہ تبسم ہے جو اس کے لبوں سے کبھی جدا نہیں ہوتا

انسان کو چاہیئے کہ وہ ہر وقت خوش، سنجیدہ اور متین رہنے کی عادت ڈالے خواہ اس کی دلی کیفیات اس کے خلاف ہی کیوں نہ ہوں، اگر یہ عادت راسخ ہو گئی جو بہت جلد ہو جاتی ہے تو اُسے سمجھ لینا چاہیئے کہ اب شاہد کامیابی

کی آغوش دور نہیں ہے،

ایک خاتون جو ہمیشہ لوگوں سے خندہ پیشانی کے ساتھ ملا کرتی تھی، اکثر وہ کسی وجہ سے اپنے وعدہ کے مطابق وقت پر نہ پہنچ سکتی تھی۔ اور لوگوں کو اس کا انتظار کرنا پڑتا تھا، لیکن جس وقت وہ اپنے متبسم لبوں کے ساتھ پہنچ جاتی تو لوگ انتظار کی اس تکلیف کو بھول جاتے تھے۔

میرا خیال ہے کہ دنیا میں کوئی ایسا شخص نہ ہوگا جو خوشدلی کی بجائے پژمردگی اور ہمت و استقلال کی بجائے بزدلی و کم ہمتی کو پسند کرتا ہوگا، مگر پھر بھی بہت سے لوگ ایسے موجود ہیں جو اپنے اندرونی جذبات و خواہشات کو پورا نہ ہوتے دیکھ کر اس قدر مایوس و شکستہ دل ہو جاتے ہیں کہ پھر انہیں اس کے خلاف جد و جہد کرنا بے سود معلوم ہونے لگتا ہے۔

جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ خوش دلی و بد مزاجی دونوں فطری چیزیں ہیں اور ان میں کسی طرح کا تغیر نہیں ہو سکتا۔ انہیں صرف اتنا خیال کرنا چاہئے کہ کیا ان کے اختیار سے یہ باہر ہے کہ وہ جس وقت کسی سے ملیں، خندہ پیشانی و گرمجوشی سے ملیں تاکہ لوگ ان کے متعلق کوئی بُری رائے قائم نہ کر سکیں اور شاہراہ ترقی میں لوگوں کی مخالفتیں انہیں مانع نہ آئیں۔

دنیا میں خواہ کوئی کتنا ہی بڑا دولت مند کیوں نہ ہو لیکن اگر اس کے اخلاق درست نہیں ہیں اور وہ لوگوں کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش نہیں آتا تو حقیقت میں وہ کامیاب نہیں بلکہ ایک انتہائی درجہ کا ناکام شخص ہے۔ کامیاب وہی انسان ہے جو اس بات کا ارادہ کر لے کہ خواہ وہ افلاس کی انتہائی بیچارگیوں میں ہو یا دولت و ثروت سے ہم آغوش کبھی اپنے آپ کو ترشرو نہ ہونے دیگا۔

اس کی ہرگز پروا نہ کرو کہ تم نے روپیہ پیدا کیا ہے یا نہیں۔ بلکہ اس کا خیال رکھو کہ تم خوشدل، شیریں کلام اور اعتدال پسند بھی ہو یا نہیں۔ دنیا کے بڑے بڑے انسان دولت کی طرف سے محروم ہی گزرے ہیں۔ لیکن اگر عمیق نظریں ڈالی جائیں تو معلوم ہو جائیگا کہ حقیقی دولت مند وہی تھے اس لئے کہ استقلال و ہمت، خوشدلی و خوش مزاجی، شیریں کلامی وصلح جوئی کے خزانوں کے وہ مالک تھے۔

میں ایک ایسے شخص سے واقف ہوں جس کی زندگی، مصائب و آلام، بیچارگی و درماندگی کا مرقع تھی مگر اسکے باوجود اسکے لبوں پر ایک مسکراہٹ کھیلا کرتی تھی، گویا وہ ایک ایسا سونا تھا جس کا تمام میل مصیبت و تکلیف کی آگ میں جل چکا تھا۔ اگرچہ یہ اب بڈھا ہو چکا ہے اور دنیا والوں کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں ہے تاہم اس کے جاننے والوں کے دل اسکی تعریف سے لبریز ہیں ✦

(ترجمہ)

سید ابو محمد ثاقب کانپوری

ضبطِ جنوں

میں دل بہلاؤں کیا ہنگامہ ہائے بزمِ امکاں سے
مجھے فرصت کہاں اپنے خیالاتِ پریشاں سے

ہے دم کے ساتھ بیمارِ محبّت کے خلش غم کی
نکالے سے نکلتا ہے کہیں کانٹا رگِ جاں سے

جنوں میں سعیٔ اخفائے جنوں ہے اِک جنوں یہ بھی
گریبانِ دریدہ کو چھپاتا ہُوں میں داماں سے

کبھی دو برگِ گُل ہی بھیج دیتے تحفتہً مجھکو!
شکایت ہے تو اتنی ہے مجھے اہلِ گُلستاں سے

وہی مَیں ہُوں وہی تم ہو وہی دشواریٔ الفت
پھرا کرتی ہیں تقدیریں کہیں تجدیدِ پیماں سے؟

خُدا جانے ہے اس بیدرد کے پہلو میں کیسا دل
توقع ضبط کی رکھتا ہے جو مجھ سوختہ جاں سے

محمد عبدالحی صدیقی (علیگ)

جوشِ انتقام

کھڑکی کے متصل سوزن کاری کے دبیز پردوں کی آڑ سے اُس نے بے چینی کیساتھ تیسری بار جھانک کر گھڑی کیطرف دیکھا۔ گو کھڑکی کے راستے آئے اور اس طرح تنہا کمرہ میں اپنے آپ کو پوشیدہ کئے ہوئے اُسے ابھی مشکل سے پانچ منٹ گذرے ہونگے۔ مگر پانچ منٹ! معاذ اللہ۔ ایسا معلوم ہوا کہ فردائے قیامت کی طرح دراز ہو گئے۔

کسی مشاق چور یا ڈاکو کی طرح اس کو اطمینانِ قلب بھی میسّر نہ تھا کیونکہ اسکی پنتالیس سال کی زندگی میں آج پہلا اتفاق تھا کہ قانون حکومت کی خلاف ورزی کا اس نے ارادہ کیا ہو۔ اس کے ہونٹوں کی خشکی قلبی اضطراب اور سانس کی بے ترتیبی لازمی تھی۔ کیونکہ وہ جس کام کے ارادہ سے یہاں آیا تھا وہ کوئی آسان کام نہ تھا بلکہ ایک شخص کی زیست وموت سے تعلق رکھتا تھا۔

کمرہ قیمتی اور خوشنما سامان سے آراستہ تھا فرش پر مخملی قالین۔ کوچ اور کرسیاں وغیرہ قرینہ سے بچھی تھیں، ایک طرف میز، میز پر لیمپ اور مختلف کاغذات وغیرہ پھیلے تھے۔ پاس ہی قلم دوات رکھا تھا، اور ایک تازہ پھولوں کا گلدستہ بھی،

جوں جوں وقت گذرتا گیا اس شخص کے ارادوں میں استحکام اور ہمت میں قوت ارادی پیدا ہوتی گئی۔ کمرہ اور اس کا سامان دیکھ کر اس کے تن بدن میں اور آگ سی لگ گئی "ہاں یہی وہ کمرہ ہے جہاں وہ آرام سے بیٹھتا ہے۔ وہ! اس کا جانی دشمن! یہی وہ کمرہ ہے جہاں اس نے اطمینان سے سوچ سوچ کر اس کی بربادی کا سامان بہم پہنچایا .... اچھا! خدا نے چاہا تو یہی وہ کمرہ ہوگا جہاں وہ اپنی ملعون زندگی کی آخری سانس لے سکے گا۔" یہ کہہ کر اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ جوشِ انتقام میں اس کی انگلیاں ریوالور پر خود بخود جم کر رہ گئیں۔ اس پر اس کے دل میں رحم اور ہمدردی کا تو ذکر ہی کیا مگر ہاں اتنی خلش ضرور تھی کہ جس طرح ہو اس فرض سے جلد سبکدوشی حاصل کرلے۔ وہ سامنے آجائے ــــ دو یا تین ہوں ــــ اور وہ فیر کرے۔ لوگ اس کو قاتل، سفاک، بیرحم، جو چاہے تصور کریں مگر اس نے اپنے دل کو یوں مطمئن کر لیا تھا کہ ایسے شخص کا وجود صفحۂ ہستی سے مٹانا یقیناً انصاف کیساتھ احسان کرنا ہوگا۔

کمرہ میں گھڑی کے چلنے کی سبک آواز آ رہی تھی اور وہ اپنے اذیت دہ انتظار کی گھڑیاں گن گن کر گذار رہا تھا کہ دفعتہً

کسی دروازے کے کھلنے اور بند ہونے کا کھٹکا سنائی دیا۔ زینہ پر کسی کے چڑھنے کی آہٹ بھی معلوم ہوئی تمنچہ کی گرفت اور لبلبی کی انگلی پر ایک بار اطمینانی نظر ڈال کروہ پردے سے باہر نکل آیا۔ کمرہ کا دروازہ کھلا اور ایک عورت دراز قد خوبصورت چہرہ سر سے پاؤں تک قیمتی جواہرات کے زیوروں سے آراستہ اندر داخل ہوئی۔ قبل اس کے کہ وہ دوبارہ پردے کی اوٹ میں واپس جاسکے عورت نے اس کو دیکھ لیا اور ذرا ٹھٹک کر بے ساختہ بولی۔

"تم کون ہو؟ ...... کیا چاہتے ہو؟"

اُس نے نہایت اطمینان کے ساتھ جواب دیا "تمہارے خاوند سے چند باتیں"

"مگر مجھے معلوم ہے کہ ان کو اس وقت کسی کا انتظار نہ تھا۔ کیا ان کو اطلاع ہے کہ تم یہاں موجود ہو؟"

"جی نہیں"

عورت پر ایک اجنبی کے ایسے صاف اور دیدہ دلیری کے جواب کا جو کچھ بھی اثر ہوتا کم تھا تاہم اس نے غیر معمولی ہمت و استقلال کا ثبوت دیتے ہوئے آگے بڑھ کر لیمپ کی بتی اونچی کی اور ایک بار اس کو نظر بھر کر دیکھا۔ گو اسکے چہرہ پر کمینگی یا بدمعاشی کی جھلک نمایاں نہ پائی مگر اس کی خونخوار نظریں، بھرائی ہوئی آواز، اور اضطرابی کیفیت نے اسکو ایک حد تک خوف زدہ کردیا وہ بھاگنے کیلئے دروازہ کی طرف بے تحاشا بڑھی مگر اس شخص نے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا اور بولا "بیگم صاحبہ! آپ بھاگئے نہیں مجھے آپ کے خاوند سے چند ضروری باتیں کرنی ہیں۔ اگر اُن کو میری موجودگی کا علم ہو گیا تو وہ یہاں ہرگز تشریف نہ لائیں گے"

عورت خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھی اس کے منہ سے گھبراہٹ میں اتنا اور نکلا "تم یہاں پہنچے کس طرح؟"

"کھڑکی سے"

یہ سنتے ہی عورت کی بے ساختہ چیخ نکل گئی ہوتی مگر اس شخص نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور بولا "دیکھئے! اگر آپنے یہاں سے جانے کی کوشش کی یا چیخی چلائیں تو یاد رکھئے کہ آپ کو اس کے نتائج برداشت کرنے ہونگے۔ آپ کے شوہر غالباً نیچے والے کمرہ میں ہیں۔ آپ کی آواز پر سب سے پہلے وہی آئیں گے اور جونہی انہوں نے اندر قدم رکھا میں فوراً فیر کردونگا۔ خوب سمجھ لیجئے کہ آپ کا شور و واویلا اُن کی ہلاکت کا باعث ہوگا"

اس نے عورت کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ اس کا خوبصورت چہرہ خوف و دہشت کی وجہ سے سفید پڑ گیا تھا اور وہ بُت کی طرح خاموش کھڑی ہوئی اس کو دیکھ رہی تھی۔ غالباً اس کے الفاظ کا پورا اثر ہوا کیونکہ اس نے چیخنے یا بھاگنے کی پھر جرات نہ کی ایک کرسی کی طرف اشارہ کرکے اس نے کہا "آپ تشریف رکھیں مجھے واقعی افسوس ہے کہ آپ اس آفت

ناگہانی میں پھنس گئیں۔لیکن اس کے بعد اب یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ آپ کو واپس چلا جانے دوں۔"

عورت کو قدرتے ڈھارس ہوئی۔قدرے دل ٹھہرا۔ وہ بالآخر بیٹھ گئی۔اس شخص کی نظروں سے معلوم ہوتا تھا کہ کوئی خاص شرارت مقصود نہیں۔اس لئے اس نے پوچھا "تم کیا چاہتے ہو؟ تم کو آخر میرے خاوند سے کونسی اہم بات کہنا ہے؟"

(مسکرا کر)" مجھے تمہارے خاوند کو خدا ترسی اور انصاف کی جانب زبردستی رجوع کرانا ہے مجھے تمہاری موجودگی کا ملال ہے۔اس لئے میں سمجھائے دیتا ہوں کہ جس وقت اُن کے آنے کی آہٹ معلوم ہو تو تم اس کھڑکی سے اس طرف باہر نکل جانا۔ورنہ........"

عورت کا دل ایک بار پھر کانپ اُٹھا۔وہ اس کی نظروں سے اس کا مطلب تاڑ گئی اور بے قرار ہو کر بولی" تو تم یہاں قتل کے ارادے سے آئے ہو؟"

"بیشک! میں تمہارے خاوند کی ناپاک ہستی سے دنیا کو پاک کرنے آیا ہوں ..... یہ قتل نہیں ہو سکتا"

"تمہاری غلطی ہے۔تمکو نہیں معلوم کہ قاتل کا کیا حشر ہوتا ہے یاد رکھو تم کو بھی پھانسی پر لٹکنا ہوگا۔"

اس عرصہ میں باہر کچھ آہٹ سی معلوم ہوئی،دونوں کی نظریں دروازے کی طرف اٹھ گئیں۔عورت کے منہ سے دفعتہً چیخ نکل گئی ہوتی مگر خوف اور دہشت کی وجہ سے جو آواز اس کے خشک حلق سے نکلی بھی وہ لبوں تک آتے آتے محض ایک خفیف جنبش بن کر رہ گئی۔

کچھ دیر بعد اس نے گھبرا کر پوچھا" اچھا یہ تو بتاؤ تم ان کو کیوں ہلاک کرنا چاہتے ہو؟"

"فقط اس لئے کہ وہ سیٹھ فیروز الدین کروڑپتی ہے،اور میں مفلس قلاش دیوالیہ،رشید الدین۔

ان الفاظ کو سنتے ہی عورت کا چہرہ تمتما اُٹھا۔اس نے پہلو بدل کر کہا" او کم ہمت،حاسد! کیا فقط اس لئے کہ میرا خاوند خوش قسمت ہے اور تو بدنصیب۔تو میرے گھر میں چوروں کی طرح آکر چھپا ہے اور اسکو دھوکے سے گولی کا نشانہ بنانا چاہتا ہے۔میں تجھ کو تیرے ارادوں میں ہرگز کامیاب نہ ہونے دونگی ——میں سامنے آجاؤں گی اور تجھ کو فقط قتل کا شوق ہے تو لے آ۔مجھے اپنی گولی کا نشانہ بنا۔"

رشید نے یہ الفاظ اس طرح بے پروائی سے سنے گویا کوئی ناسمجھ بچہ اس کے سامنے بکواس کر رہا ہے۔اس نے ایک بار مسکرا کر جواب دیا" بیگم صاحبہ! اگر آپ کو جان بھاری ہے تو میرا کیا۔بسم اللہ! قربان کیجئے۔مگر اس پر بھی آپ اپنے خاوند کی جان نہ بچا سکیں گی۔میرا ریوالور چھ فیر والا ہے،اور یہ دیکھئے سب خانوں میں کارتوس بھرے ہوئے ہیں۔

ریوالور دیکھ کر بیگم کے ہوش ایک مرتبہ پھر اُڑ گئے،دامن ہمت ہاتھوں سے چھُوٹ گیا۔اس کو خیالی طور پر اپنے

خاوند کے پاؤں کی گوش آشنا آواز باہر سنائی دینے لگی۔ کمرہ میں بجز گھڑی کی مستقل اور مقررہ وقفہ کی ٹک ٹک کے ہر طرف بھیانک اور خوف زدہ سکوت طاری تھا وہ اپنے خیالات کی اُدھیڑبن میں بے چین تھی کہ یکایک چونک کر بولی "تمکو روپیہ درکار ہے ...... ہاں بیشک تم کو روپیہ کی تلاش ہے۔ لو یہ میرا سارا زیور لے لو۔ اسمیں بہت نہایت قیمتی جواہرات ہیں" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا ہاتھ گردن تک بڑھایا مگر رشید نے حقارت بھری نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"یہ تمہاری خام خیالی ہے۔ مجھ کو تمہارے زیورات اصلا درکار نہیں ہیں تو تمہارے خاوند کے خون کا پیاسا ہوں میرا جوشِ انتقام اسی وقت فرو ہوگا جب میں اس ظالم نابکار کو فرشِ خاک پر تڑپ تڑپ کر دم توڑتے دیکھ لوں گا۔ جس کے مرنے کے بعد تم دیکھنا کہ صدہا غریب مرد اور عورتیں گھی کے چراغ جلائیں گے اور طرح طرح کی خوشیاں منائیں گے"

"ہرگز نہیں یہ سراسر جھوٹ ہے"

"بیگم یہ تو حدیث اور قرآن کی طرح سچ ہے۔ تمہارے خاوند نے تو کروڑپتیوں کا نام بدنام کر رکھا ہے خداترسی اور حقوق شناسی کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ تم کو کیا معلوم ہے کہ یہ دولت کثیر کن ذرایع سے جمع کی ہے۔ سنو! میں بتاتا ہوں کہ وہ محض جھوٹ فریب اور جعلسازی کی بدولت امیر کبیر بن بیٹھا ہے۔ وہ اتنا بڑا عیار ہے کہ اس کے دوست احباب بھی اس کی چالاکیوں اور فتنہ پردازیوں سے نہیں بچنے پاتے۔ اس نے غریب بیکس مزدوروں کا پیٹ کاٹ کاٹ کر اپنا بھلا کیا ہے"۔

بیگم کے چہرہ پر غصہ کی سرخی نمودار ہوگئی۔ اس نے جھڑک کر جواب دیا "یہ بالکل جھوٹ ہے ...... سراسر بہتان ہے"!

"جی بیگم صاحبہ! یہ حرف بحرف سچ ہے کیا تم چاہتی ہو کہ میں تمہارے خاوند کی شہرت کے متعلق صحیح الفاظ تمہارے سامنے دہراؤں...... مگر میرے کہنے سے کیا حاصل۔ یہ تو ایسی مشہور بات ہے کہ ہر کس و ناکس کو معلوم ہے ہر گلی کوچے اس کا چرچا عام ہے۔ اور تم ...... تم خود کیا اس سے ناواقف ہو۔ مجھ سے ذرا نظر ملا کر بات کرو۔ یہ تمہارا سر بفلک محل یہ تمہارے زیور و جواہرات تم ہی ایمان سے کہو کہ پاک اور محنت کی کمائی کے ہیں۔ افسوس میں جانتا ہوں کہ میرا ہاتھ نہ اُٹھے گا۔ ورنہ تم بھی اس تمام ساز و سامان کے ساتھ اسی سزا کی مستحق ہو"

"ضرور! اگر تم نے اسی کا بیڑا اٹھایا ہے تو لو میں تیار ہوں۔ شوق سے مجھے اپنی گولی کا نشانہ بناؤ مگر......"

"نہیں! مجھے تم سے کوئی خصومت نہیں۔ وہ تو فقط تمہارا خاوند ہے جس کو میں آخری گناہ سے بچانا چاہتا ہوں اور ان کاغذات پر دستخط کرنے سے قبل ہی اس کو ختم کر دینا چاہتا ہوں"۔

(گھبرا کر) "کون سے کاغذات ؟"

"تم کیا جانو - بس سمجھ لو کہ وہ بھی ایک ایسے معاملہ کے متعلق ہیں جس سے تمہارے ان قیمتی زیورات میں جلد مزید اور بیش بہا اضافہ ہوگا"

"تمہارا مطلب جمال پور کے کارخانہ کے متعلق کاغذات سے تو نہیں !"

جی ہاں ...... وہی! اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ تم اس کے کاروباری معاملات سے کما حقہٗ واقفیت رکھتی ہو۔

"ضرور! میں کم و بیش واقف ضرور ہوں - مگر تمہارا جمال پور کے کارخانہ سے کیا سروکار ؟"

یہ سُنتے ہی رشید کے جسم کا خون کھول اٹھا اسکی آنکھیں شعلۂ ملتہب کی طرح شرر فشاں ہوگئیں اس نے دانت پیس کر جواب دیا "مجھے جمال پور کے کارخانہ سے کیا سروکار ؟ خدا غارت کرے تمہارے خاوند کو وہ تو میرا ہی کارخانہ ہے میرا نام رشید الدین ہے جو آج سے پندرہ سال پہلے فقط دو سو کی حقیر رقم لیکر جمال پور آیا جس نے تھوڑے ہی دنوں میں اپنی محنت شاقہ اور جائز کمائی سے تھوڑا بہت پس انداز کر کے ایک مختصر سے جھونپڑے میں اپنا ذاتی کارخانہ جاری کیا جس نے ایمان اور حق العباد کو ہر دم ملحوظ رکھا - جو صدہا غریب بیکس لوگوں کی پرورش کا ذریعہ بنا - جمال پور ایک معمولی قصبہ تھا - رفتہ رفتہ میری ہی بڑھتی ہوئی تجارت سے اتنا وسیع شہر بن گیا - میرے ملازم اور کاریگر خوشحال تھے - مَیں خوشحال تھا - ایماندار تھا - باعزت تھا - اور مطمئن بھی - کہ یکایک آپکے شوہر صاحب اپنے روپیہ کی گرمی دکھاتے - ناتجربہ کاری کا جامہ پہنے تشریف لائے - نہ تو کارخانوں کے حسن انتظام سے واقف اور نہ ان ذرائع سے جن سے جائز روپیہ کما کر اپنے ملک اور قوم کی فلاح کا باعث ہو سکیں وہ ظالم ایک ایسے خونخوار شیر کی طرح آیا جو اپنی ہوسِ خونریزی میں ہر طرف بولایا ہوا پھرتا ہو - ابتدا میں ایک ایک کر کے دوسرے کاروباری رقیبوں کو ہضم کیا اور قبل اس کے کہ میں اپنے ذاتی واقعات کی اہمیت کا احساس کر سکوں میرے خلاف بھی ایک سازش تیار کر دی ہر چند کہ یہاں کے باعزت لوگوں میں میرا لین دین جاری تھا - اور پوری بات بنی ہوئی تھی مگر ان تعلقات کی قطع و برید میں تمہارے خاوند نے جو اوزار استعمال کئے وہ زیادہ تیز تھے - میرا اعتبار اُٹھ گیا بھرم جاتا رہا - اور اب انتہا یہ ہے کہ اخیر میں میرے کارخانہ کے بند ہو جانے کی نوبت آ جائیگی - میں دیوالیہ ہو جاؤں گا - تم نے سچ کہا تھا کہ تمہارا خاوند خوش قسمت ہے اور میں بدنصیب - مگر انشاءاللہ اس سے پہلے کہ لوگوں پر یہ راز افشا ہو وہ اس کا مزا بھی چکھ لیگا -"

بیگم - (بیقرار ہو کر) "کیوں رشید صاحب ؟ فرض کیجئے کہ وہ ان کاغذات پر دستخط ہی نہ کریں تو ......"

رشید۔ کیا کہتی ہو! بھلا وہ مانے گا؟"

بیگم۔ (نا امید ہو کر) "رشید صاحب! رحم۔ خدا کے لئے رحم۔ آخر یہ تو سوچیے کہ اُنکی جان لینے سے آپ کو کیا مل جائیگا اب سے دور۔ فرض کیجیے کہ آپ نے ان کو ہلاک بھی کر دیا تو کیا یہ ممکن نہیں کہ ان کاغذات کی تکمیل کوئی دوسرا کر دے ضرور کرے گا۔ ان کے بعد بھی کوئی نہ کوئی ان کی تکمیل ضرور کرے گا۔ آپ خدا کے واسطے مجھے چند منٹ کی اجازت دیجیے۔ مجھے ایک بار اُن سے بات کرنے کا موقعہ دیجیے۔ میرا ان پر اثر ہے ...... وہ اکثر میری سن لیا کرتے ہیں۔ مان جاتے ہیں۔ رشید صاحب! مجھے ایک بار کہہ لینے دیجیے۔"

رشید (سر ہلا کر) "بیکار ہے۔ آپ کے خاوند سے سینکڑوں نے سر مارا تو کیا کر لیا جو آپ کسی نتیجہ پر پہنچ سکیں گی۔"

بیگم "مگر یہ سمجھ لیجیے کہ میں ان کی بیوی ہوں میں دوسروں کے مقابلے میں ضرور زیادہ حق رکھتی ہوں مجھے فقط دس ...... پانچ ...... اچھا تین ہی منٹ عنایت کیجیے۔"

بیگم نے منت سماجت کرتے ہوئے رشید کا بازو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا اور بولی "ہاں بس تین منٹ! یہ سمجھ کر کہ میں ان کی بیوی ہوں مجھے کوشش کر لینے دو۔ للہ مجھے قسمت آزمائی کر لینے دو۔ اتنی سی دیر میں تمہارا کچھ نقصان نہ ہوگا۔ اگر تم وہاں سامنے پردوں کی آڑ میں کھڑے ہو جاؤ تو وہ غالباً تم کو دیکھ بھی نہ سکیں گے اُن کی قوت بصارت کمزور ہے۔"

وہ یہ کہتے کہتے ٹھٹک گئی۔ زینہ پر کچھ آہٹ سی معلوم ہوئی اور اسکی نظر دروازہ کی طرف مڑ گئی۔ "آہ! غالباً وہی آ رہے ہیں۔ رشید صاحب خدا کا واسطہ۔ بس پانچ منٹ!" یہ کہکر اُسکے قدموں پر گر پڑی۔ رشید بھی گھبراہٹ میں کوئی فوری فیصلہ نہ کر سکا۔ بہرحال اس نے گھڑی کی طرف ہاتھ اُٹھا کر کہدیا "اچھا وقت دیکھ لو۔ دس منٹ بعد جس وقت گھنٹہ بجا۔ سمجھ لینا کہ تمہارے خاوند کا خاتمہ ہو گیا۔ میں یہاں پردے کی آڑ میں کھڑا ہو کر تمہاری باتیں سنتا رہوں گا۔"

رشید فوراً پردوں کی آڑ میں ہو گیا۔ آنے والے کے پاؤں کی چاپ اب بخوبی سنائی دینے لگی۔ ایک آہ سرد کے بعد بیگم دروازہ کی طرف یہ کہتی ہوئی بڑھ گئی۔ "ہائے کچھ منٹ کی بات ہے اور بعض اوقات اُنکے مزاج کا بھی ٹھیک پتہ نہیں ہوتا الٰہی تو ہی مدد کرنے والا ہے۔ میرے مختصر الفاظ میں اس وقت وہ قوت اور اثر پیدا کر دے کہ میں اپنے ارادہ میں جلد کامیاب ہو سکوں۔"

بالآخر دروازہ کھلا۔ ایک لمبا۔ دبلا پتلا آدمی سوٹ پہنے داخل ہوا اس کی آنکھوں پر موٹے موٹے شیشوں والی عینک اور ہاتھ میں پتلی سی چھڑی تھی۔ چھڑی کے سہارے آگے بڑھ کر اُس نے آواز دی "بیگم کدھر ہو؟"

بیگم:۔"جی آئیے تشریف لائیے۔ میں تو آپ کی منتظر بیٹھی ہوں"۔ یہ کہکر وہ آگے بڑھی اور اپنے خاوند کا بازو پکڑ کر اندر لے آئی۔
خاوند (ہنستے ہوئے) "تم نے مجھے بالکل ہی اندھا سمجھ لیا ہے۔ تم کمرہ میں اکیلی ہو۔ میرا خیال تھا کہ شاید کسی سے باتیں کر رہی ہو۔ یہ کہ کر وہ میز کے پاس والی کرسی پر بیٹھ گیا اور سب سے اُوپر رکھے ہوئے کاغذات کو اٹھا لیا۔ بیگم اس کے قریب مضطرب اور لرزاں کھڑی ہو گئی اور بولی "جی ہاں! میں اکیلی بیٹھی پڑھ رہی تھی اور یہی آپ کی سب دستاویزیں"۔
خاوند:۔لیکن تمہارے لئے تو ان میں کوئی دلچسپی کا سامان نہ ہو گا"۔
بیگم:۔"جی ہاں میں جمال پور کے کارخانہ کے متعلق کاغذات پڑھ رہی تھی۔ ... آپ سچ بتائیے مجھ سے ناخوش تو نہیں ہیں؟
خاوند۔ ناخوش! ہرگز نہیں۔ مگر تم اپنے نازک دماغ کو کاروبار کے پیچیدہ جھگڑوں سے کیوں پریشان کرتی ہو۔ (اس کے گلے کا ہار چھو کر) بیگم خدا کی قسم یہ ہار بہت بھلا معلوم ہوتا ہے اور خاصکر تمہارے گلے میں"۔
بیگم:۔"سچ کہئے"۔
خاوند:"میں سچ کہتا ہوں کہ اس قسم کے اعلیٰ اور اصلی جواہرات کا ہار شاید ہی کسی نواب راجہ کے یہاں نکلے۔ خدا نے کیا تو چند ہی دنوں میں تم کو آیندہ عید کیلئے ایسا تحفہ نذر کروں گا جسکو دیکھ کر تم بھی خوش ہو جاؤ"
بیگم۔ پیارے سرتاج میرے پاس اللہ کا دیا بہت کچھ موجود ہے مجھے اب کسی مزید تحفہ کی ضرورت نہیں۔ میرے سر میں خفیف سا درد ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ آپ سے میٹھی باتیں کرتی رہوں"۔
خاوند"شوق سے لیکن ذرا ٹھیر جاؤ۔ میں ان کاغذات پر دستخط وغیرہ کر دوں اسکے بعد ہم تم اطمینان سے بیٹھ کر اپنا دل بہلائیں گے"
بیگم۔ نہیں میرے آقا۔ مجھے انہیں کاغذات کے متعلق آپ سے کچھ کہنا ہے۔ آپ ان پر ابھی دستخط ہرگز نہ کریں" یہ کہ کر اس نے اپنی دونوں ہتھیلیاں کاغذ کے اس حصہ پر رکھدیں جہاں دستخطوں کی جگہ تھی خاوند نے تعجب سے نظر اٹھا کر بیگم کو دیکھا اور بولا "یہ کیا کہتی ہو؟ ...... دستخط نہ کروں!۔ آخر تمہارا مطلب کیا ہے؟"
بیگم:۔"دیکھئے میں ان کو بخوبی پڑھ چکی ہوں اور دیر سے انہیں کے متعلق غور و خوض میں مبتلا ہوں۔ آپ کارخانہ مع تمام ساز و سامان کے صرف سات ہزار کی معمولی سی رقم میں رہن رکھ رہے ہیں جو مالک کارخانہ پر قرض ہے"۔
خاوند"بیشک"
بیگم۔ اور وہ دراصل ہو گی کتنے کی مالیت؟"
خاوند۔"ہمارے لئے مطلب یہ کہ ہماری کمپنی کیلئے ..... تو یہ سمجھ لو کہ کل کم ازکم ڈیڑھ دو لاکھ کا اثاثہ ہو گا"

بیگم نے ایک ٹھنڈی سانس لیکر اپنے پیچھے نظر ڈالی۔ اسکو ایسا معلوم ہوا کہ رشید آگے بڑھ رہا ہے اپنے خاوند سے بولی۔ تو میں خیال کرتی ہوں کہ ان موجودہ مالکان کارخانہ کا تو دیوالہ ہی نکل جائیگا۔ ان میں پھر آپ سے مقابلہ کرنے کی سکت بھلا کیا باقی رہے گی ان کو اپنا کارخانہ بیچنا ہی پڑے گا۔

خاوند "بیشک! اُن کے خلاف جو کچھ مواد جمع کیا گیا ہے وہ اُن کی تباہی کیلئے کافی ہے"۔

بیگم تھوڑا سا اور آگے بڑھ آئی۔ اس نے محبت آمیز ادا سے اپنے خاوند کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور بولی "کیوں پیارے آقا! میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اتنے بڑے کارخانے کے مالک یقیناً سچے ایماندار ہونگے۔ کیا ان کو یہ حق حاصل نہیں کہ اگر آپ کے شرائط ان کے مفاد کے منافی ہوں تو اس اقرارنامہ سے انکار کردیں"

خاوند "حق! حق ان کو ضرور تھا مگر ان کی یہ غلطی تھی کہ انہوں نے ایک بڑی کمپنی سے مقابلہ کیا"۔

بیگم نے خوشامد بھری نظروں سے اپنے خاوند کو دیکھ کر کہا "پیارے آقا۔ ایمان سے کہو کہ تمہاری یہ تمام کارروائیاں حق بجانب ہیں"۔

خاوند کی پیشانی پر اس سوال سے بل پڑ گئے۔ اُس نے قدرے غصہ سے کہا "حق بجانب؟ بیگم آخر تمہارا مقصد کیا ہے۔ میری سمجھ میں ان لفظوں کا مفہوم ہی نہ آیا"۔

بیگم "میں اس وقت اس شخص کی حالت کا خیال کر رہی ہوں جس کا ذکر ان کاغذات میں آیا ہے۔ . . . . اور جس کا نام شاید رشید الدین ہے تم محض اپنی آمدنی کو بلا ضرورت بڑھانے کیلئے اسکو قعر ذلت میں دھکیل رہے ہو۔ آہ! مجھے اُسکے بیوی بچوں کی حالت پیش نظر ہے۔ میرا دل لرزتا ہے۔ میرے پیارے شوہر ہمکو روپے کی ضرورت نہیں"۔

خاوند۔ بیگم یہ تمہاری ناسمجھی ہے روپے کی ضرورت تاحیات کبھی ختم نہیں ہوتی۔ قاعدہ ہے کہ جتنا ملے اسی قدر زیادہ ہوس بڑھتی ہے۔ میں تم کو ابھی تھوڑی دیر میں سمجھا دوں گا۔ مجھے آج ہی رات کو یہ کاغذات مکمل کرکے بیرسٹر صاحب کو پہنچانا ہیں"۔

یہ کہکر اُس نے اپنا رخ پھیرا قلم اٹھایا اور دوات سے سیاہی لیکر دستخط کرنے کیلئے آمادہ ہوا تھا کہ بیگم نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں سے تھام لیا۔ اس کی نظر پیچھے اندھیرے کی طرف مڑ گئی۔ اس کو وہ صورت جس سے وہ خائف تھی آہستہ آہستہ اپنی طرف بڑھتی ہوئی معلوم ہوئی۔ اس نے گھبرا کر اپنے خاوند سے کہا "نہیں! میرے پیارے خاوند نہیں۔ میں تم کو ان کاغذات پر ہرگز دستخط نہ کرنے دوں گی"۔

خاوند۔ (جھنجھلا کر) تم بعض اوقات ناحق کی ضد کرتی ہو اور بالکل احمقوں کی سی باتیں کرنے لگتی ہو۔ ان کاغذات پر دستخط

ہوگئے .... اور ابھی"

بیگم (ہاتھ جوڑکر) میرے سرتاج۔ میں التجا کرتی ہوں کہ دستخطوں سے باز آؤ۔ میرا احمق پن سمجھو یا ناحق کی ضد۔ مگر ہمارے پاس روپیہ کافی ہے۔ تم ان رشید الدین صاحب کو بلاؤ۔ اور ان کو اپنا کارخانہ آزادی کے ساتھ خود ہی چلانے دو ورنہ اس کی معقول اور مناسب قیمت ادا کرو"

خاوند" تم ان معاملات کے نشیب و فراز سے ناواقف ہو۔ مناسب قیمت وہی ہے جو دینے والا خوشی سے دے اور لینے والا مجبور ہوکر قبول کرے"

بیگم نے ایک بار گھڑی پر نظر ڈالی اور پیچھے بھی۔ پھر گھبرا کر خاوند سے بولی " پیارے سرتاج تمہارا فیصلہ خودغرضی پر مبنی ہے۔ میں کسی بات کیلئے تمہارے اس قدر پیچھے نہیں پڑی۔ لو میں تمہارے قدموں پر سر رکھتی ہوں۔ تم خدا کیلئے مان جاؤ۔ ان لوگوں کے بیوی بچوں کی حالت کا خیال کرکے میرا کلیجہ دکھتا ہے۔ ان زیوروں کے قیمتی جواہرات میں مجھے ہمیشہ ان معصوم آنسوؤں کے قطرات جھلکتے نظر آئیں گے۔ میں ان کو کبھی نہ پہنوں گی، مجھے ان سے نفرت ہوجائیگی۔ اچھا فرض کرو کہ رشید الدین صاحب کی جگہ اس وقت تم ہوتے اور میں تمہاری بیوی۔ پھر سوچو کہ اس حالت میں زندگی گذارنا کتنی دشوار ہوجاتی"

خاوند۔ (ہنسکر) تمہاری ان باتوں کا مجھ پر کوئی اثر نہ ہوگا۔ مجھے اگر یہ معلوم ہوتا تو شاید میں اس وقت تمہارے پاس بھی نہ آتا"

بیگم۔ نہیں یہ نہ کہو! کیا تم اس سے انکار کرسکتے ہو کہ میں اور تم دونوں فرض کرو کہ اتفاقاً آج ہی مرجائیں تو کیا تمہارے ہاتھ ان کاغذات پر دستخط کرنے سے کسی کے خون ناحق میں آلودہ نہ رہ جائیں گے"

خاوند" رہیں یا نہ رہیں مگر ظاہر ہے کہ ہر شخص دنیا میں اپنی بہتری کا خواہشمند رہتا ہے"

بیگم" اور دوسروں کی"

خاوند" میری عزیز بیگم۔ جو شخص اس معاملہ سے متعلق ہے فوراً تباہ ہوجائیگا۔ اور پھر کبھی سر نہ اُٹھا سکیگا۔ تم ایسے معاملہ میں بحث کررہی ہو جو تمہاری سمجھ سے باہر ہے۔ تجارت میں رقابت لازمی ہے۔ اور اس کی کامیابی کے ذرایع ہمت و استقلال۔ جو شخص ان دونوں کے استعمال سے قاصر ہے۔ اسکو تسلیم خم کرنا ضروری ہے۔ اس کھیل کے قواعد سے ہر شخص واقفیت رکھتا ہے۔ دونوں فریق آنکھ کھول کر مقابلے کے میدان میں قدم رکھتے ہیں۔ لیکن جس نے اپنے ارادوں میں شبہ و شک کی گنجایش باقی رکھی یا ضرب لگانے سے پہلے اپنا ہاتھ زخمی کرلیا۔ وہ فوراً تباہی اور بربادی کے نیچے ہیں

گرفتار ہو گیا۔ عقلمند اور طاقتور کامیاب ہوتا ہے اور کمزور اور بیوقوف ناکام۔ اگر کسی کو اس کھیل کا شوق ہے تو اس کے قواعد کی پابندی بھی لازمی۔" یہ کہہ کر اس نے ایک بار پھر قلم اُٹھایا — بیگم کا دل ناکامی سے بیٹھنے لگا۔ گھڑی سے گھنٹہ بجنے کی آواز آنے ہی والی تھی۔ اس نے اب کی بار پیچھے دیکھنے کی ہمت نہ کی اس کو کسی کے قدموں کی آواز اپنی طرف بڑھتے خود بخود سنائی دینے لگی۔ اس نے بیساختہ اپنا ہاتھ ہلا کر اس طرف اشارہ کر دیا اور پھر اپنے دونوں ہاتھ خاوند کے گلے میں حمایل کر کے ایک ٹھنڈی سانس لی اور بولی۔

"عزیز آقا دیکھئے میں ہر حال میں آپ کی وفادار خادم رہی ہوں۔ میں نے آج تک کسی معاملہ میں اتنی ضد یا حجت نہیں کی۔ ممکن ہے کہ میں تجارت کے اصول اور مسئلوں سے ناواقف ہُوں مگر یہ بھی مسلمہ ہے کہ بعض اوقات ہم عورتیں معاملات کی اہمیت اور نتائج کو روز روشن کی طرح منور دیکھتی ہیں۔ خواہ وہ کتنے ہی تاریک گوشہ میں پوشیدہ کیوں نہ ہوں۔ اس کا نتیجہ میری آنکھوں کے سامنے اس طرح نمایاں ہے جس طرح بے داغ آسمان پر چاند۔ بھلا ان چیزوں کی حقیقت ہی کیا ہے . . . . . . اس تمام زیور و جواہرات کی۔ اس جاہ و حشم کی اس دولت و ثروت کی۔ میں کہتی ہوں کہ آج ہمارے قبضہ میں قارون کے خزانہ کی ساری چابیاں آجائیں اور دوسرے دن موت بھی تو پھر بتاؤ کہ تمہارے مقررہ قواعد۔ تمہارے مسلمہ اصول تمہارا کہاں تک ساتھ دیں گے۔ طاقتور کو کمزور پر کیا شرف باقی رہے گا۔ کس کی پُر زور صدا خدا کے انصاف اور رحم کی زنجیر ہلانے کیلئے سب سے پہلے پہنچے گی، مظلوم کی آہ، یا کامیاب کا قہقہ، میرے پیارے شوہر، میرے عزیز آقا، تم تو عقلمند اور ہوشیار ہو مگر میں جاہل اور نادان ہو کر اس کا نتیجہ اپنی آنکھوں سے صریحًا دیکھ رہی ہُوں۔ تم کاغذات کو چاک کر ڈالو۔ خدا کے لئے ابھی کر ڈالو۔ اور حصول دولت کے اس ناجائز اور نامناسب لالچ سے ہمیشہ کیلئے توبہ کرو۔ تاکہ بعد ازاں مصائب اور گناہ کا بار عظیم ہمارے کندھوں پر نہ رہ جائے۔ لاؤ۔ کاغذات مجھے اٹھا دو۔ ابھی ایک گھنٹہ گذرا کہ تم نے مجھ سے آیندہ عید کے تحفے کی بابت دریافت کیا تھا۔ مجھے اس کے عوض میں یہی کاغذات دے دو۔ بلکہ اسکے علاوہ یہ بھی وعدہ کرو کہ تم ان رشید الدین صاحب کو سچائی اور مناسب شرایط کے ساتھ اپنا شریک تجارت بنا لو گے۔ یا یہ کہ اُن کو اپنا کارخانہ مثل سابق تنہا اور آزاد رہ کر چلانے دو گے۔"

فیروز الدین خاموش تھا — مگر بیگم پریشان۔ اس کے لئے ایک ایک پل صبر آزما ثابت ہو رہا تھا۔ اندھیرے میں اس کو ریوالور کی نالی چمکتی نظر آرہی تھی — کچھ لمحے خاموشی کیساتھ گذرنے کے بعد فیروز الدین نے ایک بار اوپر نظر اُٹھائی۔ ہاتھ سے کاغذات لپیٹ کر بیگم کے حوالہ کر دیئے اور بولا "تم نے میرا بڑا سخت امتحان لیا۔ بیگم" "ایں! کیا تم راضی ہو؟ سچ کہو۔ کیا منظور ہے؟"

خاوند۔ "بیگم ابتدا سے آج تک تم نے ہمیشہ اپنا عید کا تحفہ خود ہی پسند کیا ہے۔ میں اس قدیم رسم کو توڑنا نہیں چاہتا۔"

کاغذات کے چھوٹے چھوٹے پرزے فرش پر ادھر ادھر بے ترتیب بکھرے پڑے تھے ——— ساتھ ہی "ایک شخص کھڑکی سے باہر کودنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ دیکھ کر بیگم نے فرط انبساط میں اپنا سر فیروز کے قدموں پر رکھدیا۔ فیروز نے فوراً جھک کر اس کو اپنے دونوں ہاتھوں میں اٹھایا اور سینے سے لگا کر بولا۔ "بیگم تم کو کیا معلوم کہ اس مرتبہ تمہارا یہ تحفہ کس قدر قیمتی ہے۔"

بیگم کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ آنکھوں سے طوفان اشک موجزن تھا۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہہ دیا۔"

"تو اگر کشتہ شدی آہ چہ میکردم من"

دیوانہ (بریلوی)

برسات

مجھ سے ہو گرمِ سخن وہ مہ لقا برسات میں
سرد آہوں کی جو بندھ جائے ہوا برسات میں

رندِ میکش بن گیا ہر پارسا برسات میں
دُھل گیا دل سے خیال اتقا برسات میں

تیرے دامانِ قبا کی کھل گئیں کلیاں تمام
کس قدر ہے قوتِ نشو و نما برسات میں

فیضِ ساقی سے مرے پیشِ نظر ہے رات دن
کالی بوتل، سرخ مے، اودی گھٹا برسات میں

پاک ہیں آلودگی سے جو ہیں وارستہ مزاج
تر ہوا کب دامنِ موجِ ہوا برسات میں

اب کہیں جاتے ہیں میخانے رندِ بادہ کش
بن گئی زنجیرِ پا موجِ ہوا برسات میں

جھومتا ہے صورتِ میکش چمن میں ہر شجر
موجِ مے سے کم نہیں موجِ ہوا برسات میں

بدرؔ دیکھو کس قدر جوشِ نمو کو ہے عروج
عقدۂ پرویں ہے خوشۂ تاک کا برسات میں

سید محمد امیر حسن بدرؔ

تجلیات

رنگ ہو حقیقت کا یا بتانِ دنیا کا
میں تو اک پجاری ہوں جلوہ ہائے رعنا کا

آندھیاں جوانی کی خوب رنگ لائی ہیں
کیا بھڑک اٹھا شعلہ آتشِ تمنا کا!

اب پلائے جا ساقی چشمِ بادہ آگیں سے!
ہوش ہے کسے باقی ساغر اور مینا کا؟

جستجوئے منزل میں بے قرار و آوارہ
میں بھی ایک منظر ہوں موجہائے دریا کا!

رہبرِ محبت کی ہر قدم پہ منزل تھی
حسن کا تھا آئینہ ذرّہ ذرّہ صحرا کا!

کس قدر نظر پرور ہے ریاضِ ہستی بھی!
اک نگارخانہ ہے نقشہائے زیبا کا!

بارہا ہوا دھوکا مجھکو اپنی ہستی پر
نقشِ غیر فانی کا مظہرِ تجلّی کا!

اے اثر جوانی میں ضبط کھو گیا ایسا
اک غلام ہوں گویا قلبِ ناشکیبا کا

اثر صہبائی

غزل

میرے دل کو الفت ہے ابتدائے دنیا سے
نقشہائے زیبا سے جلوہ ہائے رعنا سے

مستیٔ بہار آئی فصل میگسار آئی
موجِ زرنگار آئی شعلہ زار مینا سے

جیسی بری شے ہے دلکو مضطرب کر لوں
یا و فورِ عشرت سے یا غمِ تمنا سے

پھر کیا حسینوں نے اہتمامِ آرائش
پھر لپک اُٹھے شعلے جلوہ گاہ سینا سے

اضطرابِ فرقت کا حال پوچھتے کیا ہو
کاہشیں فزوں تر تھیں موجہائے دریا سے

آگئیں وہ پہلو میں با فروغِ رعنائی
چاندنی اتر آئی رفعتِ ثریا سے

کیوں فریب دیتے ہو وعدہ ہائے فردا کا
کیوں شہید کرتے ہو انتظار بیجا سے

عابد

عید کا تحفہ

ایک ڈالر، اور ستاسی سنٹ - یہی کل کائنات تھی - انمیں سے ساٹھ سنٹ پینی کی شکل میں تھے - یہ ایک ایک دو دو پینی کر کے بنئے قصاب اور ترکاری والے سے سودا سلف لیتے وقت بہ دقّت و تکرار اس طرح بچائے گئے تھے کہ اگر کسی پر اس قسم کی معمولی باتوں سے پیدا ہونے والے الزام بخل کو عاید کیا جائے تو وہ شرم سے پانی پانی ہو جائے - ڈیلا نے پھر تین مرتبہ ان کو گنا - ایک ڈالر اور ستاسی سنٹ - اور دوسرے دن کرسمس کی عید تھی -

اب اسکے لئے سوائے اسکے کوئی چارہ نہ تھا کہ چھوٹے سے پھٹے پرانے سوفے پر لیٹ جائے اور آہ وزاری کرے پس ڈیلا نے یہی کیا، کیونکہ یہ امر اس اخلاقی نتیجہ کی طرف رہنمائی کرتا تھا کہ زندگی نام ہے صرف رنج و راحت کے مجموعہ کا جس میں مصیبتوں ہی کا پلّا ہمیشہ جُھکا رہتا ہے

اس عرصہ میں جہانِ غربت کی اس ملکہ نے خیال ہی خیال میں اپنے گھر کا جائزہ لینا شروع کیا - ہفتہ وار آٹھ ڈالر پر مکان کی ایک منزل رہنے کیلئے تھی جو اسباب آرایش سے بھی مزین تھی - باہر کے دروازہ پر خطوط کا صندوق آویزاں تھا جس میں کبھی کوئی خط پڑتا ہوا نظر نہیں آیا - اور ساتھ ہی ایک برقی گھنٹی بھی موجود تھی جسے بجانے کا کبھی کسی انسانی ہاتھ کو موقع نہیں ملا - اس سے ملحق ایک تختی بھی لٹک رہی تھی جس پر یہ نام درج تھا "مسٹر جیمیس ڈلنگھام ینگ"

ڈلنگھام کا یہ نام اسی مبارک زمانہ سے ہوا میں لٹک رہا تھا جب کہ ان کی آمدنی (۳۰) ڈالر ہفتہ وار تھی اب وہ آمدنی جو گھٹ کر صرف (۲۰) ڈالر ہفتہ وار رہ گئی تو - ڈلنگھام کے حروف بھی مدہم پڑنے لگے - جیسے وہ بڑی سنجیدگی سے اس بات پر غور کر رہے ہیں کہ گھٹتے گھٹتے ہمیں غیرت و خودداری کے ہاتھوں فنا کے گھاٹ اتر جانا چاہیئے جب کبھی مسٹر جیمیس ڈلنگھام ینگ باہر سے گھر میں تشریف لاتے تو مختصر طور پر جم پکارے جاتے - اور یہ بڑی عمدہ بات دیکھی گئی کہ اُن کی بیگم جس کا تعارف ہم نے ابھی ڈیلا کے نام سے کرایا ہے - ہر وقت اُنکے لئے آغوشِ محبت کو کھلا رکھتی -

ڈیلا نے اب اپنا رونا دھونا ختم کیا اور پوڈر کا چپیتھڑا لیکر اپنے گالوں کے سنوارنے میں مصروف ہو گئی - اسکے بعد اس دریچہ کے پاس کھڑے ہو کر پچھلے صحن کی چار دیواری میں چلنے والی نیلی بلّی پر ایک سرسری نظر ڈالی کل

کرسمس کی عید ہے اس کے پاس صرف ایک ڈالر ستاسی سنٹ ہیں جن سے وہ اپنے پیارے جم کیلئے ایک تحفہ لانا چاہتی ہے، وہ پیسہ پیسہ جوڑتی رہی اور کئی مہینوں کی کوشش کا یہی نتیجہ تھا (۲۰) ڈالر ہفتہ وار آمدنی کچھ زیادہ نہ تھی۔ مصارف اس کے اندازہ سے زیادہ تھے۔ خرچ کا ہمیشہ یہی حال ہے۔ پیارے جم کے تحفہ کی خرید کے لئے صرف ایک ڈالر اور ستاسی سنٹ ہیں۔ بہت سے خوشگوار گھنٹے اس نے اسی تجویز میں صرف کر دیئے کہ جم کیلئے کوئی عمدہ چیز لانا چاہئے۔ کوئی چیز ایسی جو نفیس ہو نایاب بھی ہو اور جو جم کے شایان شان ہو۔

کمرہ کی کھڑکیوں کے درمیان ایک محرابدار آئینہ تھا۔ ۸۔ ڈالر کرایہ کی منزل میں شاید آپ نے ایسا محرابدار آئینہ دیکھا ہو۔ اس آئینہ کو جسمیں عکس ذرا عجلت میں کھائی دیتا ہے دبلا پتلا اور ہوشیار آدمی دیکھکر اپنی شکل وصورت کا صحیح اندازہ کرسکتا تھا۔ نازک بدن ڈیلا اس کو دیکھنے کی کافی مہارت حاصل کر چکی تھی۔ دفعتہً وہ دریچے کے پاس سے ہٹی اور آئینہ کے روبرو کھڑی ہوگئی۔ اس کی آنکھیں بڑی تیزی سے چمک رہی تھیں مگر کوئی بیس سکنڈ کے اندر ہی اندر اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ بڑی پھرتی کے ساتھ اس نے اپنا جوڑا کھول کر اپنے سر کے تمام بالوں کو ان کی پوری لمبائی کے ساتھ لٹکتے چھوڑ دیا۔

جیمس ڈلنگھام ینگ کی ملکیت میں دو چیزیں ایسی تھیں جن کے وجود پر دونوں میاں بیوی غیر معمولی فخر کا اظہار کرتے تھے ایک تو خود جم کی سونے کی گھڑی تھی جو اسے آبا و اجداد سے ورثہ میں ملی تھی۔ اور دوسرے ڈیلا کے سر کے بال۔ اگر ملکۂ صبا اس منزل مکان کے ہوادار برآمدہ میں مقیم ہوتی تو ڈیلا اپنے لمبے بالوں کو سکھانے کیلئے دریچہ کے باہر اس لئے چھوڑتی کہ ملکہ اسے دیکھ کر اپنے قیمتی زر و جواہر سے نفرت کرنے لگے یا اگر سلیمان بادشاہ اپنے تمام خزانوں کے ساتھ جم کے دولت کدہ پر دربانی کی خدمت پر مامور ہوتا تو دروازہ سے گذرنے کے موقع پر جم اپنی گھڑی نکالکر اس لئے دیکھتا کہ سلیمان بادشاہ اس گھڑی کو دیکھ کر مارے حسد کے اپنی ڈاڑھی نوچنے لگے۔

الغرض ڈیلا کے خوبصورت بال عالم انتشار میں ادھر اُدھر چمکنے اور لہرانے لگے جیسے مٹیالے رنگ کے پانی کا ایک آبشار گر رہا ہو۔ وہ گھٹنوں سے نیچے اتر کر قدمبوسی کیلئے بیتاب تھے۔ گویا بحیثیت مجموعی وہ اس کے جسم پر ایک لبادہ بن گئے تھے۔ پھر اس نے یکایک ان بالوں کو بڑی تیزی اور بدحواسی کے ساتھ یکجا سمیٹ لیا اور کچھ دیر گنگنانے کے بعد خاموش کھڑی ہوگئی۔ یہاں تک کہ اس کی آنکھوں سے کچھ آنسو نکل کر سرخ فرش پر گر پڑے۔

اس نے اپنی پرانی بھوری جاکٹ اور ٹوپی پہنی اور جب سیڑھیوں سے اتر کر وہ سڑک کی طرف چلی ہے تو اس کے گون کا دامن لہرا رہا تھا۔ اور آنکھوں میں قطرات اشک نمایاں تھے۔

چلتے چلتے وہ ایک مقام پر ٹھیر گئی جہاں یہ تختہ لگا ہوا تھا "میڈم سافرین یہاں ہر قسم کے بال خریدے جاتے ہیں" جلدی جلدی سیڑھیوں پر چڑھ کر کچھ دیر ڈیلا نے دم لیا۔ میڈم سافرین تنومند بہت سرخ و سفید اور خشک مزاج واقع ہوئی تھی۔ ڈیلا نے کہا کیا آپ میرے بال خریدیں گے۔ "ہاں میں بال خریدتی ہوں" اپنی ٹوپی اتار لو اور مجھے ایک نظر دیکھنے دو۔ بھورے بالوں کا آبشار پھر ایک مرتبہ لہریں مارنے لگا۔

اپنے مشتاق ہاتھوں میں بالوں کو لیکر میڈم نے کہا۔

"بیس ڈالر"

"مجھے جلدی دیجئے"

اس کے بعد پورے دو گھنٹہ آناً فاناً مسرت کے پر لگائے چپ چاپ اڑ گئے۔ اب وہ صبح کے تحفہ کے واسطے دوکانوں میں کسی عمدہ چیز کی تلاش کر رہی تھی۔ آخر کار اس کو ایک چیز ملی۔ جو حقیقت میں گویا جم ہی کیلئے بنائی گئی تھی اور باوجود چھان بین کے اس سے بہتر کوئی چیز کسی دوکان ہی میں نہ تھی۔ وہ پلاٹینم کا ایک حلقہ دار توڑا تھا نہایت سادہ اور ثقہ نمونہ پر۔ اس کی قدر و قیمت جیسا کہ عمدہ چیزوں کا خاصہ ہوا کرتا ہے اسکی قابلِ تعریف گھڑت پر نہیں بلکہ صرف اسکی قدرتی پر منحصر تھی وہ توڑا گھڑی کے بھی شایان شان تھا۔ ڈیلا نے دیکھتے ہی خیال کیا کہ "یہ جم ہی کے واسطے موزون ہے" قیمت اور ثقاہت ہر دو اعتبار سے اس نے ۲۱ ڈالر اس کی قیمت ادا کی اور باقی ۸۷ سنٹ کے ساتھ گھر چلی۔ اب اس توڑے کے ساتھ، جم خواہ وہ کسی جماعت میں کیوں نہ ہو، وقت دیکھنے کا برابر مشتاق رہے گا۔ اگرچہ اسکی گھڑی قیمتی تھی لیکن اس چمڑے کی پٹی کیوجہ سے وہ بجائے توڑے کے استعمال کرتا تھا، اکثر اوقات حقارت کی نظر سے دیکھا کرتا تھا۔

ڈیلا جب گھر پہنچی تو اس کی کامیابی کا کیف اپنی عجیب حرکت کی پر استدلال تاویلات کی تلاش میں غائب ہونے لگا۔ وہ بالوں میں گھونگر ڈالنے والے اوزار کو اٹھا لائی اور انتہائی جوشِ محبت میں پیدا ہونے والی خرابی کی اصلاح میں مصروف ہوگئی۔ کوئی چالیس منٹ کے اندر ہی اندر اُس کا سر چھوٹے چھوٹے گھونگروں سے بھر گیا۔ اس حالت میں وہ ایسی ہی معلوم ہوتی تھی جیسے کسی مدرسہ کا ایک لڑکا۔ وہ بہت دیر تک آئینہ میں اپنے عکس پر بڑی نکتہ چینی کی نظر ڈالتی رہی۔

اس نے اپنے آپ کو مخاطب کر کے کہا "اگر پہلی مرتبہ دیکھکر مارے غصہ کے جم مجھے کھا نہ لے تو دوسری نظر میں وہ ضرور کہے گا کہ میں جزیرہ کونی کی ایک ناچنے والی لڑکی معلوم ہوتی ہوں۔ لیکن افسوس میں کیا کر سکتی تھی۔ ایک ڈالر ۸۷ سنٹ تو کسی کام کے نہ تھے۔

ٹھیک سات بجے کافی تیار ہوئی گرم چولہے پر توا چڑھا ہوا تھا۔ گویا تھوڑی دیر میں گوشت تلا جائیگا۔ جم نے کبھی

دیر نہیں کی تھی ڈیلا نوٹ کو اپنے ہاتھ میں دہرا کئے دروازہ کے قریب ایک میز کے کنارے پر بیٹھی ہوئی تھی، کیونکہ وہ ہمیشہ اسکی آمد پر ایسا ہی کیا کرتی تھی۔ اس نے سب سے پہلے سیڑھی پر جم کے پاؤں کی آہٹ سنی اور معًا اُس کے چہرے کا رنگ ایک لمحہ کیلئے فق ہوگیا۔ عمومًا وہ معمولی گھریلو باتوں پر خاموشی کے ساتھ دعائیں مانگنے کی عادی تھی۔ چنانچہ اس وقت بھی وہ بڑبڑانے لگی "اے خدا تو اس کے ذہن میں یہ بات ڈال دے کہ اب بھی میں اسی طرح خوبصورت ہوں"۔

جم دروازہ کے اندر آیا اور اس کو بند کرلیا۔ وہ بہت خاموش سکڑا ہوا اور نحیف نظر آتا تھا۔ یہ غریب صرف بائیس سال کی عمر میں تاہل کا بارگراں اٹھا رہا تھا۔ وہ دستانے بھی نہ خرید سکتا تھا اُسے نئے اوورکوٹ کی بھی ضرورت تھی۔

جم گھر کے اندر جب داخل ہوا تھا تو ایک ناقابل محسوس حرکت کے ساتھ جیسے شکاری کتا بھیڑ کی بُو پاکر بے حس و حرکت ہوجاتا ہے وہ ڈیلا کو بغور دیکھنے لگا اور اس کے اس دیکھنے میں کچھ نہ کچھ مفہوم ضرور تھا جسے وہ سمجھ نہ سکی۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کے دل میں خوف پیدا ہوا۔ وہ کچھ غصہ نہ تھا اور نہ تعجب، نہ اظہار ناپسندیدگی ہی تھا اور نہ کوئی احساس خطر۔ اور نہ ان جذبات میں کوئی ایسا ہی جذبہ تھا جس کی روک تھام کیلئے ڈیلا اچھی طرح مسلح ہوچکی تھی۔ وہ اس کے چہرہ پر اچھی طرح نظر جمائے گھور رہا تھا ایک عجیب کیفیت کے ساتھ ڈیلا میز کے اطراف سے چکر کاٹ کر اُس کے پاس گئی اور کہا۔

"پیارے جم تم اس طرح مجھے نہ دیکھو۔ میں نے اپنے سر کے بال کاٹ کر فروخت کردیئے ہیں۔ کیونکہ میں کرسمس میں تمہیں تحفہ دیئے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ وہ پھر دوبارہ نکل آئیں گے۔ تمہیں اس کا کچھ خیال نہیں کرنا چاہئے۔ کیوں؟ میں ایسا کرنے کے لئے مجبور تھی۔ اور میرے بال تو حیرت انگیز تیزی کے ساتھ نکل ہی آتے ہیں۔ جم عید مبارک کہو اور خوش ہوجاؤ۔ تم نے دیکھا کیسا نفیس اور کیسا خوبصورت تحفہ تمہارے واسطے لائی ہوں۔

"کیا تم نے اپنے بال کاٹ دیئے" جم نے اصرار سے پُوچھا، جیسے باوجود ذہنی تکلیف اور کشمکش کے اصل حقیقت سے اب بھی بے خبر ہے"۔

"بال کاٹے بھی اور بیچ بھی دیئے۔ کیا تم مجھے اس طرح پسند نہیں کرتے؟ میں بغیر اپنے بالوں کے وہی ہوں نا کیوں؟

جم نے تعجب سے اِدھر اُدھر کمرہ میں ایک نظر ڈالی۔

"تم کہتے ہو، تمہارے بال جا چکے" جم نے یہ جملہ بڑے بھولے پن سے کہا۔ ڈیلا نے کہا "نہیں اس کا خیال نہ کرنا چاہئے، میں کہتی ہوں وہ بیچ دیئے گئے۔ یہ کرسمس کی شام ہے اب مجھ پر رحم کرو کیونکہ وہ صرف تمہاری خاطر کاٹے گئے۔

شاید میرے بالوں کے جانے کا وقت آگیا تھا۔ وہ اسی طرح بہ متانت گھلاوٹ کے ساتھ کیے جاتی تھی

"جو محبّت مجھے تمہارے ساتھ ہے اس کا کوئی اندازہ نہیں کرسکتا، جم! کیا تو سے پر گوشت ڈال دوں؟"

جم سلسلۂ خیالات کے خواب سے اب ایک دم جاگ اٹھا اور ڈیلا کو اپنے گلے سے لگا لیا۔ بہ تقاضائے عقلمندی کچھ دیر کے لئے ہمیں اب غیر ضروری مضمون ہی کی طرف متوجہ ہو جانا چاہئے۔

ہفتہ میں آٹھ ڈالر یا سال بھر ایک لاکھ ...... دونوں میں کیا فرق ہے؟ ایک ریاضی دان یا ایک ظریف تمہیں اس کا بالکل غلط جواب دے گا۔ جم نے اپنے اوورکوٹ کی جیب سے ایک کٹا نکال کر میز پر ڈال دیا۔ "ڈیلا میرے متعلق کسی غلط فہمی میں نہ پڑنا۔ اگر بال کاٹے جائیں یا منڈائے جائیں یا شکل و صورت میں کوئی تبدیلی ہو تو میری نظر میں اپنی بیوی کی عزّت و وقعت میں کوئی کمی ہوسکتی ہے اور نہ میں ایسی باتوں کا خیال کرتا ہوں۔ لیکن اگر تم اس کٹے کو کھولکر دیکھو گی تو تمہیں معلوم ہوگا کہ میں پہلے پہل تھوڑی دیر تک کیوں بدحواس رہا۔" ڈیلا کی خوبصورت انگلیوں اور نازک ناخنوں نے ڈوری کھولکر کاغذ پھاڑا اور معاً فرطِ انبساط سے وہ چیخ اٹھی لیکن افسوس کہ جذبۂ مسرت نسوانی گریہ و بکا اور غش آور آنسوؤں کے سلسلہ سے اس قدر تبدیل ہوا کہ ڈیلا کے مالک کو آرام پہنچانے والی تمام قوتوں سے آراستہ ہونے کی فوری ضرورت لاحق ہوگئی کیونکہ یہ کنگھیاں تھیں۔ سر کے بالوں میں دائیں بائیں اور پیچھے لگائی جانے والی کنگھیوں کا وہ مجموعہ تھا جسے ڈیلا اپنی کھڑکی میں سے شاہراہ عام پر چلنے والی عورتوں کو پہنتے دیکھ کر عرصہ سے اس کی آرزومند ہوگئی تھی۔ بڑی خوبصورت کنگھیاں تھیں، خالص تابنیل کی کھال سے بنی ہوئیں جن کے کنارے جواہرات سے مزین تھے۔ اور جو اس کے بالوں پر خوب کھلتے۔ وہ جانتی تھی کہ یہ کنگھیاں بہت قیمتی ہیں اور باوجود انہیں پانے کی ذرا بھی امید نہ رکھنے کے، وہ دل سے ان کی تمنائی تھی اور ایسی چیز اگرچہ اب اس کے قبضہ میں تھی، لیکن افسوس وہ گھونگھروالے بال جنکی زینت کا یہ سامان تھا، سر سے ہی سے غائب تھے۔ لیکن ان کنگھیوں کو اس نے اپنے سینہ سے لگا لیا اور تھوڑی دیر کے بعد نیم باز آنکھوں سے دیکھ کر مسکراتے ہوئے اس نے کہا "جم! میرے بال بہت جلد نکلا کرتے ہیں"۔

اور پھر ڈیلا ایک بلی کی طرح اچھل کر بولی "آہا ہا! کیونکہ جم نے اس کے لائے ہوئے خوبصورت تحفہ کو اب تک نہیں دیکھا تھا۔ اس نے بڑے اشتیاق سے اس پیشکش کو اپنی کھلی ہتھیلی میں رکھ کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ قیمتی دھات اس کے درخشاں اخلاص دل کے عکس کے ساتھ چمکنے لگی۔

"جم! کیا یہ خوبصورت نہیں ہے۔ میں نے اس کے لئے تمام شہر چھان مارا۔ اب تو دن بھر میں سو مرتبہ تم وقت

دیکھا کرو گے۔ ذرا مجھے اپنی گھڑی دو میں دیکھنا چاہتی ہوں یہ توڑا اس پر کیسے زیب دیتا ہے"

جم بجائے اس کے کہ گھڑی دیتا آہستہ سے سوفہ پر سرک گیا اور دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کے پچھلے حصّہ کو پکڑے ہوئے مسکرانے لگا۔

اس نے کہا "ڈیلا! ہمیں کرسمس کے تحفوں کو کچھ عرصہ کے لئے اٹھا رکھنا چاہئے وہ اس وقت استعمال کرنے کے لئے قطعًا ناموزون ہیں۔ میں نے گھڑی بیچ کر انہیں پیسوں سے تمہاری کنگھیاں خریدی ہیں۔ اور چلو بس اب گوشت گرم کردو"

(ولیم سڈنی پورٹر) احمد عارف (حیدرآبادی)

بے بصر

(ایک انگریزی نظم کا بتصرف ترجمہ)

للہ! آنکھ والو مجھ کو بھی یہ بتاؤ — کیا کام ہے نظر کا کس کام کی نظر ہے!
میں بے بصر ہوں مجھکو آتا نہیں نظر کچھ — کیا چیز روشنی ہے کیسی ہے، وہ کدھر ہے؟

سنتا ہوں فکر تمسے اکثر ادھر اُدھر کا — کہتے ہو تم کہ سورج روشن ہے بے محابا
محسوس اسکی گرمی کرتا ہوں یوں تو میں بھی — لیکن وہ کس طرح سے خالق ہے روز و شب کا

قبضہ میں میرے خود ہیں دن اور رات میرے — جب جاگتا ہوں دن ہے سوتا ہوں جب تو شب ہے،
ممکن اگر یہ ہوتا میں جاگتا ہی رہتا — پھر دن ہی دن جو ہوتا دنیا میں کیا عجب ہے،

محرومیوں کے میری ماتم گسار ہو تم — ناکامیوں کا میری افسانہ بن گیا ہے،
لیکن ملال مجھ کو اس چیز کا نہیں کچھ — واقف نہیں ہوں جس سے جو نظر نا جدا ہے،

میں بے بصر ہوں تو بھی اللہ کی ہے رحمت — حاصل سکون دل ہے پر لطف زندگی ہے
پھر چھیڑ کر فسانہ محرومیوں کا میری — تکلیف مجھکو دینا کیا حق دوستی ہے؟

ابوالفاضل راز چاندپوری

حضرتِ شیخ

کچھ عجیب و غریب فطرتِ شیخ   بارک اللہ! ذاتِ حضرتِ شیخ
ہر طرف ذکرِ خرقِ عادتِ شیخ   ہر طرف شہرۂ کرامتِ شیخ

جسکو دیکھو، وہ سادہ لوحی سے   داخلِ حلقۂ ارادتِ شیخ
جسکو پوچھو، وہ بدنصیبی سے   قائلِ منصبِ امامتِ شیخ

جو ہے۔ وہ شیخ کی طرف مائل   ایک دنیا نثارِ دعوتِ شیخ
جو ہے۔ وہ تیغِ شیخ کا گھائل   ایک عالم شکارِ بیعتِ شیخ

حکمِ ترکِ ریا سے ظاہر ہے   مائلِ مکر و زور نیتِ شیخ
غرۂ اتقا سے ظاہر ہے   عُجب و کبر و غرورِ طینتِ شیخ

رات دن لقمہ ہائے تر کا خیال   محض تن پروری طریقتِ شیخ
رات دن فکر جمعِ دولت و مال   محض حرص ہوا شریعتِ شیخ

فکر تہذیبِ نفس سے کیا کام   کسبِ زر منتہائے ہمتِ شیخ
کجروی دین۔ کجروی اسلام   راستبازی خلافِ ملتِ شیخ

مائلِ اعتقادِ شیخ نہ ہو   گمرہی حاصلِ عقیدتِ شیخ
حالِ خدامِ شیخ دیکھ نہ لو   بدنصیبی مآلِ خدمتِ شیخ

حیف! آزادِ بے ادب صد حیف
یہ خیالات اور نسبتِ شیخ

حکیم آزاد انصاری

مزدور

میں نے ایک مزدور کو ایک عظیم الشان ہوٹل کی انتہائی بلندی سے اپنی پیڑ سمیت گرتے دیکھا، جب وہ نیچے گر رہا تھا، میں نے دیکھا کہ وہ ایک چاقو کے ساتھ پیڑ کے بانس پر اپنا نام کھودنے کی کوشش کر رہا ہے، اس کے پاس یہ کوشش کرنے اور یہ کام پُورا کرنے کیلئے کافی وقت تھا، کیونکہ فاصلہ تقریباً تین سو فٹ کا تھا، میں اس فضول کام کی انجام دہی کو اس کی حماقت کے سوا اور کچھ خیال نہ کر سکا، کیونکہ تین سکنڈ میں نہ صرف یہ آدمی ہی مرگیا، بلکہ اس بانس کا بھی چند ہفتوں تک ایندھن میں جلایا جانا یقینی تھا۔ جس پر اس نے اپنے نام کا کچھ حصہ کھودنے کی کوشش کی تھی۔

میں اپنے گھر کو روانہ ہُوا، کیونکہ مجھے کچھ کام کرنا تھا، میں اس شام اس شخص کی حماقت پر بہت غور کرتا رہا۔ یہاں تک کہ یہ خیال میرے ضروری کام میں حائل ہوگیا۔ اور میں نے اُسے چھوڑ دیا۔

اس رات جب میں دوبارہ کام میں مشغول تھا، اس مزدور کی روح میرے کمرے کی دیوار میں سے نکلی اور میرے سامنے ہنستی ہوئی کھڑی ہوگئی۔

میں اس کی سفید موہوم سی شکل کو بخوبی دیکھ سکتا تھا، جو میرے روبرو ہنستی اور تھرتھراتی کھڑی تھی، میں نے کوئی آواز نہ سنی، میں نے اُسے مخاطب کرکے پُوچھا "تم کس بات پر ہنس رہے ہو؟"

وہ روح بولی "میں تمہارے اس طرح بیٹھنے اور کام کرنے پر ہنس رہا ہوں"

میں نے کہا "کیوں تم اس اہم کام پر کیوں ہنستے ہو؟"

اس نے جواب دیا "تمہاری یہ امیرانہ زندگی ہوا کے مانند گزر جائے گی، اور تمہاری یہ ناقص تہذیب چند صدیوں کے اندر تباہ ہو کر رہ جائیگی"

وہ پھر ہنسنے لگا۔ لیکن اس دفعہ ذرا بلند آواز سے ہنسا، اور اسی طرح ہنستے ہوئے اسی دیوار میں غائب ہوگیا جس میں سے وہ اندر داخل ہُوا تھا

(لارڈ ڈنزنی)

نظامی

ہندی اور سنسکرت کے شعرا

ماہ جنوری ۱۹۲۶ء کے "ہمایوں" میں صفحہ ۱۰۵ پر میں نے "میر، غالب۔ اقبال" کا دلکش عنوان دیکھا۔ تحسین ومدح شاعری کا یہ طرز فی الحقیقت اچھوتا اور بڑا اثر ہے اردو میں اس سے قبل داد کلام ایسے پیرایہ میں شاید نہیں دی گئی۔ جن صاحب نے میر۔ غالب۔ اقبال کی نسبت شعر لکھ کر اس طرز خاص کا تتبع کیا ہے اردو زبان کو اُنکا شکر گذار ہونا چاہئے۔ سنسکرت اور ہندی میں اس قسم کا خیال ملتا ہے سنسکرت کا ایک اشلوک اور ہندی کا ایک دوہا مجھے اس وقت یاد ہے دونوں ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔ ممکن ہے اور بھی اشعار ایسے ہوں۔

سنسکرت۔
اُپما کالی داسیہ بھاروی ارتھ گو رَوَم
دَنڈِنہ پدلالِتیم ماگھے سنتی تریو گُنا

ترجمہ۔ کالی داس (مصنف شکنتلا) کے تشبیہات واستعارات۔ بھاروی (مصنف کرا تارجنی ام) کی بلاغت ومعنی آفرینی ڈنڈن (مصنف دش کمار چرت) کا انتخاب الفاظ بہترین مشہور عام ہیں۔ لیکن ماگھ (مصنف ششو پال بدھ) میں یہ تینوں خوبیاں موجود ہیں۔

ہندی:۔
سندر پد کوی گنگ کے اُپما کو ور ویر
کیشو ارتھ گنبھیر کو سور تین گن تیر

ترجمہ۔ کوی گنگ کی بندش الفاظ۔ بیربل کی تشبیہات کیشوداس کا پرمعنی و پرمغز کلام خصوصیات سے ہے مگر سورداس جی (جن کے بھجن مشہور ہیں) ان اوصاف میں کامل ہیں۔

ڈرائڈن کے اور اردو کے اشعار میں جو جنوری نمبر میں درج فرمائے گئے ہیں۔ شعرا کا نام جن کا مقابلہ اور تذکرہ کیا گیا ہے نہیں آسکا ہے۔ سنسکرت اور ہندی کے اشعار میں نام بھی ظاہر کر دیئے گئے ہیں۔

خاکسار جے دیال سکسینہ

محفلِ ادب

انتظارِ تبسم

جس طرح اے حسن خود میں، نبضِ کاہ و روحِ کوہ ۔۔۔ روز و شب اک لرزشِ پیہم سے رہتی ہے دوچار
کاہ کے دل میں چمکتا ہے بفکرِ رنگ و بُو ۔۔۔ کاوشِ خورشید و سعیِ بادِ باراں کا شرار
کوہ میں فرطِ نمو سے نا تراشیدہ صنم ۔۔۔ بُت تماشوں کی نظر کو ڈھونڈتے ہیں بار بار
یونہی میرے جوہرِ خوابیدہ اے رازِ حیات ۔۔۔ تیرے ہلکے سے تبسم کیلئے ہیں بیقرار

جوشؔ ملیح آبادی ۔۔۔ "مجلۂ عثمانیہ"

ایک شاعر کا انجام

(۱)

جیوپیٹر سو رہا ہے، دیویاں آہستہ آہستہ خواب گاہِ الوہیت کے قریب جاتی ہیں اور پھر دبے پاؤں واپس آتی ہیں پرواز کنیز یں حد درجہ سبک پرواز کے ساتھ خلوتگاہِ مقدس کے چاروں طرف چکر لگاتی ہیں اور لوٹ آتی ہیں۔

آفتاب بلند ہو کر کوہ اولمپس کی چوٹی کو زرنگار بنا رہا ہے، چڑیاں اپنے اپنے آشیانوں سے نکل کر پرہوا ہیں کسان ہل لے کر کھیتوں میں پہنچ گئے ہیں، لکڑہارے کلہاڑیاں لئے ہوئے خشک درختوں کی تلاش میں نکل گئے ہیں پھول کھل چکے ہیں۔ سبزہ شبنم سے لہک اٹھا ہے چشموں کی روانی میں تیزی پیدا ہو چلی ہے۔ الغرض ساری کائنات بیدار ہو چکی ہے لیکن جیوپیٹر ہنوز محوِ خواب ہے کیونکہ بارگاہِ خداوندی کے مطرب گنگ ہیں، اُنکے ساز خاموش ہیں اور موسیقی جس کی نازک موجیں، جیوپیٹر کی نیند میں تھرتھری پیدا کر کے اُسکو بیدار کرتی تھیں آج نہ مغنّی کے گلے سے پیدا ہوتی ہیں نہ بربط کے تاروں سے۔

(۲)

دولت کی دیوی:۔

"اے شاعر! بغیر تیرے موسیقی ویران ہے اور جیوپیٹر ابھی بیدار نہیں ہوا، سنا ہے کہ شاعر دولت کا شیدا ہوتا ہے اسلئے سب نے

مجھے منتخب کرکے تیرے پاس بھیجا ہے کہ تجھے مناکر دربار میں لے چلوں اور اگر تو چاہے تو اسکے عوض ساری دنیا کی دولت تیرے آگے ڈالدوں"

یہ کہکر اُس نے اپنے لانبے سیاہ بال نچوڑے اور شاعر کے قدموں پر موتیوں کا ڈھیر لگ گیا۔

شاعر نے جو بالکل خاموش دونوں ہاتھوں سے سر کپڑے بیٹھا تھا نگاہ اُٹھاکر اوپر دیکھا اور پھر اسی طرح گردن جھکا لی۔ دیوی اس کا یہ انداز دیکھ کر ہنس پڑی اور شاعر کے سامنے بیشمار نقرئی پھول بکھر گئے۔

شاعر بدستور خاموش بیٹھا رہا اور دیوی یہ سمجھ کر کہ شاید وہ اس سے بھی زیادہ کچھ چاہتا ہے آگے بڑھی اور بولی اے شاعر اگر تو اس پر بھی راضی نہیں تو میں تجھے دنیا کی سب سے زیادہ قیمتی چیزیں دینے کیلئے تیار ہوں جو سوائے جیوپٹر کے کسی اور کا حصہ نہیں ہاں میں اپنے لبوں کا یاقوت، کانوں کے صدف، انگلیوں کے ہیرے، اور ان سب سے بڑھ کر اپنے سینہ وشانہ کا نرم اور لچکدار سونا بھی تیری سپردگی میں دینے کیلئے آمادہ ہوں، لیکن خدا کے لئے تو میرے ساتھ چل اور جیوپٹر کو کسی طرح بیدار کر"

یہ کہہ کر وہ شاعر کی آغوش میں مچلنے ہی والی تھی کہ اس نے خشونت کے ساتھ اُسے ہٹادیا اور بولا "نہیں! مجھے ان میں سے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ اور نہ میں تیرے ساتھ چل سکتا ہوں کیونکہ میری شاعری خود اب تک محو خواب ہے"

(۳)

شہرت کی دیوی :۔

"اے شاعر میں سمجھتی تھی کہ تجھے منانے کیلئے مجھی کو آنا پڑے گا سچ ہے تجھے دولت کی کیا پروا ہوسکتی ہے تیرا دماغ خود بے بہا خزینہ ہے بہترین جواہرات کا، تجھے تو صرف شہرت درکار ہے، سو میں ایک تحفہ تیرے پاس لائی ہوں اسے قبول کر"

یہ کہہ کر اس نے ایک نہایت نازک بلبلہ جس میں قوس قزح کے تمام رنگ جھلک رہے تھے دامن میں رکھکر پیش کیا اور بولی اے شاعر دیکھ اس کے اندر کیا نظر آتا ہے۔ ذرا غور کر سارے آسمان و زمین میں تیرا ہی نام جلی حروف سے لکھا ہوا دکھائی دیتا ہے، بادلوں کی روانیوں، شفق کی رنگینیوں، پہاڑوں کی بلندیوں، وادیوں کی وسعتوں، سمندر کی گہرائیوں میں ہر جگہ تو ہی تو ہے۔ لے یہ طلسم بند حباب اپنے پاس رکھ اور فضائے عالم میں حکومت کر"

شاعر نے برہمی کے ساتھ اس حباب رنگین کو لیکر زمین پر پٹک دیا۔ اور وہ چور چور ہوگیا۔ شاعر نے پیشانی میں شکنیں ڈالکر کہا "اے دیوی، مجھے ناپائدار شہرت وعزت کی ضرورت نہیں۔ میں تو کچھ ایسی چیز چاہتا ہوں جو میری روح کے اضمحلال کو دور کرسکے، میں چلکر کیا کرونگا جب کہ میری شاعری مجھ سے گم ہوگئی ہے"

(۴)

شعر و موسیقی کی دیوی :۔

"اے شاعر آج تو کیوں اس قدر افسردہ ہے، کیا تیرا ملکۂ شعری مضمحل ہوگیا ہے، کیا اب تیرا کوئی خیال موسیقی قبول کر کے تیری زبان سے شعر بن کر نہیں نکلتا۔ وہ تو مجھے معلوم تھا کہ جب تک میں نہ آؤں گی تو راز دل کسی سے نہ کہے گا دولت تیرے سامنے کیا چیز ہے، شہرت کا ناپائیدار وجود کیا حقیقت رکھتا ہے، اچھا اب اس سوگ کو دور کر اور مجھے اپنی آغوش میں لیکر اپنے سینہ کو شاعری سے بھر لے۔ میری زبان کو بوسہ دیکر اپنی شاعری میں والہانہ ترنم پیدا کرلے۔ ہاں میری آنکھیں چوم لے تاکہ تو اپنے کلام سے لوگوں پر جادو کر سکے لب سے لب ملالے تاکہ تیری ہر شاعرانہ تخئیل موج بادہ بن کر نکلے"

یہ کہکر دیوی اپنے نازک ہات بڑھائے ہوئے اس کے قریب پہنچی لیکن شاعر نے اُسے روک دیا اور بولا "مجھے ایسی آورد کی شاعری درکار نہیں ہے، یہ شاعری تو تیرے سینہ و آغوش، تیرے لب وچشم کی ہوگی نہ کہ میرے دل کی۔ جا مجھے پریشان نہ کر کہ میری روح آج کیفیات کے اعتبار سے بالکل تہی دست ہے۔

(۵)

حسن وشباب کی دیوی۔

"اے شاعر! مجھ سے زیادہ واقف حال دنیائے شعر کا کون ہوسکتا ہے لیکن میں نے کہا کہ پہلے اوروں کو کوشش کرلینے دوں میں تو سمجھتی تھی کہ نہ تو دولت سے فریب کھانے والا ہے نہ شہرت کے سیمیائی وجود پر مٹنے والا اسی طرح میں اس رمز سے بھی واقف تھی کہ جب تک احساس حسن قوی نہ ہو نہ سچا شعر پیدا ہوتا ہے نہ حقیقی موسیقی، اس لئے اے میرے اچھے شاعر، گردن اُٹھا، نگاہ اونچی کر، اور جنگل کے اس سکون میں اپنی آغوش کو لبریز جمال بنالے"

یہ کہہ کر حسن کی دیوی، تمام ان معطر صباحتوں کے ساتھ جو فردوس ہی کے یاسمن زاروں سے حاصل ہوسکتی ہیں تمام ان پاکیزہ نزاکتوں کیساتھ جو کوثر وسلسبیل ہی کی موجوں سے استعارہ ہوسکتی ہیں۔ تمام ان رنگینیوں کیساتھ جنہیں صرف بہار جنت ہی پیش کرسکتی ہے۔ تمام ان کیفیتوں، سرشاریوں اور ادا ہائے جانستاں کیساتھ جو صرف نوخیز شباب ہی میں نظر آسکتی ہیں۔ لبوں سے شراب ٹپکاتی، آنکھوں سے آنسو چھلکاتی، اعضا میں خواہش سپردگی جوش جوانی میں التماس فشار اور سینہ کی عریانیوں میں دعوت لذات بے اندازہ دیتے ہوئے مدہوشانہ والہانہ، کورانہ آگے بڑھی تاکہ نوجوان شاعر کے سراپا میں آگ لگا دے اسکو پانی کر کے بہالے مفرط لذت سے اسکی روح کو بے چین کرے باہر لے آئے۔ مگر قبل اسکے کہ یہ بجلیاں شاعر کے خرمن ہوش سے کوئی خراج وصول کریں، شاعر نے آہستگی سے ہاتھ بڑھا کر اُسے روکدیا اور بولا۔

اے دیوی مجھے حُسن کی قوتوں کا اعتراف ہے، اس لئے تو اس کے ثبوت میں ان اداؤں سے کام نہ لے جن سے میں نا آشنا نہیں ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ میں تجھے اس عالم میں دیکھ کر تیرے سامنے کانپنے لگوں، تھرتھرانے لگوں، لیکن میرے جسم کی یہ کپکپی

مجھے ہلاک تو کرسکتی ہے لیکن کسی شعر میں تبدیل نہیں ہوسکتی، کوئی موسیقی نہیں بن سکتی میری روح بالکل شل ہوگئی ہے میرا دل برف سے زیادہ سرد ہوگیا ہے ایسا سرد کہ شاید اب کوئی دنیاوی شعلہ اس میں گرمی پیدا نہیں کرسکتا۔ تو جا اور کہہ دے کہ شاعر مجھے نہیں ملا، کیوں کہ تیری توہین مجھے گوارا نہیں ہے۔

(۶)

شاعر، تھک کر سو گیا، نیند اسکی روح کو سیر کراتی ہوئی ایشیا کے اس سب سے بڑے جزیرہ نما میں لے گئی، جسے وحشی جاہل اور غیر مہذب کہا جاتا ہے :۔

رات کا پچھلا پہر ہے اور سارا گاؤں سوائے آبادی کے اس حصہ کے جسے عورت سے تعبیر کیا جاتا ہے سو رہا ہے ہر گھر سے چکی کی غمگین آواز آرہی ہے اور اسی کے ساتھ سادہ نرم موسیقی معصوم سروں میں کبھی کبھی بلند ہو کر شاعر کی روح کو کسی خاص غور و فکر میں مبتلا کر دیتی ہے۔

صبح کا وقت ہے، مرد خشمگین چہرہ لئے ہوئے اُٹھتا ہے اور عورت کو آواز دیتا ہے، وہ جو برتن پھیلائے ہوئے انہیں صاف کر رہی ہے، اپنے بچوں کا منہ دھلا رہی ہے اپنے انہماک میں نہیں سنتی۔ مرد دیو کی طرح خونخوار آگے بڑھتا ہے اور اس کے نازک جسم کو آزار پہنچانے لگتا ہے۔ وہ خاموشی سے اس ستم کو برداشت کر رہی ہے اور پھر مکان کے ایک کونے میں ہاتوں کی ٹوٹی ہوئی چوڑیاں ڈال کر کلائی کا خون پونچھ رہی ہے اور روتی جاتی ہے۔ مرد چھوٹے چھوٹے معصوم بچوں پر غصہ نکالتا ہے اور انہیں اپنے قوی ہاتوں کی ضرب سے لہولہان کر کے گھر سے باہر نکال دیتا ہے عورت اپنے جگر کے ٹکڑوں کا یہ حال گھونگھٹ کے اندر ہی اندر کنکھیوں سے دیکھتی جاتی ہے اور خاموش کھڑی کانپ رہی ہے شام کو وہی ظالم مرد کسی اور گاؤں کو چلا جاتا ہے اور رات کو اس کی وہی مظلوم عورت جب تنہائی میں کچھ گنگناتی ہے تو صرف یہ کہ :۔

"تجھ بن پیا کچھ نہ سہائے"

شاعر جاگ اُٹھتا ہے لیکن ایک کراہ کے ساتھ جو کبھی اس کے دل سے نہ نکلی تھی۔ جیوپٹر کے مطربوں اور مغنیوں کے ساز میں نغمہ دوڑنے لگتا ہے لیکن اس درجہ جگر خراش و دلدوز کہ اولمپس کی فضا میں اس سے قبل کبھی نہ گونجا تھا، جیوپٹر بیدار ہوتا ہے لیکن ایسی افسردگی لئے ہوئے جو کبھی اس سے قبل اس پر طاری نہ ہوئی تھی دیویاں جب شاعر کی تلاش میں پھر صحرا کی طرف جاتی ہیں تو اس کو پتھر پر سر رکھے ہوئے اطمینان کی نیند میں مصروف پاتی ہیں اس حال میں کہ اس کا کلیجہ شق نظر آتا ہے اور دل سینہ سے باہر۔

نیاز فتحپوری

(نگار)

تبصرہ

نقش ارژنگ مسٹر جلال الدین اکبر پنجاب کے نوجوان شعرا میں سے ہیں اُن کا مجموعہ کلام اس نام سے شایع ہوا ہے۔ ابتدائی ۴۲ صفحات مقدمے اور مشاہیر کی آرا کے لئے وقف ہیں اس کے بعد چند نظمیں ہیں جن میں انگریزی نظموں کے تراجم بھی شامل ہیں۔ باقی ستر صفحے کے قریب غزلوں پر مشتمل ہیں اکبر صاحب غزل اور نظم دونوں بہت اچھی لکھتے ہیں۔ امید ہے کہ ان کا کلام مقبول ہوگا۔ کاغذ لکھائی چھپائی بہت اچھی ہے حجم ۱۲۸ صفحے قیمت عہ محمد اسمٰعیل صاحب نعیم پبلشر ہزارداستان لاہور سے طلب فرمائیے۔

مجلۂ عثمانیہ یہ سہ ماہی رسالہ طلبہ کلیہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کی طرف سے شایع ہوا ہے۔ جامعہ عثمانیہ اردو کی جو خدمات انجام دے رہی ہے اُن کا یہ ایک قابلِ قدر نمونہ ہے اردو کا حصہ ۱۰۳ صفحات پر اور انگریزی کا حصہ ۴۳ صفحات پر مشتمل ہے اس کے اڈیٹر عثمانیہ کالج کے قابل اور ہونہار طالب العلم سید غلام محی الدین صاحب زور ہیں بیشتر مضامین کا جو چھپے ہیں اور عثمانیہ کالج کے طلبہ اور پروفیسروں ہی کے زورِ قلم کا نتیجہ ہیں کاغذ لکھائی چھپائی عمدہ قیمت چھ روپے سالانہ فی پرچہ دو روپے:۔ مینجر مجلہ عثمانیہ۔ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن سے طلب فرمائیے۔

باقیات فانی مشہور شاعر حضرت فانی بدایونی کے مجموعۂ کلام کا دوسرا اڈیشن اس نام سے شایع ہوا ہے حضرت فانی کسی تعارف کے محتاج نہیں وہ ملک کے مسلم الثبوت اور مقبول عام شاعر ہیں۔

باقیاتِ فانی مجلّد ہے۔ کاغذ لکھائی چھپائی عمدہ ہے قیمت تین روپے مقرر ہے۔ حجم ۱۲۵ صفحات

پتہ۔ حضرت فانی بدایونی معرفت مطبع آگرہ اخبار آگرہ

بہارِ بلاغت خان قلندر علی خاں و بی ایم، اے۔ ایل، ایل، ایم کی یہ کتاب تشریح و توضیح علم بیان صنائع و بدائع اور عروض و قوافی پر مشتمل ہے، سہولت کیلئے فارسی مثالیں بھی دی گئی ہیں۔ یہ کتاب بہت مفید ہے اور مختلف کتابوں مثلاً حدائق البلاغت اور نہر الفصاحت چہار گلزار۔ عروض سیفی سے ماخوذ ہے حجم ۱۴۰ صفحے کاغذ لکھائی چھپائی عمدہ قیمت مجلد عہ

پتہ:۔ خان قلندر علی خاں صاحب ایم اے۔ ایل، ایل، ایم پبلک پراسیکیوٹر حصار

فہرست مضامین

جلد ۱۱	بابت ماہ مئی سنہ ۱۹۲۷ء	نمبر ۵

تصاویر

ہمایوں مفت

گزشتہ مہینے ہم نے ہمایوں کے سالانہ چندہ میں رعایت کا اعلان کیا تھا۔ اس رعایت کی میعاد ختم ہو چکی ہے۔ لیکن چونکہ ہمایوں کا اجرا بطور ایک یادگار کے عمل میں آیا ہے اور اس سے تجارتی اغراض وابستہ نہیں بلکہ محض زبان اور قوم کی خدمت ہمارا انتہائے نظر ہے اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ اپنے نئے خریداروں کیلئے کسی مستقل رعایت کا اعلان کر دیں تاکہ ہمایوں کی توسیع اشاعت سے اس کے اجرا کا مقصد بھی پُورا ہوتا رہے اور اس کے شائقین بھی اپنے ادبی ذوق کی تسکین کا سامان بہم پہنچاتے رہیں۔

اس اعلان کے بعد ان اصحاب کے نام ہمایوں سال بھر کے لئے بالکل مفت جاری کر دیا جائے گا جو اس کے تین سالانہ خریدار پیدا کر کے دفتر میں اُن کا چندہ بھجوا دیں گے یا ہمیں وی پی بھیجنے کی اجازت دیں گے۔

ناظرین ہمایوں سے خاص طور پر توقع ہے کہ وہ "ہمایوں" کی توسیع اشاعت میں دلچسپی لیں گے۔

ایجنٹوں کی ضرورت

ہندوستان کے تمام شہروں میں ہمیں ہمایوں کے لئے خوش معاملہ اور دیانت دار ایجنٹوں کی ضرورت ہے، ایجنسی کی شرائط بذریعہ خط و کتابت طے ہو سکتی ہیں

مینیجر ہمایوں لاہور

ہمایوں ریلوے سٹیشنوں پر

ناظرین ہمایوں کی آسانی کیلئے ہم نے تمام ریلوے سٹیشنوں پر جہاں جہاں ویلر کی دُکانیں ہیں ہمایوں کی فروخت کا انتظام کر رکھا ہے اگر کسی سٹیشن پر ہمایوں دستیاب نہ ہو تو براہ نوازش ہمیں اطلاع دیجئے۔

مینیجر "ہمایوں" لاہور

اکبر کا شکار
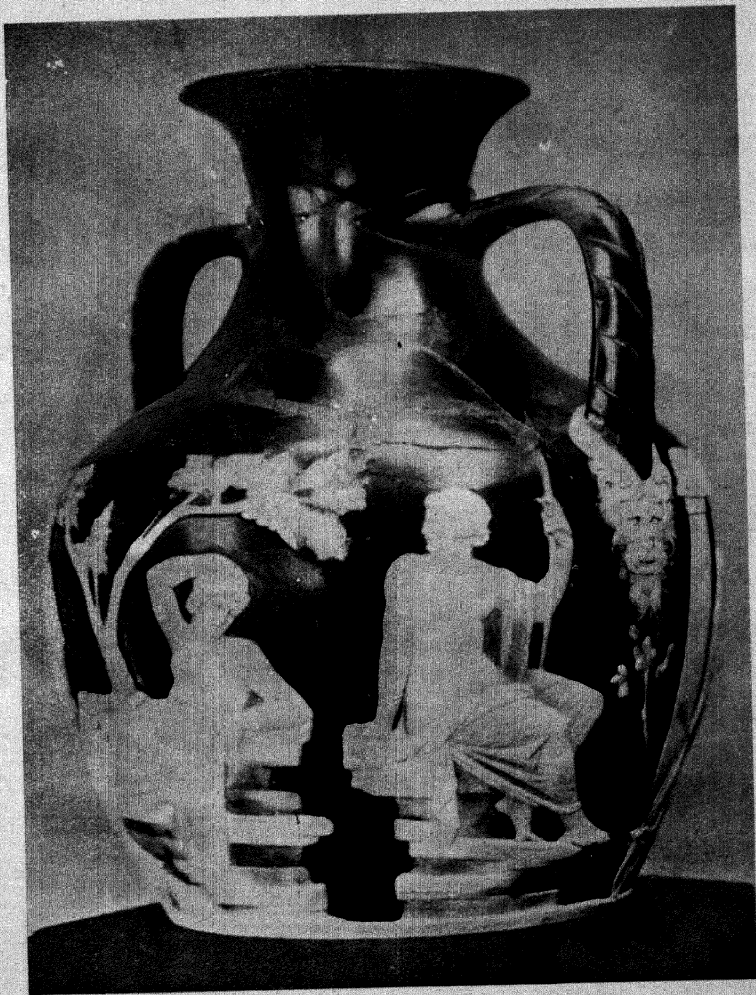
ایک قدیم یونانی گلدان
(برٹش میوزیم - لنڈن)

جہاں نما

مصنفین کی دولت مندی۔ کامیاب مصنف بعض اوقات بیقیاس دولت کے مالک بن جاتے ہیں اور بخلاف اس کے بعض مرتبہ وہ اپنی ضروریات زندگی کو بھی پورا کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔

موجودہ زمانہ میں اعلیٰ درجہ کے مصنفین محض اپنے قلم کی برکات سے غیر معمولی طور پر دولت مند بن چکے ہیں۔ انکی تصانیف فلموں، ڈراموں اور دوسری زبانوں کے تراجم کے ذریعے سے اُن کے تمول میں اضافہ کرتی رہتی ہیں۔

"الگزینڈر پوپ" نے ہومر کے ترجمہ کے معاوضہ میں دس ہزار پونڈ حاصل کیئے تھے جو آجکل کے ۳۰ ہزار پونڈ کے مساوی ہیں "تاریخ ہبوط و زوال روما" لکھنے پر گبن کو دس ہزار پونڈ کی آمدنی ہوئی تھی۔ مکالے کو "تاریخ انگلستان" کے لکھنے پر ۲۵۰۰۰ ہزار پونڈ ملے تھے۔ چارلس ڈکنس نے اپنی تصانیف کی بدولت ایک سال میں دس ہزار پونڈ حاصل کئے تھے اور جب وہ مرا تو اس کے نام پر ایک لاکھ پونڈ کی رقم بنک میں جمع تھی۔

ملٹن کو "گمشدہ بہشت" کے لکھنے پر صرف دس ہزار پونڈ حق تصنیف ملا تھا۔ بعد ازاں اسی تصنیف پر اُسے آٹھ ہزار پونڈ مزید ملے تھے۔

ایک امریکن سنڈیکیٹ نے ایک نہایت ہر دلعزیز انگریز مصنف کو ظریفانہ افسانے لکھنے کے معاوضہ میں فی افسانہ ۳۰۰۰ پونڈ کی رقم ادا کی تھی۔

جارج گسنگ نے جو یورپ کے راشد الخیری تھے اور جو ہمیشہ المناک ناول لکھا کرتے تھے غربت و افلاس میں جان دیدی۔

اے۔ ایس۔ ایم۔ ہچنسن نے اپنی ایک تصنیف "اندیشۂ زمستاں" پر ایک لاکھ پونڈ پیدا کئے تھے۔

سر والٹر اسکاٹ نے اپنے قرضخواہوں کا روپیہ یکے بعد دیگرے متعدد ناول لکھ کر ادا کیا۔ حتیٰ کہ اپنے ناولوں کی تصنیف کی بدولت اس نے ایک لاکھ پونڈ قرضہ ادا کر دیا اور اسکے بعد اپنی حالت کو بھی بہتر بنا لیا۔ لیکن سر والٹر کی صحت خراب ہو گئی اور آخری ایام مصیبت میں گزرے۔

سر جیمس بیری نے محض اپنی ایک کتاب لکھنے پر ۴۰ ہزار پونڈ کا منافع حاصل کیا۔

کپلنگ ایک مختصر افسانہ کیلئے ۱۰۰۰ پونڈ کا کثیر معاوضہ لیتا ہے۔

سر ہال کین نے بغیر روپے کے کام شروع کیا تھا۔ اس کے ناول نصف ملین کی تعداد میں فروخت ہو چکے ہیں۔ اب وہ

ایک بہترین محل کا مالک ہے اور متمول طبقہ میں اس کا شمار ہوتا ہے

شعرا۔ جان ڈیوڈسن انگلستان کا مشہور شاعر ملک کی ناقدردانی کا شکار ہوکر اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا

بالعموم وہ شعرا جنہوں نے شہرت اور ہر دلعزیزی حاصل کی ہمیشہ مفلس اور قلاش رہے۔

ایک بہترین شاعر ایک سال میں جس قدر رقم حاصل کرتا ہے اتنا ایک کم مایہ اخبار نویس ایک ماہ میں پیدا کرلیتا ہے۔

مندرجہ ذیل مصنفین علمی اور مالی حیثیت سے ہمیشہ اپنے قلم کی بدولت ممتاز رہے۔

آرنلڈ بینیٹ۔ جان گلاس ورتھی۔ سمرسٹ ماگھم۔ ایکروالیس۔ اینھل ایم۔ ڈیل۔ ہچنسن ہل سرجے ایم بیری جی برنارڈ شا اور ہال کین۔ اور بھی متعدد مصنفین ہیں جن کی تصانیف ہزاروں پونڈ حاصل کرتی ہیں۔

دمدار انسان۔ انگلینڈ کے رائل کالج میوزیم میں گذشتہ سال ایک انسانی دم کا مشاہدہ کیا گیا۔ "برٹش میڈیکل جرنل" رقمطراز ہے "یہ دم ایک بچے کی تھی جس کو ایک سرجن نے اپنے بچے کی پیدائش سے چند ہفتے بعد اس کے جسم سے علیحدہ کیا تھا اور جو طول میں چار انچ تھی۔

دمدار قومیں۔ تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ ایسی دمدار اقوام دنیا کے مختلف حصص میں پائی گئی ہیں۔ بالعموم مشرق بعیدہ فلپائن کے جزائر اور وسطی افریقہ میں دمدار انسان دیکھے گئے۔ پچھلے دنوں لندن کے اخبارات میں ایک دمدار انسان کی ایک شاندار تصویر شائع ہوئی تھی۔ یہ تصویر جنوبی فلپائن کے ایک باشندے کی تھی۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ وہاں ایک خاندان کا خاندان دمدار انسانوں کا تھا۔

حقیقی نیند کی مدت۔ شب بھر میں مکمل آرام وسکون کی مدت صرف ساڑھے گیارہ منٹ ہوتی ہے۔ اور باقی وقت میں اعصاب وغیرہ مصروف کار رہتے ہیں۔

تبت کی عورتیں۔ سرزمین تبت میں سن رسیدہ کنواری عورتیں نہیں پائی جاتیں۔ ایک تبتی عورت رن چین لا مویا اپنی کتاب "تبتی عورت" میں رقمطراز ہے کہ ہمارے ملک میں ننوں کے خوفناک وجود کے لئے گنجائش نہیں کوئی خاتون ایسی نہیں پائی جاتی جو بغیر شادی کے زندگی بسر کرتی ہو تبتی عورت کبھی سگرٹ یا تمباکو نہیں پیتی۔ وہ کوئی پوڈر یا سفیدہ وغیرہ مصنوعی خوبصورتی کے لئے استعمال میں نہیں لاتی وہ اپنے چہرے کو ہوا اور دھوپ سے بچانے کیلئے ایک سیاہ نقاب استعمال کرتی ہے

مصطفٰے کمال پاشا کا مجسمہ۔ آسٹرین مجسمہ ساز ایچ کریل غازی ممدوح کے تین مجسمے تیار کر رہا ہے۔ پہلا مجسمہ مکمل ہو چکا ہے۔ یہ سرائے غولی (قسطنطنیہ) میں نصب کیا جائیگا۔ اس میں غازی موصوف سولین لباس پہنے ہوئے ننگے سر دکھائے گئے ہیں۔ انگورہ میں جو مجسمہ نصب کیا جائیگا اس میں غازی ممدوح فیلڈ مارشل کے لباس میں ہونگے۔ تیسرا مجسمہ طول میں ۲۸ فٹ ہوگا جو اسی لباس میں ہوگا۔ لیکن سر پر فولادی خود ہوگا۔

ڈاڑھی مونچھ والی عورت۔ فرانس میں سب سے زیادہ عجیب و غریب عورت مادام ویلی نامی ہے۔ جس کے ڈاڑھی اور مونچھیں دونوں موجود ہیں۔ محض اس کی دلچسپ خصوصیت کے باعث اسکو دیکھنے کیلئے تماشائیوں کا ایک ہجوم رہتا ہے بالخصوص نقاش اور مصور ضرور اسکی تصویر لینے کے لئے آتے ہیں۔ اسکو دیکھنے کیلئے ٹکٹ کی ایک رقم مقرر ہے۔ فرانس کا ایک مشہور متمول شخص اس ریشائیل حسینہ کا گرویدہ ہے۔ مادام ویلی کی ایک لڑکی بھی ہے لیکن لڑکی ریش وغیرہ کی نعمت سے محروم ہے۔

مختلف معلومات

اونٹ چار گھوڑوں کے برابر بوجھ اُٹھا سکتا ہے۔

۔ ایک ریشم کا کیڑا اپنی عمر میں ایک ہزار گز ریشم بُن لیتا ہے۔

عنکبوت کی عام عمر تین سال ہوتی ہے لیکن بعض عنکبوت ۱۳ سال کی عمر تک پہنچ جاتے ہیں۔

لندن کے باغات میں جو حیوانی اور انسانی فضلہ ڈالا جاتا ہے اس کی قیمت ۱۰۰۰ پونڈ ہوتی ہے۔

دنیا میں سب سے پہلا روزانہ اخبار چین سے شائع ہوا تھا۔

امریکہ سے ۲۳ ہزار۔ برطانیہ سے ۱۳ ہزار اور مصر سے ۱۲۹ روزانہ اخبار شائع ہوتے ہیں۔

مچھلی کی دنیا بھر میں دس ہزار اقسام ہیں۔

برٹش میوزیم میں تین ملین سے زاید کتب موجود ہیں۔

نومولود لڑکا اپنی ولادت کے چار روز بعد سے سننا شروع کرتا ہے

حکومتِ برطانیہ میں ۱۸۳۷۰۰۰ مربع میل جنگل کا رقبہ پڑا ہے۔

پارلیمنٹ کے ہر دو ایوانوں (دارالامراء و دارالعوام) کی مرمت پر دس لاکھ پونڈ صرف ہوگا۔ اور پندرہ سال میں کام ختم ہوگا۔

لندن کے خاص چوراہوں مثلاً پال مال۔ وائیٹ ہال۔ پکاڈلی اور آکسفورڈ اسٹریٹ میں رات کو گیس کے لیمپ روشن کئے جاتے ہیں۔

برلن کے بازاروں میں چاکولیٹ کے نمونے اس کثرت سے بطور اشتہار گرائے گئے کہ لوگوں میں کثرت سے ہاتھا پائی اور گھونسہ بازی تک نوبت پہنچی۔ حتی کہ پولیس کو اشتہار بازی کا یہ طریقہ بند کر دینا پڑا۔

شہر نیویارک میں ۴۰۰۰۰ ہزار نفوس عربی زبان بولتے ہیں۔

ممالک سویڈن و ناروے میں کوئی شخص مکروہ الاعضا نہیں۔ ساری مملکت میں ایک آدمی ایسا تھا دو سال ہوئے جب وہ فوت ہوا تو لوگوں نے اس کے مرنے پر انتہائی مسرت کا اظہار کیا۔

فلسطین کی سرکاری زبانیں انگریزی۔ عربی اور عبرانی ہیں لیکن وہاں فرانسیسی۔ یونانی۔ ہسپانی۔ جرمن رومانوی اور اطالوی زبانیں بھی بولی اور سمجھی جاتی ہیں۔

پروانہ

پروانے، تجھے یہ کیا ہوا ہے
تُو کس کا طواف کر رہا ہے

اس شمع میں روشنی ہے کس کی
دل میں ترے لو لگی ہے کس کی

کیوں وقفِ صد اضطرار تو ہے
کس واسطے بے قرار تو ہے

بیتابیٔ دل تری عیاں ہے
جذبے سے اُسی کے پرفشاں ہے

شورش سی یہ تیرے دل میں کیا ہے
سچ کہہ ترے آب و گل میں کیا ہے

یہ آخرِ شب یہ وقتِ راحت
ہر چیز ہے مستِ خوابِ غفلت

چُپ چاپ وحوش ہیں بھٹوں میں
خاموش طیور گھونسلوں میں

انسان بھی ہو گئے ہیں خاموش
بستر پہ پڑے ہیں کیسے مدہوش

اک شمع کہ شمعِ انجمن تھی
رونق دہِ محفلِ سخن تھی

تنہا کھڑی ٹمٹما رہی ہے
روتی ہوئی مسکرا رہی ہے

اک وہ ہے اور ایک تُو ہی بیدار
تم دونوں میں کچھ تو ہے سروکار

یہ راز و نیاز تم میں کیا ہے
یہ سوز یہ ساز تم میں کیا ہے

کیوں دل ترا وقفِ صد تپش ہے
کیا شعلۂ شمع میں کشش ہے

کہتے ہیں کہ جب ہوا اندھیرا
تھی فکر تجھے کہ ہو سویرا

اتنے میں ہوئی جو شمع روشن
سمجھا کہ ہے مہر جلوہ افگن

پُھولا نہ خوشی سے تُو سمایا
دوڑا ہوا دیکھنے کو آیا

ہم کو بھی ہے روشنی سے الفت
تاریکی سے طبع کو ہے نفرت

ہوتے نہیں چاند پر فدا ہم
کرتے نہیں عشق مہر کا ہم

گرتے نہیں آگ میں کبھی ہم   مرتے نہیں کر کے خودکشی ہم
کیوں تجھ کو ہے اضطراب ایسا   ہے کس کے لئے خراب ایسا
کیوں رقص میں مست تو ہے پیہم   کیوں وجد کا ہر گھڑی ہے عالم
کیوں شعلہ پہ جان دے رہا ہے   پھر پھر کے بلائیں لے رہا ہے
کیوں سر کو لگن پہ مارتا ہے   کیوں شمع پہ جان وارتا ہے
کیوں آگ میں جی جلا رہا ہے   کیوں موت کے منہ میں جا رہا ہے
کیوں شمع کی لو کو چومتا ہے   کیوں آ کے مزے میں جھومتا ہے
آیا تو ہے تُو جھپٹ کے لَو پر   جل جائے گا آگ سے لپٹ کر
کیوں تجھ کو ہے اشتیاقِ سوزش   کیوں دل میں ہے یہ مذاقِ سوزش
کیا یہ ہی کمالِ زندگی ہے   سوزش ہی مآلِ زندگی ہے
ننّھا سا وہ دل ترا کہاں ہے   جس سے تب و تاب یہ عیاں ہے
رکھ دے مرے سینہ میں وہی دل   اپنا سا بنا دے مجھ کو بسمل
دل میں مرے پیہم اک تپش ہو   اک درد ہو ٹیس ہو خلش ہو
دن رات کبھی نہ چین آئے   رہ رہ کے تپ دروں ستائے
ہو ہجر کہ وصل بے کلی ہو   اک آگ سی ہر گھڑی لگی ہو
شمع رخ یار جب نظر آئے   شورش مری اور کچھ ابھر جائے
پروانہ سا ہر طرف پھروں میں   اس شعلۂ حسن پر گروں میں
مرنے لگوں جب میں ہو کے گھائل   مستانہ ہو میرا رقصِ بسمل
جب موت کی ہچکیاں لگی ہوں   نظریں رخِ یار پر جمی ہوں

لازم ہے فراق زندگی میں

دُنیا کی مذہبی و معاشرتی تاریخ پر ایک نظر

۵

اِسلام

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب اسلام نے علمی و روحانی اخلاقی و معاشرتی زندگی میں یُوں ترقی کی کہ نوعِ انسان کو اس معراجِ آزادی پر پہنچا دیا تو پھر کیونکر اُسکی وہ حالت ہوگئی جو آج ہم دیکھتے ہیں۔ اس کا جواب آسان ہے اور وہ یہ ہے کہ جس طرح اسلام کے اولیں اصولوں پر ایک آزادانہ طریق میں عمل کر کے مسلمانوں نے ترقی کی اسی طرح کبھی ان اصولوں پر تنگ نظری سے عمل کر کے اور کبھی اُن سے منحرف ہو کر وہ تنزل کے غار میں گر گئے۔

مسلمانوں کے تنزل کی داستان غم افزا ہے لیکن دلچسپ۔ زندگی کے شعبوں میں اُن کا تنزل بیک وقت واقع نہیں ہُوا۔ کوئی قوم رفعت کی چوٹیوں سے ذلت کے غاروں میں فوراً نہیں گر جاتی اور پھر ایک ایسی قوم جس کے طولانی سلسلے ادھر مشرق اور ادھر مغرب میں پہنچ چکے تھے جب رو بہ انحطاط ہوئی تو آہستہ آہستہ عباسیہ عہد میں عقل پرستوں کا بول بالا ہُوا۔ اور اس زریں عہد میں "متشرعین" نے اُن پر غلبہ پا لیا۔ بغداد کی تباہی کے ساتھ اسلام کا سیاسی نظام برباد ہو گیا لیکن اس کے بعد بھی بعض قابلِ احترام شخصوں نے علم و فن کے میدان میں قدم بڑھایا۔

پہلی صدی ہجری میں اسلام دو گروہوں میں تقسیم ہو گیا۔ شیعہ بنی امیہ اور بنی عباس کی خلافت کے مخالف تھے لیکن دوسری جماعت جس کے اراکین منصور اور ہارون کے عہد میں اہل السنت والجماعت کہلائے پہلے خلافتِ دمشق اور پھر خلافتِ بغداد کی معاون بنی رہی۔ اور انہیں کے اثر کے سایہ میں اُن کے مسلک نے پرورش پائی۔ اُن کے اصول و قوانین کے چار ماخذ ہیں۔ قرآن۔ حدیث۔ اجماع الامت اور قیاس۔ لیکن اب صدیوں سے وہ اپنے چار مشہور اماموں۔ ابو حنیفہ، مالک، شافعی اور حنبل میں سے ایک نہ ایک امام کے مقلد یا پیرو رہے ہیں۔

امام ابو حنیفہ نے کہا کہ جہاں کسی امر کے متعلق کوئی حکم قرآن مجید میں بصراحت موجود نہیں وہاں ہمیں عقل سے کام

لینا چاہیئے۔ امام مالک نے آنحضرت کی زندگی کے جزوی حالات کی بنا پر احکام سنت وضع کئے۔ امام شافعی نے قواعد لسانی کی طرف توجہ کرکے اصولِ فقہ کی تدوین کی۔ امام حنبل نے احکامِ دینی کے لفظی معانی پر زور دیا۔ اور شرح کی عقلی تشریح کو کفر و بدعت سے تعبیر کیا۔

بنی امیہ کے عہد میں "جبریہ" "صفاتیہ" اور "مشبہہ" کا زور تھا جو جبر کے قائل اور خدا کی صفات اور اسکی انسانی مشابہت کے ماننے والے تھے۔ حسن بصری اور شیعہ اماموں کا عقیدہ اُنکے خلاف تھا۔ عطا بن واصل نے معتزلہ کی بنا ڈالی اور وہ اور اسکے پیرو دنیا کو عقل و فلسفہ کی راہ پر لے گئے۔ امام حنبل نے اس فلسفہ آرائی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور اپنی قدامت پسندی کے زور میں معتزلہ کی جدت نمائیوں پر بے دھڑک پے درپے حملے کئے۔ اہل عقل اور اہل شرع میں ایک خونریز جنگ شروع ہوگئی جس کا نتیجہ بالآخر اہل شرع کے حق میں ہوا۔ جو "صفاتیہ" اصول کے حامی اور عوام الناس کے مذہبی نمایندے تھے۔ خلیفہ متوکل (۸۴۷ء تا ۸۶۱ء) نے معتزلہ کو یک قلم حکومت کے کاروبار سے علیحدہ کردیا۔ اور ہر طرف اُن کے خلاف احکام جاری کردیئے۔ بغداد جو کبھی معتزلہ کے علم و فلسفہ سے بقعۂ نور ہوگیا تھا اب اُسکے گلی کوچوں میں اُن کے خون کی ندیاں جاری ہوگئیں۔ الکندی۔ فارابی اور ابن سینا علمی میدان میں عقل کا علم بلند کئے رہے مگر عوام قدامت پسندوں کی گرفت میں آچکے تھے۔ اور باوجودیکہ بعد کے بعض خلفا نے پھر مذہب اعتزال کی طرف توجہ کی لیکن معتزلہ کا زور روز بروز گھٹتا گیا۔ اور اشعری نے (جس کا زمانہ نویں صدی عیسوی کے نصف آخر کا ہے) آکر اس کی رہی سہی طاقت بھی سلب کرلی۔ ابوالحسن الاشعری نے معتزلہ سے تعلیم پاکر انہیں کی سکھائی ہوئی منطق سے اُنکے خلاف اصولِ مذہب وضع کئے۔ اُس نے "صفاتیہ" اصول کی اشاعت شروع کی اور کہا کہ خدا کی صفات ازلی ہیں وہ کائنات کا مالک و حاکم ہے۔ اور وہی اوامر و نواہی جاری کرتا ہے نیکی بدی سب اسی سے صادر ہوتی ہے۔ انسان کے سب کام اُسی کے حکم سے ہوتے ہیں۔ ہر کام خدا سے صادر ہوتا ہے اور پھر انسان سے۔ ابن عساکر نے جو اشعری کے تقریباً ڈھائی سو برس پہلے گذرا ہے اُس کے مذہب کی تشریح کی ہے کہ مسلمان کے لئے مذہب کی سب باتوں پر بلا چون وچرا ایمان لانا اور اعتقاد رکھنا لازم ہے۔ مذہب میں سوال کرنا اور شک و شبہ رکھنا اک گناہ کبیرہ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دوزخ اور بہشت ضرور موجود ہیں۔ قیامت کی ساعت یقینی طور پر آنے والی ہے۔ قرآن کا ہر لفظ غیر مخلوق ہے دنیا میں نیک و بد سب کچھ خدا کے حکم سے ظہور میں آتا ہے اور انسان وہی کرتا ہے جو پہلے سے اس کی قسمت میں لکھا ہوتا ہے اور وہ روحانی فلاح کے لئے کچھ نہیں کرسکتا جب تک مشیت ایزدی اس کی مددگار و معاون نہ ہو۔ اس کے نزدیک سچا مسلمان پیغمبر کی شفاعت، دجال کی آمد، منکر و نکیر کے سوالات۔ معراج کی اصلیت۔ شیطان کی ترغیب

اور امام وقت کی فرمان بری کا قائل ہے" سلاطینِ بویہ نے معتزلہ کی طرف رجوع کیا لیکن سلجوقیوں نے پھر حنبلیت واشعریت کو اپنے سائے میں لے لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کے اکثر پیرو صدیوں کے لئے قدامت پسندی اور قسمت کے نام لیوا ہو گئے۔

اخوان الصفا نے دسویں صدی میں عقل پسندی اور تزکیۂ نفس کے مسلک کی اشاعت کی لیکن اشعری و حنبلی خیالات اہل سنت والجماعت کے دائرے میں پھیل چکے تھے اور ان فلسفہ دانوں سے عوام زیادہ متاثر نہ ہو سکے۔

امام غزالی (سنہ ۱۰۵۸ء تا سنہ ۱۱۱۱ء) نے آکر" قدامت پسندی کو جہالت کے پنجے سے رہائی دلائی اور اگرچہ انہوں نے مذہب کی حمایت میں فلسفے پر حملہ کیا۔ لیکن ساتھ ہی اسلام کی بنیاد کو مضبوط و پائدار بھی بنا دیا۔ انہوں نے کہا کہ عقل کو اعتقاد پر ترجیح ہے۔ انہوں نے انفرادی آزادی کی اعانت کی اخلاقی پاکیزگی پر زور دیا۔ نوجوانوں کی تعلیم و تربیّت کی طرف توجہ دلائی اور ملّاؤں کو اپنی بے سود اور شرمناک زندگی کی اصلاح کی طرف ترغیب دی۔

غزالی کی وفات کے چالیس برس بعد خلیفہ مستنجد کے حکم سے ابن سینا کی تصنیفات اور اخوان الصفا کے رسائل بغداد کے چوک میں آگ کی نذر کر دیئے گئے۔ قدامت پسندوں نے مضبوطی کے ساتھ اپنا اقتدار قائم کر لیا۔ اور اسلامی دنیا میں آزادی کا گلا گھونٹ کر اپنے خیالات کی اشاعت شروع کی +

اسلام ایک سادہ مذہب تھا جس میں بظاہر اختلافات و نظریات کی گنجائش نہ تھی لیکن دنیاوی جاہ و جلال کی حرص۔ اہل عرب کی فرقہ بندی اور انفرادیت کے زور نے اہل اسلام کو بہت سے فرقوں میں منقسم کر دیا۔

اسلام کے دو بڑے فرقے سنی اور شیعہ ہیں۔ سنیوں کا بیشتر حصہ چار اماموں میں سے ایک نہ ایک کا مقلّد ہے اٹھارہویں صدی میں عرب میں عبدالوہاب نے ایک اصلاحی تحریک شروع کی جس کا مقصد قدیم و حقیقی اسلام کی تجدید و استحکام تھا۔ وہابی قبروں کی زیارت اولیا پرستی اور اس قسم کے تمام اوہام کے مخالف ہیں۔ اور نہایت سختی کے ساتھ مذہبی احکام کی بجا آوری کرتے ہیں۔ خارجیہ دراصل سنی نہیں لیکن چونکہ انہوں نے حضرت علی سے تنازعہ کر کے اُن کے خلاف صف آرائی کی لہٰذا وہ بھی ایک قسم کے سنی سمجھے جاتے ہیں۔ عباسیہ زمانے میں انہوں نے متعدد بار عَلَم بغاوت بلند کیا لیکن اب وہ زیادہ امن پسند ہو گئے ہیں۔ عبادی بھی ایک خارجی فرقہ ہے جو بہت پابندِ صوم و صلوٰۃ ہے۔ سنیوں کے ہاں تازہ ترین تحریک غیر مقلدوں کی ہے جو موجودہ اسلام کو پھر عقل پرستی کی طرف واپس لے جاتا

چاہتے ہیں۔ قرآن کا اپنی زبان میں ترجمہ کرنا۔ نماز اپنی زبان میں ادا کرسکنا اور اسی قسم کی اور اصلاحیں اُن کے پیش نظر ہیں۔ اگر یہ تحریک پھیلی اور یقین ہے کہ اس ترقی کے زمانے میں پھیلے گی تو اسلام بہت سی اُن آلائشوں سے پاک ہو جائے گا جو صدیوں سے اُس کے اندر سرایت کرتی چلی گئی ہیں۔

شیعوں کے حلقے میں شروع ہی میں بہت سے فرقے پیدا ہو گئے۔ زیدیہ جو پہلے تین خلفا کی خلافت کے بھی قائل تھے۔ مغربی اسماعیلیہ مصری فاطمی خلفا کے پیرو تھے جنہوں نے ۹۰۵ء سے ۱۱۷۱ء تک عباسی خلافت کے خلاف اپنا علم بلند کئے رکھا۔ ان کے عہد میں قاہرہ میں دارالحکمت اور وہ خفیہ انجمنیں قایم ہوئیں جن کی تقلید میں صلیبی عیسائیوں نے یورپ میں جا کر ٹمپلرز اور ہاسپٹلرز کی جماعتیں اور ٹیسینی انجمنیں قایم کیں مشرقی اسماعیلیہ حسن بن صباح کے نام لیوا تھے جو قلعہ الموت پر متمکن تھا اور جس کے فدائیوں نے اسلامی دنیا کو اپنی خفیہ ریشہ دوانیوں سے پاش پاش کرنے کا کام اپنے ذمہ لیا تھا۔ روشنیہ کا بانی بایزید تھا۔ تصوف اور کثرت پرستی کا رنگ اس فرقے میں پایا جاتا تھا۔ ان کے علاوہ غالیہ اسحاقیہ خطابیہ وغیرہ فرقے پیدا ہوئے جن میں سے اکثر کثرت پرستی تجسیم اور شخصیت پرستی کی اس خیالی حد تک پہنچ گئے کہ محمدؐ، علیؓ۔ فاطمہؓ، حسنؓ۔ اور حسینؓ اجتماعی صورت میں ربانیت کا مظہر ہیں۔ خالص شیعہ جو اپنے تئیں اثناعشریہ یا امامیہ کہتے ہیں دو فرقوں میں منقسم ہیں۔ فرقہ اخباری جو زیادہ تر عوام پر مشتمل ہے جو اپنے ملاؤں کے تحت ہیں اوہام میں گرفتار ہیں اور اصولی جو مجتہدین سے بے نیاز ہیں۔ اور مذہب کے بارے میں اپنی ذاتی رائے رکھتے ہیں۔ ایران میں اسمٰعیل صفوی کے وقت سے اثناعشریہ ملکی مذہب ہے معتزلہ کے عقاید بعض ترقی یافتہ ایرانیوں کے خیالات میں پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ زمانۂ حال میں ملّا صدرا نے ابن سینا کے فلسفے کی حمایت میں اپنی آواز بلند کی اور مرزا علی محمد باب نے اس مذہب کی اشاعت کی جسے آج دنیا بابیت اور بہائیت کے نام سے پکارتی ہے۔ "باب اول" کو ایرانی حکومت نے (۱۸۵۰ء میں) گولی سے مروا دیا لیکن اس کے پیرو مرزا حسین علی نے بہاءاللہ بن کر پہلے بغداد اور یورپین ترکی میں اور پھر بمقام عکہ بہائیت کے اصولوں کو مدوّن کیا۔ بہائیت کا عقیدہ ہے کہ خدا کائنات کی روح ہے اور یہ روح وقتاً فوقتاً بعض شخصیتوں میں حلول کر کے نوع انسان کی ہدایت کیلئے دنیا میں پیغمبر اور رہنما بھیجتی رہتی ہے۔ بدھ، موسےٰ۔ عیسےٰ۔ محمدؐ، بہاءاللہ اس قسم کے روحانی رہنما تھے۔ اس مذہب میں کوئی رسمیات نہیں۔ مذہب صرف انسان کی روزمرہ کی زندگی سے ظاہر ہوتا ہے۔ بہائیوں میں کوئی پادری پروہت یا ملّا نہیں ہوتا۔ معاشرت میں مرد عورت کو بہاءاللہ نے برابر کا درجہ دیا ہے۔ وحدتِ ازدواج کو لازم قرار دیا ہے۔ اور جنگ کا سدّباب کرنے کے لئے مصالحت کا اصول قایم کیا ہے۔ بہاءاللہ ۱۸۹۲ء میں وفات پا گیا اور اس کی جگہ عبدالبہا نے لی۔

اسلامی دنیا کا بیشتر حصہ سنی المذہب ہے۔ شیعہ صرف ایران اور ہندوستان کے بعض حصوں (مثلاً اودھ وغیرہ) میں پائے جاتے ہیں۔

اسلام کے فرقوں اور مسلکوں کا بیان نامکمل رہے گا اگر ہم صوفیوں اور درویشوں کا ذکر نہ کریں۔

اسلامی تصوف کا سرچشمہ قرآن مجید ہے۔ جس میں خدا کے وجدانی علم اور خدا اور انسان کے ازلی تعلق کی طرف متعدد بار اشارہ کیا گیا ہے "ہم خدا کے ہیں اور ہمیں خدا ہی کی طرف لوٹ جانا ہے" پہلی صدی ہجری میں حضرت علی اور حسین بعد میں جعفر الصادق۔ حسن بصری۔ ابراہیم بن ادھم۔ جنید۔ رابعہ۔ بایزید بسطامی کے مقولات میں تصوف کا رنگ پایا جاتا ہے۔ بنی امیہ کے استبداد نے بہت سے لوگوں کو دنیاوی کاروبار سے بیزار کردیا۔ اور وہ علم معرفت میں وہ سکون و اطمینان تلاش کرنے لگے جو انہیں کاروبار ملکت میں نصیب نہ ہوا۔ تیسری صدی میں تصوف پر غیر اسلامی رنگ چڑھنے لگا۔ چھٹی صدی ہجری میں جب غزالی نے دیکھا کہ اشعریت نے اسلام کو قطعی محدود و پابند بنا دیا ہے تو اس نے علاوہ اپنی اخلاقی تعلیم کے اسلام کو تصوف کے رنگ میں پیش کیا اور کہا کہ انسانی روح خدا سے براہ راست تعلق پیدا کر کے حقیقت کو پا سکتی ہے۔ غزالی نے "مقاصد الفلاسفہ" اور اپنی دوسری تصانیف سے فلسفے کے دانت کھٹے کر دیئے لیکن تصوف کی چاشنی سے مذہب کی خشکی اور عقیدہ پرستی کو دور کر دیا۔ دنیائے اسلام میں چاروں طرف خانقاہیں اور زاویے بن گئے اور ساری اسلامی دنیا تصوف کے سلسلے میں منسلک ہوگئی۔ اس کا جہاں اچھا اثر ہوا۔ لوگوں کے اخلاق سدھرے اور اُن کی طبیعتیں راہ راست پر آگئیں۔ وہاں تصوف نے ان میں سے اکثروں کو قوت عمل سے محروم بھی کر دیا۔ اور وہ ترک دنیا کو ذریعۂ نجات سمجھنے لگے +

تصوف میں "سالک" "طریقت" کے رستے پر چلتا ہے اور ان دشوار گذار "مقامات" سے جو اس راہ میں واقع ہیں گذرتا ہوا بالآخر فنا فی الحق ہو جاتا ہے۔ یہ ہے اس کی زندگی کا منتہائے کمال۔ یہ ہے اسکی سب سے بڑی خوشی اور اسی کے حصول میں وہ دنیا کی ساری تکلیفیں اُٹھاتا اور اپنی زندگی کی ساری خوشیاں قربان کر دیتا ہے۔

طریقت کے بعض مقامات یہ ہیں۔ توبہ، زہد، فقر، صبر، توکل "مقامات" ریاضت و مجاہدہ سے طے ہوتے ہیں لیکن "احوال" جو قلبی اور روحانی حالتیں ہیں محض خدا کی خوشنودی سے ہیں۔ احوال میں سے بعض یہ ہیں۔ مراقبہ، قرب الٰہی۔ عشق سکون و اطمینان۔ مقامات کو ایک صوفی مصنف نے اس طرح بیان کیا ہے کہ پہلے طالب حقیقت عالم ناسوت میں سے ہو کر گذرتا ہے۔ وہ شریعت کے مطابق عمل کرتا ہے اور تمام شرعی احکام و رسوم کا پابند رہتا ہے۔ پھر اس کا گذر عالم ملکوت میں سے ہوتا ہے۔ اور یہاں وہ طریقت کے رستے پر چلتا ہے۔ پھر وہ عالم جبروت کا مقام طے کرتا ہے اور یہاں وہ معرفت

کو اپنا رہبر بناتا ہے۔ سب سے آخر وہ عالم لاہوت میں پہنچتا ہے۔ جہاں وہ حقیقت کی اعانت سے فنا فی الحق ہو جاتا ہے۔
صوفیہ کا ایمان ہے کہ کائنات میں صرف خدا کی ذات موجود ہے۔ وہ سب اشیا میں ہے اور سب اشیا اُس میں ہیں۔ ہمہ اوست اور ہمہ ازوست۔ تمام مرئی وغیر مرئی اشیا کا سرچشمہ خدا ہے۔ اور اس سے علیحدہ اُن کی کچھ ہستی نہیں۔ مذاہب کی کچھ اہمیت نہیں بجز اس کے کہ وہ حقایق کے سمجھنے میں کچھ مدد دیتے ہیں۔ ان میں بعض دوسروں سے بہتر ہیں۔ مثلاً اسلام جس کا صحیح فلسفہ تصوف ہے۔ نیکی اور برائی میں کوئی اصلی فرق نہیں۔ کیونکہ یہ دونوں وحدت میں جذب ہو جاتی ہیں۔ خدا نوع انسان کے افعال کا منبع ہے۔ خدا ہی انسان کے ارادے کو قایم کرتا ہے۔ لہذا انسان اپنے اعمال میں محض مجبور ہے۔ روح جسم سے پہلے موجود تھی اور جب تک انسان جیتا ہے وہ اس قفس میں مقید رہتی ہے۔ لہذا موت ہر صوفی کا نصب العین ہونا چاہئے۔ تاکہ وہ جس قدر جلد ممکن ہو خدا سے پھر جا ملے۔ موت کی منزل سے گذر کر روحیں پاک و صاف ہو جاتی ہیں اور خدا سے جا ملتی ہیں۔ بغیر فیضان الٰہی کے وصال کسی کو نصیب نہیں ہوتا لیکن توبہ و دعا سے فیضان حاصل ہو سکتا ہے۔ سو ایک صوفی کا اصلی کام وحدانیت پر غور و فکر کرنا اور طریقت سے گذر کر خدائے لایزال سے متحد ہو جانا ہے۔ نفس کشی زندگی کا بڑا مرحلہ ہے۔ جب انفرادی ہستی مٹ جاتی ہے تو ہمہ گیر ہستی کا جزو بن جاتی ہے۔ "اپنے دل میں دیکھ کہ خدا کی خدائی وہاں پر تو افگن ہے" کائنات حقیقی وجود کی ظاہری و مرئی شکل ہے اور حقیقی وجود ہی کائنات کی باطنی وغیر مرئی حقیقت ہے۔" انسان کائنات کا سرتاج اور اس کی علت غائی ہے شر یا برائی کی یہ وجہ ہے کہ بغیر برائی کے اس نیکی کا پالینا جو نفس کشی کی جزا ہے غیر ممکن ہے۔ مولانا روم کا عقیدہ ہے کہ کائنات میں کوئی شے قطعی بری نہیں بری اشیا میں بھی نیکی کی روح دیکھنا چاہو تو عشق اور اس کے حقیقی علم کی عینک لگا کر دیکھو۔ عشق حقیقی کی رنگینیوں سے صوفیانہ شاعری کی فضا لبریز رقت ہے۔ اور ان کی دنیا میں من تو شدم تو من شدی کی ہزاروں مست و شیریں صداؤں سے روز و شب معرفت و حقیقت کی دل گداز گونج پیدا ہوتی رہتی ہے۔

صوفیوں نے اسلام کو اپنی بیش بہا دولت سے مالا مال کر دیا۔ ان میں سے بعض اپنی جسمانی محنت۔ تزکیہ نفس اور اپنی قوت عمل سے خواص و عوام کے راست رو رہنما بن گئے۔ اور ایسے زمانے میں جب سلطنت کا انتظام درہم برہم ہو چکا تھا۔ جب صوبے صوبے میں ایک بادشاہ اور شہر شہر میں ایک مطلق العنان امیر اپنی حکومت جمائے اپنے تخت پر متمکن تھا خلق کے اخلاق و معاشرت کی باگ ڈور انہوں نے اپنے ہاتھ میں رکھی۔ اور بعض ممالک مثلاً ہندوستان میں اشاعتِ اسلام کا اہم کام بحسن و خوبی سرانجام دیا۔ لیکن بدقسمتی سے اُن میں جلد سچے انسانوں کے پہلو بہ پہلو جھوٹے اولیا پیدا ہونے شروع ہو گئے اور آخر وہ بجائے اخلاق عامہ کے سنوارنے کے اس کے بگاڑنے والے بن گئے۔ مشائخ

کے بیسیوں سلسلے قایم ہوگئے۔ اور لاکھوں ناہنجار نابکار جاہل مرید اُن ہزاروں فقرا اور مرشدوں کی تلاش میں آوارہ پھرنے لگے۔ جن کا ہر آبادی میں اک زاویہ یا تکیہ تھا اور جن میں سے اکثر فریب کاری یا ریان کاری کی دلق مرقع پہنے روز و شب ان بدنصیبوں کی گھات میں لگے رہتے تھے۔ فقرا کے ان سلسلوں اور خاندانوں میں بعض بہت مشہور ہیں شیخ علوان نے پہلی صدی ہجری میں علوانیہ۔ مولانا روم نے مولویہ۔ عبدالقادر گیلانی نے قادریہ۔ معین الدین چشتی نے چشتیہ اور بیسیوں اور بزرگوں نے بہت سے اور سلسلے مثلاً نقشبندیہ۔ جلالیہ۔ سہروردیہ۔ مداریہ۔ قلندریہ۔ رفاعیہ وغیرہ کی بنیاد ڈالی۔ رفاعیہ مصر و ترکی کے ناچنے گانے والے درویش ہیں۔ مداریہ میں وہ ملنگ فقیر شامل ہیں جو ہندوستان کے بازاروں میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ جلالیہ وسط ایشیا اور سہروردیہ افغانستان میں پائے جاتے ہیں۔

جب ایک شخص کسی سلسلے میں داخل ہوتا ہے تو وہ اس سلسلے کے شیخ یا مرشد کے پاس جاتا ہے۔ اسکے ہاتھ پر بیعت کرکے اس کا مرید بن جاتا ہے۔ مرشد سفر روحانی میں مرید کا رہبر بن کر اُسے ریاضت و مجاہدات کے ان طریقوں سے آگاہ کرتا ہے جن سے نجاتِ روحانی حاصل ہوتی ہے۔ مُرید اعتراف و معاہدہ کرتا ہے مرشد اُسے ذکرِ خفی کا طریق بتاتا ہے۔ مثلاً یہ کہ لا الہ الا اللہ کس طرح دُہرانا چاہئے۔ نقش بندیہ اپنے اذکار کو پانچ سے لیکر دس ہزار دفعہ روزانہ دہراتے ہیں۔ ایک دفعہ استغفار ایک دفعہ فاتحہ نو دفعہ انشراح اور اسی طرح اور کئی قسم کی دعائیں کرتے اور نمازیں پڑھتے ہیں۔ یہ لوگ عموماً جمعرات کے روز اپنے شیخ کے زاویے یا مرشد کے تکیے میں باہم ملتے ہیں اور مل کر عبادات میں حصّہ لیتے ہیں۔ پہلے مرشد چند الفاظ کہتا ہے۔ پھر ساری جماعت مل کر باوازِ بلند اللہ یا ہُو کہتی ہے۔

ہمیں یہ کہنے کا حق حاصل نہیں کہ حال کے سب صوفیانہ و فقیرانہ طریقے طمع و فریب کے پھندے ہیں لیکن کوئی شخص اسلام کے عروج کے زمانے کا حال پڑھ کر اور ان کیفیتوں کو اپنی آنکھوں دیکھکر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کہاں وہ عقل پرستی وہ عمل آرائی وہ جدت نمائی کہاں۔ یہ قبروں کی زیارت۔ پیروں کی پرستش اور یہ اندھا دھند تقلید کی روش۔ حیرت ہوتی ہے ؎

کہ کل کیا تھے اور آج کیا ہو گئے ہم   ابھی جاگتے تھے ابھی سو گئے ہم

جب مسلمانوں نے دین میں تقلید کی راہ اختیار کی جب وہ مذہب میں عملِ صالح سے بے خبر ہو گئے تو دنیا کی عزت وحرمت اور زندگی کی قوت و دولت بھی اُن کے ہاتھ سے جاتی رہی۔ وہ گروہوں میں منقسم ہو گئے وہ دور دراز ملکوں میں تتر بتر ہو گئے۔ اُن کے ہاں صدہا فرقے قائم ہو گئے اُن کے ہاں بیسیوں سلطنتیں قایم ہو گئیں۔

ترکوں نے اسلامی سلطنت پر قبضہ نہیں کیا۔ بلکہ ان کی آمد کے ساتھ اسلامی تمدن کی روح بھی پرواز کر گئی۔

یہ درست ہے کہ یورپ کے شہروں پر اسلام کا پرچم ان کے عہد حکومت میں صدیوں سے لہراتا رہا ہے لیکن جب انکی فاتحانہ پیش قدمی رکی۔ یورپ نے ان پر جارحانہ حملے شروع کردیئے اور بتدریج انکی سلطنت کو ٹکڑے ٹکڑے کردیا۔ دنیوی حیثیت سے اسلام کا انحطاط سترہویں صدی میں شروع ہوگیا۔ اور اٹھارہویں صدی میں مسلمانوں کو اپنی وسیع سلطنت کا سنبھالنا دشوار نظر آنے لگا اور ان کی مادی و اخلاقی حالت روز بروز بگڑنے لگی۔ آداب و اخلاق علم وفن سب ملیامیٹ ہوگئے۔ خود پرست والی و پاشا جا بجا ظلم کرنے لگے لوگوں میں اپنی عقل اور سمجھ نہ رہی۔ تجارت بند ہوگئی اور زراعت برباد۔ انیسویں صدی میں یورپ میں افریقہ میں ہندوستان میں غرض ہر جگہ عیسائیوں نے مسلمانوں کو شکست دی۔ ان کے ملک چھن گئے اور اُن کا رہا سہا رعب جاتا رہا۔ لیکن انیسویں صدی میں جب مسلمان اپنے تنزل کی انتہائی گہرائیوں تک پہنچ گئے۔ ان میں بیداری کے کچھ نشان ظاہر ہونے شروع ہوئے۔ سب سے پہلے عرب میں وہابی تحریک نے سر اٹھایا اور سوئے ہوئے مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کیا کہ اٹھو اور پھر ویسے بنو جیسے تم پہلی صدی ہجری میں تھے۔ کچھ عرصے بعد ترکی میں اک آزاد جماعت اٹھی۔ مصر میں جامع ازہر میں شیخ محمد عبدو نے صدائے عبرت بلند کی۔ ہندوستان میں سرسید احمد خاں نے تعلیم و تہذیب کا ڈنکا بجایا۔ طرابلس کے صحراؤں میں شیخ سنوسی نے بدوی عربوں کی اصلاح اور جاہل حبشیوں میں اشاعت اسلام کا اہم کام اپنے ذمہ لیا۔ جنرل خیرالدین نے (سنہ ۱۸۶۰ء میں) طونس کو موجودہ تہذیب سے آشنا کرنا چاہا۔ چین میں یعقوب بیگ نے (سنہ ۱۸۷۰ء میں) بغاوت کا جھنڈا بلند کیا۔ جمال الدین ہندوستان سے مصر اور مصر سے قسطنطنیہ پہنچا۔ جہاں اس نے سلطان عبد الحمید کے ساتھ مل کر ایک ہمہ گیر "وکل اسلامی تحریک" کی بنیاد ڈالی جس کا مقصد سب مسلمانوں کو خلیفہ ترکی کے علم کے نیچے جمع کرنا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے جتنی کوششیں گرے ہوئے مسلمانوں نے سنبھلنے کی کیں اتنی ہی مصیبتیں اُن پر نازل ہوئیں طونس اور الجزائر پر فرانس نے قبضہ کرلیا۔ طرابلس پر اطالیہ نے ہاتھ صاف کیا۔ ایران کو روس و انگلستان نے آپس میں تقسیم کرلیا۔ مصر پہلے ہی اپنی آزادی کھو چکا تھا۔ ابھی ترکی سنہ ۱۹۱۱ء کی لڑائی سے فارغ بھی نہ ہوئی تھی کہ بلقان کی سلطنتوں نے مل کر سنہ ۱۹۱۲ء میں اُس پر حملہ کیا اور اس کے حصے بخرے کرلئے اسی پر بس نہیں سنہ ۱۹۱۴ء کی جنگ عالمگیر دنیا پر ایک طوفان بن کر چھاگئی۔ اور اس طوفان نے تمام اسلامی ملکوں کی آزادی کو تباہ و برباد کردیا۔

لیکن خدا کو اس تباہی و ہلاکت میں سے ایک نئی دنیا پیدا کرنی مقصود تھی اور اس میں مسلمانوں کو بھی حصہ ملا۔ ترک اپنی جان پر کھیل گئے اور اپنے آبائی وطن میں پھر آزاد بن بیٹھے۔ ایران انقلاب زدہ روس اور مضمحل انگلستان کے پنجے سے نکل گیا۔ افغانستان کے سر سے بھی انگریزی اور روسی سایۂ عاطفت اُٹھ گیا اور دنیاوی اقتدار کی

بحالی کے ساتھ مسلمانوں کی معاشرتی و اخلاقی، مذہبی و سیاسی حالت بھی سدھرنے لگی۔ چنانچہ اس وقت اسلامی دنیا میں ایک انقلاب عظیم واقع ہو رہا ہے۔ جس کے اثرات کا یورپ و امریکہ کے بعض دوربین نکتہ چین دلچسپی کے ساتھ مشاہدہ اور اندازہ کر رہے ہیں۔

مسلمان تعلیم میں ترقی کر رہے ہیں۔ جہالت کے وہ پردے جو صدیوں سے اسلامی گھرانوں پر چھائے ہوئے تھے اٹھ رہے ہیں اور مغربی تعلیم کے خلاف تعصب قطعی طور پر مٹ گیا ہے ہندوستان میں علاوہ اسلامی تعلیمی انجمنوں کالجوں اور اسکولوں کے قیام کے کم ازکم شہریوں کے ہاں اخبارات کے مطالعہ اور جلسوں میں جانے کا شوق بہت بڑھ گیا ہے ہندوؤں کے مقابلے اور بین ملّی معرکے نے مسلمانوں میں تعلیم و ترقی کا ذوق پیدا کر دیا ہے۔ ترکی میں تعلیم و فنون و فنی رات چوگنی ترقی کر رہی ہے۔ مصر میں ۱۹۲۳ء کے قانونِ دستوری کے بموجب تعلیم جبری کر دی گئی ہے افغانستان میں سفری سکولوں کا انتظام کیا گیا ہے۔ جو مختلف مقامات میں جہاں کے لوگ دنیا سے الگ تھلگ پڑے ہوئے ہیں جا کر تعلیم دیتے ہیں۔ علاوہ بریں ہر سال سینکڑوں ہندی افغان ترک اور مصری۔ طونسی اور عرب۔ فرانس اور جرمنی اور امریکہ میں جا کر مغربی علوم میں ڈگریاں پاتے ہیں۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ اسلامی دنیا میں اس وقت کم ازکم پندرہ سو اخبارات ہیں جن میں سے سات سو صرف عربی میں ہیں۔ مطالعہ کا شوق دامنگیر ہو گیا ہے۔ ہزاروں کتابیں مغربی زبانوں سے عربی اور فارسی اور اردو اور ترکی میں ترجمہ ہو رہی ہے۔ مصطلحات کے ترجمے ہو گئے ہیں اور طبیعیات کی تحصیل بھی جزو تعلیم ہوتی جاتی ہے۔ اخبارات اسلامی دنیا کے تفصیلی اور تازہ ترین حالات ہر روز اپنے قارئین کے سامنے پیش کرتے رہتے ہیں۔ موجودہ تعلیم نے حالی اور اقبال سے شاعر اور بیسیوں ادیب اور مصنف پیدا کر دئیے ہیں۔ جن کا طلسمی اور خاموش اثر بڑا اپنا کام کر رہا ہے۔ معاشرت میں تعلیم کی وجہ سے اصلاحیں ہو رہی ہیں۔ اور رسوم و توہمات میں انہماک کم ہوتا جاتا ہے۔ عورتوں کا درجہ بڑھ رہا ہے اور وہ کامیابی کے ساتھ اپنے جائز حقوق کا مطالبہ کر رہی ہیں تعلیم کے دروازے اُن کے لئے صدیوں کے بعد پھر کھل گئے ہیں۔ ترکی میں ۱۹۲۴ء میں ترکی نسوانی معلموں کا ایک جلسہ ہوا جس میں قسطنطنیہ سے ایک ہزار اور انگورہ سے دو سو نمائندگان شریک ہوئیں۔ قسطنطنیہ میں ایک اسلامی کالج ہے اور وہاں کی یونیورسٹی میں عورت مرد اکٹھے تعلیم پاتے ہیں۔ دو سال ہوئے مصری حکومت نے اکیس مصری عورتوں کو صرف انگلستان بھیجا جو خود مغربی ممالک میں تعلیم پاتی تھیں۔ مشرقی ایشیا میں موروں کے سلطانِ سولو نے اپنی لڑکی کو امریکہ حصول تعلیم کے لئے روانہ کیا۔ کثرتِ ازدواج کی رسم اسلامی ممالک میں مفقود ہوتی جاتی ہے اور اب مسلمانوں کی عام رائے اس کے قطعی خلاف ہے۔ ترکی میں اُسے قانوناً بند کر دیا گیا ہے۔ ہندوستان میں یہ خال خال پائی

جاتی ہے مصر کے اعلیٰ طبقوں میں اس کا وجود نہیں۔ عربوں کے ہاں ابھی اس کی کمی ہے۔ پردے کا دقیانوسی دستور کم ہو رہا ہے۔ ترکی عورتیں حرم سے باہر نکل آئی ہیں۔ ایرانی عورتیں برقع اتار رہی ہیں۔ ہندوستان میں بھی بعض مسلمان عورتیں چاردیواری سے باہر نکل آئی ہیں۔ اور بعض مسلمان عورتوں نے تعلیمی اور ڈاکٹری اور اخباری کاموں میں حصہ لینا بھی شروع کر دیا ہے۔ اخلاق و آداب بھی تعلیم سے جلا پا رہے ہیں اور مشنری تک مانتے ہیں کہ اب مسلمانوں میں وہ پہلا سا تعصب اور بے مہری نہیں رہی۔ سیاسیات میں اسٹینڈرڈ مٹ رہا ہے اور جمہوریت اس کی جگہ لے رہی ہے۔ ترکی اب ایک جمہوری حکومت ہے۔ اور ایران اور افغانستان میں بھی جہاں ہنوز بادشاہوں کی حکومت ہے بادشاہ عوام کی رائے کا پابند اور اس کا وقت بہبود خلائق کے لیئے وقف ہے۔ قومیت کی روح ملک ملک میں سرایت کر گئی ہے۔ ایک وسیع اسلامی سلطنت کے بجائے اب اسلامی حکومتوں کا ایک سلسلہ قایم کرنے کا خیال پیدا ہو گیا ہے جو ایک دوسرے سے متحد اور آڑے وقت میں ایک دوسرے کی معاون ہوں۔ "کل اسلامی تحریک" کا زور اب باقی نہیں رہا۔ قومی آزادی کے جذبات اور جداگانہ قومیت کی تحریک اب اسلامی ممالک میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک موجزن ہے۔ جہاں مسلمان نہیں ہیں وہاں وہ غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات بڑھا رہے ہیں۔ (جنگ کے بعد شمالی افریقہ کے تین لاکھ مسلمان حصول معاش کی غرض سے فرانس میں جا مقیم ہوئے ہیں) جہاں وہ آزاد ہیں وہاں وہ غیر مسلموں کو اپنے مانند حقوق دے رہے ہیں۔

تجارت اور صنعت و حرفت کی طرف مسلمان متوجہ ہو رہے ہیں۔ اسلامی ملکوں میں ذرائع آمد و رفت میں سہولتیں پیدا ہو رہی ہیں۔ اسلامی کالجوں اور سکولوں کے علاوہ اب مسلمان اسلامی بنک کھولنے کی بھی فکر کر رہے ہیں۔

لیکن مذہب کے معاملے میں مسلمانوں کی بیداری حیرت انگیز ہے۔ یہ درست ہے کہ مغربی تعلیم و تہذیب کے اثر سے اس صدی میں بعض تعلیم یافتہ مسلمانوں کو دہریہ پن اور لامذہبی کا گھن لگ گیا ہے۔ وہ مادی باتوں میں منہمک ہو گئے ہیں۔ انہیں مذہبی فرائض کی چنداں پروا نہیں رہی وہ مغرب کی عیش و عشرت کا شکار ہوتے جاتے ہیں مسجدوں میں نمازیوں کی تعداد بہت کم ہو گئی ہے۔ مذہبی رسوم کی پابندی کو بہت سے لوگ اپنے لیئے ننگ و عار سمجھنے لگ گئے ہیں۔ یہ باتیں ایک حد تک ناقابل گریز تھیں۔ جدید تعلیم نے جس طرح یورپ کو مذہب سے بیزار کر دیا ہے۔ اس طرح اس کے مشرقی تلامذہ کو بھی مذہب سے کسی قدر علیحدہ کر دیا ہے۔ لیکن مغربی تعلیم کی آمد سے پہلے بھی سوائے اس کے کہ مسلمان صدیوں سے اوروں سے الگ ہو کر اپنی جہالت و توہمات میں ڈوبے ہوئے تھے مذہبیت کی کوئی اور نشانی ان میں باقی نہ رہی تھی۔ اس سے بہتر تھا کہ وہ ترقی یافتہ لوگوں سے ملیں، اُن کی برائیاں سیکھ لیں

تو ان سے زندگی کے کچھ مفید سبق بھی لے لیں۔ اپنی حالت سے بیزار ہوں اپنی غفلت سے بیدار ہوں، دیکھیں کہ ہم کیا سے کیا ہوگئے ہیں۔ اسلام کا پیغام کیا تھا اور ہم اُسے اب کیا سمجھ رہے ہیں؟

جدید تعلیم اور مغربی تمدن کے اثر سے مسلمانوں میں لا مذہبی بڑھ گئی لیکن اسی سے اُن میں اپنے مذہب پر نئی روشنی ڈالنے اور اسی طرح اُسے نئی روشنی سے بچانے کی تحریک بھی پیدا ہوئی۔ سر سید احمد خاں نے ہندوستان میں اور محمد عبدہ نے مصر میں قرآن مجید کی ایک عقلی تفسیر شایع کی۔ ہندی امیر علی اور مصری محمد بدر نے اسلام کو اک نئے انداز میں پیش کر کے کہا کہ یہی وہ قدیم اسلام ہے جو جدید ترین ضروریات کا کفیل بھی ہو سکتا ہے۔ ہندوستان میں فرقہ احمدیہ نے دعنکے اس دعویٰ کو کہ اُن کا روحانی رہنما مسیح موعود ہے بہت سے مسلمانوں نے بدعت اور کفر کہا) اکثر باتوں میں اسلامی عقاید کو حشو و زوائد سے پاک کر کے اسلام کو لا مذہب مسلمانوں اور غیر مسلم نقادوں کے سامنے پیش کیا۔

اشاعت اسلام کے سلسلے میں انہوں نے انگلستان اور امریکہ میں مستقل طور پر کام شروع کر دیا اور انگریزی میں کتابیں اور رسائل شائع کئے۔ یہ فرقہ صوم وصلوٰۃ کا پابند ہے اور مذہبی رسوم کا ادا کرنا ضروری سمجھتا ہے اور اگرچہ اس کے بعض پیرو تنگ خیال ہیں لیکن بہت سے ایسے ہیں جو اسلام کو ایک عقلی نقطۂ نظر سے دیکھنے کے مدعی ہیں اور اس کے پیغام کو دنیا تک پہنچانے اور لوگوں میں پھیلانے کے لئے بے قرار نظر آتے ہیں۔

غرض ساری اسلامی دنیا میں ایک ہیجان برپا ہے پچیس کروڑ مسلمان بیدار ہو رہے ہیں وہ جنہوں نے کبھی مغرب کو علم و آزادی کا درس دیا تھا وہ جنہوں نے تیرہ صدیاں ہوئیں ایک تاریک ساعت میں تہذیب و تمدن کے چراغ روشن کئے تھے جن کا مذہب سادگی و صداقت جنکا اخلاق انکسار و شجاعت اور جن کی معاشرت عدل و مساوات تھی وہ صدیوں سو کر جہالت میں رہ کر ٹھوکریں کھا کر اب اُٹھے ہیں اپنے آپ کو دیکھ رہے ہیں اپنے مذہب کو دیکھ رہے ہیں اور اہل دنیا کو تعجب ہے کہ کمر بستہ بھی ہوگئے ہیں کام بھی کر رہے ہیں اور قدرت کے ہاتھوں انعام بھی پا رہے ہیں! اسلام جس نے کبھی غیر متحد لوگوں کو الفت و اتحاد کی تعلیم دی جو عقل و آزادی کے خیالات پر مبنی ہے جس کا سرا ادھر مشرق سے ملا ہے اُدھر مغرب سے۔ کیا وہ جنگجو قوموں کو پھر صلح کا راز بتائے گا کیا وہ جسمانی اور روحانی بندشوں سے پھر غلاموں کو آزاد کریگا۔ کیا وہ اپنی اخوت و رواداری کا سبق دیکر دنیا کو موجودہ قومی و نسلی امتیاز کے تصادم سے بچائے گا؟ وہ جو مذہب کو خدا کی آواز سمجھ کر سنتے ہیں، یقین رکھتے ہیں کہ ایسا ہونے والا ہے اور ہو رہا ہے! حقیقی اسلام تعصب اور تلوار کا مذہب نہیں۔ عدل اور محبت کا مسلک ہے اُسے دوسرے مذاہب کے ساتھ لڑتے رہنا منظور نہیں بلکہ اُنکے ساتھ مل کر دنیا میں رہنا اور خلق خدا کی اصلاح و خدمت کرنا مقصود ہے اسلام نے صدیاں ہوئیں یہ پیغام دنیا کو دیا تھا کہ "مشرق و مغرب دونوں خدا کے ہوئے" اور "فساد خدا کو مرغوب نہیں" اور "جو لوگ خدا پر یقین رکھتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم دین و دنیا دونوں میں سرخرو ہونگے"

بشیر احمد

تجلّیات

ایسا بھی کوئی لمحہ ہو شام و پگاہ میں
وحشت ہو سازِ عیش سے، لذّت ہو آہ میں

تاریک تر ہے روح جو تو جلوہ گر نہیں
یُوں تو ہزار جلوے ہیں دامِ نگاہ میں

تیرے بغیر رنگِ سحر بھی سیاہ ہے
تُو ہو تو آفتاب ہے شامِ سیاہ میں

ہیں میرے سوز سے تری رعنائیاں فزوں
مَیں بھی ہوں ایک شمع تری جلوہ گاہ میں

مقصودِ زندگی ہے فقط تیری آرزو
اب کوئی میکدے میں ہو یا خانقاہ میں

اس رند پر ہزار عبادت نثار ہو
حاصل ہے جس کو قُرب تری بارگاہ میں

وہ کاروانِ ناز تو کوسوں نکل گیا
گُم شیخ و برہمن ہیں مگر گردِ راہ میں

آئینہ دارِ حُسن ہیں حیرانیاں مری
آئینہ بن گیا ہُوں تری جلوہ گاہ میں

ہر چند جانتا ہُوں فریبِ نگاہ ہے
میں پھر بھی مُبتلا ہُوں فریبِ نگاہ میں

گُلہائے نوبہار میں ہے کس کا رنگ و بو؟
کس کا فروغِ حسن ہے خورشید و ماہ میں؟

لذّت اگر نہیں ہے عبادت میں زاہدو!
کُھل جاؤ پھر کہ کچھ تو ہے لذت گناہ میں

اُس کی تباہیوں پہ مری راحتیں نثار
جس لب پہ تیرا ذکر تھا حال تباہ میں

سجدے کئے حضور کو معبُود جان کر
کافر تو ہُوں ضرور مگر کس گناہ میں

اُن کے تبسمات قیامت ہیں اے اثر
سو سو تبسمات ہیں جن کی نگاہ میں

اثر صہبائی

گدھ سے سیکھا

جنگل میں مردہ جانور کی لاش گدھ کھا رہے تھے۔ دو چار لاش کو نوچتے تھے دو چار دور کھڑے تھے جو پیٹ بھر چکے تھے۔ دو چار قریب کے درختوں پر بیٹھے تھے دو چار آسمان سے سن سن کرتے اتر رہے تھے دو چار آس پاس اڑتے پھرتے تھے۔

یہ گدھ کیسی بری شکل کے ہیں ان کی گردن کیسی بے ڈھنگی ہے۔ ان کی صورت دیکھ کر نفرت ہوتی ہے مردار خوار ہیں ان کی زندگی، اور زندگی کی خوراک قدرت نے کیسی خراب بنائی ہے۔

انسان بھی مردار گوشت کھانے لگے تو اپنے ہم جنس لوگوں میں حقیر و ذلیل ہو جاتا ہے۔ یہ جانور خبر نہیں پھل کھانے والے خوبصورت پرندوں کی نظر میں کیسا سمجھا جاتا ہوگا۔

کہتے ہیں چیل کی اور گدھ کی عمر بھی زیادہ ہوتی ہے اور آنکھیں بھی بہت تیز ہوتی ہیں۔ میلوں دور سے چھوٹی چھوٹی چیزیں ان کو نظر آ جاتی ہیں شاید یہ گوشت کھانے کا اثر ہو یا شاید مردار گوشت میں آنکھوں کا نور بڑھانے کی تاثیر ہو۔

یورپ والے گدھ کو مبارک جانور سمجھتے ہونگے جب ہی تو بعض حکومتوں نے عقاب کی تصویر کو سلطنت کا نشان بنایا ہے۔ اور قیصر جرمنی کے تو تاج پر عقاب (گدھ) کی صورت بنی ہوئی ہے۔ مقصد یہ ہوگا کہ اس تاج کو اور حکومت کو عقاب کی سی طویل زندگی نصیب ہو۔ اور عقاب جیسی تیز آنکھیں میسّر ہوں تاکہ وہ دور دور کے مردار کو دیکھ سکیں اور دوڑ کر وہاں جا سکیں۔

ہوائی جہاز بھی اہل یورپ نے اس بلند اڑنے والے جانور کو دیکھ کر بنائے ہیں اور جب ہوائی جہاز اونچا ہو جاتا ہے تو دور سے ایک چیل یا عقاب معلوم ہوتا ہے۔

غالباً گدھ بہت صابر و قانع جانور ہے کیونکہ مردار گوشت کے انتظار میں مدتوں کچھ نہیں کھاتا۔ اور چونکہ مردار گوشت روز روز میسّر نہیں آتا اس لئے یہ اپنی بھوک پر صبر کی پٹی باندھے اڑتا رہتا ہے۔

سڑا ہوا گوشت معدہ کے لئے زہر سمجھا جاتا ہے۔ مگر گدھ اکثر سڑا ہوا گوشت کھاتا ہے۔ اور اسی خراب گوشت سے اسکی عمر بڑھتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ قدرت نے ہر چیز کو بعض کے لئے اچھا بنایا ہے اور بعض کے لئے برا بنایا ہے۔ سڑا ہوا گوشت ہمارے لئے مضر ہے۔ مگر عقاب اور چیل کوّوں اور غلیظ کیڑوں کی غذا ہے۔

آج دیکھا ایک بڑا گدھ پروں کو سمیٹ کر اور سر نیچے کی طرف کرکے تیر کی طرح زمین کی طرف آرہا تھا اسکو کندے جوڑ کر اترنا اور آنا کہتے ہیں۔ جب وہ زمین کے قریب آگیا تو اس نے پر کھول دیئے اور ہوائی جہاز کی طرح چاروں طرف چکر کاٹنے لگا وہ کسی مردار کی طرف تاک لگا رہا ہوگا۔

اس وقت اس گدھ کی شکل بہت شاندار معلوم ہوتی تھی اور وہ ہوا کا تاجدار اور ہوا کا مالک و مختار بنا ہوا تھا میں نے چاہا کہ اس گدھ سے کچھ سبق لوں تو دل نے کہا۔ یہ مردار کھاتا ہے بُرا کرتا ہے۔ تو مردار نہ کھا اور گدھ کی اس بُرائی سے سبق لے۔ مگر گدھ کی زندگی کا بڑا سبق یہ ہے کہ وہ زمین کی گندگی اور بدبو کو اپنے معدہ میں رکھ لیتا ہے اور بے شمار نازک صنع مخلوق آلہی کو گندگی اور بدبُو کو بچا لیتا ہے۔ اگر وہ مردار جانوروں کی لاشوں کو صاف نہ کردیا کرے تو ساری زمین بدبُو سے خراب ہو جائے۔

پس اس طرح جو انسان تجھ کو کسی بُرے کام میں مصروف نظر آتا ہے تو یہ خیال کر کہ شاید اس کی برائی میں بھی قدرت نے کوئی حکمت پوشیدہ رکھی ہو۔ لہذا تو گدھ سے سیکھ کر دوسروں کے عیب نہ دیکھا کر بلکہ اپنے تصور کو اچھی حکمت کی تلاش میں لگا دیا کر۔ تاکہ تیرا یہ کام رفتہ رفتہ تجھ کو ہر برائی سے خوبی کی حکمت نکالنے کا علم سکھا دے جو کامل انسانوں کی شان ہے

حسن نظامی

غزل

تو ہے تو پھر ہمیں ہوسِ دورِ جام کیا	اے چشمِ مست کیفِ مئے لعل فام کیا؟
دینے لگی وہ نرگسِ مستانہ پھر صلا	لو ہم چلے حدیثِ حلال و حرام کیا
ہر ذرہ چشمِ حسنِ نظر باز ہے یہاں	از فرش تا بہ عرش بچھا ہے یہ دام کیا
آئی بہار گل نے قبا چاک چاک کی	اہل جنوں کو کاوشِ ناموس و نام کیا

سودائے انتظار نہ اس سر سے جا سکا
کیا جانوں میں کہ صبح ہے کیا اور شام کیا

غزل

ہر ذرّہ پرستش کے قابل نظر آتا ہے ‏ ‏ ہر قطرہ سمندر کا حامل نظر آتا ہے

اب وصل ہو یا فرقت دلشاد نظر آنا ‏ ‏ اب حوصلۂ الفت کامل نظر آتا ہے

مجبور ہوں الفت کا لپکا نہیں چھٹ سکتا ‏ ‏ معذور ہوں گھٹی میں شامل نظر آتا ہے

دل ایک زمانے سے مفتوں ہے، مگر کس کا ‏ ‏ جو ایک زمانے کا قاتل نظر آتا ہے

جو ظالم وجابر ہو منصف نہیں ہو سکتا ‏ ‏ افسوس! ترا دعوے باطل نظر آتا ہے

یا تو فلکِ ظالم سفلہ ہے، کمینہ ہے ‏ ‏ یا تیری شریعت پر عامل نظر آتا ہے

یہ راز نہیں کھلتا میں تجھ سے جدا کیوں ہوں ‏ ‏ جو قطرہ ہے، دریا سے واصل نظر آتا ہے

بس اب کوئی ساعت میں لیلیٰ بھی نظر آئی ‏ ‏ ناقہ نظر آتا ہے محمل نظر آتا ہے

اجسام زمیں رنگیں، اجرام بریں رنگیں ‏ ‏ عالم کسی گلرو کی محفل نظر آتا ہے

درویشِ دو عالم کی خیرات سے کیا خوش ہو ‏ ‏ درویش فقط تیرا سائل نظر آتا ہے

ہم شیخ سے منزل کا کیا خاک پتا پوچھیں ‏ ‏ خود شیخ ہی گمراہِ منزل نظر آتا ہے

انصاف کی نظروں سے دیکھو تو خود انساں ہی ‏ ‏ انساں کی ترقی میں حائل نظر آتا ہے

آزاد کبھی پہلے آزاد ہو ممکن ہے

اب تو ترے بندوں میں داخل نظر آتا ہے

حکیم آزاد انصاری

دِل اَور زندگی

جیسا دل ہوگا ویسی ہی زندگی! باطن ہر ہر لمحہ ظاہر ہوا جاتا ہے۔ کوئی شے جلوہ دکھائے بغیر نہیں رہتی، وہ جو مستور ہے صرف تھوڑی مدت کے لئے مستور رہے پختہ ہو کر وہ رونما ہو جاتا ہے! بیج درخت۔ پھول اور پھل کائنات کے چار درجے ہیں۔ ہر انسان کی حالتِ قلبی سے اُسکے حالات زندگی ترتیب پاتے ہیں۔ اُس کے خیالات سے اعمال کے پھول نکلتے ہیں اور پھر یہ پھول سیرت اور مقدر کا پھل لاتے ہیں۔ زندگی کا نہاں خانہ ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔ اور اس پر دنیائے ہست کی روشنی پڑتی ہے! اور خیالات جو دل میں نشو و نما پاتے ہیں انجام کار اپنے تئیں لفظوں عملوں اور مکمل باتوں میں ظاہر کرتے رہتے ہیں۔

جیسے ندی اپنے چھپے ہوئے سرچشمہ سے پھوٹ نکلتی ہے اور اسی طرح انسان کی زندگی اُسکے دل کے مستور گوشوں سے رونما ہوتی ہے جو کچھ انسان ہے اور جو کچھ وہ کرتا ہے یہ سب وہیں سے آتا ہے، جو کچھ وہ ہوگا اور کریگا سب وہیں سے آئے گا!

غم اور خوشی۔ درد اور شادمانی۔ امید اور خوف۔ نفرت او محبت۔ جہالت اور شائستگی دل کے سوا کہیں نہیں یہ فقط ذہنی کیفیات ہیں! انسان اپنے دل کا امین اور اپنے نفس کا نگہبان اور اپنے حصار زندگی کا تنہا دربان ہے! اس لحاظ سے وہ ہوشیار یا غافل ہو سکتا ہے وہ اپنے دل کے ساتھ زیادہ اعتنا کر سکتا ہے اپنے نفس کی زیادہ دقت کے ساتھ نگہداری اور تزکیہ کر سکتا ہے اور اپنے تئیں ناراست خیالات کے سوچنے سے بچا سکتا ہے۔ یہی ہے شائستگی اور برکت کا رستہ! اس کے برعکس وہ زیادہ عیش و بے اعتنائی کے ساتھ زندگی گذار سکتا ہے کہ اپنی حیاتِ دنیوی کی صحیح ترتیب و تہذیب سے روگردانی کرے۔ اور یہی ہے خود فریبی اور زحمت کی راہ۔

جو شخص یہ سمجھ لے کہ زندگی قطعی طور پر نفس سے پیدا ہوتی ہے برکت اُسکے لئے اپنی آغوش کھول دیتی ہے کیونکہ پھر اس پر یہ امر روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے نفس پر کامل اختیار رکھتا ہے اور یہ قوت بھی کہ وہ اپنے نفس کو منتہائے خیال کے سانچے میں ڈھال سکے اور وہ ضبط و استقلال کے ساتھ خیالات و اعمال کے ان رستوں پر گامزن ہوتا ہے جو تمام تر خود صداقت پر مبنی ہیں۔ زندگی اس کی نگاہوں میں حسین اور مقدس ہو جاتی ہے اور وہ اس دن کے قریب تر ہو جاتا ہے جب کدورت اور ابتری اور زحمت اُسکے سامنے ہتھیار ڈال دیتی ہیں اور یہ اس لئے کہ اک ایسا آدمی جو اپنی ان تھک کوششوں کے ساتھ اپنے حرم خانۂ دل کی نگہداشت کرتا ہے ممکن نہیں کہ وہ بہت جلد آزادی اور شائستگی اور حقیقی امن کو نہ پالے!!

عالمِ نزع

ایک کیڑا ہے کچھ نہیں انساں — گرچہ ہو سام و رستم و بہرام
قابلِ دید ہے وہ نظارہ — آئے جس وقت موت کا پیغام
توبہ توبہ لبِ مسلماں پر — اور زبانِ ہنود پر ہے "رام"
ڈاکٹر اور طبیب گھبرائیں — کوئی کچھ کر سکے نہ روک نہ تھام
ہاتھ پاؤں میں اک تشنج سا — سلب ہو طاقتِ قرار و قیام
نبضیں چھٹ جائیں ہوش اُڑ جائیں — اور زباں میں رہے نہ تابِ کلام
سانس رُک جائے آنکھیں پتھرائیں — ہو چکے آخری پیام و سلام
جسم اور جان میں جدائی ہو — ملک الموت کر چکے سب کام
سننے والوں کے دل پگھل جائیں — ایک برپا ہو ماتم و کہرام
دارِ دنیا سے کوچ کرنے پر — ہاتھ پلے رہے نہ ایک چھدام
جاہ و منصب سبھی دھرا رہ جائے — مال، اعمال بن نہ آئے کام

وارثوں میں ہو سیم و زر تقسیم — جیسے دربار میں بٹے انعام
یہ زمینیں یہ جائدادیں ہیں — نقد اتنا ہے اس قدر ہے وام
لینے دینے کے سارے لکھے ہوں — کوڑی کوڑی کا ہو حساب تمام

دیر تھی آنکھ کے جھپکنے کی — کارخانہ نیا، نیا ہے نظام
رنگِ محفل نیا نئے ساماں — ساقی و مطرب و مئے گلفام
وہ امنگیں وہ ولولے وہ جوش — وہ شب و روز فکرِ نیل مرام
آسمان و زمین کا دورِ نیا — وہ رہا ہے نہ یہ رہے گا مدام
ہے ہر اک چیز آنی و فانی — اور باقی ہے بس خدا کا نام

مظہر

کانفیوشس

ایک مورخ لکھتا ہے کہ یہ بزرگ ۵۵۱ء قبل از مسیح پیدا ہوا تھا (یعنی بدھ بھگوان سے سات سال پہلے) اور ۷۲ سال کی عمر میں فوت ہوا۔ اُس کے حسب ونسب کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ چوہلی نام جو مملکت لُو کا ایک شہر تھا اس کے زادبوم ہونے کا فخر رکھتا ہے۔ قدیم شہر تو اب موجود نہیں اس کے بجائے اب شہر شٹنگ ہے اس کے زمانہ میں بادشاہوں کی قوت رو بہ زوال تھی، کیونکہ جاگیردار لوگ زور پکڑ گئے تھے اور رعایا کی حالت بہت خراب تھی، نہ زمانہ طفولیت سے اُسے خیال تھا کہ اپنی قوم کی اصلاح کرے۔ اس کی زندگی خادمی سے شروع ہوتی ہے، عرصہ تک وہ خدمت گذاری کرتا رہا۔ انجام کو مخدوم بنایا گیا۔ اسکی ذہنی طاقتیں زبردست تھیں تین ہزار کے قریب اسکے شاگرد بنے۔ ۳۲ سال کی عمر میں اس نے شاہی کتب خانہ کا مطالعہ کیا، اور زمانہ ماضی کے حالات سے کامل آگہی حاصل کی۔ حکومت وقت نے باون سال کی عمر میں اُسے مجسٹریٹ مقرر کیا۔ اُس کے انتظام سے جرائم کم ہوئے اور اس کے علم وفضل سے ملک کو بہت فائدہ پہنچتا رہا۔ انتظام ملک کے ساتھ ساتھ وہ وعظ کہتا رہتا تھا اُس کی کامیابی نے حاسد پیدا کر دیئے اس کے خلاف سازشیں شروع ہوگئیں۔ آخر دق ہو کر اس نے ملازمت سرکاری ترک کر دی، اور رمتا سادھو بن کر وہ سارے ملک میں گھومتا رہا۔ تہذیب اور اخلاق کے وعظ کہتا پھرا۔

اس مصلح قوم نے عقبیٰ کی جانب توجہ نہیں کی۔ زہد وتقویٰ کا قائل نہ تھا۔ اسکی توجہ ہمیشہ دنیوی امور کی طرف رہی۔ ترک دنیا کی اس نے کبھی حمایت نہیں کی، انصاف اور حق کا حامی تھا۔ صفائی قلب اطاعت والدین۔ نیک ہمسائیگی کی تلقین کرتا تھا۔ تاریخی یادگاروں کے تحفظ میں ہمیشہ کوشاں رہا۔ اور قومی نظموں کے مجموعے تیار کرتا رہا۔

تسین خاندان شاہانِ چین کے سلسلہ کا پہلا تاجدار اس مصلح قوم کی تصانیف کے تلف کرنے میں کوشاں رہا لیکن وہ کامیاب نہ ہوا۔ اس تاجدار کے جانشین اس کی تصانیف کے اجتماع اور تحفظ میں سعی کرتے رہے۔

اس بزرگ کی اخلاقی تعلیم کا چینیوں پر بہت اچھا اثر پڑا ہے۔ روحانی تعلیم سے اسکو سروکار نہ تھا۔ راستی اس کی تعلیم کا لب لباب تھی۔ صدیوں سے باشندگانِ چین پر اس کا اثر چلا آتا ہے۔

اس کے نصائح اخلاق سکھاتے ہیں جن کی تفصیل اس کی تصانیف میں پڑھ سکتے ہیں شاید چین میں اُس کے نصائح شروع میں تعجب سے سنے جاتے ہوں۔ ہند کا لٹریچر تو اُن سے مالا مال ہے۔

اس کے دو قول ہم کو دلچسپ معلوم ہوئے جو ذیل میں ہم درج کرتے ہیں۔

"لڑکیوں اور ملازموں کو خوش رکھنا مشکل کام ہے۔ اگر ہم ان سے محبت رکھیں تو وہ خود سر ہو جاتے ہیں۔ اگر ان کو منہ نہ لگائیں تو وہ ناراض رہتے ہیں"

"علم بدون فکر کے بے سود ہے۔ اور فکر بدون علم کے خطرناک ہے"

ایک زمانہ تھا کہ چین میں کان فیوشس۔ لاٹوز اور بدھ دھرموں میں رقابت تھی اور باہم تنازعے ہوتے رہتے تھے لیکن رفتہ رفتہ تینوں دھرم رائج اور قایم ہو گئے۔ چند سال ہوئے ایک مقدمہ برہما میں پیش ہوا اس میں یہ بحث تھی کہ مورث متوفی کا مذہب کیا تھا۔ سیاحوں کے سفرنامے پیش ہوئے تحقیقات ہوئی تو یہ طرفہ ماجرا معلوم ہوا کہ بعض اشخاص جب اُن سے مذہب دریافت کیجیے تو اپنے تئیں تینوں مذہبوں کے پیرو بیان کرتے ہیں۔ ہائی کورٹ نے فیصلہ ہوا کہ متوفی تینوں مذہب رکھتا تھا۔ یہ فیصلہ انڈین کیسز میں شائع ہو چکا ہے اور نہایت دلچسپ ہے

شمیم

بچے وہ جیتے جاگتے لعل و جواہر ہیں جو ابھی ابھی آسمان سے گرے ہیں۔

بچپن آدمی کو نمایاں کرتا ہے۔ جیسے صبح دن کو

بچوں کی بھرمار شادی کا مزیدار تحفہ ہے۔

گلچیں

دشمن مجھے چین نہیں لینے دیتے

دشمن مجھے چین نہیں لینے دیتے۔ اے دوست آ اور مجھے میرے دشمنوں سے بچا!

میرے دکھ درد میں کوئی ہم درد نہیں، میرے غم و اندوہ کا کوئی غمگسار نہیں، میری تکلیفوں اور مصیبتوں میں میرا کوئی ساتھی کوئی مددگار نہیں جس کی موجودگی سے مجھے تسلی اور جس کی مشورت سے مجھے طمانیت ہو!

میں جب سے تیری دنیا میں آیا تیری نعمتوں کا انبار اس طرح میرے گردوپیش پھیلا پڑا تھا جیسے اک جنگلی چنبیلی کے پودے کے نیچے چاروں طرف پھول ہی پھول بکھرے ہوئے ہوں ——— چاندی سونے کی چکاچوند میرے مداحوں کی آنکھیں چندھیائے دیتی تھی۔ رفیع الشان مکان اور انکے سازو سامان معاشرتی غربت و عسرت پر خندہ زن تھے عقل و علم اور فن و ہنر کی گھٹائیں میرے دل و دماغ کے خرمن پر نام و نمود کی شبریں بوندیں ٹپکاتی تھیں۔ میں سمجھتا تھا کہ ان کے ہوتے دنیا میں مجھے کسی شے کی کمی نہیں کسی حلیف کی ضرورت نہیں کسی مصیبت کی فکر نہیں جو چاہوں حاضر جسے بلاؤں موجود۔ دنیا بھر کے آرام میرے اور لوگوں کے جھگڑوں جھمیلوں سے آزادی مجھے اور پھر جسم کا امن جان کی امان دل کی خوشی، دماغ کی مسرتیں سب میری ہیں! ——— لیکن انہیں رنگ رلیوں میں سے میں نہیں جانتا کس طرح جیسے برسات کے بعد بے شمار کیڑے زمین سے نکل پڑیں۔ کچھ اسی طرح میں جوں جوں ہوش سنبھالتا گیا میرے فکر و تشویش کے سامان پیدا ہوتے گئے*

کسی نے مجھے دکھ نہ دیا۔ کسی نے مجھ پر ظلم نہیں کیا کوئی غاصب نہیں، کوئی سارق نہیں، بلکہ سبھی مجھے میری خوش نصیبیوں پر مبارکباد دیتے ہیں۔ لیکن اس پر بھی مجھے کچھ بے چینی سی ہے تاریک بادل میری ہستی پر چھائے ہوئے ہیں اور ان میں اضطراب کی بجلیاں جابجا کوندتی ہیں! اور یہ اس لئے کہ دولت سے کاہلی پیدا ہوئی اور عیش و عشرت سے غفلت، اچھے لباس اور اچھی معاشرت نے نازک اور نکما بنا دیا۔ مجلسی تعریف اور باہمی خوشامد نے جتنے وصف تعریف کے قابل تھے چھین لئے، ادھر علمیت نے یقین دلایا کہ مزید تحصیل بیکار ہے عقل نے وجدان کی آنکھوں پر پٹی باندھی اوروں کی نقل نے اپنی اصل کو جڑ سے اکھیڑ کر رکھ دیا! پھر کیا تھا نعمتیں مصیبتیں بن گئیں، راحتیں کلفتیں ہوگئیں جہاں بیسیوں احباب نظر آتے تھے وہاں دشمن ہی دشمن دکھائی دینے لگے

یہ دشمن جو میرے جی ہی میں موجود ہیں مجھے چین نہیں لینے دیتے اے دوست آ اور مجھے ان سے رہائی دلا۔

ب ا

چینی دیوتا

گریٹ منچورین ریلوے کے زمانۂ تعمیر میں جو سرکاری طور پر "ویسٹرن چائنا ریلوے" کے نام سے موسوم کی جاتی ہے میں جنوبی مشرقی حصہ میں مامور تھا، جسے صدر مقام "ہان ٹاؤ" سے براہ راست تعلق تھا، ہان ٹاؤ میں دفاتر، مرمت و درستی کی دکانیں اور انجن کے سائبان موجود تھے، اور اسباب تعمیر، سامان رسد، ذخیرۂ خوراک اور انسانی ضروریات کی وہ تمام اشیا جمع کی گئی تھیں جو ایک ایسی خطرناک مہم کیلئے ازبس ضروری ہیں، گو میں ایک تجربہ کار انجنیر ہوں مگر مجھے اعتراف ہے کہ جب میں اپنے فرائض کی انجام دہی کے بعد خستہ ہوتا تھا اس وقت کسی انسان کی صحبت ایک بیش بہا نعمت تھی جو میری کلفت اور دماغی اذیت کو دور کر دیتی تھی، اگرچہ وہ ہوٹل کے مالک کی خوردسال، شرمگین بچی ہی کیوں نہ ہو اسکی موجودگی میرے تفکرات اور پریشانیوں کو دور کرنے کا بہترین ذریعہ ثابت ہوتی تھی۔

کچھ عرصہ بعد میں سرنگ لگانے کے اوزاروں کا جائزہ لینے کیلئے ٹیما کاؤ بھیج دیا گیا جو اس زمانہ میں ایک غیر آباد مقام تھا، یہاں چند چھوٹے بدنما اور بدقطع لکڑی کے مکانات کے سوا کچھ نہ تھا لیکن بہت جلد ساز و سامان سے لدے ہوئے خچروں کی گڑبڑ، اور خوش طبع چینیوں کی زندہ دلی کی وجہ سے ایک قسم کی چہل پہل نظر آنے لگی ٹیما کاؤ ایک وادی میں واقع ہے جسے اونچی اونچی سنگلاخ چٹانیں اطراف سے گھیرے ہوئے ہیں، ایک نہایت طویل دیودار کا جنگل اس گاؤں کے قریب ہے جو دور سے ایک صف بستہ فوج کے مانند نظر آتا ہے۔ اس جنگل کے کچھ حصے عجیب بے ہنگم طور پر ادھر اُدھر پھیلے ہوئے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ جنگل رفتہ رفتہ ترقی کرکے پورے شہر پر قبضہ کرنا چاہتا ہے، میں روزانہ صبح کو کامل اطمینان کی حالت میں اٹھ کر اس فوج کو دیکھا کرتا تھا جو بے حس و حرکت پڑی ہوئی تھی۔ اور لطف اندوز ہوا کرتا تھا۔

میری سکونت ٹیما کاؤ میں ایک لکڑی کی عمارت میں تھی جو دفعۃً ایک سرے سے شروع ہو کر نامکمل طور پر دوسرے سرے پر ختم ہو گئی تھی، نہ فن معماری کی کوئی خصوصیت اس سے ظاہر ہوتی تھی اور نہ آرائش و آسائش کے کوئی آثار اس میں پائے جاتے تھے، یہ عمارت دور دراز کا سفر کرنیوالوں کے لئے مخصوص تھی، تاکہ مسافر یہاں ٹھیر کر کچھ دیر آرام کرلیں اور پھر تازہ دم ہو کر اپنے سفر کو جاری کریں۔ یہ عمارت ہوٹل کا کام بھی دیتی تھی، جہاں انجنیر ٹھیکہ دار وغیرہ جو پٹڑی کے معائنہ کے لئے آتے تھے، سرکاری کام کے اختتام تک ٹھیرتے تھے، ایک سرے پر ایک بڑا ہال طعام گاہ کا کام دیتا تھا یہاں ہر قسم کے لوگ جو ریلوے کی تعمیر کے سلسلہ میں ملازم تھے کھانے کے وقت جمع ہوتے تھے اور شام کو تفریح طبع کے لئے،

میں ایک دن کھانے کے انتظار میں بیٹھا ہوا تھا اور دل ہی دل میں کہہ رہا تھا کہ ایک مشرقی باورچی کے انتظام میں بڑی تاخیر ہوتی ہے اور پھر وقت گذارنے کے لئے اخبار کا ایک پرانا پرچہ بادلِ ناخواستہ دیکھنا شروع کیا تھا کہ اتنے میں میری نیم وا آنکھوں نے ایک نوجوان چینی کو ہال میں داخل ہوتے دیکھا جو دبکتا ہوا میری طرف بڑھ رہا تھا میں نے بہ نگاہ غور اس کی طرف پلٹ کر دیکھا اس کی داڑھی اور مونچھیں منڈی ہوئی تھیں اور وہ سر سے پاؤں تک اودے ریشمی سوٹ میں ملبوس اور مخملی جوتے پہنے تھا، یقیناً وہ ایک خوشحال چینی تھا۔ ایک ہلکے سے تبسم کی لہر ناک سے شروع ہو کر آہستہ آہستہ منہ، گال، آنکھ اور پھر تمام چہرہ پر دوڑ گئی میں نے تعجب کے ساتھ اسکی طرف دیکھا، اس کے پاس ایک بھاری ریشمی بنڈل نظر آیا جسے وہ بہزار وقت اپنے ڈھیلے لباس کے اندر چھپائے ہوئے تھا اس نے متانت آمیز تبسم کے ساتھ جھک کر سلام کیا میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

اُس نے ہچکچاتے ہوئے کہا "جناب والا" میں لی ٹائے جنوبی ملک کا ایک سوداگر ہوں، مجھے معلوم ہوا ہے کہ جناب کو قدیم اور خوشنما چینی اشیا خریدنے کا شوق ہے، خدا آپ کے والدین پر رحمت نازل کرے کیا آپ میرا سامان معائنہ کرنے کی زحمت گوارا کریں گے؟

پھر جھک کر با ادب کھڑا ہوگیا، تبسم اسکے ہونٹوں پر کھیلتا نظر آیا، میں نے بھی خم ہو کر سلام کا جواب دیا اور کہا۔

"مسٹر لی ٹائے، تم سے مل کر مجھے بڑی خوشی حاصل ہوئی، تم سچ کہتے ہو میرا شوق بڑھا ہوا ہے مگر خریدنے کی استطاعت کم"

ناامیدی کی ہلکی سی جھلک اس کے چہرہ پر نظر آئی۔

اُس نے پرزور لہجہ میں کہا "لیکن اس بنڈل میں خوبصورت قدیم چینی اشیاء ہیں" پھر میری طرف معنی خیز نظروں سے دیکھ کر اور مسکرانے کی کوشش کر کے بالکل آہستہ سے کہا "ایک امیر کے ساتھ خوش معاملگی کی وجہ سے یہ اشیاء حاصل ہوئی ہیں ..... بہت نفیس قدیم چینی اشیاء ہیں ..... فو دیوتا ..... خوش نصیب بنانے والا دیوتا ..... جس معزز شخص کے گھر میں یہ ہونگے اُسکو شہرت اور دولتمندی کے انتہائی مدارج پر پہنچا دیں گے ..... بے حد ناموری ..... اور بڑی دولت حاصل ہوگی"

"لی ٹائے جو کچھ تم کہہ رہے ہو سچ ہے ..... لیکن اگر تمہارے دیوتاؤں کو وہ قوت حاصل ہے جو تم بیان کرتے ہو یعنی یہ بت اپنے مالک کو نامور اور مشہور بنانے کی طاقت رکھتے ہیں تو پھر تم جیسا عاقل و دانا شخص الگ کرنے پر کیوں آمادہ ہے۔

"لی ٹائے کے چہرہ سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ پہلے ہی سے اس سوال کے جواب کے لئے تیار ہو کر آیا تھا نہایت نرمی سے اُس نے ہاتھ ملتے ہوئے پرجوش لہجے میں ادب سے جھک کر کہا۔

"جناب والا! بیشک یہ ایک معقول سوال ہے اور لی ٹائے بھی اس کا بہت معقول جواب دیگا، آپ جانتے ہیں کہ میں ایک معمولی حیثیت کا آدمی ہوں، مجھے شہرت اور ناموری کی ضرورت نہیں ..... "

"اور نہ دولت کی"؛

اسکی طرف غور سے دیکھ کر میں ہنس دیا لیکن لی ٹائے نے بغیر کسی قسم کی شکستہ دلی و پست ہمتی کا اظہار کئے کہا "جناب والا! کیا آپ مجھے ان بتوں کے دکھانے کی اجازت دیں گے ..... یہاں نہیں ... بلکہ خلوت میں"

"یہاں کیوں نہیں؟"

میرے یہ پوچھتے ہی کچھ پریشان سا ہو کر کہنے لگا "جناب والا! عوام اس قابل نہیں ہیں کہ ان خوبصورت قدیم اشیا کو دیکھیں"

"ہاں اچھی بات ہے۔ میرے پیچھے چلے آؤ"

میں اپنے کمرہ کی طرف چلا اور وہ میرے پیچھے ادب کے ساتھ کچھ فاصلہ پر آرہا تھا، کمرہ میں داخل ہوتے ہی اسکی لمبی انگلیاں ریشمی بستہ کو تیزی سے کھولنے میں مشغول ہوئیں، اسکی لمبی لمبی انگلیوں کا اس تیزی و سرعت کے ساتھ بستہ کھولنا اور صفائی کے ساتھ اشیا کو ٹھیک کرنا مجھے بہت بھلا معلوم ہو رہا تھا آخر اس نے سب سے بڑے بستہ سے نہایت نفیس پتھر کی مورت کے پاؤں نکالے اور پھر رنگین مورتوں کو نکال کر تین قطاروں میں رکھا، پھر ایک دم چند قدم پیچھے ہٹا اور اس کے بعد دونوں دیوتاؤں کی طرف بڑھ کر بدن کو جھکا کر زاویہ کی شکل بنائی اور ایک سٹیج کے مینیجر کے مانند میرے تاثر کا اندازہ لگانا شروع کیا۔ اس مورت کے پاؤں بعینہٖ ان سفید سفید بادلوں کے مانند تھے جو فضائے نیلگوں پر بہتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اور پتھر کے پاؤں پر دیوتا عمدہ اور قیمتی پوشاک پہنے کھڑے ہوئے تھے پوشاک اس خوش اسلوبی کے ساتھ پہنائی گئی تھی کہ اصلی حسن کو دوبالا کر رہی تھی مورتیں سفید خاکی نیلی اور پتھر کے اصلی بادامی سرخ مخلوط رنگ کی تھیں یہ سب صنعت گری کا بہترین نمونہ تھیں صناع نے اس خوبی اور جانفشانی سے کام کیا تھا کہ چہرہ کا باریک سے باریک آتار چڑھاؤ اور لباس کی تہ صاف طور پر نظر آرہی تھی، کل نو مورتیں تھیں چھ مردوں کی اور تین عورتوں کی، سب سے بڑی جو بیچ میں تھی وہ ایک سفید بالوں والے بزرگ کی مورت تھی جس کی صورت سے تقدس و بزرگی اور ہمدردی و مآل اندیشی ظاہر ہو رہی تھی، اس قدر اعلیٰ درجہ کا کام کیا گیا تھا کہ اس ضعیف چہرہ کی باریک سے باریک شکن اور سفید و مقدس ریش کا ہر ایک بال، اور اس کی ہاتھوں کی انگلیوں کا نقشہ بہ آسانی نظر آتا تھا، اس مقدس ہستی کے دائیں طرف ایک ڈراؤنی شکل کا کبڑا کھڑا ہوا تھا جس کا چہرہ مصائب و آلام کی سختیوں سے داغدار تھا۔ دوسری طرف نصف آدمی اور نصف بکری کی ایک شکل تھی۔ جو عجیب مضحکہ خیز طور پر دبکی بیٹھی تھی اور بناوٹی ہنسی سے دانت پیس رہی تھی، ان کے پیچھے مختلف العمر مختلف لباس پہنے ہوئے آدمی تھے۔ مگر ان میں نقاشی کا کوئی خاص کمال نہ تھا، سب سے اونچی سطح پر تین حسین و جمیل پری پیکر نازنینیں بکمال عشوہ و انداز کھڑی ہوئی تھیں، ان کی ٹھوڑی اور گردن کا خوشنما نقشہ جو نصف سے زیادہ نقاب سے چھپ گیا تھا گلابی پتلے پتلے ہونٹوں کی دلفریبی۔ ان کی اٹھی ہوئی مخصوص چپٹی ناک، ان کی ترچھی نظریں، ان کی پیشانی کی خوشنما شکنیں

لمبے لمبے سیاہ بال اس قدر خوبصورتی سے بنائے گئے تھے کہ وہ اعلیٰ درجہ کی نقاشی وصناعی کا نمونہ اور کاریگری کی چابکدستی وکمالِ فن کا بیّن ثبوت تھے۔

ان مورتوں کے بنانے والے کا حسنِ صنعت دیکھنے میں مَیں اس قدر محو ہوگیا کہ مجھے دنیا ومافیہا کی خبر کچھ نہ رہی اور لی ٹائے کی موجودگی کا خیال مگر اس چالاک سوداگر نے ایک منٹ کے لئے بھی اپنی نگاہ میری طرف سے نہ ہٹائی بلکہ میرے استغراق سے خاطر خواہ نتیجہ نکال کر اُسے کامل اطمینان ہوگیا اور اپنے مقصد میں کامیاب ہونے کے خیال سے اس کا چہرہ تمتما اٹھا مگر وہ اسی طرح ہاتھ ملتا کھڑا رہا۔

میں نے ایکدم پوچھا "لی ٹائے یہ چیزیں تم نے کہاں سے خریدیں؟"

اس کے چہرہ پر ہوائیاں اڑنے لگیں، اور اس کی آواز سے دغابازی کی بو آنے لگی۔ اس نے رکتے رکتے کہا۔

"جناب والا! ایک ہی ایسا طریقہ ہے جس کے . . . ذریعہ سے یہ چیزیں حاصل ہوسکتی ہیں.... یعنی ایک چینی امیر کے ساتھ خوش معاملگی کا ذریعہ . . . . . . "

"اچھا لی ٹائے مجھے یہ چیزیں بہت پسند آئیں، کہو ان کی کیا قیمت ہے؟"

اندازِ محبت سے مسکرا کر اس نے تھوڑی دیر پس وپیش کیا اور اپنی صورت سے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ قیمت کا سوال اسکے دماغ میں اسوقت داخل نہ ہوا تھا مگر جب پوچھا گیا تو اُسے خیال آیا، آخر کار اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس نے فروخت کرنے کا تہیّہ کرلیا ہے

"جناب والا! کیا آپ اسکی قیمت چالیس روبل[1] دیں گے؟"

"لی ٹائے اس قسم کے خیالِ باطل کو دل میں جگہ نہ دو تاکہ تمہیں آخر میں دل شکستہ نہ ہونا پڑے اگر تم واقعی میری رائے معلوم کرنا چاہتے ہو تو میں اسکی قیمت چالیس روبل ٹھیرانے کا ہرگز مشورہ نہ دوں گا اسلئے کہ اتنی بڑی رقم میں کسی طرح ادا نہیں کرسکتا۔"

بہت متفکرانہ چہرہ بنا کر اس نے کہا "لیکن جناب والا کیا بتوں کی خوبصورتی کی قیمت ۲۰ روبل نہ ہوگی؟"

"بیس . . . . ہاں . . . . لیکن چالیس نہیں۔

"اور دیوتا جو آپ کو خوش قسمت بنادیں گے اس کے بیس روبل"

میں نے درشت لہجہ میں کہا "لی ٹائے۔ کیا میں سودائی ہوں؟"

اس نے چوکنا ہوکر تذبذب میں میری طرف گھور کر دیکھا اور کہا "جناب والا! . . . میں نہیں جانتا"

پھر تعجب ظاہر کرتے ہوئے "شاید آپ کو دیوتاؤں پر اعتقاد نہیں؟"

---

[1] ایک روسی سکہ ہے جس کی قیمت ۲ شلنگ ۱ پنس ہے۔

"لی ٹائے میں اس معاملہ میں کچھ نہ کہوں گا، جو کچھ میں کہہ سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ شاید یہ دیوتا مجھے پسند نہ کریں..... یا اس سے پہلے کہ کسی قسم کا فائدہ ہو وہ گم ہو جائیں یا کوئی انہیں چُرا لے جائے اور ہر اس غیر مطمئن حالت میں تم چاہتے ہو کہ میں تمہیں ان دیوتاؤں کی اصل قیمت سے بیس رُوبل زیادہ دوں؟ نہیں! میں تم کو صرف بیس رُوبل ان کی خوبصورتی کے دوں گا اور شہرت و دولت کے متعلق کچھ بھی نہیں"

لی ٹائے نے کانپتی ہوتی آواز میں کہا "جناب والا!........"

لی ٹائے مجھے پسند ہیں مگر افسوس ہے کہ میں اس سے زیادہ قیمت نہیں دے سکتا"

"جناب والا!......"

"خدا حافظ! لی ٹائے"

"جناب والا! کیا آپ خوش قسمت بننے کیلئے بیس رُوبل دینے کو تیار ہیں......."

میں نے گرجتی ہوئی آواز میں کہا "نہیں"

"اور... خوبصورتی.... کے متعلق بھی.... کچھ نہیں...."

مجھے بے انتہا ہنسی آرہی تھی مگر میں نے ہنسی روک لی، میں سمجھ گیا کہ وہ معاملہ کی نوعیّت بدل کر کسی نہ کسی صورت سے معاملہ کرنا چاہتا ہے، میں نے روپے گن دیئے۔ لی ٹائے نے اپنی فطری زندہ دلی کا اظہار کئے بغیر روپے لے لئے۔

"جناب والا خدا آپکے والدین پر رحمت نازل کرے، طالعمند بنانے والے دیوتا کی وجہ سے آپ کو ناموری اور بے انتہا دولت حاصل ہو، خدا حافظ!"

"خدا حافظ! لی ٹائے"

بقیہ دن رپورٹ کی تیاری اور سرکاری کام کی انجام دہی میں ختم ہوا جب میں واپس آیا تو رات کا زیادہ حصہ گذر چکا تھا، بت اُسی طرح اپنی جگہ پر تھے، صرف ایک موم کی بتّی کی روشنی میں غیر معمولی دلفریبی اور مسخر کرنے والا حسن اُن میں پیدا ہو گیا تھا جب میں نے اس روشنی کو ایک طرف سے دوسری طرف حرکت دی تو محسوس کیا کہ بتوں کی پوشاک کی تہوں کا سایہ بھی روشنی کے ساتھ ساتھ حرکت کرنے لگا۔ مورتوں کی مخمور با دامی آنکھیں چمکتی ہوئی نظر آئیں انہوں نے مسکرانا شروع کیا، نیم آدمی کے چہرہ سے پسندیدگی کا اظہار ہو رہا تھا، اور ضعیف آدمی کا شفقت آمیز چہرہ کبھی نہ بجھنے والی آگ سے چمکنے لگا۔

آخر کار میں نے اُن کا تصوّر چھوڑ دیا، اور دوسرے دن کے لئے تیاری شروع کردی۔ ایک روز پہلے دس ہزار رُوبل کے نوٹ وصول ہوئے تھے جس سے مجھے ملازمین کی تنخواہ کا تصفیہ کرنا تھا مگر یہ ایک بڑی ذمہ داری اور وقت کا کام تھا اس لئے جب تک

میں اس سے سبکدوش نہ ہوجاتا تھا، میرے لئے اس کی موجودگی ایک بارگراں تھی،

میرے کمرہ کا دروازہ پرانی وضع کی ایک آہنی چٹخنی سے بند ہوتا تھا، مکان دوسری عمارات سے دُور اس گھنے جنگل کے کنارہ واقع ہوا تھا، سونے سے پیشتر میں نے روپے والے بٹوے کو بڑی احتیاط سے توشک اور تکیوں کے درمیان چھپا دیا اور پستول کو ہاتھ سے کچھ فاصلہ پر رکھ دیا جسے میں بوقت ضرورت بہ آسانی استعمال کرسکتا تھا، بغیر کپڑے بدلے میں بستر پر لیٹ گیا اور دیا سلائی۔ موم بتی اور گھڑی کو قریب ہی کرسی پر رکھ لیا۔ ایک بڑے جنگل کی سرحد پر انوکھی وضع کے لکڑی کے مکان میں تنہا سرہانے نوٹوں کا بنڈل رکھکر گہری نیند سونا اور خوشگوار خواب دیکھنا ایک دشوار کام تھا۔

ریاضی کے پیچیدہ اور مشکل سوالات اور فن تعمیر کے دقیق حل طلب مسائل اور اعداد و شمار کے پریشان کن خیالات میرے دماغ میں گھومنے لگے، آخرکار تھک کر میں اونگھنے لگا اور طالعمند بنانے والے دیوتا کے خواب دیکھنے لگا،

جنگل کے سرے پر گرے ہوئے درخت کے قریب، ضعیف آدمی اپنی شفقت آمیز خشک مسکراہٹ کیساتھ نیلگوں آسمان کی طرف ٹکٹکی لگائے بیٹھا تھا، اس کے پاؤں کے پاس سنہری نیم آدمی خوفناک صورت بنائے دانت پیستا بیٹھا ہؤا تھا اسکی لمبی اور پتلی انگلیاں بے شمار سونے کے چمکتے ہوئے سکّوں پر کھیل رہی تھیں، اور دوسرے دل کے نوٹ پھیلا کر انکے فرش پر ہاتھ میں ہاتھ ملائے ناچ رہے تھے۔ وہ نیم ترچھی نظر اور چاند کی شکل والی حسین عورتیں اُن کے ساتھ شریک ہوگئیں، یکایک منظر صرف نیم آدمی کی شکل میں مبدل ہوگیا اسکی ماہیت لمحہ بہ لمحہ بڑھتی گئی وہ اسی طرح مضحکہ خیز اور بد باطن نظر آتا، خواب کی گڑبڑ میں مَیں نے محسوس کیا کہ وہ میری طرف بڑھ رہا ہے اسی وقت اس کا سیاہ فام ہاتھ آہستہ آہستہ میری طرف بڑھنے لگا جس نے آخرکار میرے بازو کو مس کیا آنے والی آفت کے خوف سے نیند میں مَیں نے ایک چیخ ماری اور نیم آدمی کی کلائی مضبوط پکڑ لی، ناکامی مقصد کے غصہ کی ایک ہیبت ناک آواز آئی پھر میں نے ایک تنومند آدمی کے جسم کا وزن محسوس کیا جو میرے اوپر اچھل رہا تھا۔ اب میں بالکل ہشیار، چست و چالاک اور مستعد تھا، غضبناک ہوکر بڑی جانفشانی کے ساتھ اس بیجا مداخلت کرنے والے کے خلاف جدوجہد کرنے لگا میں بڑی مضبوطی سے اسکی کلائی پکڑے رہا۔ اور اس کی گرفت سے چاقو نکال لینے کی کوشش کی اگر میں ایسا نہ کرتا تو یقیناً وہ میرا خاتمہ کردیتا، ہماری لڑائی کے شور و شر سے بھی زیادہ سخت ہنگامہ کی آواز کان میں آئی۔ باہر طوفان بپا تھا باد و باراں کے شور سے جنگل میں قیامت مچی ہوئی تھی، سنگلاخ چٹانوں میں رعد و برق، باد و باراں اور طوفان نے قیامت کا نقشہ کھینچ دیا تھا۔ ایک زور کے جھٹکے سے میں اپنا ہاتھ تکیے کے نیچے لے جانے میں کامیاب ہؤا، پھر اسی تیزی کے ساتھ میں نے پستول کو قابو میں لاکر چلادیا۔ کچھ دیر تک کوئی نتیجہ برآمد نہ ہؤا لیکن بعد کو میرے بدن سے وہ بوجھ کم ہوتا ہؤا نظر آیا، اور کسی کے ڈگمگاتے ہوئے چلنے کی آواز آئی، بجلی کی روشنی نے کمرہ کو منور کردیا اور میں نے مداخلت کرنے والے کی

بدباطن مضحکہ خیز صورت دیکھی، اس کے بائیں جانب خون کی دھار نظر آئی۔

انتہائے تعجب میں میرے مُنہ سے نکلا "لی ہائے"

مگر وہ خاموش چلا گیا۔

رات بھر اور دوسرے دن بھی طوفان اسی شدت و تیزی کے ساتھ جاری رہا؛ دوسرے دن رات کو کہیں جا کر اس میں کمی ہوئی۔ مگر سوائے اسکے کہ رعد و برق اپنا حصہ ختم کر کے رخصت ہوگئے، طوفان کی تندی میں کسی قسم کا فرق نہ آیا، باد و باراں ٹیما کاؤ کے لکڑی کے مکانوں کو غرقاب کرنے میں برابر مصروف رہے جس طرح ایک مضبوط اور قوی آدمی رسیوں سے کسا ہوا دشمن کے قبضہ میں بے دست و پا مجبوراً بیٹھا ہوا تازیانے کھاتا ہے۔ اسی طرح درخت ناقابل برداشت بوجھ سے بیزار ہو کر واویلا اور فریاد کر رہے تھے دوسرے دن صبح افق پر سفید روشنی ظاہر ہوئی، سفیدی بتدریج بڑھتی گئی اور مطلع کچھ کچھ صاف ہوا، مگر اس قدر صاف نہیں ہوا جس سے آفتاب کے نکلنے کی امید کی جاتی۔

سرنگ کا کام بالکل رکا رہا، دن کا زیادہ حصہ میں نے بیکاری میں ضائع کیا، آخر کار میں اپنے کمرہ میں چلا گیا اور رات کے آئے ہُوئے خطوط کا جواب لکھنے بیٹھ گیا۔ کوئی ایک گھنٹہ بعد دروازہ پر دستک کی آواز آئی،

میں نے پکار کر کہا" اندر چلے آؤ"

دروازہ کھلا اور دو مہمان ایک مرد اور عورت اندر داخل ہوئے، مرد فوجی آدمی تھا قد متوسط درجہ سے کچھ ہی بڑا تھا پہلی نظر میں تو وہ ایک نازک اندام شخص نظر آیا۔ مگر نظر ثانی نے پہلی نظر کو غلط ثابت کیا۔ اس لئے کہ قوت و طاقت، تہذیب و شائستگی کے پردہ میں چھپی ہوئی تھی۔ اس کا مردانہ حسن ناز و انداز لئے ہوئے تھا، میں نے قیاس کیا کہ وہ کوئی روسی افسر ہے اُس نے فصیح انگریزی میں مجھے مخاطب کر کے کہا۔

"مسٹر ہاورڈ! مجھے افسوس ہے کہ ہماری وجہ سے آپ کے کام میں خلل واقع ہُوا ہوگا، پٹڑیوں کی حفاظت کیلئے میں نیا کپتان مقرر کر کے بھیجا گیا ہوں، میرا نام الکس ڈیمیٹریف ہے اور یہ میری بیوی ہے۔"

میں نے جُھک کر سلام کیا۔

عورت کمسن، اور حسین و جمیل تھی، معلوم ہوتا تھا کہ وہ سرکیشین نسل کی تھی، اس کی آنکھوں میں سرور تھا اور زبان میں شگفتگی، اس نے بھی انگریزی میں بات کی مگر بہ نسبت شوہر کے ذرا مشکل سے بات کر سکی۔

"مسٹر ہاورڈ! آپکے نمایاں کارناموں کا تذکرہ ہم نے بہت کچھ سنا ہے ..... ایک عرصہ کے بعد لوگوں کو آپ کی لیاقت

اور قابلیت کی خبر ہوئی ...... یہ دنیا کی آہستہ رفتاری کا ثبوت ہے .... آپ ایسے انگریز ہیں کہ ہم کو آپ سے ملکر بے حد مسرت ہوئی "۔ اس کی ہنسی میں وہ حلاوت تھی جو دل کو گونا گوں انبساط و سرور سے معمور کئے دیتی تھی۔

" آپ نے اس ناگوار موسم میں ایسا خطرناک عزم کیا، وہ بھی صرف ایک سادہ، معمولی، جفاکش اور محنتی انگریز سے ملاقات کرنے کے لئے "؟

کپتان نے سر ہلا دیا اور کہا " بالکل ٹھیک ..... کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ہم کو مشتاقِ ملاقات بنانے کے لئے یہ کافی نہیں ہے "؟

زیادہ عرصہ نہ گذرا ہوگا کہ ہم بے تکلف اور پرانے دوستوں کے مانند باتیں کر رہے تھے اور ہنس رہے تھے۔ کپتان کے اخلاق نے مجھے گرویدہ کر لیا، وہ ایک خوش ادا، شائستہ، معاملہ فہم شخص تھا، میڈم کے چہرہ سے بشاشت و خوش مزاجی نمایاں تھی، تاہم اس میں کچھ ایسی بات بھی تھی جو ناممکن البیان ہے لیکن اس نے مجھے تو تردد و پریشانی میں ڈال دیا۔ باوجود اس کے میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ وہ کیا خاص بات ہے، آخر کار وہ جانے کے لئے اُٹھے میں نے میڈم کو جھک کر سلام کیا۔ اور اس سے مصافحہ بھی کیا۔

کپتان نے کہا " مسٹر ہاورڈ! ہمارے لئے یہ زیبا نہیں ہے کہ ہم ایک انگریز کے ادائے فرائض میں خلل انداز ہوں میں امید کرتا ہوں کہ آپ بہت جلد کسی دن ہمارے ہاں تشریف لاکر ہمیں ممنون فرمائیں گے۔ آپ ہی ایک ایسے شخص ہیں جن سے مل کر مجھے روحانی مسرت حاصل ہوئی اور بغیر کوفت محسوس کئے مختلف مباحث پر گفتگو کرتا رہا ہوں .... میں امید کرتا ہوں کہ آپ ضرور تشریف لائیں گے "؟

میں نے بخوشی وعدہ کر لیا

" ڈیمیٹریف کی ملاقات کے چند دن بعد ایک اور مہمان سو ہو سین آگئے جو میرے پرانے شناسا اور ایک دولتمند ٹھیکہ دار تھے، کاروباری، عدیم الفرصت، اشخاص کے برخلاف جو ہمیشہ اپنے دھندوں میں پھنسے رہتے ہیں وہ چینی ادب کے متبحر عالم اور اثریات کے ماہر تھے۔

میں نے کہا " سو ہو سین، کس خوشگوار روح پرور ہوا کے جھونکے نے تمہیں یہاں پہنچا دیا اور عین چاء کے وقت "

" آہ، میرے عزیز دوست ہاورڈ کاروبار، کاروبار، کاروبار، نے مجھے یہاں پہنچا دیا، اور مجھے آپ کے مشورہ کی ضرورت ہے۔ خیر اب ہمیں اس کے متعلق گفتگو نہیں کرنی چاہئے، جب تک ہم ..... وہ کونہ میں کیا چیز رکھی ہوئی ہے "؟

پہلی ہی نظر میں اس نے بتوں کو دیکھ لیا، گو دریچوں پر پردہ ڈال دیا گیا تھا تاکہ لوگوں کی نظروں سے محفوظ رہیں۔

اور اس بات کی کوشش کی گئی تھی کہ نگاہ کو خیرہ کردینے والی سورج کی روشنی اندر نہ آنے پائے، لیکن پردہ کے پیچھے شمالی دریچہ سے سورج کی کرنیں داخل ہوئیں اور ہر طرف پھیل گئیں۔ اور بتوں کو ایک عجیب خوشنما اور رنگ برنگ کی وضع میں پیش کیا، سوہوسین نے ان بتوں میں سے ہر ایک کی صنعت کا غور کی نگاہ سے بہت باریک معائنہ کیا پھر مجھے مخاطب کرکے کہا۔

"میرے اچھے دوست کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم نے یہ مورتیں کہاں سے خریدیں"؟

میں نے اس سے تمام قصہ بیان کردیا،

"سوہوسین میں اس کے سوا کچھ نہیں جانتا کہ وہ غیر معمولی طور پر مجھے کامران اور خوش نصیب بنادیں گے مگر تم دیکھتے ہو کہ مجھے لکھ پتی بننے کے لئے ایک زمانہ چاہئے،" پھر میں ہنس دیا،

سوہوسین معنی خیز تبسم سے چاء کی پیالی میں چمچہ چلانے لگا، پھر اس نے عجیب سنجیدگی کے ساتھ کسی اہم مسئلہ پر غور کرتے ہوئے سگریٹ کے ساتھ کھیلنا شروع کیا، نہ جانے وہ کس نتیجہ پر پہنچا کہ فوراً مجھے مخاطب کرکے کہا۔

"میرے پیارے دوست، ہمارے علم قدیم کے مطابق تمام مادی کامیابی کا انحصار دلی کیفیت اور واقعات کی خوش آہنگ موافقت پر مبنی ہے مثلاً جس شخص کا مطمح نظر، حصول دولت اور دنیاوی کامیابی ہو اس کے لئے ضروری ہے کہ ناموافق زین غیر خوش آئند خیالات انسانی کو اپنے ماحول کے اثرات کے مطابق بنائے، یہ آسان کام نہیں ہے اس لئے کہ ہم عام طور پر اس نیکی یا بدی کی پیروی کرنے میں جس سے ہمیں سابقہ پڑتا ہے، اور بمشکل نیکی یا بدی کی راہ جدید میں قدم رکھتے ہیں، کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تمہیں سب سے زیادہ کونسی مورت پسند آئی"؟ میں نے کہا ضعیف آدمی اور تناسب الاعضا عورتیں،

سوہوسین نے اظہار خوشنودی کے طور پر سر ہلادیا اور بیان کرنا شروع کیا۔

"ان میں سے ہر ایک مورت نیکی و بدی کی قائمقام ہے اور اس سلسلے کے مجموعہ کا ایک جگہ ہونا ضروری ہے اس لئے کہ وہ اچھے ایک دوسرے کا جو مدارج ترقی کے طے کرنے اور بے تعداد دولت کے سرچشمہ پر پہنچانے میں مدد دیتا ہے وہ ضعیف مآل اندیش، شریف آدمی عزت کی قائم مقامی کرتا ہے، جو پتھر کے مجمع کے بیچ میں صدر مقام پر قابض ہے اور یہ چھوٹی پستہ قد حسین اور دلکش عورتیں علی الترتیب فیاضی، وفاداری، اور ہمدردی کی علامت ہیں اور اُن کا بتایا ہوا سیدھا راستہ ہی انسان کو راہ کامیابی پر لگا دیتا ہے،"

اور بڑی سنجیدگی سے بہ تاکید اس نے کہا "لیکن یہ اچھی طرح سے آپ پر روشن ہوجائے کہ جس شخص کو مادی کامیابیوں پر اقتدار حاصل کرنے کی ضرورت ہے اُسے مجبوراً ان دوسرے پانچ دیوتاؤں کو عزیز رکھنا پڑے گا، وہ عیار سرخ بالوں والا دغا ہے اور وہ بدذات کبڑا ریاکاری اور دوسرے ظلم، خودغرضی اور احسان فراموشی ہیں، جیسا موقعہ پیش آئے

اُسی طرح جو کوئی ان میں سے نیکی یا بدی کسی ایک کے مقبرہ پر عُود دلوبان جلائے گا اسے ویسا ہی حریصانہ انعام ملے گا"۔

زمانہ مابعد میں میں نے زیادہ وقت ڈیمیٹریف کی صحبت میں صرف کیا۔ اکثر مرتبہ وہ میرے ہاں آتے اور میں اُنکے ہاں گیا، زمانہ بیحد اطمینان اور خوشی کی حالت میں گذر گیا۔ کپتان کے ساتھ میری دوستی مستقل طور پر قایم ہوگئی۔

میرے حیرت واستعجاب کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے ایک دن میڈم ڈیمیٹریف کو بغیر ہمرکابی شوہر کے کمرہ میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا، شرارت آمیز تبسم اس کے ہونٹوں پر تھا،

"آہ میرے دوست مجھے یہاں دیکھکر تمہیں تعجب ہوا ہوگا..... یہ عجیب بُت اس کا سبب ہیں.... جب سے میں نے انہیں دیکھا ہے اُن کا خیال اس بری طرح جاگزین ہوگیا ہے کہ میں نے اس کو دل سے نکالنے کی ہزار کوشش کی مگر ناکام رہی......"

وہ کچھ عجیب صورت بنا کر ہنسنے لگی۔

میں نے نرمی سے پوچھا "طالعمند بنانے والا دیوتا؟"

"کیوں... ہاں... کیا تم انہیں اسی نام سے پکارتے ہو؟ جب سے میں نے انہیں دیکھا ہے اس وقت سے انکا خیال میرے لئے سوہانِ روح بن گیا ہے۔ یہاں تک کہ میں اب خواب بھی انہیں کے دیکھتی ہوں.... انہوں نے میری زندگی کو بے لطف بنا دیا ہے، اور یقین دلاتی ہوں کہ یہ ایک نادر ترین اور عجوبہ روزگار شے ہے؟"

جب اس نے اِن بتوں کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں ایک غیر معمولی چمک نظر آئی پھر اس نے دفعتاً میری طرف پلٹ کر کہا "مسٹر ہاورڈ تم جانتے ہو کہ ان کا مطلب کیا ہے؟"

مجھے جو کچھ سوہوسین کی زبانی معلوم ہوا تھا وہ سب میں نے بیان کر دیا۔

وہ کامل سکون اور نہایت توجہ کے ساتھ سنتی رہی، پھر یک بیک حالتِ اضطراب میں اس کے ہونٹ ہلنے لگے اور یکایک میری طرف بڑھ کر کہنے لگی۔

"مسٹر ہاورڈ، کیا تم ان بتوں کو فروخت کر دو گے؟"

"کیوں... میری پیاری میڈم.... میرا... مطلق ارادہ نہیں......"

"رحم.... رحم کیجئے.... عزیز دوست.... تم نہیں جانتے کہ میرے دل میں ان کی کس قدر وقعت ہے... آپکو ان بتوں پر اعتقاد نہیں ہے... مگر مجھے ہے... بہت جلد اور بآسانی مالدار بننے کے لئے ان کا دستیاب ہونا ضروری ہے

.... میری درخواست منظور فرمائیے ... منظور فرمائیے"

میں نے اظہارِ انکار میں سر ہلا دیا۔

ایک سسکتی ہوئی آواز اس کے منہ سے نکلی۔

"آپ نہیں چاہتے کہ وہ میرے پاس آئیں ... تو پھر میں خود اُنکے پاس آتی ہوں .... اور تمہارے پاس مع جسم و روح کے

وہ مجھ سے لپٹ گئی اور سسکیاں بھر کر رونے لگی،

میں نے سختی کے ساتھ الگ کرتے ہوئے چیخ کر کہا

"میڈم تمہیں ہو کیا گیا، تمہاری عقل سلیم کہاں گئی۔ ہوش میں آؤ، سنبھلو۔ اگر ان ہنوں نے تم پر ایسا ہی اثر کیا ہے تو اے خاتون! خدا تم کو اپنی حفاظت میں رکھے، بغیر کسی معاوضہ کے یہ سب تمہارے ہیں، تمہیں مبارک ہوں!"

"اوہ میرے عنایت فرما آپ کا بہت بہت شکریہ .... بہت بہت .... شکریہ"

میں نے تمام مورتوں کو اکٹھا کر کے ریشمی بسنہ میں لپیٹ کر اسکے حوالہ کر دیا اور کہا۔

"لو! تمہاری مطلوبہ چیزیں یہاں موجود ہیں! لیکن میڈم تمہارے جانے سے پہلے یہ جتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں تمہارے شوہر کا وفادار دوست ہوں اور تم اس کی **بیوی**!!

میں نے جھک کر سلام کیا، مگر وہ مجھ سے ایسی حالت میں رخصت ہوئی جبکہ وہ اظہارِ تشکر میں کوشاں تھی قلب احساس و عنایت سے معمور۔ اور زبان فرطِ سپاس سے گنگ، اور خوشگوار زندگی کے خیال سے چھپائے نہیں سما رہی تھی۔

بغیر کسی قابلِ تذکرہ واقعہ کے پیش آئے یہ دشوار گذار زمانہ اسی قدیم نظام عمل کی پابندی، امور روزمرہ کی انجام دہی اور ادائے فرض میں گذر گیا۔ ڈیمیٹریف کسی اور خدمت پر مامور ہو کر دوسرے ضلع میں چلا گیا۔

تقریباً چھٹے ماہ بعد ایک دلفریب اور خوشگوار صبح کو کپتان بغل میں ایک بنڈل دبائے آہستہ سے کمرہ میں داخل ہوا، فرطِ شوق سے میں پکار اٹھا

"کیوں ڈیمیٹریف! کپتان تم میری چشم مجروح کے لئے باعث مسرت ہو .... کہو مزاج کیسا ہے؟"

گرمجوشی کے ساتھ ہم نے مصافحہ کیا،

"کپتان کیا معاملہ ہے۔ کیا بیمار تھے؟"

اس نے نفی میں سر ہلا دیا،

"نہیں اس کا کوئی اور ہی سبب ہے ... میں یہ تمہارے دیوتا واپس لایا ہوں ......"

اُس نے فوراً بنڈل کھول کر میز پر مورتوں کو جما دیا اور کہا ہاں یہ تو بتاؤ ان میں سے کوئی غائب تو نہیں ہو گئی"
"ہاں، ان میں سے ..... ریاکاری ...... خود غرضی ..... اور احسان فراموشی .... غائب ہیں"
"بالکل ٹھیک ...... ریاکاری ..... خود غرضی ..... اور احسان فراموشی .... یہ تینوں غائب ہیں"
پھر تلخ لہجہ میں کہا "اور اسی طرح میری بیوی بھی"
میں بالکل سٹ پٹا گیا، اس لئے کہ میرے نزدیک یہ ایک ناقابل یقین بات تھی۔
"اف کپتان .... غضب ہو گیا ...... یہ سُن کر مجھے اس قدر افسوس ہُوا کہ میں بیان نہیں کر سکتا...."
"ہاں میرے دوست یہ حیرت انگیز بات ہے کہ وہ ہمیشہ ان ناپاک بتوں کو اپنے ساتھ لئے پھرتی تھی .... اور آخرکار ایک دن وہ ایک چینی دولت مند سوداگر کے ساتھ ..... بھاگ گئی ...... ریاکاری، خود غرضی اور احسان فراموشی ...... ہاں وہ بہت چالاک عورت تھی وہ جانتی تھی کہ کون سے بت اپنے مقصد کیلئے مفید ہیں۔ آخرکار انہوں نے اُسے طالعمند بنا دیا۔ علاوہ اس کے وہ بہت دانا اور فہمیدہ بھی تھی، میرے لئے دوسرے بت چھوڑ گئی ..... وہ کیا ہیں ...... عزت ...... وفاداری ...... اور .... ہمدردی ...."
رقت کی وجہ سے اس کی آواز کانپنے لگی۔
تھوڑی دیر تک ہم بالکل ساکت و خاموش بیٹھے رہے۔ یکایک میرے دل میں شبہ پیدا ہُوا اور میں نے پوچھا
"کپتان! کیا تمہیں اس چینی کا نام معلوم ہے؟"
ایک منٹ تک تو وہ سوچتا رہا، پھر گردن اٹھا کر کہنے لگا:۔
"کیوں .... ہاں ...... مجھے اچھی طرح یاد ہے ..... اس کا نام تھا .... لی ... ٹائے، ....لی ... ٹائے"

(ترجمہ) عبدالمنعم سعیدی بی، اے (علیگ)
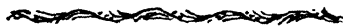
رباعی

خودرا بہ نہانخانۂ وحدت بُردیم ... ماییم کہ پیشتر زمُردن مردیم

درباختن و بُردماست رمزے مضمر ... خودرا درباختیم یعنی بُردیم

غزل

تعبیہ در وجودِ ما دوزخِ ما بہشتِ ما ... میچکد از نگاہِ ما معنیِ خوب و زشتِ ما

بے خبری دہد خبر معنی و حرف در نظر ... ساغرِ جم سفالِ ما آئنہ ایست خشتِ ما

ہر دو رفیق در ازل ہر دو شفیق در عمل ... عشق و وفا خمیرِ ما عقل ادب سرشتِ ما

دانہ زخوشہ نامراد خوشہ زدانہ بے نصیب ... ارزشِ نیم جو نداشت حاصلِ کار و کشتِ ما

حرفِ غلط نخواندہ ایم راہ غلط نکردہ ایم ... ردّ و قبول جلوہ ریز در خطِ سرنوشتِ ما

راہبِ دیر پردہ در شیخِ حرم بلا نظر ... خوب نبود خوبِ ما زشت نبود زشتِ ما

طرحِ محبت افگنیم مدحِ گرامی آوریم

عاشقِ پاکبازِ ما رند وفا سرشتِ ما

گرامی

چکّر

ایک نوجوان عورت اپنے چار سال کے بچّے کے ساتھ قصبہ کے ایک غیر آباد کوچے میں صبح کا گشت لگا رہی تھی۔ بچّے کا چہرہ مسرّت سے چمک رہا تھا وہ محبّت بھری نظروں سے اسکو دیکھتی جاتی تھی اور جی ہی جی میں خوش ہوکر مسکرا رہی تھی بچّے کے ہاتھ میں لوہے کا ایک خوبصورت چکّر تھا جس پر زرد رنگ ہو رہا تھا۔ وہ اس کو زمین پر رکھ کر گھماتا اور خود ایک البیلے انداز سے اس کے پیچھے بھاگتا۔ وہ مسرّت سے بے اختیار ہوکر بلند قہقہے لگاتا، اپنی آہنی چھڑی اوپر اٹھاکر ہوا میں ہلاتا اور بھاگنے میں اپنی ننھّی ننھی ٹانگوں کو نہایت تیزی سے حرکت دیتا۔

بچّہ کی خوشی بے جا نہ تھی، اسے یہ چکر اسی دن ملا تھا۔ یہ چیز اس کے لئے بالکل نئی تھی اُسے یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوتی کہ اس چکر کی مدد سے وہ نہایت تیز دوڑ سکتا ہے بچّے نئی چیزوں کو دیکھ کر قدرتی طور پر خوش ہوتے ہیں اور یہاں اس کے لئے ہر چیز نئی تھی۔ صبح کے وقت بازاروں میں سے گزرنا سورج کا مسکراتے ہوئے افق سے ہویدا ہونا، اور دور شہر کی آبادی میں بیداری کا شور وغُل برپا ہونا یہ سب چیزیں اسکے لئے نئی تھیں جن کو دیکھ کر اس کا معصوم دل بچپن کی پاک مسرّت سے لبریز ہو رہا تھا۔

۲

کوچے کے چوک میں پھٹے پرانے کپڑے پہنے ایک سخت اور بھدّے ہاتھوں والا بڈھا کھڑا تھا۔ عورت اور بچّے کو دیکھ کر وہ ان کو راہ دینے کے لئے ایک طرف ہٹ گیا۔ بڈھے نے اپنی بے نور آنکھوں سے لڑکے کی طرف دیکھا اور اسکے جھریوں والے چہرے پر ایک بے معنی سا تبسّم نظر آیا۔

"چھوٹا سا آدمی اس کی بساط ہی کیا ہے۔ مگر خوشی سے پھُولے نہیں سماتا۔ دیکھو تو سہی کس پھرتی سے دوڑ رہا ہے"

بڈھے نے فرطِ رشک سے یہ باتیں اپنے دل کے ساتھ کیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بڈھا اسکی مسرت کے مفہوم ہی سے ناواقف تھا بچّے کی حرکتوں پر اُسے اچنبھا ہو رہا تھا۔

وہ حیران تھا کہ بچّہ کو ڈانٹ ڈپٹ کیوں نہیں کی جاتی۔ کھیل کود تو شوخی اور شرارت ہے اور شرارت بچوں کی گھٹی ہی میں داخل سمجھی جاتی ہے۔ ماں موجود ہے لیکن کوئی کلمۂ ملامت اس کی زبان سے نہیں نکلتا۔ وہ چیخ پکار نہیں کرتی، نہ اُسے گالیاں ہی دیتی ہے۔ عورت بھی بشاش اور چست وچالاک تھی ان دونوں کے چہروں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ

انہیں عیش و آرام کے تمام سامان مہیا ہیں۔

بخلاف اس کے جب وہ یعنی بڈھا خود بچّہ تھا اس کی زندگی کتوں سے بھی بدتر گزرتی تھی۔ اور اب بھی اس کے دل کی تاریکی میں مسرّت کی کوئی کرن نظر نہ آتی تھی حالانکہ اب یقیناً کوئی اس کی گوشمالی کرنے والا موجود نہ تھا اور اسے کھانے پینے سے بھی فراغت تھی۔ اس نے اپنے لڑکپن کے دنوں کو یاد کیا۔ سردی۔ بھوک۔ مار پیٹ یہی باتیں تھیں۔ جن سے اسے اپنے بچپن میں سابقہ پڑا تھا اُسے بچپن میں کبھی کوئی کھلونا میسّر نہ ہوا تھا۔ نہ اُسے گھمانے کے لئے کبھی اس قسم کا چکّر جڑا تھا اس کی زندگی پریشانیوں اور مصیبتوں کا مرقع تھی جس میں مسرّت کی صورت بالکل ناپید تھی۔

وہ بچّہ کو دیکھ کر اپنے پوپلے منہ سے مسکرایا۔ اس کو بچّہ کی حالت پر رشک آرہا تھا پھر اس نے کچھ تامل کے بعد اپنے دل میں کہا

"عجب بے معنی کھیل ہے"

لیکن رشک کی آگ اس کے دل میں بھڑک رہی تھی۔

وہ کارخانہ میں گیا جہاں وہ بچپن سے کام کر رہا تھا اور کام کرتے کرتے بڈھا ہو گیا تھا لیکن بچّہ کا خیال تمام دن اس کے دل میں چکّر لگاتا رہا۔

بچّہ کا خیال اُسکے دل میں ایک مستقل اور گہرا نقش سا جما چکا تھا اس کے لئے اس کا بھول جانا مشکل تھا بچہ ہنستا کھیلتا، دوڑتا اور زمین پر قدم مارتا اور چکّر کو گھماتا ہوا اسکی آنکھوں میں پھر رہا تھا۔ بار بار اس کے رشک بھرے دل میں یہ خیال آتا کہ بچّے کی ننھی ننھی ٹانگیں کتنی فربہ تھیں اور گھٹنوں تک سے برہنہ! ....

دن بھر کارخانہ کے شور میں بھی بچّہ اور اس کا آہنی چکّر اس کے دماغ میں پھرتا رہا اور رات کو خواب میں بھی اُسے وہی نظر آتا رہا

۳

دوسرے دن صبح پھر یہی خیالات بڈھے کے سر میں چکّر لگانے لگے کارخانے کے کام سے وہ اکتا گیا تھا۔ مزدور اپنے اپنے کام میں مصروف تھے اور بڈھا کسی اور ہی خیال میں محو اپنے پوپلے منہ سے مسکرا رہا تھا۔ ہوا گرد سے بوجھل ہو رہی تھی اور کارخانے کے وسیع اور بلند کمروں میں چمڑے کے پٹے اژدہوں کی طرح پھنکارتے ہوئے مشینوں کے لاتعداد پہیوں پر تیزی کے ساتھ چکّر لگا رہے تھے بھاپ اور گہرے آبی بخارات کی وجہ سے دُور کے گوشے نظر نہ آتے تھے آدمی خیالی صورتوں کی طرح آنکھوں کے سامنے آتے اور اوجھل ہو جاتے تھے اور مشینوں کے متصل شور و غل میں انسانی آواز کان پڑی سنائی نہ دیتی تھی۔

بڈھا آدمی اپنے خیالات میں گم تھا۔ اُسے یوں معلوم ہو رہا تھا کہ وہ خود بھی ایک کمسن بچہ ہے اور اسکی ماں بھی ایک امیر عورت ہے۔ اس کے پاس بھی لوہے کا ایک چکر ہے اور وہ اسے اپنی چھوٹی سی چھڑی کے ساتھ گھما رہا ہے اس نے بھی عمدہ اور اجلا لباس پہن رکھا ہے اسکی بھی ننھی ننھی فربہ ٹانگیں ہیں اور گھٹنوں پر سے برہنہ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

کئی دن گزر گئے کارخانے میں کام جاری رہا اور بڈھے کا تصور پیہم کام کرتا رہا۔

(۴)

ایک شام جب وہ کام کے بعد کارخانے سے گھر کی طرف آ رہا تھا اُسے بازار میں کسی راب کے پیپے کا ایک آہنیں حلقہ ملا یہ نہایت غلیظ اور بھدی سی چیز تھی۔ مگر بڈھا مسرت سے کانپنے لگا اور اسکی بے نور آنکھوں میں آنسو جھلکنے لگے۔ دفعتہً اسکے دل میں ایک بیصابانہ خواہش پیدا ہوئی اُس نے جھک کر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے چکر کو پکڑ لیا اور شرمیلے چہرہ کے ساتھ مسکراتا ہوا اُسے اٹھا کر گھر لے گیا۔

راستہ میں نہ کسی نے اس کی طرف دیکھا اور نہ اس سے کسی قسم کا سوال کیا۔ کسی کو کیا پڑی تھی کہ ایک پھٹے پرانے کپڑوں والے بڈھے سے جو لوہے کا ایک زنگ خوردہ بیکار چکر اُٹھائے لئے جا رہا تھا مخاطب ہوتا۔

وہ لوگوں کے ٹھٹھے کے خوف سے چوری چوری جا رہا تھا۔ وہ خود نہیں جانتا تھا کہ اُس نے کس لئے یہ چکر اُٹھایا اور کیوں اُسے لئے جا رہا تھا۔ بہر حال یہ بچہ کے چکر سے مشابہ تھا۔ اور یہی اُس کی دلکشی کے لئے کافی ضمانت تھی۔ کیا ہوا اگر یہ زمین پر گرا ہوا تھا۔

وہ اسے ہاتھ میں پکڑ سکتا تھا، اسے چھو سکتا تھا، وہ کارخانے میں روزانہ اسی چکر کے خیالوں میں کھویا سا جاتا یہاں تک کہ مشینوں کے شور وغل کی آواز مدھم پڑ جاتی اور آبی بخارات کا دھندلا پن بھی کم ہونے لگتا

کئی دن تک یہ چکر بڈھے آدمی کے بوسیدہ جھونپڑے میں اسکے پلنگ کے نیچے پڑا رہا وہ اکثر اُسے وہاں سے اٹھا کر دیکھتا۔ اس غلیظ زنگ خوردہ چکر کو دیکھکر اسے تسکین ہوتی اور اسکے نظارہ سے اسکے دل میں اُس ننھے سے ہشاش بشاش بچے کا کبھی نہ بھولنے والا خیال اور زیادہ راسخ ہو جاتا۔

(۵)

ایک دن علی الصباح جبکہ ٹھنڈی ٹھنڈی خوشگوار ہوا چل رہی تھی اور درختوں پر پرندے معمول سے کچھ زیادہ خوشی کے ساتھ چہچہا رہے تھے بڈھا آدمی اپنے وقت سے بہت پہلے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اپنا چکر اٹھایا اور شہر سے باہر کچھ دور نکل گیا۔

وہ جنگل کے گھنے درختوں اور خاردار جھاڑیوں میں سے کھانستا ہوا گذر رہا تھا خشک سیاہی مائل پھٹی ہوئی چھال والے درخت اسے

ضرورت سے زیادہ خاموش اور متین نظر آتے تھے جنگل عجیب عجیب خوشبوؤں سے مہک رہا تھا قسم قسم کی جنگلی جڑی بوٹیاں اور عجیب الہیئت کیڑے مکوڑے دیکھ کر اُسے تعجب ہو رہا تھا یہاں گرد و غبار اور شور و غل کا کچھ پتا نہ تھا۔ درختوں کے پیچھے صبح کی ہلکی ہلکی دھند چھائی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ بڈھے آدمی کے سالخوردہ پاؤں جو خشک پتوں پر تیزی سے حرکت کر رہے تھے کبھی کبھی درختوں کی بڑی بڑی زمین سے اُبھری ہوئی اور پیچ و خم کھائی ہوئی جڑوں میں الجھ کر رہ جاتے اور وہ گرتے گرتے سنبھلتا۔

اس نے ایک درخت کی خشک ٹہنی توڑ کر اپنا چکر اس پر لٹکا لیا۔ آخر وہ ایک کھلے اور روشن مقام پر پہنچا چھوٹی چھوٹی سبز گھاس پر اوس کے قطرے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے

دفعتہً اس نے اپنا چکر چھڑی پر سے نیچے لڑھکا دیا اور پھر اسے چھڑی کی مدد سے گھاس کے سبز فرش پر گھماتا ہوا ایک طرف سے دوسری طرف لے گیا۔ بڈھا کھکھلا کر ہنسنے لگا۔ خوشی سے اس کا چہرہ چمک اُٹھا اور وہ اس ننھے بچے کی طرح اپنے چکر کے پیچھے پیچھے بھاگنے لگا اسکے قدم تیزی سے حرکت کر رہے تھے اور وہ اس چھڑی کو جسکی مدد سے چکر کو گھما رہا تھا اس ننھے بچے کی طرح اوپر اٹھا کر ہوا میں ہلاتا۔

اُسے یوں محسوس ہوتا کہ وہ ایک خوش نصیب ننھا بچہ ہے اور اسکی ماں فنا بھرے دل کیساتھ مسکراتی ہوئی اسکے پیچھے پیچھے آ رہی ہے وہ سبزہ کے فرش پر ایک ایسے بچے کی طرح مسرور ہوا جو پہلے ہی دن سیر کے لئے باہر نکلا ہو اس کی بھوری ڈاڑھی جو اسکے ٹیالے رنگ کے چہرہ سے مناسبت رکھتی تھی تھرتھرا رہی تھی۔ اسکے کھانسنے کی آواز اسکے قہقہوں میں گم ہو گئی تھی اور اس کے پوپلے منہ سے خوشی کی بلند چیخیں نکل رہی تھیں۔

(۶)

بڈھے کو اپنے چکر کے ساتھ صبح کا وقت جنگل میں گزارنے سے بہت خوشی ہوتی اور آخر یہ اس کا معمول ہو گیا

بعض اوقات اُسے خیال آتا کہ اگر کوئی اسے دیکھ لے تو اسکی کتنی ہنسی اڑائے اس خیال سے اُسے سخت شرمندگی کا احساس ہوتا۔ یہ شرم خوف سے مشابہ تھی۔ اسے پسینہ آ جاتا اور اسے اسکی طاقت جواب دے جاتی وہ خوف اور شرم سے اپنے اردگرد نگاہیں ڈالتا لیکن وہاں کون تھا نہ کوئی آواز سنائی دیتی اور نہ کوئی نظر ہی آتا۔ . . . .

اور جی بھر کر کھیل چکنے کے بعد وہ مسکراتا ہوا واپس شہر کو چلا جاتا۔

(۷)

اسے چکر گھماتے ہوئے کبھی کسی شخص نے نہ دیکھا اور نہ اُسے کوئی اور غیر معمولی واقعہ پیش آیا۔ بڈھا کئی دن تک متواتر اطمینان سے کھیلتا رہا لیکن ایک دن جب کہ ہوا میں کچھ زیادہ خنکی تھی وہ سردی سے بیمار ہو گیا وہ اپنے جھونپڑے میں جا کر بستر پر پڑ گیا اور اس کے چند ہی دن بعد مر گیا کارخانے کے ہسپتال میں اجنبیوں اور غیروں میں مرتے ہوئے اسکے چہرہ پر مسکراہٹ نمایاں تھی۔

گزری ہوئی باتوں کی یاد اُسے تسکین دے رہی تھی وہ بھی ننھا بچہ بن چکا تھا۔ وہ بھی گھنے درختوں کے درمیان قہقہے لگا چکا تھا . . . سبز گھاس

[illegible]

غزل

تکمیلِ آرزو سے مذاقِ فنا کریں — کوئی ہمیں مٹایا کرے، ہم مٹا کریں

دل چاہتا ہے اپنا تصوّر بھی چھوڑ دیں — آزردۂ فریبِ تخیّل ہیں کیا کریں

احساسِ اجتناب، حقیقت سے دُور ہے — اپنا گلہ کریں، کہ تمہارا گلہ کریں

دنیائے دل ہے اور تری فتنہ خرامیاں — اے کاش حشر تک یہی محشر رہا کریں

ہمکو تو اک ادائے تغافل ہے دیکھنا — حاصل ہے ایک صبر کریں، یا گلہ کریں

کہتی ہے بے خودی کہ حقیقت نہیں ہے دور — ہم آپ کو تو آپ سے نا آشنا کریں

دیوانگی بھی ہے کرمِ برقِ آشیاں — کیوں خانماں خراب نہ تنکے چُنا کریں

کیا زیرِ آسماں یہی مفہومِ صبر ہے — اہلِ زمیں چُھری کے تلے دم لیا کریں؟

آجا کبھی تو سامنے اے محشرِ جمال! — کب تک ترے خیال کو سجدے کیا کریں

ہے انتہائے شوق کہ مطلوب خود بنیں — وہ حسرتیں کہ تجھ سے تری التجا کریں

کچھ انتہائے حسرتِ گفت و شنید ہے — کب تک ترے خیال سے باتیں کیا کریں

کس درجہ دلفریب ہے گویاؔ کسی کا قول
"تجھ سے دغا کریں تو خدا سے دغا کریں"

گویاؔ جہان آبادی

غزل

بے رخی اپنی اُسے یاد آئی — جب لبوں پر مرے فریاد آئی

دل ہی سینے میں نہ باقی چھوڑا — آہ! کس طرح تری یاد آئی

شبِ فرقت کی مصیبت ہے یہ — موت رہ رہ کے مجھے یاد آئی

بعد مرنے کے بھلا کیا صادقؔ
اس ستم گر کو مری یاد آئی

صادق ایوبی

محفلِ ادب

عورت اور مرد - افسوس اے عورت! محبت کے دیوتا کی درگاہ میں سب سے دشوار قربانی تجھے دینی پڑتی ہے، اگر تیری محبت پاک ہے تو خیر، اور اگر وہ ناجائز ہے، تو تجھے کن آفتوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے! وہ عاشق جسکی محبت کی خاطر تو اپنے عورتوں کے فرائض کو بھلا دیتی ہے، تیرے لئے کسی قسم کا ایثار نہیں کرتا بجالیکہ تو اس کے لئے سب چیزیں قربان کر ڈالتی ہے، اگر تیرا عشق ظاہر ہو جائے تو نقصان کسے برداشت کرنا پڑتا ہے؟ صرف تجھے اُسکی عزت وشہرت، دولت اور ثروت میں کچھ فرق نہیں آتا مگر تجھ سے سب چھین جاتے ہیں۔

عیاش مرد پھر بھی عالیشان محلوں میں رہ کر امن کی زندگی بسر کرسکتا ہے، مگر عیاش عورت کیلئے سلاخدار کمرے ہی وقف ہوتے ہیں اسکی خاطر تو بے عزت بننا گوارا کرتی ہے اور اس بات کی پروا نہیں کرتی کہ تجھے لعنت ملامت ہوتی ہے اور بعض حالتوں میں اُسکی بے وفائی یا بے اعتنائی سے تیرا دل ٹوٹ جاتا ہے مگر اے باوفا اور بے غرض بھولی بھالی محبت کی مجسم دیوی تو ہے کہ برابر اس بیوفا اور احسان فراموش عاشق پر جان نثار کرنے کیلئے ہر وقت تیار رہتی ہے۔ . . . .

مگر تیری خاطر وہ ان سب باتوں کا لاکھواں حصّہ بھی گوارا کرنا پسند نہیں کرتا۔ مان سرو ور لاہور (اردو)

بیوہ کا آئینہ - گوشۂ تنہائی میں ایک ناکارہ میز پر کسی حسینہ کے محبوب کی حسرت آگیں یاد، اسکے اپنے حنائی ہاتھوں کا بچھڑا ہوا رفیق آئینہ گرد کے دامن میں منہ لپیٹے پڑا تھا اور اس کا دل اپنے رنج کے بار تلے دبا جا رہا تھا۔ وہ خاموش تھا، مگر اس خاموشی میں ٹوٹے ہوئے دل کی وہ صدائے جگر خراش گونج رہی تھی جسے سننے کے لئے گوشِ ہوش کی ضرورت ہے۔

انسان کا غرور کتنا ناپائدار ہے - کتنا بے بنیاد، ایک وہ دن تھا جب اس حسین دنیا کے ایک حسین بیٹے نے مجھے اپنی محبوبہ کو تحفہ دینے کیلئے انتخاب کیا تھا اور ایک دن ہے جب میں اپنی نگاہوں میں خود ذلیل وخوار ہوں اور دنیا کے تمام خوشگوار منظر مجھ پر حرام ہیں شوہر جنگ میں جا کر واپس نہ آیا - نازنین بیوہ ہو گئی - اور اس کے بعد میں نے ایک بار بھی اس کا منہ نہیں دیکھا۔

وہ جو نازوں میں پلی تھی - جسے گھر کی رونق کہا جاتا تھا - اب بدنصیب بیوہ ہے جس پر دنیا کی تمام رنگین مسرتوں کے دروازے بند ہیں اور میں اس بیوہ کا بدبخت آئینہ ہوں :- سرسوتی الہ آباد (ہندی)

ہندی کا سب سے پہلا اخبار - اسوقت تک یہی سمجھا جاتا رہا ہے کہ ہندی کا سب سے پہلا اخبار "بنارس اخبار" تھا - جو ۱۸۴۵ء میں

راجہ شیو پرشاد سنگھ کے اہتمام سے شائع ہوا تھا۔ اور جسکے ایڈیٹر پنڈت رگھوناتھ پنت جی تھے لیکن حال ہی میں ایک اور اخبار "بدھی پرکاش" کی کچھ جلدیں دستیاب ہوئی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اخبار بنارس اخبار سے بھی پہلے شائع ہوتا تھا اس کا سائز ۷ ۳/۴ × ۱۲ ۱/۲ انچ تھا کاغذ سفید لیکن باریک۔ ہفتہ وار شائع ہوتا تھا۔ بدھی پرکاش کے مالک منشی سدا سکھ لال تھے جنکا مطبع نور ہند آگرہ میں بہت مشہور تھا اس اخبار کے ایک سال کے پرچے دستیاب ہوگئے ہیں اسکے بعد کا حال معلوم نہیں کہ یہ اخبار کب تک جاری رہا اور کب بند ہوا۔ اس اخبار میں صرف خبریں ہی شائع نہیں ہوتی تھیں بلکہ مضامین نظم و نثر کا بھی اہتمام تھا اور اس زمانہ کا خیال کرکے جس وقت وہ شائع ہوتا تھا تعجب ہوتا ہے کہ اس وقت بھی ایسے عالمانہ مضامین اخبارات میں لکھے جاتے تھے

(مادھوری لکھنؤ (ہندی))

بھکارن شام کا وقت تھا میں شہر سے باہر ایک غیر آباد سڑک پر اپنے خیال میں محو آہستہ آہستہ چلا جا رہا تھا اور میرے چاروں طرف شام کی تاریکی بڑھتی جاتی تھی۔

اتنے میں میرے سامنے ایک بھکارن آکر کھڑی ہوگئی اور میری طرف عجیب نگاہوں سے دیکھ کر بولی "میں بھوکی ہوں"

میرے دل میں ہلچل مچ گئی۔ میں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور کہا۔ "کتنے پیسوں سے تمہارا کام چل جائے گا؟"

بھکارن کا اداس چہرہ چمکنے لگا جیسے شام کے وقت نیلگوں آسمان میں کوئی درخشاں تارہ ظاہر ہوجائے اس نے پر امید لہجہ میں جواب دیا "ایک آنے میں"۔

یکایک میرا دل دھڑکنے لگا میری جیب خالی تھی میرا سر جھک گیا اور چہرے پر ندامت کا رنگ جھلکنے لگا۔

بھکارن کی تیز نگاہوں نے یہ دیکھا اور سب کچھ سمجھ گئی اسکے بعد اس نے اپنا ہاتھ اٹھایا اور دعائیہ لہجہ میں کہا "پرماتما تیرا بھلا کرے" میں بھکارن کو کچھ نہ دے سکا، مگر وہ مجھے جو کچھ اسکے پاس تھا دے گئی۔

میں اس غیر آباد سڑک کی مٹی پر دوزانو ہوکر رونے لگا ——— میں بھکارن سے بھی گیا گذرا تھا۔

(مانسی کلکتہ (بنگالی))

ہیرا اور کوئلہ۔ سائنس کہتی ہے "ہیرا اور کوئلہ دونوں ایک ہی ماں کے بیٹے ہیں اُنکے جسم ایک ہی قسم کے ذرات پر مشتمل ہیں" لیکن پھر بھی ان میں کتنا تفاوت، کتنا فاصلہ ہے۔

ہیرا سخت ہے۔ کوئلہ ملائم ہے ہیرا خوشرنگ ہے کوئلہ سیاہ ہے۔ ہیرا بیش قیمت ہے کوئلہ ارزاں ہے

ہیرا دوسرے ہیروں سے الگ رکھا جاتا ہے اُسے تراشا جاتا ہے اور متکبر امرا کے قبضہ میں دیا جاتا ہے

کوئلہ اپنے حقیقی بھائی بہنوں کے ساتھ رہتا ہے اور ان کے ساتھ جلتا ہے۔

ہیرے میں خوبصورتی کی خیالی تنویر ہے کوئلے میں سادگی کی مادی روشنی ہے اور حقیقت کی مادی حرارت ہے

ہیرا بہت دقت سے دستیاب ہوتا ہے اور کسی مصرف میں نہیں آتا کوئلہ بہت آسانی سے مل جاتا ہے اور دنیا کے لاکھوں کام سنوارتا ہے
ہیرا امرا کا مونس ہے۔ کوئلہ غربا کا ہمدم ہے۔
اے ہیرے! تو اپنی ثروت پر نازاں نہ ہو کوئلہ تجھ سے ہزارہا درجہ بہتر ہے۔ اگر تجھے بھی بندگان خدا کی حقیقی خدمت گذاری کی چاہ ہے تو دنیا کیلئے جلنا سیکھ کہ تیری ناموری اور دنیا کی بہتری اسی میں ہے۔ گوجراتی احمد آباد (گوجراتی)

بہشت کہاں ہے؟ جاپانی ماں اپنے شیرخوار بچے کو رات کے وقت جو کہانیاں سناتی ہے ان میں سے ایک حسب ذیل ہے
ایک جنگل میں دو غریب بھائی رہتے تھے ان کے پاس نہ عمدہ کپڑے تھے نہ مکان۔ نہ روپیہ پیسہ نہ ———"
"مگر لٹو تو ضرور ہونگے"
"لٹو کہاں سے آتے۔ وہ امیر تھوڑے سے تھے۔ بیچارے جنگل کے پھل کھاتے تھے۔ ندی کا پانی پیتے تھے اور رات کے وقت نیلے آسمان کے نیچے لیٹ کر سو رہتے تھے"
"اُن کی ماں کہانیاں بھی نہیں سناتی تھی"؟
"ان کے ماں باپ نہیں تھے"
"تو جب صبح ہوتی ہوگی۔ جب آپ ہی اٹھ کر مدرسے چلے جاتے ہونگے۔ کیوں اماں جان!"
"نہیں بیٹا وہاں جنگل میں اسکول کس نے کھول رکھے ہیں۔ اب بیچ میں نہ ٹوکنا۔ نہیں میں کہانی کہنا بند کردوں گی تو وہ سارا دن کھیلتے پھرتے تھے۔ کبھی ریت کے گھروندے بناتے کبھی درختوں پر چڑھتے کبھی پانی میں نہاتے اسی طرح کئی سال گذر گئے۔ اب خدا کا کیا کرنا ہوا کہ ایک دن ایک کبوتر درخت پر بیٹھا غٹرغوں غٹرغوں کررہا تھا کہ یکایک ایک باز نے اس پر جھپٹا مارا۔ کبوتر کو اپنا ناچنا گانا سب بھول گیا۔ تیر کی طرح ایک طرف کو اڑا کہ جان بچا کر نکل جائے مگر ظالم باز نے اُسے پکڑ ہی لیا۔ کبوتر نے سمجھ لیا کہ اب مرے۔ لیکن ان بھائیوں میں سے ایک نے بڑھ کر ایک چھوٹا سا نوکیلا پتھر اٹھایا اور نشانہ باندھ کر جو مارا، تو باز مرگیا اور کبوتر اڑ کر ایک درخت پر جا بیٹھا"
"کبوتر بچ گیا نا؟ چلو اچھا ہوا!"
"یکایک وہ کبوتر ایک پری کی شکل میں تبدیل ہوگیا اور اس لڑکے سے بولا۔ تم نے مجھ پر بڑی مہربانی کی ہے جو مجھے بچا لیا ہے نہیں تو میں مرجاتی۔ یہ ظالم ایک دیو تھا اور بڑی مدت سے میرے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ اب تم مجھ سے اپنی کوئی خواہش بیان کرو میں اُسے پورا کردوں گی۔ میں پریوں کی ملکہ ہوں"
اُس لڑکے نے سوچ سوچ کر کہا ہم دونو کو دنیا کی بہشت میں پہنچا دے ہم اور کچھ نہیں چاہتے"

پری نے مسکرا کر کہا اے تم نے تو بڑی اچھی چیز مانگی۔ خیر اب تمہیں دنیا کی بہشت ہی میں لئے چلتی ہوں ذرا آنکھیں بند کر دو۔
لڑکوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ تھوڑی دیر بعد آواز آئی کھول دو۔ لڑکوں نے آنکھیں کھولیں تو کیا دیکھتے ہیں نہ وہ جنگل ہے نہ پری ہے۔ وہ جاپان میں بیٹھے ہیں۔ لڑکے بڑے خوش ہوئے کہ چلو پری چلی گئی تو کیا ہوا۔ دنیا کی بہشت میں تو جگہ مل گئی۔ اب کیا فکر ہے مزے سے بہشت میں رہیں گے۔

جام جمشید بمبئی (گجراتی)

ایک قوم پرست ہندوستانی کا گیت ۔ میں بہادر ہوں میں نے مادر وطن کی خدمت کا عہد کیا ہے اور اُسے روح و جسم کی تمام تر قوتوں سے پورا کر دوں گا۔

میں بھارت ماتا کا بیٹا ہوں میری زندگی اپنی ماں کی خدمت ہے اسکے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھنے کیلئے میں اپنی زندگی اور اسکی تمام لذتیں قربان کرنے کو تیار ہوں

میری ماں جو کبھی دنیا کی مہارانی تھی آج اپنے ہی محل میں ذلیل ہو رہی ہے اور اس کے بیٹے اسکی طرف سے بے پروا ہیں جب یہ دیکھتا ہوں۔ اور میرا دل میرے سینے میں بیتاب ہو جاتا ہے۔

دنیا کے سمندر میں کئی کشتیاں پانی پر ناچتی ہوئی آزادی اور مسرت کے مندر کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ میری ماں کی آنکھیں اس مندر کی طرف لگی ہوئی ہیں اور میرے بھائی پتوار چھوڑ کر باہمی جنگ و جدل میں مصروف ہیں۔

میں اُنکو سمجھاؤں گا۔ اور کہوں گا کہ یہ موقع خانہ جنگی کا نہیں اس وقت زندگی اور موت کا سوال ہے۔ اپنی ماں کی طرف دیکھو اس مندر کا خیال کرو جس پر ایک خوشرنگ علم لہرا رہا ہے۔ ان خوشبوؤں کی طرف سے آنکھیں بند نہ کرو۔ جو ہمارا خیر مقدم کرنے کیلئے سمندر کے دوسری طرف بازو کھولے کھڑی ہیں اور آپس میں لڑنے کی بجائے پانی کی خوفناک موجوں سے مقابلہ کرو۔

میں بہادر ہوں میں نے مادر وطن کی خدمت کا عہد کیا ہے اور میں اُسے روح و جسم کی تمام تر قوتوں سے پورا کروں گا۔

مہاراشٹر کیسری پونا (مراٹھی)

نئے افسانہ نویسوں کیلئے ۔ آج کل کہانیوں کا زمانہ ہے۔ ہر روز افسانہ نویس بڑھتے جا رہے ہیں لیکن ہمیں شبہ ہے کہ انکو کہانیاں لکھنے کا تو دور رہا کہانیاں پڑھنے کا بھی شعور نہیں ہے نئے افسانہ نویسوں کی رہنمائی کیلئے ذیل میں ہم چند ہدایات درج کرتے ہیں تاکہ وہ ادھر اُدھر نہ بھٹک جائیں۔

۱۔ سب سے اول کہانیاں پڑھو اور انہیں ایک ہی مرتبہ نگل جانے کی کوشش نہ کرو بلکہ ان کو بار بار چباؤ۔
۲۔ اپنی پہلی کہانی کو کم از کم چھ مہینے سنبھال کر رکھو اور اسکے بعد پھر پڑھو۔ تم یقیناً اُسے ردی کی ٹوکری میں پھینک دوگے
۳۔ اپنی کہانی میں تم کبھی کسی ایسے مقام کا ذکر نہ کرو۔ جو تم نے اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا ہو
۴۔ اپنی کہانی میں تم کبھی ایسے زمانہ کا ذکر نہ کرو جسکے رسم و رواج کا کماحقہ تمہیں علم نہ ہو۔

فہرستِ مضامین

جلد ۱۱ | بابت ماہ جون ۱۹۲۷ء | نمبر ۶

تصاویر (۱) آزادی وجمہوریت کی فتح (۲) دار السلطنت برطانیہ پر فرشتۂ امن کی پرواز (۳) جہاز ایس، ایس لوانتھن طوفان خیز سمندر میں

جہاں نما

ہندوستانی نوجوانوں سے خطاب

اٹھو! وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی　　دوڑو! زمانہ چال قیامت کی چل گیا

مس ایم، اے ٹاٹا ایم ایس سی بیرسٹرایٹ لا نے حسب ذیل الفاظ میں ہندوستانی طلبہ سے خطاب کیا ہے:۔

زمانۂ قدیم سے شعرا کے نغمے شباب کی تعریف کیلئے وقف رہے ہیں۔ شباب زندگی کا سب سے زیادہ بیش قیمت حصہ ہے کسی ملک کے نوجوان اس ملک کیلئے وہی حیثیت رکھتے ہیں جو حیثیت بہار کی باغ کیلئے ہے نوجوانوں کو زندہ رہنے کی خوشی کا احساس ہوتا ہے وہ زندہ تمنائیں جوان کے سینہ میں موجزن ہوتی ہیں اسی طرح اپنی نمود کی کوشش میں منہمک ہوتی ہیں جس طرح پھول موسم بہار میں زمین کا سینہ چیر کر ظاہر ہو جانا چاہتے ہیں یہی وہ حیات افروز قوتیں ہیں جو نوجوانوں کے دل میں جرأت مردانگی ہمت وشجاعت اور عزم واستقلال پیدا کرتی ہیں۔ بلاشبہ یہ قوتیں شباب ہی کا حق ہیں اسی لئے ان میں دل ہمدردی کی فراوانی اور وسعت سے مالامال ہوتے ہیں۔ دنیا گھروں کی چاردیواری کے چھوٹے چھوٹے تنگ حصوں میں تقسیم نہیں ہو چکی ہوتی اور دماغ عقائد وروایات کے زیر اثر فرسودہ نہیں ہو چکا ہوتا۔ امید اور زندہ دلی نوجوانوں کا مابہ الامتیاز ہے اور اگر یوں نہ ہوتا تو دنیا کی ترقی مسدود ہو جاتی۔ شباب کی جرأت آزمائش ہی ہر قسم کی ترقیوں کی محرک ہے زندگی وہ سب سے بڑی مہم ہے جو ہم سب کے سامنے آتی ہے اگر ہم وقت پر مقابلہ سے جی چرائیں یا پیٹھ موڑلیں تو یقیناً ہماری روح یا ہمارے جسم میں کوئی نقص ہوگا کیونکہ شباب کی فطرت میں تامل، ہچکچاہٹ اوہام ووساوس اور شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ شباب کی فطرت ہمت ہے، جرأت ہے، امید ہے آج کل ہر شخص مختلف قسم کے خواب دیکھتا ہے مختلف مطمح ہائے نظر بناتا ہے لیکن اب محض بڑے بڑے شاندار خواب دیکھنے سے کام نہیں چل سکتا۔ یہ دور عمل کا دور ہے۔ تاریخ عالم میں کسی وقت عمل کی ضرورت آج سے زیادہ محسوس نہیں ہوئی۔ یہ دور عظیم الشان قومی تحریکات کا دور ہے ہم لوگ سیاسیات وتجارت میں اتحاد وتنظیم کے فوائد سے خوب واقف ہو چکے ہیں پھر کیوں نہ ہم سب ایک قوم کے نوجوان آپس میں مل جائیں اور متحدہ عمل سے ترقی یافتہ قوموں کے دوش بدوش کھڑے ہونے کی کوشش کریں۔ اس سے پہلے کہ وقت گزر جائے ۔

کھیتوں کو دے لو پانی اب بہ رہی ہے گنگا　　کچھ کرلو نوجوانو اٹھتی جوانیاں ہیں

اقتصادیات اور ہندوستانی طلبہ

ملک کے باشندوں کی اپنے ملک کے شعبہ ہائے اقتصاد سے بیگانگی نہ صرف افسوسناک بلکہ ایک تحیر انگیز امر ہے

اہل ہند ملکی اقتصادیات سے جس قدر بیگانہ ہیں اسکے لئے کسی تشریح کی ضرورت نہیں یہ حقیقت اُس وقت اور بھی افسوسناک صورت اختیار کرلیتی ہے جب ہم اس باب میں اپنے ملک کے نام نہاد تعلیم یافتہ فرقے کے مبلغ علم کا جائزہ لیتے ہیں۔

یہ امر مسلم ہے کہ موجودہ طریقۂ تعلیم میں اقتصادیات سے بہت تغافل روا رکھا جاتا ہے اور سررشتہ تعلیم کے ارباب حل وعقد کی یہ فروگزاشت نہایت افسوسناک ہے۔ حالت یہ ہے کہ اگر کسی ایسے شخص سے جو بظاہر تعلیم یافتہ سمجھا جاتا ہو ہندوستان کی بین الاقوامی تجارت۔ محصول درآمد و برآمد یا زرمسکوک کے مسائل کے متعلق ایک آدھ سوال کرکے دیکھا جائے تو یا وہ منہ تکتا ہی رہ جاتا ہے اور یا ایسے جواب دیتا ہے جن کو سن کر پھر ہنسنے یا رونے کے اور کوئی چارہ نہیں رہتا۔ موجودہ تعلیم اس قدر ناقص ہے کہ ملک کے پڑھے لکھے لوگ بھی پیدائش وتقسیم دولت، بنک کے معمولی کاروبار، مبادلہ و قدر زر اور اصول واجرائے محصول سلطنت کے ضروری مسائل سے بالکل ناواقف ہیں۔

اگر اقتصادیات کے ابتدائی مسائل کی تعلیم ہی کسی قدر عام کردی جائے تو یقیناً تعلیم یافتہ گروہ میں سے بہت سے لوگ اس قسم کی بحث میں حصہ لینے کے قابل ہوسکتے ہیں۔ مثلاً خاص حالات میں کسی خاص تجارت کے تحفظ یا امداد میں حکومت کو حصہ لینا چاہئے یا نہیں۔

موجودہ صورت میں بجز یونیورسٹیوں اور کالجوں کے بڑے بڑے پروفیسروں کے اور کوئی شخص اقتصادی مسائل کے مباحث میں کسی قسم کا حصہ نہیں لے سکتا۔ یہی حال ہمارے اخبارات کا ہے۔ بیشتر اخبارات تو ان مسائل سے کنارہ کش ہی رہنے میں اپنی بہتری سمجھتے ہیں اور اگر کہیں بھولے سے کسی اخبار میں اقتصادی مسائل پر ایک آدھ مضمون شایع ہو بھی جائے تو اُسے کوئی سمجھ ہی نہیں سکتا۔ اقتصادی مجالس کی روئدادیں بالعموم اخبارات میں جگہ نہیں پاتیں اور اگر کبھی ایک آدھ روئداد ایسی شایع ہو بھی جاتے تو پڑھنے والوں کے ایک بہت بڑے گروہ کے لئے وہ بعید از فہم معموں کا ایک مجموعہ ہوتی ہے ع

زبان یار من ترکی و من ترکی نمی دانم

ہمارے خیال میں اس مسئلہ پر سررشتہ تعلیم کی کامل توجہ کی ضرورت ہے۔ ہمیں کوشش کرنی چاہئے کہ انٹرنس کے درجہ میں کم ازکم ہندوستانی اقتصادیات کے ابتدائی مسائل کی تعلیم لازمی قرار دے دی جائے۔

آزادی

یا مجھے آزادی دو یا موت

کامل محبت میں دُنیا کی کامل آزادی کا راز مستور ہے

بہت کم لوگ ہیں جنہیں حقیقی آزادی حاصل ہے۔ ہم سب کے سب اپنے خیالات وعادات کے غلام ہیں۔

آزادی عصمت کے مانند جب ایک مرتبہ کھوئی جائے تو کبھی اپنی پاکیزگی کو نہیں پا سکتی۔

مشیت ایزدی کی اٹھتی ہوئی موج آزادی کو دنیا کے کونے کونے میں لئے پھرتی ہے۔

آہ آزادی! کتنے ظلم ہیں جو تیرا نام لے کر کئے گئے

کیا تم آزاد ہونا چاہتے ہو؟ تو سب سے پہلے خدا سے محبت کرو اور اپنے ہمسائے سے اور ایک دوسرے سے اور بہبود خلائق کو پیش نظر رکھو۔ پھر تم سچی آزادی کو پالو گے۔

آزادی خود کسی قوم کی طرف نہیں بڑھتی بلکہ لازم ہے کہ قومیں اسکی طرف بڑھیں۔ یہ وہ نعمت ہے جسکا حصول جدوجہد کا محتاج ہے

رعایا کی آزادی بادشاہوں کی قوت کو استوار کردیتی ہے اور بادشاہ کی قوت اسی لئے ہے کہ وہ رعایا کی آزادی کی کما حقہٗ حفاظت کرے

آزادی جسم ملت کے لئے ہے جیسے صحت جسم انسان کے لئے۔ انسان کے لئے صحت کے بغیر کوئی خوشی نہیں اور ملت کے واسطے آزادی کے بغیر کوئی مسرت نہیں ہوسکتی۔

گلچیں

آزادی و جمہوریت کی فتح
(یہ مجسمہ پیرس کے ایک چوراہے میں کھڑا نظر آتا ہے)

دارالسلطنت برطانیہ پر فرشتہ امن کی پرواز
(یہ مجسمہ لندن کے باغ عامہ (ہائیڈ پارک) میں ایک بلند مقام پر نصب ہے)
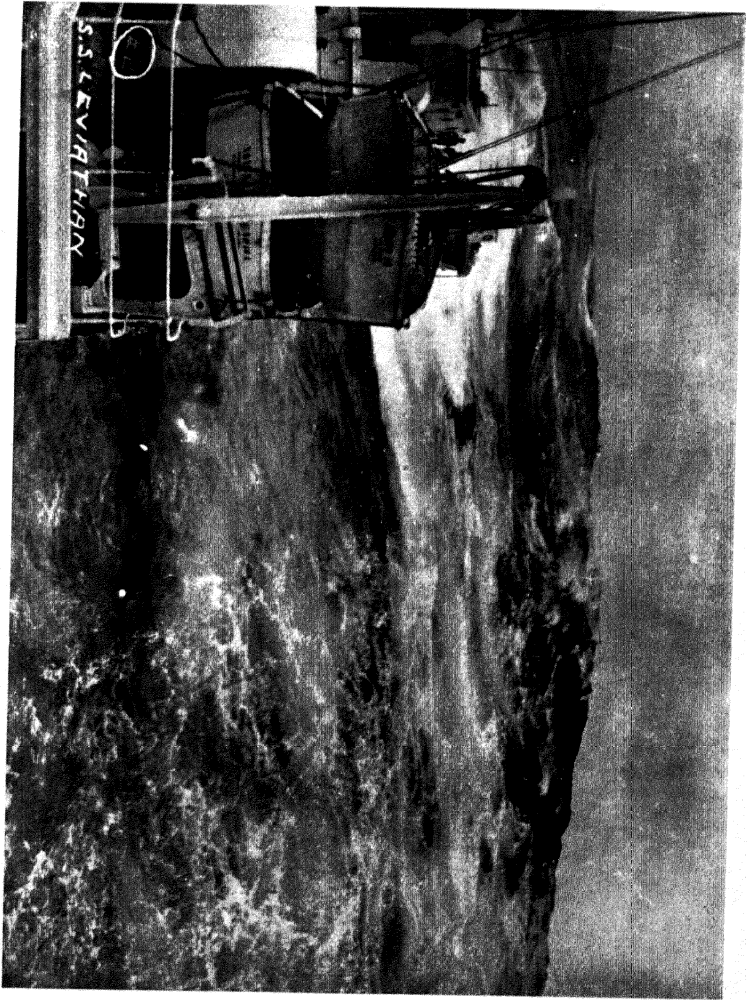
جہاز ایس ایس لیوائتھن
(طوفان خیز سمندر میں)

تین خیال

دنیا کا وہ مسافر جسے رستہ نہیں آتا اور جسے کوئی نہیں چاہتا، وہ مجبور نابینا جو آج جاپان میں ہے تو کل امریکہ اور پرسوں کلکتے، وہ جو قطب شمالی میں سوتا ہے تو قطب جنوبی میں آنکھ کھولتا ہے، شہروں کو ہلا دینے والا۔ آرام گاہوں کو مٹا دینے والا، وہ بے خبر مگر بدنام، بے سمجھ بدانجام جس سے سمندروں میں آہ و بکا ہے، وہ گردش کا مارا غریب اور آوارہ جس کا نام سن کر دہلی و لاہور کی بھولی بھالی بچیاں

جل تو جلال تو
آئی بلا کو ٹال تو

کہہ اٹھتی ہیں۔

طُوفان

مجھے امریکہ کے رستے میں ملا، جہاز پر کرسیاں اجڑ گئیں، پلنگ آباد ہو گئے، وہ لہریں جن کی انتہائی جرأت یہ تھی کہ چھ منزل نیچے کے روزنوں سے نیچے نیچے چلیں وہ اچھل کر سب سے اونچی منزل میں عرشہ پر یُوں خراماں تھیں گویا کہ گھر اُن کا ہے۔

خدا جانے کیوں مگر شاید اس وجہ سے کہ میرا دل اگر بجائے خود طوفان نہیں تو طوفان زدہ تو برسوں کا ہے مجھے کسی قسم کی بیقراری یا تکلیف محسوس نہ ہوئی برآمدے کے شیشوں کی پناہ میں گھنٹوں اس تلاطم کا، جہاز کی مستانہ لغزشوں کا، طوفان کی شہزوریوں کا لطف اُٹھایا۔ سفید دنیا میں گندمی رنگ کے واحد نمایندے کی امتیازی خصوصیتوں میں یہ ایک سرخاب کا پر اور لگا کہ Schooner اچھا ہے۔ بے پروا آنکھیں، پُرغرور ہونٹ تبسّم پیش آنے لگے مگر کہاں وہ تکلف کی گرمجوشی کہاں لہروں کی بیساختہ شوخیوں کا جادو؟ اس بھولے بھٹکے طوفان کے اضطراب میں اس قدر مشغول تھا کہ جب پہلو سے آواز آئی کہ

"آپ کو طوفان سے بہت دلبستگی معلوم ہوتی ہے"

تو میں چونک اٹھا اور ایک ثانیے کے کچھ حصے کے لئے یہ سوچا کیا کہ ان الفاظ کا مخاطب کوئی اور ہوگا۔ مگر نہیں۔ یہ

بوچھاڑ مجھی پر تھی۔

میں - جی ہاں! اس لئے کہ مجھے انسانوں سے محبت ہے۔

وہ - یہ کیسے ؟

میں - کیا ہر انسان بجائے خود ایک مرکزِ طوفان نہیں ؟

وہ - میں تو نہیں ہوں۔

میں - اپنے کسی چاہنے والے سے پوچھئے۔

وہ - آپ کو ان کا کیا پتہ ؟

میں - آپ ہی فرمائیے اس کا کیا جواب دوں ؟

اتنے میں کچھ اور لوگ آشامل ہوئے اور وہ اس قافلہ کے ساتھ سدھاریں۔ میں اور پھر وہی طوفان کی دید بازی ایک خیال تو یہ تھا کہ جس قوم کا رزق لہروں پر ہے وہ اگر دنیا پر حکمران نہ ہو تو کیا کرے "آئی بلا کو ٹال تو" کی دعا مانگنے والے بھلا ان کا کیا مقابلہ کرینگے ؟ کہاں ایک ذراسی آندھی کو دیکھکر کوٹھریوں میں گھُس کر "جل تو جلال تو" کہنے والیاں اور کہاں وہ کہ پاؤں فرش پر جمتا نہیں مگر ناچ ہے کہ جاری ہے۔ دوسرا خیال یہ تھا کہ اگر سچ بولنا نیکی ہے اور جھوٹی تہمت لگانا گناہ ہے تو دنیا میں انسان ہونے سے زیادہ ذلت اور کوئی نہیں۔ جن اشخاص کی دانشمندی پر بھروسا ہو سکتا تھا وہ بھی یہ کہتے سنائی دئیے۔ "کمبخت طوفان!" "وحشی طوفان!" "جہنمی طوفان!"

ایک نے بھی نہ سوچا کہ طوفان بچارا نہ اپنے بس میں ہے نہ اسکا کوئی فعل بالارادہ ہے۔ وہ کوئی شخص تو ہے نہیں اس ہوا کا جس پر ہماری زندگی کا مدار ہے ایک حصہ سورج کی غیر مساوی طور پر تقسیم شدہ گرمی کا شکار ہے اگر ہوا کے اس حصہ کو جاندار ہی قرار دینا ہے تو اس کے ساتھ ہمدردی چاہئے نہ کہ شکوہ اور ملامت۔ مگر انسان صدیوں سے قہر اور غضب کے اتہام لگاتا آیا ہے۔ اس دو ٹانگ والے بندر کو اپنا مرنا جینا اس قدر اہم امور نظر آتے ہیں کہ محض اپنی تسلی کے لئے اس نے جھوٹ کے ہزارہا جال چاروں طرف پھیلا رکھے ہیں اور پھر چاہتا یہ ہے کہ ان جھوٹ کے جالوں میں راستی کے ہما کو پھنسا لے۔ طوفان قہر ہے اس لئے قربانی کرو بجلی غضب ہے اس لئے بت توڑو۔ زلزلہ قیامت ہے۔ اس لئے ان انسانوں کی جو تم سے اعتقاد میں مختلف ہیں زندہ کھال اتار دو۔ یہ ہیں ان حضرت کی کارستانیاں۔ دل کے کانوں میں انگلی دئیے سچ تو سنتا نہیں خود ساختہ افترا کے طومار لگائے چلا جاتا ہے واقعی بہت ذلیل ہے۔ کیا کوئی دن آئے گا کہ بنی نوع انسان کی طرف سے طوفانوں سے بصد عجز گزشتہ اتہام کی معافی مانگی جائیگی اور آئندہ کیلئے اقرار کیا جائے گا کہ طوفان کو آفت یا قہر کی علامت نہ کہا جائیگا؟

تیسرا خیال یہ تھا کہ گو میرا ملک اس قابل نہیں مگر کاش کہ ہندوستان کی گلی گلی میں طوفان کا گذر ہو۔
میں اس خیال میں تھا اور جہاز دو بڑی لہروں کے درمیانی عمیق غار میں سرنگوں جا رہا تھا۔ یکا یک سامنے والی لہر نے زور کر کے اس کو اپنے مضبوط کندھوں پر تھاما۔ جہاز کا سامنے کا حصہ ابھرا گویا ایک مہیب مچھلی پانی میں سے اچکنے لگی ہے۔ اتنے میں لہر نیچے سے کھسک گئی اور جہاز تقریباً پچاس ساٹھ فٹ یک لخت گر پڑا۔ اس گرنے سے جو جھٹکا جہاز کے شہتیروں، دروازوں اور دیواروں کو لگا اس کی آواز گو پہلے بہت دفعہ سُن چکے تھے مگر اس دفعہ خاص طور پر دہشت خیز تھی۔ خدا جانے اوروں نے کیا سنا مگر مجھے تو صاف صاف سنائی دیا کہ طوفان نے میرے تینوں خیالوں کا جواب ایک لفظ میں دے دیا۔ شہتیروں، دروازوں، دیواروں، کی کڑ کڑ..... کڑکڑ سنائی نہ دی بلکہ صاف یہ سنا۔

ارے

او

جاہل

فلک پیما

ایس ایس لوائتھن

لوائتھن جہاز کی تصویر جو اس پرچہ کو زینت دے رہی ہے، ہمیں اپنے عزیز دوست جناب "فلک پیما" سے حاصل ہوئی ہے۔ یہ جہاز ۶۰۰۰۰ ٹن وزنی ہے ہمارے دوست لندن سے نیویارک جا رہے تھے کہ جہاز کو طوفان نے آلیا۔ مندرجہ بالا مضمون کا تعلق ایک حد تک اسی واقعہ سے ہے۔

میری دُنیا

میری دنیا جس میں میرے محل، میرے خزانے میرے باغ اور میرے کوہ و دشت پھیلے پڑے ہیں اس میں کسی غیر کا گذر نہیں وہ اپنی تمام لطافتوں اپنی ساری جدتوں کے ساتھ صرف میری ہے۔ فقط میرے لئے وقف ہے۔ وہاں دوست دشمن کا جھگڑا نہیں۔ چور کا کھٹکا نہیں۔ فنا کا بھی ڈر نہیں جو مجھے مل چکا ہے۔ وہ ہمیشہ کے لئے میرا ہے اور کچھ نہیں تو اس فانی دنیا سے اک دائمی دنیا میں ضرور اپنے ہمراہ لئے جاؤں گا۔

صحبتیں جو زندہ دل دوستوں کی تھیں، راگنیاں جو میں نے سنی اور سنائیں، ہمدردیاں جو مجھ سے کی گئیں محبتیں جو میرے لئے وقف ہوئیں کلفتیں جو کچھ میں نے سہیں لیکن زیادہ تر اوروں نے اٹھائیں خوشیاں جو میرے نصیب میں تھیں مسرتیں جو میں نے ہر ایک زندگی میں دیکھیں، کوششیں جو ناکام رہ رہ کر بارآور ہوئیں دلفریب تصویریں جن کی نقل پر اصل کا دھوکا ہوا۔ بیکس و نامراد شخص جن کی طرف میں نے کبھی کچھ التفات کی۔ مظلوم عورتیں جن کی کس مپرسی نے میرے دل کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا پھر پرانے لوگوں کی کہی ہوئی باتیں لعل و جواہر جو باوجود صدیوں کی پامالی کے ہنوز چمکتے ہیں۔ گئی گزری قوموں کے قصے جن کا غرور خاک میں مل گیا، عالی حوصلہ رہنماؤں اور پیغمبروں کی زندگیاں جنہوں نے اک دنیا کو تباہی سے بچا لیا —— قدرت کے انقلابات زلزلے، آندھیاں بجلیوں کا کوندنا۔ دریاؤں کا طغیانی پر آجانا سمندر کے طوفان باد و باراں کی لطافت آزمائیاں پھر قدرت کی حسن آفرینیاں۔ آبشاروں کے نغمے، آبجوؤں کی اٹھکیلیاں۔ بہار کی جادو نگاری۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے، میدانوں کی وسعت، پہاڑوں کی رفعت، ستاروں کی جھلملاہٹ۔ اُف! میری بے باکی و کم فہمی کی کیا انتہا ہے کہ میں کاتب قدرت ہونے کا خاموش دعویٰ کر رہا ہوں کیا میری محدودیت ان لامحدود اور بے شمار نعمتوں کا احاطہ کر سکتی ہے جن سے میری زندگی عبارت ہے؟ کفرانِ نعمت ہے کہ میں ان کو گننے بیٹھوں جب تک جسم میں جان ہے یوں وقت کو ضائع نہ کروں لطف اٹھائے جاؤں" اپنی مملکت کو بڑھائے جاؤں +

بشیر احمد

عربی ارباب قلم

مکمل تاریخ ادبیاتِ عرب لکھ دینا تو بعض وجوہ کی بنا پر اس وقت میرے بس کی بات نہیں، لیکن اس سے متعلق ایک بسیط تحریر لکھ رہا ہوں، میں نہیں کہہ سکتا کہ ناظرین کے پیش نظر کرنے کا شرف مجھے کب حاصل ہوگا؟

عربی ادبیات پر کچھ لکھنے کیلئے جو کتابیں میرے زیر مطالعہ ہیں ان میں ایک کتاب کا نام اشہر مشاہیر ادبا الشرق ہے۔ اس کتاب میں محمد کرد علی کے سلسلۂ ذکر میں موصوف کا ایک طویل مضمون الانشاء والمنشئون مندرج ہے، پیش نظر تحریر درحقیقت موصوف کے اس مفصل مضمون کی ترجمانی ہے اور ترجمہ بھی،

ادبیات عرب پر نظر ڈالتے ہوئے اگر یہ معلوم کرنے کی کوشش کی جائے کہ بادیہ نشیں شتربانوں کی محدود و مختصر زبان کیونکر اس قدر وسعت پذیر ہوگئی کہ مختلف علوم و فنون کا گہوارہ بن گئی، تو قرآن مجید و احادیث نبوی کے نفوذ و اثر سے قطع نظر کے بعد معلوم ہو جائیگا کہ اس باب میں جو کچھ حصہ ہے وہ عربی انشا پردازوں کا جن کی موثر بلاغت و فصاحت نے عربی زبان کے سر پر ایک غیر فانی تاج رکھ دیا۔

عہد آغاز اسلام میں جسے بلاغت و انشا کا دور اول کہنا چاہئے، فصاحت و بلاغت کی ریاست بلاچون وچرا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے زیر قلم تھی، محققین اس امر میں متفق ہیں کہ قرآن مجید و احادیث نبویہ کے بعد نہج البلاغۃ ہی کا مرتبہ ہے، جو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خطبات کا مجموعہ ہے جس کی تدوین شریف رضی نے کی اور شرح ابن ابوالحدید نے امام ابوبکر باقلانی اور علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے مصنفات اعجاز القرآن، اتقان، اور نہر سہر یز اور دوسری کتابوں کا مطالعہ کرنے والوں سے مخفی نہیں کہ قرن اول کے اس دور میں اور بھی بہت سے انشا پرداز ہیں، بقول رقاشی عربوں کے دماغ نے نظم سے زیادہ نثر کا حصہ پیدا کیا، لیکن نثر کا دسواں حصہ بھی محفوظ نہ رہ سکا اور نظم کا دسواں حصہ ہی بچ سکا یہ مختصر اور محفوظ حصہ طباعت کی دولت سے محروم ہے، اور زیادہ تر مغرب کی یونیورسٹیوں اور کتب خانوں میں گزشتہ خاک نشینوں کی یادگار ثابت ہو رہا ہے۔ اس دور میں جن ممتاز منشیوں کا پتہ چلتا ہے ان میں زیاد، حجاج، قطری، عمران وغیرہ قابل ذکر افراد ہیں، اس بزم کی آخری شمع حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ ابن سعد نے طبقات میں اور ابن جوزی نے مناقب میں آپ کے جو خطبات اور مختصر رسائل نقل کئے ہیں، وہ فصاحت اور بلاغت میں آیات کبریٰ کا مرتبہ رکھتے ہیں اور ان کے پڑھنے سے نہ صرف آپکے انشا پردازانہ اقتدار کا پتہ چلتا ہے۔

بلکہ آپ کی سلطنت دانی اور سیاست دانی کے حالات و واقعات بھی آئینہ ہوجاتے ہیں +

قرن ثانی کی صبح طلوع ہوتی ہے، اور سب سے پہلے ہم عبدالحمید بن یحییٰ سے ملتے ہیں، موصوف اپنے وقت کے نہایت بلیغ صاحب قلم ہیں، ان کا اسلوب تحریر دوسروں کے لئے چراغِ راہ ثابت ہؤا، اس عہد کا دوسرا مقتدر اہل قلم عبداللہ بن المقفع ہے اس فصیح اور بلیغ محرر نے جو کچھ لکھا وہ تکلف اور تصنع سے خالی ہے، اس کی کل کتابیں کلیلہ و دمنہ کی طرح انتہائی بلاغت میں رنگی ہوتی ہیں، اس شخص کی عمر نے کچھ زیادہ وفا نہ کی اور وہ صرف چھتیس برس جیا ورنہ اپنے مقلدین اور متبعین کا ایک کثیر التعداد گروہ چھوڑ جاتا، سہل بن ہارون بھی اس قرن کا قادر القلم ادیب ہے، اس صاحب انشا کے قلمی آثار اگرچہ کتابوں میں بہت کم اور مختصر مذکور ہیں، لیکن جو کچھ بھی ہیں وہ اس کے اقتدار اور جامعیت پر شاہد عادل ہیں، اس کی تحریر سہل اور ممتنع کی خصوصیت رکھتی ہے، اور مبتذل کلمات اور حشو و زوائد سے پاک ہوتی ہے۔ امام جاحظ نے صاحب قلم کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے "انشا پردازوں کے الفاظ و کلمات پیچیدہ وحشی، مبتذل اور بازاری نہیں ہوتے" سہل بن ہارون اس تعریف کا پورا پورا مصداق ہے، اسمٰعیل بن صبیح (ہارون رشید کا کاتب) عمر بن مطرف (منصور و مہدی وغیرہ خلفا کا کاتب) صالح بن جناح (مصنف کتاب الادب والمروۃ) خلیفہ معتمد علی اللہ کا وزیر ابو اسحٰق ابراہیم ابن محمد المدبر یہ لوگ اس عہد کے نہایت فصیح الکلام اور بلیغ القلم افراد ہیں، موخر الذکر کے آثار بلاغت میں النظم الرائق والنثر الفائق، ادوات الکتابۃ، الرسالۃ العذراء فی موازین البلاغۃ جیسی بہترین تصانیف ہیں، رسائل البلغا جو مطبوعات جدیدہ کی ایک ممتاز کتاب ہے اور جس میں چوٹی کے ارباب بلاغت جمع ہیں، ابو اسحٰق کا رسالۃ العذراء اس میں شائع ہوچکا ہے، یوں تو اس عہد کے ادبا میں بکثرت افراد داخل فہرست ہیں جیسے عبداللہ بن المقفع، عمار بن حمزہ، خالد بن یزید، محمد بن محمد الشی، ابن ابی شیخ سالم بن عبداللہ، سعدہ، ہرمز، عبدالجبار بن عدی، احمد بن یوسف، ابراہیم بن عباس صولی، حسن بن وہب، سعید بن عبدالملک، وغیرہ وغیرہ لیکن ان مالکان قلم میں صرف ابن المقفع احمد بن یوسف اور صولی ہی تین شخص ایسے ہیں جن کی قلمی خدمات اب تک لماریوں کی زینت ہیں۔ باقی افراد کے نقوش قلم گردش روزگار کے ہاتھوں یا تو بالکل محو و برباد ہوچکے یا اس قدر مختصر موجود ہیں کہ ان پر حکم نہیں لگایا جاسکتا۔

تیسرا قرن شروع ہوتا ہے اور امام جاحظ کو پیش کرتا ہے۔ یہ ممتاز اور فائق ادیب اپنے افکار و علوم کا نہایت قادر القلم محرر تھا، جس بے تکلفی کے ساتھ مختلف موضوعوں پر اُس نے مخصوص اسلوب تحریر میں اپنی ادبیت صرف کی ہے اس کی نظیر سے ماسبق کا عہد خالی ہے، اس کی تحریر کے کلمات جتنی بار بھی دہرایئے ان کی شیرینی کم نہیں ہوتی، اس کی

عبارت جتنی دفعہ پڑھیے معانی کی لطافت، بندش کی چستی، ذہن میں اتری چلی جاتی ہے، پڑھتے جائیے اور دل نغمہ آفریں کرتا جاتا ہے۔ کہ لکھنے والا کلمات کے برمحل استعمال کرنے پر پورا پورا قادر اور زبان کے نکات و اسرار کا ماہر کامل ہے۔ اثنائے تحریر میں جاحظ افکار میں تبدیلی پیدا کرنے کی غرض سے کہیں کہیں عامی الفاظ بھی استعمال کرتا ہے اگر ہم ایسے ادبا کی تلاش کریں جو اپنے زور تحریر اور قدرت قلم کی بنا پر حق کو باطل اور باطل کو حق کر دکھاتے ہوں تو جاحظ سے قبل ہم کو قریب قریب مایوس ہو جانا پڑتا ہے یہ امام قلم ایک بات لکھتا ہے اور اس طرح لکھتا ہے کہ قاری کا ذہن بالکل مطمئن اور قانع ہو جاتا ہے، لیکن اس کے بعد ہی وہ بالکل برعکس لکھتا ہے، اور اس بہترین انداز سے کہ پہلے کا اطمینان غائب اور قناعت کافور ہو جاتی ہے۔ جاحظ اپنی پوری کتاب میں اس طرح ناظرین کے دل و دماغ کے ساتھ جادو بھرا کھیل کھیلتا جاتا ہے۔ امام موصوف کی ہر کتاب درحقیقت زمانہ کی دستبرد سے بچا ہوا ایک خزانہ ہے جو عربی کتبخانوں کے لئے سرمایۂ صد افتخار ہے۔ موصوف کی کوئی کتاب بھی کھولو تفنن اور جدت کا وہ عالم تمہارے پیش نظر ہوگا کہ انگشت بدنداں رہ جاؤ گے۔ تم بچشم خود مشاہدہ کرو گے کہ کس طرح معانی اپنی لطافتوں کا لشکر لئے ہوئے جاحظ کی دعوت پر لبیک کہتے ہیں۔ کس طرح افکار اپنی دلکشی و شیرینی سمیت موصوف کے دربار قلم میں غلامانہ اطاعت و فرمانبرداری کے ساتھ حاضر ہوتے ہیں۔ ہاں اس کی کتاب میں قاری کی وحشت کا بھی کچھ نہ کچھ سامان رہتا ہے۔ اور وہ گاہے گاہے ظرافت کی چال بھی چل جاتا ہے، جاحظ کا مخصوص رنگ اس کی کل کتابوں میں موجود ہے چنانچہ الحیوان، البیان و التبیین البخلا، المحاسن والاضداد، الحاسد والمحسود وغیرہ مصنفات کا مطالعہ کرنے والا اس امر کا تصریحی اعتراف کر سکتا ہے، موصوف کی ضخیم کتابوں سے قطع نظر کر لینے کے بعد ان کے مختصر مختصر رسائل بھی جو مطبوع ہو چکے ہیں یہ شان رکھتے ہیں کہ اُن کے ایک ورق کو کسی مستقل تصنیف کا ہم رتبہ قرار دیا جائے۔ ابو حیان کہتا ہے کہ متقدمین اور متاخرین میں سے صرف تین آدمیوں کو میں منتخب کرتا ہوں، ابو عثمان الجاحظ، ابو حنیفہ دینوری مصنف الاخبار الطوال، ابو زید احمد بن سہیل البلخی یہ وہ افراد ہیں کہ ان کے فضل و کمال، علوم و فنون، مصنفات و رسائل کی داد پورا عالم دے تو کم ہے، اس قسم کے عجیب انداز میں ابو حیان ان تینوں کی تعریف و توصیف کرتا ہے۔

متقدمین کے علوم و فنون کے تراجم کا آغاز قرن اول کے وسط میں خالد بن یزید اموی کے زیر عنایت ہوا اور حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کے زیر اہتمام آخری صدی کے آخر تک ہوتا رہا، اس عہد کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ منصور عباسی کے دور میں اس شعبہ کی طرف کافی توجہ مبذول ہوگئی، اور پھر مامون کے عہد میں تو توجہ کی کوئی حد نہ رہی، اب کیا تھا مختلف علوم و فنون نے عربی میں ایک نئی روح پھونک دی۔ اور اس کا دامن یونانی، سریانی، فارسی

ہندی وغیرہ متعدد زبانوں کے تراجم سے مالامال ہوگیا۔ طرز تحریر کی رنگا رنگی، اسلوب نگارش کے تنوع افکار اور خیالات کی جدت وندرت کے اعتبار سے عربی زبان کو وہ دن دیکھنے نصیب ہوئے جو اس سے قبل کبھی نصیب نہ ہوئے تھے۔ متعدد اجنبی اقوام کا یہ پہلا اثر تھا جس سے عربی زبان متاثر ہوئی، اور اس قدر ہوئی کہ شعر و سخن، اخلاق و محاسن کی حد سے ترقی کر کے علوم و فنون کی زبان بن گئی، درحقیقت مامون کا مبارک عہد علم و ادب اور عربی تمدن کی کل تمہیدات کا زرین عہد ہے۔ عہد مامون کا اولیں بلیغ اہل قلم احمد بن یوسف ہے۔ موصوف کے آثار قلم کا پتہ صولی کی کتاب الاوراق (قلمی) اور ابن طیفور کی کتاب کتاب بغداد (مطبوعہ) نیز تراجم المطولہ میں چلتا ہے، احمد کی تعریف کے لئے صرف اسی قدر کہہ دینا کافی ہے کہ خلیفہ مامون الرشید جیسے فرزانہ حاکم نے اس کے زور قلم کا لوہا مان لیا۔ اور اپنی طرف سے قلمدان وزارت پیش کردیا اس عہد کے مقبول القلم افراد کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ بعضوں کے نام یہ ہیں۔

عمر بن مسعدہ (وزیر مامون) ابوالفتح البستی، ابن علی الامغانی، مامون الرشید نے بلاغت کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے "دو طوالت سے دوری اور معانی مقصودہ سے تقرب، کم الفاظ میں بہت سے معانی ادا کردینا" عمر بن مسعدہ کی ادبیت اور انشا پر مامون کی یہ تعریف پوری پوری صادق آتی ہے۔ اس عہد کی مقبول کتابیں حسب ذیل ہیں۔

الامامۃ والسیاسۃ، کتاب الحرب، الاشربہ، المعارف، عیون الاخبار، ادب الکاتب، یہ کتابیں ابن قتیبہ کی تصانیف ہیں جو اپنی علمیت و انشا پردازی اور زورِ قلم کی ہمہ گیری میں امام جاحظ کا ثانی ہے، ادب الکاتب کی شرح مصنفہ ابن سید بطلیوسی۔ التنبیہ علی اوہام ابی علی فی امالیہ مصنفہ ابوعبید بکری جس کے زور قلم کا نتیجہ کتاب معجم ما استعجم ہے

قرن رابع کے ادبا میں پہلا نمبر احمد ابن یوسف معروف بہ ابن الدایہ کا ہے، جو بغدادی الاصل ہے اور جس کے والد مصر سے بغداد آئے تھے۔ یہ زبردست ادیب حکومت طولونیہ کا محرر تھا۔ اس کے آثار قلم میں حسن العقبیٰ اور کتاب المکافاۃ ہے، جو بلاغت اور انشا کے نمونے ہیں دوسرے اہل قلم افراد حسب ذیل ہیں۔

ابوبکر صولی ان کے نتائج قلم، کتاب الاوران اور ادب الکاتب کے صفحات میں موجود ہیں، احمد بن عبد ربہ مشہور کتاب عقد الفرید کے مصنف۔ جعفر بن قدامہ بن زیاد الکاتب، ابوالفضل ابن العمید (وزیر بنو بویہ) ابوالفضل کے والد حکومت سامانیہ کے محرر تھے، ابوالفضل سجع اور بدیع کی صنعت کا ناشر ہے، کہا جاتا ہے کہ رسائل کی انشا عبدالحمید سے شروع ہوئی اور ابن العمید پر جاکر ختم ہوگئی جس طرح شعر گوئی کا آغاز امراء القیس سے ہوا، اور اختتام ابوفراس ہمدانی پر، ابن عباد ابن العمید کے متعلق رائے ظاہر کرتے ہوئے لکھتا ہے

"ادبائے عصر چار ہیں استاذ رئیس (ابن العمید) ابو القاسم عبدالعزیز بن یوسف۔ ابو اسحٰق صابی اور چوتھا خود سمجھ لو یعنی مجھ کو"

اسی طبقہ کے افراد میں مخصوص فرد ابوبکر خوارزمی ہیں (۳۸۳ھ) موصوف اسلوب انشا میں ابن العمید کے ہمرنگ تھے آپکے مشہور مطبوعہ رسائل جو سرتاپا سجع اور صنائع کی پابندیوں سے پر ہیں، فصاحت و بلاغت کے بہترین آثار ہیں۔ ان کے بعد بدیع الزمان ہمدانی کا نمبر ہے (۳۹۵ھ) جن کے رسائل اور خصوصاً مقامات کافی شہرت پاچکے ہیں ہمدانی خوارزمی کی طرح سجع اور صنائع کے پابند نہیں۔ مخصوص مقامات اور مقررہ جملوں میں کہیں کہیں کوئی صنعت ملحوظ رکھی ہے، اور پھر وہی اپنا مخصوص رنگ جو ناظرین کے لئے نہایت دلکش و دلچسپ ہوتا ہے، اس دور کے قادر القلم ادبا میں۔ صابی بھی ایک ادیب ہیں، موصوف کے آثار قلم کے جو اقتباسات ہم کو ابوالعباس کی صبح الاعشیٰ میں ملتے ہیں وہ ان کی بلاغت اور قدرت انشا کے بہترین نمونے ہیں، صابی اگر اپنی تحریروں میں بعض صنائع اور سجع کا پابند نہ ہوتا تو یقیناً اس کے نقوش قلم اسلام کے لئے باعث صد فخر اور اخلاف کے لئے زبردست معلم ثابت ہوتے،

حسب ذیل افراد اسی دور کے قابل ذکر اور ممتاز ارباب قلم ہیں:۔

ابوالفرج ببغا۔ عبداللہ بن عمرو الفیاض (محرر سیف الدولہ) ابوالقاسم علی اسکافی نیشاپوری جو نثر نویسی کے اقتدار اور نظم سے بے اعتنائی میں امام جاحظ کی طرح ہیں۔ علی بن ہند اور مصنف الکلم الروحانیہ، یحییٰ بن عدی تہذیب الاخلاق و سیاستہ النفس کے مصنف (۳۶۴ھ) ابن حبان بستی (۳۵۴ھ) اور مصنف کتاب روضۃ العقلاء، حاتمی جنہوں نے اپنے رسالہ حاتمیہ میں متنبی کے سرقات اور اس کے عیوب شعری کی تفصیل لکھی ہے۔ قاضی تنوخی (۳۸۴ھ) جن کے آثار قلم میں النشوار اور الفرج بعد الشدہ ہے، قدامہ بن جعفر کاتب (۳۳۷ھ) جن کی تصانیف میں نقد الشعراء اور کتاب الخراج ہے، ابن نباتہ جن کے خطبات دنیا بھر میں مشہور ہیں، ابوجعفر محمد بن العباس خلیفہ مکتفی اور مقتدر کا وزیر، ابومنصور بغوی (۳۷۵ھ)، اس عہد کے ارباب قلم کا رئیس اعظم ابوالعلا معری جس کی طبیعت پر شعریت غالب تھی، موصوف کی تحریروں میں مغلق لغات کا استعمال بڑی فیاضی سے کیا گیا ہے، اور ظاہر ہے کہ اس خصوصیت کے لئے کس قدر کاوش اور خشک طبعی کی ضرورت ہے،

معری کا رسالہ غفران جسے اس نے ابن قارح کے جواب میں لکھا تھا (یہ دونوں رسائل مطبوع ہیں) اٹلی کے مشہور معروف دانتی کے بعض افسانوں سے بہت زیادہ مشابہ ہے اور اس امر سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ معرہ کا ایک نابینا شاعر شعری اور تخیل میں اٹلی کے ماہر فن شاعر کا استاد اور رہبر ہے، یورپ کے بعض مستشرقین نے بحث کی ہے کہ دانتی نے حکایات الیسہ

میں سے تین حکایات جہنم، جنت اور مطہر کو سن ۱۳۰۰ سے ۱۳۱۸ تک مطبوع ہو چکی ہیں، اور خصوصاً فسانہ جہنم کو معری کے رسالہ غفران سے اخذ کیا ہے، دانتی نے اپنے افسانوں میں کل تخیلات اسی انداز پر قائم کئے ہیں۔

معری نے ابو تمام کے دیوان پر ذکری حبیب کے نام سے اور بحتری کے دیوان پر عبث الولید کے نام سے اور متبنی کے دیوان پر معجزۃ احمد کے نام سے جو تبصرے کئے ہیں، وہ اس بات کے ثبوت ہیں کہ معری اسرار عربیت کا کس قدر گہرا واقف اور عربوں کے کلام و محاورات سمجھنے میں کتنے درجہ کا منتہی فرد تھا اُسے ادبی تنقید میں کیسا راسخ ملکہ حاصل تھا، اس وقت ہمیں اس کے دیوان اور خصوصاً لزومیات سے قطع نظر کر لینا چاہئے، کیونکہ وہ نرا ادیب اور انشا پرداز نہ تھا بلکہ اُسے فلسفی اور لغوی ہونے کی زبردست حیثیت بھی حاصل ہے۔

انہیں لوگوں میں علی بن خلف ہیں جو مواد البیان کے مصنف ہیں، مواد البیان کا ایک کافی حصہ قشقلندی نے صبح الاعشیٰ میں نقل کیا ہے۔

پانچویں صدی میں کثیر التعداد اہل قلم پیدا ہوئے جن میں سے وہ مشہور افراد حسب ذیل ہیں جن کے آثار قلم کا کچھ نہ کچھ حصہ اب تک محفوظ ہے۔

امیر قابوس بن وشمگیر (۴۰۳ھ) موصوف کے آثار قلم میں کمال البلاغت نامی ایک کتاب ہے، آپ کی تحریریں گیا ہوتی تھیں۔ موسیقی کے نغمے اور بلا قافیہ وردی کے اشعار، مگر سجع کی پابندیوں پر سختی سے قایم تھے، امام ثعالبی (۴۲۹ھ) جو اس عہد کے اہل قلم افراد کے سردار تھے اسلوب تحریر میں امیر موصوف کے برعکس تھے، ثعالبی کے دماغ نے لغت و ادب کی جلیل ترین خدمتیں انجام دی ہیں، فقہ اللغتہ کے اوراق آج بھی اُن کے ثبوت میں پیش کئے جا سکتے ہیں، کتاب یتیمۃ الدہر جس میں ثعالبی نے ادبائے عصر کے حالات و تراجم لکھے ہیں اگر سجع کی پابندیوں سے بے نیاز ہوتی جس طرح المضاف والمنسوب، لطائف المعارف وغیرہ کتابیں اس صنعت سے خالی ہیں تو وہ ایک بے عیب شے ہو جاتی، ابن رشیق قیروانی نے اپنے انتقادی رسائل میں اس گرانقدر کتاب پر تبصرہ کیا ہے۔

عہد قدیم میں لوگ چار کتابوں پر بہت زیادہ اعتماد رکھتے تھے اور ان چاروں کو ادبیات میں نہایت وقیع اور مستحکم جانتے تھے۔ جاحظ کی البیان والتبیین، ابن قتیبہ کی ادب الکاتب مبرد کی الکامل اور ابو علی قالی کی امالی، ان کتب اربعہ کی شرحیں بھی لکھی گئیں، تنقیدیں بھی ہوئیں اور تلخیص و تبصرہ بھی کیا گیا۔

چوتھی صدی کے اوائل میں جن اہل قلم افراد کی وفات ہوئی ان میں ابو حیان توحیدی قابل ذکر فرد ہے، توحیدی ایک مخصوص طرز تحریر کا موجد ہے، جس کی شہادت میں اس کی کتاب المقابسات الصدیق والصداقہ، اور اشارات الہیہ

کے اوراق پیش کئے جا سکتے ہیں، امام ثعالبی نے آل بویہ کے محررین کا تذکرہ لکھتے ہوئے حسب ذیل تین شخصوں کا ذکر کیا ہے اور اُن کے کلام کے پاکیزہ نمونے پیش کئے ہیں۔

ابوالقاسم عبدالعزیز بن یوسف، ابو احمد عبدالرحمٰن بن الفضل الشیرازی، ابوالقاسم علی بن القاسم قاشانی وقیع اور مقتدر ارباب قلم کے طبقۂ اولیٰ میں شمار کئے جانے والے افراد یہ ہیں، ابوالفرج اصفہانی، مشہور کتاب اغانی کے مصنف، ابوالحسن بن عبدالعزیز مصنف الوساطۃ بین المتنبی وخصومہ امیر عبداللہ میکالی، ابوالنصر عتبی مصنف تاریخ سبکتگین (معروف بالیمینی تاریخ ابن سبکتگین سجع اور بدیع کے سلسلہ میں ایک بہترین یادگار ہے،

اس عہد کے ارباب قلم میں ابن موصلایا (۴۹۸) اور ابن ناقیا (۴۸۵) اور موفق بن خلال مشہور افراد ہیں، نیز حافظ عبیدی کے عہد میں دیوان انشا کا صدر بھی مقتدر ادیب تھا، موصوف کو صنعت ترسل میں کمال قدرت حاصل تھی، موفق بن خلال کی تحریروں میں سجع کی پابندیوں سے زیادہ معانی کی رعایت ملحوظ ہے، مصر میں جب سلطنت علویہ کا دور دورہ تھا، بلاغت و انشا کو معراج کمال حاصل تھی، چنانچہ اس وقت کا دفتر مراسلات مقتدر ارباب قلم کا مرہون قلم رہا کیا۔ انہیں خداوندان قلم کی تحریری طاقت و جبروت میں سلاطین وقت کا جلال و رعب مضمر رہا۔ اس وقت کے مقبول الانشا اور ذی اثر افراد میں ہلال بن المحسن صابی قابل ذکر شخص ہیں۔ کتاب اخبار الوزرا موصوف ہی کی انشا کا نتیجہ ہے، احمد بن مسکویہ (۴۲۱) اگرچہ آپ کا شمار طبقۂ فلاسفہ میں ہے تاہم تہذیب الاخلاق۔ الفوز الاصغر تجارب الامم وغیرہ آپ کی مصنفات آپ کو ایک ماہر منشی اور زبردست انشا پرداز ثابت کرتی ہیں۔ انہیں افراد میں ابو طاہر محمد بن حیدر (۵۱۷) ہیں، موصوف نے قانون البلاغۃ کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے، جو اب تک طباعت کی نعمت سے محروم ہے۔

اس عہد نے اندلس میں وزیر بن زیدون (۴۶۳) کو پیدا کیا، جس کی بلند ادبیت کا نہایت وقیع ثبوت اس کا وہ مشہور رسالہ جو اس نے مستکفی باللہ کی لڑکی ولادہ (جو اپنے عہد کی نہایت بلیغ الکلام ممتاز خاتون تھی) کی زبان سے ادا کیا ہے۔ اندلس کا ایک زبردست ادیب ابن حزم اندلسی (۴۵۶) ہے جو بہت اچھا لکھنے والا ہے اور ساتھ ہی اس کے بہت زیادہ لکھتا ہے۔ ابن حزم کی طوق الحمامہ اور اس کے اخلاقی رسائل اس کی زبردست ادبیت کے شاہد ہیں، موصوف کی تحریریں پڑھنے والے کو فرانس کے چودھویں وزیر کا عہد ادب یاد آجاتا ہے،

اندلس میں اس عہد کے اور اس کے بعد والے عہد میں محررین اور اہل قلم افراد کا ایک طبقہ پیدا ہوا، جس میں بعضوں نے قلمدان وزارت اپنے قبضے میں کر لیا، جس طرح آج بلیغ ترین خطیب وزارت عظمیٰ کا اہل تصور کیا جاتا ہے، اسی طرح

اس عہد میں یہ خیال غالب تھا کہ بہترین صاحبِ قلم ہی وزارت کا مستحق ہے، اس قسم کے افراد میں حسب ذیل اہل قلم قابل ذکر ہیں +

باجی۔ ابن دباغ، ابن جلد۔ ابن قاسم۔ ابو الاصبغ۔ ابو عامر۔ ابن سفیان۔ ابن الحاج۔ ابن عبدون۔ ابن ابو الخصال

ابن عبد العزیز۔ ابن سقاط۔ ابن القصیرہ،

ان لوگوں کا اسلوبِ تحریر قدما کا ہمرنگ ہے، ان کی انشا میں متاخرین کی طرح سجع اور صنائع کی پابندیاں نہیں ہاں مگر بعض بعض افراد کی تحریروں میں کہیں کہیں متاخرین کا رنگ بھی جھلکتا ہے، لیکن یہ آمد کا درجہ رکھتا ہے آورد کا نہیں، ان بعض افراد میں ذیل کے نام گنائے جاسکتے ہیں +

ابن عبد الغفور، ابن عمار، ابن الافطس، ابن امین، ابن سالم، منذر بن سعید۔ ابن امین، ابن لبانہ، ابن عبد البر فرضی، ابن سعید (مورخ) ابن حیان، ابن قطویہ، ابو عبید بکری جن کے آثار قلم میں معجم، استعجم اور المسالک والممالک دو ممتاز کتابیں ہیں، ابن طفیل جو رسالہ حی بن یقظان کے مصنف ہیں، اس رسالہ میں نشو و ارتقا کے نظریہ کے متعلق اشارات ہیں۔ اسی قسم کے افراد میں بطلیوسی، ابن تومار۔ ابن ہود۔ تحلی۔ اشبونی۔ قسطلی۔ ابن لبون۔ ابن زرین، نمری سرقسطی، ابن قلاس، صناعی، بہاری، حجازی، دانی، بلنسی، طلیطلی، وغیرہم ہیں۔ انمیں سے ہر فرد ایک مجدد منشی فصیح و بلیغ مصنف کا مرتبہ رکھتا ہے، اور یہ کوئی تعجب خیز امر نہیں اس لئے کہ اندلس نے علم و ادب کی بڑی بڑی ہستیاں پیدا کیں، جن کی تحریریں اپنی مغربی خوشبو سے دل و دماغ کو معطر کرتی ہیں۔ عرب علمائے اندلس کے تراجم کے سلسلے میں اسپین کی کسی مشرقی سوسائٹی نے ایک کتاب شایع کی ہے، جس میں تین ہزار افراد کا تذکرہ ہے۔ ان میں علما بھی ہیں، ادبا اور فقہا بھی، مہندس بھی ہیں اور اطبا بھی، قلائد العقیان اور مطمح الانفس کے مصنف فتح بن خاقان (۵۳۵ھ) اور ابن بسام نے بھی اندلسی ادبا کے تراجم میں کتابیں لکھی ہیں۔ دار السلام بغداد میں جن بلیغ محررین نے وزارت کا مرتبہ حاصل کیا اُن میں وزیر علی بن عیسیٰ اور وزیر ابو الحسن بن الفرات قابل ذکر ہیں۔ مقدم الذکر اپنی انشا میں ترسل کا وہ رنگ رکھتے ہیں کہ وہ کسی کو نصیب نہیں حتیٰ کہ ابن الفرات بھی اس سے محروم ہیں، انہیں لوگوں میں ابو علی بن خاقان اور محمد بن عبد الملک الزیات وغیرہ مشہور افراد ہیں، اور بعض اوقات غیر مشہور ارباب شہرت سے زیادہ اہلیت و قابلیت کے مالک ہوتے ہیں۔

اس عہد کے نثر نویسوں میں امام حریری (۵۱۰ھ) پیش پیش ہیں، جن کے آثار قلم میں مقامات اور درۃ الغواص جیسی کتابیں ہیں، مقامات کو جو مقبولیت حاصل ہوئی وہ کسی سے مخفی نہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس مقبول کتاب کی انشا

سرتاپا تکلف و تصنع ہے اگر حریری اور حجۃ الاسلام (امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی انشا کا مقابلہ ہو اور ہمیں اختیار دیا جائے تو ہم امام غزالی کی تحریروں کو نسبتاً زیادہ پسند کریں گے۔ خصوصاً مولانا کا وہ رنگ جو احیاء العلوم کے تیسرے حصے میں ہے اور جس کی جھلک تہافۃ الفلاسفہ۔ التفرقہ بین الاسلام والزندقہ وغیرہ رسائل میں نظر آتی ہے۔ اسی سلسلہ میں راغب اصفہانی اور ماوردی بھی ہمارے نزدیک حریری کے مقابلہ میں مستحق ترجیح ہیں۔ راغب کی محاضرات، تفصیل النشاتین اور الذریعہ الی مکارم الشریعہ ماوردی کی ادب الدنیا والدین۔ احکام السلطانیہ پڑھئے۔ حریری کی عبارت میں تعمل کی صنعت ملحوظ ہے جس کا امتیاز صرف انہیں افراد کے لئے مخصوص ہے جو عربی لغت اور اس کے لوازمات کے ماہر اور ساتھ ہی اس کے متمنی ہیں کہ اپنی پوری عربیت، ادبیت اور ٹھوس لغویت ایک جگہ جمع کر دیں۔ ابن الخشاب کی رائے ہے کہ حریری مقامات کا آدمی ہے، یعنی مقامات کے علاوہ اسے کسی امر میں کچھ دسترس نہیں، اور غالباً علامہ جاراللہ زمخشری (۵۳۸) کی ادبیت حریری کی انشا پر فائق ہے جس کا ثبوت موصوف کی تفسیر، مفصل، اساس البلاغۃ مقامات، اطواق الذہب، الکلم النوابغ، الفائق وغیرہ مصنفات سے بخوبی مل سکتا ہے، یہ مصنفات انتہائی لطافت ورقت کے محاسن سے معمور ہیں۔ زمخشری اور رشید الدین وطواط کے مابین کچھ چشمک تھی لیکن زمخشری اپنی ادبیت اور علم میں بہت زیادہ وسعت کا مالک ہے۔ ابن جوزی (۵۹۷) اس عہد کا بہت بڑا صاحب قلم واعظ ہے۔ اور کثیر التعداد مصنفات کا مصنف، موصوف کی کتابوں کا جو رنگ ہے اسکو Folklore سے تشبیہ دی جاسکتی ہے جسے اہل فرانس "عادات و مراسم" کے مرادف معنی کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ کتاب الاذکیا، اخبار الحمقی والمغفلین وغیرہ ابن جوزی کی اسی قسم کی کتابیں ہیں، عربی ادبیات میں اس نوع کی کتابیں بکثرت ہیں جیسے اخبار عقلا ریحانین مصنفہ حسن بن حبیب معتسر

تاریخ نے قرون اولیٰ کے اس قسم کے بہت سے اہل قلم افراد کا پتہ چلایا ہے جو آج کل کے یورپین افسانوں کے مشابہ حکایات و روایات تصنیف کرتے تھے۔ اس قسم کے افسانوں سے آج کسی تحریک کی تبلیغ و اشاعت مقصود ہوتی ہے، یا عوام کے افکار و خیالات کو ایک طرف متوجہ کرنا تاکہ وہ حکومت کے مصالح اور مہمات میں توجہ کر کے دخل انداز نہ ہوسکیں، اس سلسلہ میں جس قدر قصص اور خرافات لکھے گئے اس کے بعض حصے فارس، ہند، روم، بابل وغیرہ سے ماخوذ ہیں اور بعض خود عربوں کے طبعزاد،

عہد جاہلیت کے عاشقوں کے حالات سے متعلق عشقیہ قصص، معشوقوں کے دلچسپ و ظرافت آمیز واقعات حسن و عشق کی پرناز و نیاز روایات یہ سب اسی سلسلہ کی مختلف کڑیاں ہیں، اسی نوع میں متاخرین کی کتاب الف لیلۃ و لیلہ

اور سندباد بحری کا قصّہ ہے جو مشرق میں کافی شہرت حاصل کرچکا ہے، لیکن ان ادبیات کا شمار بلند لٹریچر میں اس لئے نہیں کہ وہ عوام کیلئے تصنیف ہوئیں۔ اور اُن کے لکھنے والے کسی فصیح و بلیغ قلم و زبان کے مالک نہ تھے۔

اس صدی کے ممتاز فرد ضیاء الدین بن الاثیر ہیں۔ جن کی کتاب المثل السائر پر ابن ابی الحدید نے سختی سے تنقید کی ہے، اور اپنی کل تنقیدوں کو ایک کتاب الفلک الدائر علی المثل السائر میں جمع کردیا ہے۔ اس عہد کے مسلم اور متفق استاد قاضی فاضل (وزیر صلاح الدین) ہیں۔ قاضی صاحب اپنی تحریروں میں زیادہ تر سجع و صنائع کے پابند تھے اگر موصوف کی کل تحریریں جمع کی جائیں تو متعدد ضخیم جلدوں کی ضرورت ہوگی۔ آپ کے آثار قلم کا جو مختصر حصہ ابو العباس نے صبح الاعشیٰ میں نقل کیا ہے۔ نیز کتاب روضتین میں جو اقتباسات ہیں وہ نہایت بہتر اور دلچسپ ہیں۔ آپ کے بعد عماد الدین اصفہانی کا نمبر ہے۔ اصفہانی قاضی صاحب کے ہمرنگ بلکہ مقلد ہیں۔ لیکن تعلّی اور ادعائے برتری میں وہ ضیاء الدین مصنف المثل السائر کے ہمنوا ہیں، ادعا اور تعلی خواہ وہ صداقت و صحت کے حدود میں کیوں نہ ہو انسان کے علمی وزن کو بہت کچھ کم دیتی ہے۔ موصوف کی ادبیت و انشاپردازی کا بہترین نمونہ آپ کی کتاب الفتح القسی اور اور زبدۃ النصرۃ ہے، قاضی صاحب اور اصفہانی کے عہد میں ایک ظریف ادیب بھی تھا، جس کا نام وہرانی رکن الدین ابو عبداللہ محمد (۵۷۵) ہے، وہرانی کے آثار مستحر میں المنامات والرسائل نام کی ایک کتاب ہے جو اب تک غیر مطبوع ہے، ابن خلکان کی تصریح کے مطابق آپ نے ظرافت کا رنگ اس لئے اختیار کیا کہ قاضی فاضل اور عماد الدین کی موجودگی میں کسی کی ہوا بندھنا مشکل تھا، اس عہد کے افراد میں ابن منقذ بھی ہے، موصوف کی قلمی خدمات میں کتاب الاعتبار ہے جس میں شجاعت اور مردانگی سے متعلق قصص اور واقعات ہیں۔ اور ان واقعات کا تعلق خود موصوف کی ذات اور ان کے خاندان سے ہے جو صلیبی جنگوں کے آغاز میں قلعہ شیرز کے مالک و مختار تھے، الاعتبار میں صلیبیوں کے عادات و اطوار کی بھی عجیب و غریب تفصیل درج ہے، انہیں افراد میں یحییٰ بن زیاد شیبانی بھی ہیں جو انشا اور کتابت کے بہترین اور منتہی ماہر ہیں۔ اور ابن صیرفی بھی جن کی تصانیف میں الاشارۃ الی من نال الوزارۃ اور قانون دیوان الرسائل ہے۔

ساتویں صدی میں جن اہل قلم افراد نے قاضی فاضل کا مسلک اختیار کیا، ان میں محی الدین ابن عبد الظاہر (۶۹۲) اور ان کے صاحبزادے محمد فتح الدین ہیں، یہ باپ بیٹے اپنے اور اپنے بعد کے عہد میں انشاپردازی کے نظام و آئین کے واضع اور موجد سمجھے جاتے تھے۔ ابن عبد الظاہر کی جو تحریریں صبح الاعشیٰ میں اقتباس کی گئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ میدان بلاغت میں فاضل اور اصفہانی دونوں سے پیچھے ہے۔ عبد اللطیف بغدادی فلسفی (۶۲۹) کو بلاد

آثار کی نقشہ کشی میں کمال حاصل تھا۔ اس کی کتاب الادب والاعتبار اس بات کی بہترین شاہد ہے کہ وہ اپنے وقت کا بہترین بلیغ ہے۔ انہیں افراد میں وزیر عبدالحسن ابن حمو (۶۴۳) کا سفرنامہ ادبیات میں ایک بڑا رتبہ رکھتا ہے موصوف نے شہروں کے اوصاف و محاسن میں جو کچھ لکھا وہ درحقیقت ان تمام تحریروں پر فوقیت رکھتا ہے جو اس کے ماقبل ومابعد اس باب میں لکھی گئیں، جیسے ابن بطلان، ابن فضلان متقدمین میں، اور متاخرین میں عبدری (۶۶۸) بلوی (۷۴۰) ابن بطوطہ (۷۷۹) زرکشی (۷۹۴) ابن ابی البرکات نجدی (۸۹۵) ابن جبیر نے پانچویں صدی کے نصف اول میں عراق سے شام کا سفر کیا تھا، احمد بن فضلان کی معجم البلدان اور اس قسم کی بستیوں اور شہروں کے حالات و اوصاف سے متعلق کتابوں سے اس وقت کے ذوق وفضل کا پتہ چلتا ہے، جغرافیہ کے تذکرہ میں یاقوت حموی کی دو کتابیں یقیناً ایک ممتاز درجہ رکھتی ہیں، بلاشبہ معجم البلدان، معجم الادبا، اس صدی کے اہل قلم افراد کی بلیغ ونفیس خدمات میں سب سے زیادہ گراں قدر ہے۔ اور اسی طرح قفطی (۶۴۶) کی اخبار الحکماء، ابن ابو اصیبعہ کی طبقات الاطباء اپنے فن میں نہایت بلند پایہ ادبیات کی حامل ہے، معجم البلدان، معجم الادبا، اخبار الحکماء، طبقات الاطباء ان چاروں کتابوں کو مستشرقین نے شایع کر کے درحقیقت ہمیں بہت سی ایسی باتیں بتائیں جو عربی تمدن اور عمرانیت کے متعلق معلوم نہ تھیں۔ اسی سلسلہ میں ابن جریر طبری کی تاریخ الرسل والملوک، مسعودی کی مروج الذہب ابن اثیر کی الکامل اور حمزہ اصفہانی کی تاریخ یعقوبی اور تاریخ سنی ملوک الارض والانبیا، ابن طقطقی کی الفخری، مطہر بن طہر المقدسی کی تاریخ البدء وغیرہ متقدمین کی تاریخی مصنفات، اسی طرح عرب جغرافیہ دانوں کی بیسیوں کتابیں جو مستشرقین نے اپنی ذاتی کوششوں اور کاوشوں سے حال میں شائع کی ہیں اور جن سے ہمیں اپنے ملک کے اقتصاد اور عمران کے متعلق وہ معلومات حاصل ہوئے جنہیں خواب میں بھی نہ دیکھا تھا، انہیں مطبوعات نے ہمارے راس المال میں کافی اضافہ کیا۔

آٹھویں صدی کے مصری اور شامی ادبا میں قابل ذکر افراد حسب ذیل ہیں۔

ابن فضل اللہ عمری، مصنف مسالک الابصار، تعریف بالمصطلح الشریف، صلاح صفدی (۷۶۴) مصنف الوافی بالوافیات وتحفۃ ذوی الالباب ونکت الہمیان وجناس الجناس، ودمعۃ الباکی، شہاب محمود حلبی مصنف حسن التوسل فی معرفۃ صناعۃ الترسل، علاؤالدین غانم، احمد انصاری، ابن القیسرانی، کمال الدین الزملکانی۔

اسی عہد میں اندلس میں لسان الدین بن الخطیب کا ظہور ہوا، اگر موصوف کے آثار قلم کا کل حصہ صفحۂ ہستی سے محو ہو جاتا اور الاحاطہ فی اخبار غرناطہ باقی رہ جاتا، تو صرف یہی ایک کتاب آپ کے تفوق اور نظم ونثر کی مہارت کے

ثبوت کے لئے کافی ہوتی، واقعہ یہ ہے کہ موصوف نے غرناطہ کے ارباب علم کے تراجم کچھ اس طرح تحریر فرمائے ہیں کہ پڑھنے والا گویا آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ اور اس سے ماننا پڑتا ہے کہ ابن الخطیب ایک ماہر و مشاق محرر ہی نہ تھا، بلکہ وہ ایک مصور بھی تھا۔ مقری نے اپنی کتاب نفح الطیب میں جہاں اندلس کے بعض اہل قلم ادبا کا تذکرہ کیا ہے وہاں لسان الدین کی نظم و نثر کا بہترین حصہ بھی نقل کیا ہے، ابن الخطیب اور اس کے دوست ابن خلدون (۸۰۸ھ) نے انشا سے بعض بعض پابندیاں اٹھا دیں جس سے انشا پردازی میں کچھ جدت پیدا ہوئی، ورنہ چھٹی اور ساتویں صدی تک اہل قلم اسلوب تحریر میں ایک دوسرے کے متبع اور مقلد نظر آتے ہیں۔ واقع یہ ہے تقلید و اتباع کے ہنگامۂ سرد میں (نویں صدی کے آغاز میں) یہی دو ہستیاں پیدا ہوئیں جن کے سر جدت کا سہرا ہے۔ ان سے قبل تاریخی اور اجتماعی مباحث اس رنگ میں نہیں لکھے جاتے تھے جس میں ابن خلدون نے لکھا ہے۔ بلاشبہ یہ دونوں اندلس کی وہ باقیات الصلحات جنہیں مغرب نے مشرق کو بطور تحفہ پیش کیا ہے اور انہیں کے بعد گلستان مغرب ہمیشہ کے لئے برباد ہو گیا۔

قرطبہ، غرناطہ، قاہرہ، دمشق اور بغداد وغیرہ مقامات جو خلافت کے مستقر تھے، ان میں محررین و کاتبین کے دفاتر درحقیقت عربی ادبیات و انشا پردازی کے مدارس کی حیثیت رکھتے تھے، پھر جب اندلس تاراج ہو چکا عثمانی ترکوں نے مصر، شام اور عراق پر اپنا قبضہ جمایا، ادبیت و انشا پر اوس پڑ گئی، کیونکہ حکومت قدر افزائی سے مجبور اور اہل قلم تحسین سے محروم، نظرتاً ادبیات کا بازار سرد ہو گیا، ہاں البتہ شعرا کی تعداد بڑھتی رہی، اس لئے کہ معمولی شاعری انشا سے سہل ہے۔ نیز شعرا مدح و منقبت کا دروازہ کھول کر حکومت سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ اور یوں تو عربی ادبیات کا ہر دور اپنے اندر محررین سے کہیں زیادہ شعرا کا وجود رکھتا ہے۔

عبدالحمید نعمانی

ہونا تھا اسی طرح سبھی کچھ
کھونا تھا اسی طرح سبھی کچھ
کاٹا وہی بویا جو بھی لیکن
بونا تھا اسی طرح سبھی کچھ

ب

ابرِ بہار

گھر کے کالی گھٹائیں آتی ہیں — ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں آتی ہیں
اک مسرت سی ہے ہواؤں میں — اور دیوانگی گھٹاؤں میں
ہر کوئی یہ پکار اٹھا ہے — "لو وہ ابرِ بہار اٹھا ہے"
وہ گھٹا کی ادائے مستانہ — چال اس کی وہ ہائے مستانہ
بادلوں نے بہت سی پی کی ہے — اُن پہ مستی سی کوئی مستی ہے
اس قدر نشہ میں ہیں متوالے — کہہ رہے ہیں یہ دیکھنے والے

"لے کے دنیا پہ نُور برسیں گی
یہ گھٹائیں ضرور برسیں گی"

شورِ ہستی سے دُور بیٹھا ہوں — پی کے جامِ سرور بیٹھا ہوں
اک تر و تازہ سبز میدان ہے — جس میں بادِ نسیم رقصاں ہے
چھیڑ کرتی ہے یاں جو پھولوں سے — جا اُلجھتی ہے واں ببولوں سے
بادلوں کا پیام لائی ہے — موسمِ گل کے نام آئی ہے
ہر کسی کو سناتی پھرتی ہے — لَے میں اپنی یہ گاتی پھرتی ہے
لو وہ ابرِ بہار آیا ہے — موسمِ خوشگوار آیا ہے
بادل آیا سیاہ مستانہ — حسن پر اپنے آپ دیوانہ

لے کے آیا پیام رحمت کا — دے رہا ہے سلام رحمت کا
مے کشو اٹھو، آؤ گلشن میں — ہاں پیو اور پلاؤ گلشن میں

گھر کے ابرِ بہار آیا ہے
موسمِ خوشگوار آیا ہے"

دور ندی کے اس کنارے پر — سیلِ امواج سے پرے ہٹ کر
بنسی جوگی کوئی بجاتا ہے — خیرِ مقدم کے گیت گاتا ہے
موسمِ گل کے بادلو آؤ — میری دھرتی پہ مینہ برساؤ
دیر سے انتظار تھا مجھ کو — شوقِ ابرِ بہار تھا مجھ کو
میں اسی دھن میں گاتا پھرتا تھا — بنسی اپنی بجاتا پھرتا تھا
حسنِ فطرت کا ہوں میں دیوانہ — شمعِ قدرت کا ہوں میں پروانہ
موسمِ گل کے بادلو آؤ — میری دھرتی پہ مینہ برساؤ
جنگلوں میں بہار ہو جائے — دشت بھی لالہ زار ہو جائے

جلوۂ حسنِ یار دیکھوں گا
آج میں بھی بہار دیکھوں گا

بشیر ضیائی ایم، اے

رام نومی

ماہِ چیت میں چاند راتوں کے پندرہ دن ہندوؤں کے لئے خصوصیت کے ساتھ متبرک اور پوجن پاٹ کے دن ہوتے ہیں۔ ابتدائی نو یوم نوراترہ کے نام سے مشہور ہیں ان دنوں میں دیوی یا درگا کی عبادت کی جاتی ہے جو نظام عالم میں قدرتِ کاملہ۔ روح عمل، شکتی اور حکمت ہو کر نمودار ہے۔ بنگال میں جس طرح ماہ اکتوبر درگا پوجا کی دھوم ہوتی ہے اسی طرح پنجاب اور ممالکِ متحدہ آگرہ و اودھ میں یہ نوراترہ بڑی مسرت و شادمانی کے ساتھ ہندوؤں کے گھروں میں منائے جاتے ہیں۔ نواں روز شری رامچندر جی کی ولادتِ مبارک کا دن ہے۔ دسمی چیتی دسہرہ کے نام سے موسوم ہے چنانچہ اس روز گنگا و جمنا کا اشنان خاص ثواب کا باعث ہے۔ پورنماشی کو ہنومان جینتی (روز ولادت ہنومان جی) ہے ✦

ہمیں اس وقت صرف رام نومی کے متعلق کچھ لکھنا ہے۔ ہندوؤں کے لئے سال میں دو دن۔ ساون میں اندھیرے پاکھ کی اشٹمی جو بھگوان کرشن کا جنم دن ہے۔ اور چیت میں اجالے پاکھ کی نومی جو شری رامچندر جی کا جنم دن ہے خاص عظمت کے دن ہیں۔ یوں تو ہندوؤں میں متعدد فرقے اپنے اپنے عقائد کے بموجب بزرگ ہستیوں (ہیروز) کے دن مناتے ہیں۔ لیکن یہ دو روز ہندوؤں کے واسطے عام اکابر پرستی (ہیرو ورشپ) کے دن ہیں۔ موجودہ زمانہ میں ہندوؤں کی مذہبی راسخ الاعتقادی روبہ انحطاط نظر آتی ہے۔ لیکن ہیرو ورشپ کا خیال ان کے دلوں میں اب تک بدستور جاگزین ہے۔ اسی سے یہ قوم زندہ ہے۔ کسی قوم کی ہستی اور اس کی شان و عظمت بڑی حد تک ہیرو ورشپ پر مبنی ہے۔

بھگوت گیتا میں بھگوان شری کرشن ارجن کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں کہ جب کبھی نیکی کم ہو جاتی ہے اور بدی غلبہ پاتی ہے اس وقت میں وجود اختیار کرتا ہوں اور نیک آدمیوں کی حفاظت کرنے اور بدکرداروں کو غارت کرنے کے واسطے نیز دھرم قائم کرنے کے لئے وقتاً فوقتاً ظاہر ہوتا ہوں۔ متعدد ممالک و اقوام کی تاریخ شاہد ہے کہ کرشن جی کے یہ الفاظ نہ صرف ہندوستان میں بلکہ روئے زمین کے مختلف حصوں پر حرف بحرف سچے ثابت ہو چکے ہیں۔ دنیا میں جتنی بڑی بڑی قومیں ہیں سب میں وقت ضرورت ایسے پیغمبر اور اوتار پیدا ہو کر اپنے حیرت انگیز اور عظیم الشان کارنامے دکھا چکے ہیں۔ بارہا برائی مٹانے اور نیکی قائم کرنے کے لئے نور ازلی سے منور و پاکیزہ ہستیاں خلق خدا کو رہِ راست پر لانے کے لئے دنیا میں اتری ہیں۔

شری رامچندر جی کا جنم بھی ایسی ہی ضرورت پر سرزمین بھارت میں ہوا تھا۔ ان کے حالات کے متعلق جو کچھ روایات یا تاریخی کتب اس وقت موجود ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ملک میں راکشس قوم کا دور دورہ تھا۔ اُن کے ظلم وستم سے مخلوق مصائب وآلام میں مبتلا تھی۔ نہ صرف آبادیاں بلکہ جنگلوں میں رہنے والے عابد وزاہد بھی اُن کی بداعمالی سے نالان و پریشان تھے۔ سوسائٹی کی حالت بھی متزلزل تھی۔ دھرم کے عقاید کمزور پڑ گئے تھے۔ ایسے حالات میں رامچندر جی کی بزرگ و پرنور ہستی کا دنیا میں آشکارا ہونا لابد تھا۔ سناتن دھرمی ہندوؤں کے نزدیک رامچندر جی کا وجود خدائے ذوالجلال کا وجود صورت انسانی میں تھا اور ہے۔ اسی نظر سے وہ رام کو پوجتے ہیں اور ان کی یاد کرتے ہیں۔ ان کا نام لینا اور ان کے نام کے مالا پھیرنا باعثِ نجات مانتے ہیں اُن کا یہ فعل کوئی غیر معمولی بات بھی نہیں ہے۔ نام کی عظمت مسلّمہ ہے۔

وصال حق طلبی ہم نشین نامش باش ٭ ببیں وصال خدا در وصالِ نامِ خدا

(خواجہ غریب نواز علیہ الرحمۃ)

لیکن اس عقیدت وارادت سے قطع نظر کر کے بھی دیکھا جائے تب بھی رامچندر جی کی بلند ترین شخصیت انکو انسان سمجھتے ہوئے اور ان کے افعال نیک و پاک پر نگاہ ڈالتے ہوئے بڑی متبرک اور قابل پرستش قرار پاتی ہے۔ رام کے اوتار کو "مریادا پرشوتم" کہا جاتا ہے اسلئے کہ رامچندر جی جب تک صفحۂ زمین پر پابند حیات وجسم رہے انھوں نے اپنے تمام کام ایک معمولی انسان کی طبیعت وجذبات کے ساتھ انجام دیئے۔ اور ابتدا سے انتہا تک سوسائٹی کے آداب و مراتب کا اتباع اسی طرح کیا اور اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کو اسی طرح بجالائے۔ جیسا کہ اُن کے مرتبہ کے ایک انسان کے لیئے واجب تھا۔ ان کی زندگی اور اس کے کارنامے دنیا کے سامنے ہر پہلو سے ادائے فرضِ انسانی کا اونچا سے اونچا معیار بہم پہنچاتے ہیں۔ باپ کے حکم کی تعمیل واطاعت میں ان کا بجائے تاج وتخت لینے کے جنگلوں میں جاکر چودہ سال تک قیام رکھنا، بھائیوں اور بیوی کے ساتھ محبت ووفا کا سلوک، سیتا جی کے کھوئے جانے اور لکشمن جی کے تیر لگنے سے بیہوش ہونے پر گریہ وزاری جنگلوں میں شجاعت وبہادری کے کام۔ بے کس اور مظلومین کی امداد اور ظالم و بدکردار ہستیوں کی غارت گری۔ اجودھیا میں واپسی پر رعایا پروری اور معدلت گستری۔ راج نیتی اور دھرم کا پالن۔ رعایا میں سے کسی شخص کی غائبانہ شکایت پر سیتا جی کا محلسرائے سے اخراج۔ عدول حکمی میں لکشمن جی کو سزائے جلاوطنی۔ یہ تمام کام رام نے ایک فرض شناس انسان کی حیثیت سے انجام دیئے۔ اور ان میں اپنے اصلی سروپ کو کبھی ظاہر نہیں ہونے دیا۔" ہر چند اُنکا وجود انسانی وجود کے مقابلہ میں بالاتر وبرتر تھا۔ اور وہ اپنے اعمال وافعال میں مختار

اور عالم کل تھے۔

رامچندر جی کی زبردست و پاکیزہ ہستی کے ساتھ، سیتا جی، لکشمن، بھرت، ہنومان کی ہستیاں بھی اسی قبیل کی تھیں ہر ایک قدرت کی کسی نہ کسی طاقت کا مظہر تھا۔ سیتا جی حسن ظاہری و باطنی اور حیا و عصمت کی دیوی تھیں۔ ان کی ہستی نسوانی زندگی کا اعلیٰ ترین نمونہ تھی اس مقدس ہستی کی شان میں ایک فارسی صحیفہ رامائن مسیحی کے چند اشعار ذیل میں نقل ہیں

تنش را پیرہن عریاں ندیدہ　　چو جاں اندر تن و تن جاں ندیدہ

بعصمت ہمچو عصمت پاک گوہر　　حیا را چوں حنا بر حسن زیور

بروش پاکیٔ مریم قسم خوار　　پرستیدے حیا نقشش صنم وار

بہر خاکے کزو سایہ فتادہ　　بنائے قبلۂ عصمت نہادہ

حیا ابر نقاب ماہِ رویش　　صبا نشنیدہ ہرگز رنگ و بویش

لکشمن جی کی زندگی بڑے بھائی کی اطاعت و خدمت کے مرادف تھی بھرت جی ایثار و نیاگ کی تصویر تھے۔ ہنومان جی ایک خادم و عقیدتمند کی حیثیت سے اپنی مثال آپ تھے، دنیا کی تاریخ میں ایسی مثالیں نایاب ہیں۔

ان متبرک ہستیوں کے مفصل حالات دیکھنے کیلئے ہم کو رامائن کے اوراق الٹنے کی ضرورت ہے۔ اب رامائن مختلف زبانوں میں تالیف ہو چکی ہے۔ ناظرین اردو فارسی، انگریزی میں بھی اسے ملاحظہ فرما سکتے ہیں ابتدائً رامائن کی تصنیف ترنیا جگ میں بزبان سنسکرت ہوئی تھی۔ والمیکی رشی نے اسے لکھا ہے۔ دوسری رامائن تلسی داس جی کی ہے یہ ہندی نظم میں ہے اور صرف تین سو سال قبل کی تصنیف ہے۔ کہا جاتا کہ کلجگ میں تلسی داس جی والمیکی رشی کا اوتار تھے اور انہوں نے رامائن کے مضمون کو عام فہم بنانے کے لئے اس کو ہندی میں لکھا۔ تلسی داس جی نے ہندی رامائن کا آغاز سمت ۱۶۳۱ بکرمی میں اسی مبارک دن رام نومی کو کیا تھا۔ علاوہ رامائن کے دو سنسکرت کی کتابیں اور ہیں جن میں شری رامچندر جی اور ان کے خاندان کے حالات درج ہیں۔ ایک کا نام "رگھو ونش" ہے اور دوسری "اتر رام چرتر" ہے اول الذکر مشہور و معروف شاعر کالیداس کی اور دوسری بھاؤ بھوتی کی تصنیف ہے۔ بھاؤ بھوتی ساتویں صدی عیسوی کے آخر زمانہ کا شاعر تھا۔ فارسی میں رامائن مسیحی قابل ذکر ہے مسیحی تخلص رکھنے والے شاعر نے ایک غیر قوم کے پیغمبر کے حالات جس اخلاص و عقیدت سے نظم کئے ہیں وہ قابل ستائش ہے۔

جے دیال سکسینہ

مسلمِ گم کردہ راہ

سرگرمِ جستجو ہے اگر دل، ہوا کرے　　اُٹھتی ہے گرد گر سرِ منزل، اٹھا کرے
بڑھنا اگر ہے پائے طلب، ہاں بڑھا کرے　　برگشتگی بڑھے گی جو ہمت وفا کرے
سالارِ قافلہ نہ ہو جس کا وہ کیا کرے

بزمِ جہاں سے رشتۂ الفت کو توڑ کر　　پیمانۂ حیات سے منہ اپنا موڑ کر
اور کاسۂ امید سرِ راہ چھوڑ کر　　بیٹھا ہُوا ہُوں دشت میں منزل کو چھوڑ کر
سالارِ قافلہ نہ ہو جس کا وہ کیا کرے

کیوں کارواں نہ اپنا ہدف ابتلا کا ہو　　اور کیوں نہ سامنا اسے تیرِ قضا کا ہو
ہر راہرو ضعیف جو بھوکا وفا کا ہو　　رہزن پہ کیوں نہ اسکو گماں رہنما کا ہو
سالارِ قافلہ نہ ہو جس کا وہ کیا کرے

اے بد نصیب قوم تو گم کردہ راہ ہے　　اس افتراق سے تری حالت تباہ ہے
حالِ زبوں کی، خود تری بستی گواہ ہے　　لیکن یہ واقعہ ہے کہ تو بے گناہ ہے
سالارِ قافلہ نہ ہو جس کا وہ کیا کرے

محمود اسرائیلی

حقیر شے کی قوت

ابتدائے آفرینش سے لیکر اس وقت تک کے واقعات کی تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے یہ امر بخوبی ذہن نشین ہو سکتا ہے کہ بعض اوقات حقیر چیزیں ہی تہذیب و تمدن کا رخ پلٹ دینے اور مذہب و معاشرت میں انقلاب عظیم پیدا کرنے کا باعث بنی ہیں۔ انہیں حقیر چیزوں کی بدولت اقوام عالم کی قسمتیں نکبت و ادبار کی گھٹاؤں سے نکلکر نصرت و اقبال کے آسمان پر مہر و ماہ بن کر چمکی ہیں۔ اور چھوٹی چھوٹی باتوں ہی نے کئی باجبروت شہنشاہوں کی سلطنتوں کے تخت الٹ دیئے ہیں۔ ثمر ممنوع کھا لینے کی پاداش میں حضرت آدم علیہ السلام کا جنت بدر ہونا اس نظریہ کی اولیں مثال تھی!!

تاریخ کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ ان اولوالعزم انسانوں نے جو اپنی ہمت اور کوشش سے لوح ہستی پر اپنا نام کندہ کر چکے ہیں، ہر شعبۂ زندگی میں حقیر چیز کی قوت و طاقت کا اعتراف کیا ہے۔ زندگی خود کیا ہے؟ چھوٹی چھوٹی باتوں اور چھوٹے چھوٹے واقعات کا مجموعہ! دنیا کی کسی چیز کو تحلیل کر لو اس کا ہر جزو گو حقیر ہو مگر اپنی کمزوری کے دامن میں ایک عظیم طاقت پنہاں رکھتا ہے۔ فلک بوس پہاڑ ریت کے ذروں کا اور ناپیدا کنار سمندر حقیر قطروں کا عظیم الشان مجموعہ ہیں۔ سو سال کی طویل عمر کیا ہے؟ آنکھ کی جھپک میں گزر جانے والے حقیر لمحات کا اجتماع۔ تھیکرے[1] نے لکھا ہے کہ کیا ہر شخص کی زندگی چھوٹے چھوٹے ابواب پر مشتمل نہیں؟ ہر ایسا حقیر سانحہ جو دیکھنے میں کم وقعت اور بے حقیقت معلوم ہوتا ہے بعض اوقات اقوام عالم کی قسمتوں کا دو ٹوک فیصلہ کر دیتا ہے۔ جنگ کریمیا جس میں یورپ کی چار عظیم الشان طاقتیں ٹرکی، انگلستان، روس اور فرانس بر سر پیکار تھیں ایک حقیر سی کنجی نہ دینے کا نتیجہ تھی۔ یونانی گرجا نے بیت المقدس کے ایک معبد پر اپنا حق جما کر اسے مقفل کر دیا۔ اور اپنے حریف لاطینی گرجا کو اس کی کنجی دینے سے انکار کر دیا۔ اس بحث نے یہاں تک طول کھینچا کہ روس کلیسائے یونان کا حامی بن کر اور فرانس لاطینی گرجا کا معاون بن کر آمادۂ جنگ ہو گیا۔ اسی دوران میں روس نے ٹرکی سے مطالبہ کیا کہ اس گرجا کی شکست و ریخت کی مرمت کر دی جائے۔ ترکوں نے اپنی خود اختیاری کی توہین سمجھ کر ٹکا سا جواب دیا۔ بس پھر کیا تھا انگریز ترکوں کی مدد کے لئے تیار ہو گئے اور فرانس کی معاونت سے روس کے ساتھ ایک محشر خیز جنگ چھڑ گئی جس میں لاتعداد روپے کے نقصان کے علاوہ ہزاروں قیمتی جانیں تلف ہو گئیں۔ اور کئی ہولناک معرکوں نے مشہور

---

[1] تھیکرے - وینٹی فیر

مقامات کا بھی قلع و قمع کر دیا۔

شرابِ ناب سے لبریز ایک گلاس نے فرانس کی تاریخ میں ایک حیرت انگیز تبدیلی پیدا کر دی تھی اور برسر حکومت خاندان کو نان شبینہ تک کا محتاج کر دیا تھا۔ بادشاہ لوئس فلپ کا لڑکا ڈیوک آف آرلینز اپنے دوستوں کے ساتھ صبح کا ناشتہ کھا رہا تھا کہ عادت سے زیادہ بادۂ گلرنگ کا ایک اور گلاس پی گیا۔ جس نے اس کے حواس میں اختلال پیدا کر دیا۔ دوستوں سے علیحدہ ہو کر وہ گاڑی میں سوار ہونے کو تھا کہ گھوڑے کسی وجہ سے ڈر کر بھڑک اُٹھے اور شہزادہ اوسان نہ درست ہونے کے باعث اپنے قدم نہ جما سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کا سر پختہ سنگ آستانہ پر اس زور سے لگا کہ بھیجا باہر نکل آیا۔ اگر وہ خوابیدہ بخت نوجوان مئے تند کا فالتو گلاس نوش نہ کرتا تو بہت ممکن تھا کہ ضرورت کے وقت اپنے توازن کو قائم رکھ سکتا یا جب زمین کی طرف آ رہا تھا تو شاید اپنے قدم سنبھال سکتا۔ آتش سیال کے چند جرعات ولیعہد حکومت کی زندگی کا خاتمہ کر دینے کے علاوہ شاہی خاندان کی جلا وطنی اور ان کی لاتعداد ذاتی دولت اور جاگیر کی ضبطی کا باعث ہوئے۔[1]

بعض اوقات ایک ہلکا سا تبسم، چھوٹا سا فقرہ، کوئی ننھا سا خیال انسان کی زندگی میں ایسا اہم انقلاب پیدا کرتا ہے کہ دنیا مبہوت و متحیر رہ جاتی ہے۔ مارٹن لوتھر عیسائی مذہب کا سب سے بڑا مبلغ و مصلح گزرا ہے۔ مسیحیت کو پوپ کی استبدادی حکومت کے جوئے سے آزاد کرنے میں جو اولوالعزمانہ جدوجہد اس نے کی اور جن مشکلات کا اُسے سامنا کرنا پڑا، یہ سب واقعات یورپ کی مذہبی تاریخ کے صفحات ہی پر درج نہیں بلکہ ہر پیرو مسیح کے دل پر کندہ ہیں ابتدا میں لوتھر کی ہر سعی پیہم صریح ناکامی کے قالب میں منتقل ہو جاتی تھی۔ اور بہت کم لوگ اصلاح کلیسا کے فلسفہ اور اس کی اہمیت و ضرورت کی طرف متوجہ ہوتے تھے۔ یہاں تک کہ دن رات کی ناکامیوں نے اُسے مایوس کر کے اس کی ہمتوں کو پست اور حوصلوں کو سرد کر دیا۔ اس کی وفا شعار بیوی اس کے دل کی مرجھائی ہوئی کلی کو شگفتہ کرنے کیلئے بہت کوشش کرتی مگر بے سود ثابت ہوتی۔ ایک دن لوتھر جمہور کی کم التفاتیوں اور اپنی کمزوریوں پر دل ہی دل میں نادم ہو رہا تھا کہ اس کی بیوی ماتمی لباس پہنے غمگین صورت بنائے آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتی اسکے پاس آئی،

"کون مر گیا ہے؟" لوتھر نے متحیرانہ طور پر بلند آواز میں پوچھا۔

اس کی بیوی نے مغموم لہجہ میں جواب دیا "آہ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ آسمان پر خدا کا انتقال ہو گیا ہے"۔

نوجوان مبلغ کی آنکھیں چمک اٹھیں، اس کے سڈول اور مضبوط شانوں میں حرکت پیدا ہوئی اور اس نے

---

[1] دی سیکرٹ آف اچیومنٹ۔

خشمگین انداز میں کہا "دیکھو ایسی لغو گفتگو کی تمہیں کیسے جسارت ہوئی ——— خدا کس طرح مر سکتا ہے۔ وہ ازل سے ہے اور ابد تک زندہ رہے گا"

"کیا یہ فی الحقیقت درست ہے" خوبصورت بیوی نے یہ سوال اس انداز میں کیا جیسے خاوند کی اس بات پہ اُسے بہت کم یقین تھا کہ خدا ابھی تک زندہ ہے۔

لوتھر نے اپنی پیشانی پر شکن ڈال کر کہا "تمہیں اس کے زندہ ہونے میں کیا شک ہو سکتا ہے جس طرح یہ بات یقینی ہے کہ خدا آسمان پر ہے ویسے ہی یہ امر بھی یقینی ہے کہ وہ کبھی مر نہیں سکتا"

اسکی بیوی نے حوصلہ مندانہ آواز میں کہا "تو پھر جب تمہیں یقین ہے کہ خدا زندہ ہے۔ تمہارا ہمت توڑ کر بیٹھ جانا کتنی غیر مآل اندیشی اور حماقت ہے۔ تم تو ایسے مایوس ہوئے ہو گویا خدا مر چکا ہے"

یہ تھا ایک مختصر سا فقرہ جس نے لوتھر کے ارادوں کو مستحکم، اسکی ہمتوں کو بلند، اور اسکے نام کو غیر فانی بنا دیا۔ یہ تھا حقیر سا خیال اُس "حقیر ترین مخلوق" کا جو آج بھی باوجود ادعائے ترقی و تہذیب مردوں کے استبداد کی تختہ مشق اور اُنکے ظلم و جور کی شکوہ سنج ہے۔

"مسرت" ——— ایک چیز ہے کہ تمام دنیا اسکی تلاش میں ہے۔ انسان دیوانہ وار اسکی جستجو میں پھرتے ہیں لیکن نادان یہ نہیں سوچتے کہ یہ بڑے بڑے ایوانوں اور سر بفلک محلات میں نہیں مل سکتی۔ بلکہ اس کا ماخذ مہربانی کے چھوٹے چھوٹے کام، تعظیم و تکریم کے مختصر الفاظ اور خوش نما لبوں پر کھیلنے والا وہ لطیف تبسم ہے جو ہر دل کو سہانا معلوم ہوتا ہے۔ دولت کی فراوانی، تخت و تاج کی ملکیت یا حکومت کی ہیبت نہ اسے خرید سکتی ہے نہ اس قابل ہے کہ اُسے مرعوب کر سکے۔ زندگی کی مسرت کن باتوں پر مشتمل ہے؟ جذبات کا احترام، نکتہ چینی سے احتراز، ایک محبت بھرا خط، خوشگوار الفاظ، یہ ہیں چند مختصر چیزیں جن کا اجتماع ایک معمولی دل کو کسی سلطنت کے حکمران سے بھی زیادہ مسرور و شادماں بنا دیتا ہے۔ اس قبیل کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو انسان بزعم خود سر پائے حقارت سے ٹھکرا دیتا ہے۔ لیکن یہ نہیں سمجھتا کہ جس "بڑی" چیز کی تلاش کر رہا ہے وہ انہیں پردوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں ملفوف ہے۔

شہرہ آفاق مصور مائیکل انجیلو نے کیا خوب کہا ہے کہ چھوٹی چھوٹی چیزیں ہی آرٹ کو مکمل کرتی ہیں اور "اکملیت" کچھ چھوٹی چیز نہیں۔ محبت و تلطف کے چھوٹے چھوٹے کام جو دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں بیسیوں ملنے والوں کے دل میں مسرت و شادمانی کی لہر پیدا کر دیتے ہیں۔ عمر بھر میں نیکی کے صرف ایک عظیم الشان "کارنامہ" سے بدرجہا افضل و بہتر ہیں۔ زندہ رہنے اور مرنے کے فلسفہ پر بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر چارمس نے کہا ہے "اے غیر فانی انسان! اچھے کام کر

ف چیر نل نس ایز لے لایف پاور

اور اپنے پیچھے نیکی کا ایک ایسا سنگین مجسمہ چھوڑ جا جسے حوادثِ زمانہ کبھی تباہ نہ کرسکیں ۔ محبت، رحم اور شفقت کے قلم سے ان انسانوں کے دلوں پر اپنا نام لکھ جن کو تجھ سے سابقہ پڑے پھر یہ غیر ممکن ہے کہ وہ تجھے فراموش کردیں چھوٹے چھوٹے نیک کام زمین پر اسی طرح درخشاں رہیں گے جس طرح چرخ نیلوفری کے دامن میں تابناک ستارے"۔

یاد ہس بخیر، جب ریگستانِ عرب پر جہل کی ظلمت چھائی ہوئی تھی تو ناقابلِ التفات باتوں پر قبیلے کے قبیلے کٹ مرتے تھے ۔ بکر اور تغلب کی چہل سالہ خون آشام لڑائی جو ۴۹۴ء سے لیکر ۵۳۵ء عیسوی تک برابر جاری رہی اور جس میں رفتہ رفتہ عرب کے تمام قبیلے شریک ہوگئے تھے ستر ہزار انسانوں کی قیمتی جانیں لیکر ختم ہوئی ۔ بقول مولانا حالی یہ کوئی ملک و دولت کا جھگڑا نہ تھا ۔ بلکہ ایک معمولی سی بات تھی کہ ایک شخص کا اونٹ کسی کھیت میں چلا گیا ۔ کھیت والی عورت نے اُسے مارا، اس کے انتقام میں اونٹ والے نے عورت کی چھاتی کاٹ لی ۔ اسی طرح انہی کی بیان کردہ حربِ واحس ہیں، جو ۵۶۸ء سے لیکر ۶۳۱ء عیسوی تک جاری رہی، بے شمار آدمی قتل ہوئے یہاں تک کہ بعض قبیلوں کا نام و نشان مٹ گیا ۔ یہ لڑائی بھی ۳۲ سال پہلے ختم ہونے والی جنگ کی طرح ایک نہایت معمولی بات پر شروع ہوئی تھی ۔ واحس ایک نہایت سبک رفتار گھوڑا تھا جو گھوڑ دوڑ میں آگے بڑھا چاہتا تھا کہ ایک شخص نے بڑھ کر اسے بدکا دیا[۱] ۔ بس یہ تھی ساری حقیقت خلقِ خدا کے اس طرح بے تحاشا کٹ مرنے کی ۔

۱۷۳۹ء میں جب نادر شاہ، نظام اور سعادت خاں کی فوجوں کو کرنال میں شکست دیکر، دہلی میں داخل ہوا تو کسی نے افواہ اڑا دی کہ نادر شاہ مرگیا ۔ اُس قتلِ عام میں جو نادر شاہ کے سپاہیوں نے دن بھر جاری رکھا ہزاروں آدمی تہ تیغ کیے گئے اور اس قدر مال و دولت وہ اپنے ہمراہ لے گیا کہ اس کا حساب لگانا ازبس دشوار ہے[۲] ۔ ایک حقیر سی افواہ کی کتنی بڑی قیمت دہلی نے ادا کی ——— دنیا کی تاریخ میں ایسی مثالیں بہت کمیاب ہیں ۔ پھر ۱۸۵۷ء کے غدر پر غور کیجئے کہ ایک بھنگی کی بے سر و پا بات کا نتیجہ تھا، انقلابِ سلطنت کے علاوہ جو مالی و جانی نقصان ہندوستان نے برداشت کیا، اس کی تلافی کا خواب ابھی شاید ایک ہزار سال تک بھی پورا نہ ہوسکے ۔

حقیر چیز کی قوت کا صحیح اندازہ اسی بات سے ہوسکتا ہے کہ اگر ایک ہوشمند و طباع بچہ اپنی ذہانت کے باعث ایک چھوٹے سے سوراخ کی طرف متوجہ نہ ہوتا تو شاید ایک چوتھائی یورپ کی ایک پوری سلطنت کو بحیرہ شمالی میں غرق کرنے میں کامیاب ہوجاتا ۔ ہالینڈ سمندر کے کنارے واقع ہے لیکن سطح بحر سے ذرا نیچے ۔ ساحل کو سمندر کے حملوں سے محفوظ رکھنے کی خاطر بڑے بڑے بند اور پشتے بنا رکھے ہیں ۔ ایک شام کسی چھوٹے سے بچے نے دیکھا کہ بند کے حصہ زیریں میں ایک سوراخ ہے جس سے سمندر کا پانی خشکی کی طرف آرہا ہے ۔ اسے قدرتی طور پر احساس ہوا کہ اگر پانی کی روک تھام نہ کی گئی

---

[۱] حواشی مسدس حالی ص۵۵ [۲] تاریخ ہند حصہ اول مصنفہ پروفیسر سیتارام کوہلی و پروفیسر ایشری پرشاد ایم ۔ اے ۔

تو یہ چوہے کا بنایا ہوا سوراخ چند لمحوں میں اور زیادہ وسیع ہو جائیگا۔ برق آسا تیزی کے ساتھ ایک خیال اس کے دماغ میں پیدا ہوا۔ پھر اس نے زمین پر گھٹنے ٹیک کر اپنے ننھے ہاتھ کی ہتھیلی سے اس سوراخ کو بند کر دیا۔ رات از حد خنک اور تاریک تھی مگر وہ خرد سال لڑکا جی کڑا کر کے اس وقت تک اپنے فرض کی تکمیل میں مصروف رہا جب دوسری صبح چند راہرو وہاں پہنچ گئے۔ اور انہوں نے نہایت تعجیل و مستعدی سے آنے والی تباہی کے پیش خیمہ کا تدارک کر لیا۔ آج ہالینڈ میں اس لڑکے کا نام نہایت عزت و توقیر سے لیا جاتا ہے اور اس قومی محسن کے مجسمے مشہور شہروں میں نصب ہیں۔

آج سے تقریباً ڈیڑھ سو سال پہلے شمالی امریکہ بھی انگریزوں کے زیر اقتدار تھا۔ ملکی ضروریات اور انتظامی مصارف کو مدنظر رکھتے ہوئے انہوں نے نو لاکھ روپے کی آمدنی بڑھانے کی خاطر ایک ایکٹ جاری کر دیا۔ رعایا محصل کی اس زیادتی کے خلاف تھی، چنانچہ جمہور کی متفقہ مخالفت کا نتیجہ انقلاب امریکہ کی صورت میں رونما ہوا۔ اور ایک خونریز لڑائی کے بعد نئی دنیا کے مکینوں نے آزادی حاصل کر لی۔ اس جنگ میں اتلاف جان کے علاوہ انگلستان کو ایک ارب پچاس کروڑ روپیہ کا نقصان برداشت کرنا پڑا۔ اسی طرح فرانس اور انگلستان کے درمیان ایک جنگ اس بات پر ٹھن گئی کہ دو جہازوں میں سے پہلے کونسا پانی میں ڈالا جائے۔ اس لڑائی کی قیمت ایک لاکھ بہادر سپاہیوں کے خون کی صورت میں ادا کرنی پڑی ہے۔ حقیر چیزوں اور چھوٹی چھوٹی باتوں کی بدولت کتنی زہرہ گداز لڑائیاں لڑی جا چکی ہیں دنیا کی تاریخ عبرت آموز واقعات سے معمور ہے!

گوئٹے نے ایک دفعہ کہا تھا کہ ذرا ننھے بچوں سے ان حقیر جھڑبیری کے بیر اور کچی جامنوں کا ذائقہ تو دریافت کرو ——— تمہاری لذیذ سے لذیذ مٹھائیاں، ربڑی اور دودھ کی شیرینیاں ان حقیر جنگلی بیروں اور آم کی کچی کیریوں کے سامنے کوئی وقعت نہیں رکھتیں، غالباً ہندوستان کے سوا دنیا کا کوئی اور ملک بمشکل اس قسم کی مثال پیش کر سکے جہاں ایک معمولی بسکٹ دس ہزار روپے میں فروخت ہوا ہو موجودہ شہریار دکن کی عمر اس وقت چھ سال کے قریب تھی کہ وہ اپنے والد نامدار میر محبوب علی خاں مرحوم کے ساتھ بازار میں کھڑے محرم کا جلوس دیکھ رہے تھے ان کے ساتھ یمین السلطنت مہاراجہ سرکشن پرشاد کے علاوہ دیگر اراکین سلطنت اور اعیان دربار بھی موجود تھے۔ قریب ہی ایک غریب سا پانچ سال کا بچہ ہاتھ میں بلبل لئے کھڑا تھا۔ میر عثمان علی خان نے بلبل دیکھتے ہی اپنے جلیل المرتبت والد سے فرمائش کی کہ یہ پرند ہمیں لے دیجئے۔ چنانچہ خلد آشیاں نظام نے لڑکے سے بلبل مانگا تو اس نے دینے سے انکار کر دیا اعلیحضرت نے ایک سو روپے کا لالچ دیا مگر بچہ پھر بھی نہ مانا۔ آخر بڑھتے بڑھتے یہ سودا دس ہزار روپیہ کی گراں قدر رقم

ـــــہ رائزنگ ان دی ورلڈ۔

تک جا پہنچا مگر اس غریب بچّہ نے جس کے دل میں دس ہزار تو کجا دنیا کی بادشاہت بھی ہیچ تھی، اس رقم خطیر کے عوض بھی اس مشتِ بال و پر کی مفارقت پسند نہ کی عجب ابتلا کا لمحہ تھا۔ ادھر خُرد سال ولیعہد سلطنت کی دل شکنی کا خیال ادھر رعیت کے ایک معمولی فرد کے دلی جذبات کا احترام پیش نظر۔ سرکار نظام ابھی اس کشمکش میں تھے کہ مہاراجہ کشن پرشاد آگے بڑھے اور نہایت ادب و احترام سے عرض کیا "سرکار یہ کم سمجھ بچّہ دس ہزار روپیہ کی کیا قیمت جانے اس کو کوئی کھانے کی چیز دکھائی جائے"۔ یہ کہہ کر ہز ایکسیلنسی نے ایک ڈبہ سے بسکٹ نکال کر خود کھانا شروع کیا۔ بچہ دیکھ رہا تھا ـــ مدار المہام نے پوچھا "کیا تم بسکٹ لوگے"۔ ننھے بچہ نے رکتے رکتے نہایت آہستہ اور شرمیلی آواز میں سر ہلا کر کہا "ہاں"۔

بس ایک سرد و گرم چشیدہ وزیر اپنی خدا داد ذہانت کے باعث ایک ایسے عقدہ کو حل کر چکا تھا جسے وا کرنے کے لئے "قاضی الحاجات" کا ناخن تدبیر بھی عاجز تھا۔ دوسرے لمحہ میں مہاراجہ نے کہا "بہت اچھا اگر بسکٹ لینا ہے تو یہ بلبل ہمیں دے دو"

ننھے بچّہ نے پیار کی نظروں سے بلبل کی چمکتی ہوئی آنکھوں اور اس کے خوبصورت پروں کو دیکھ کر دل کی دھڑکن کا بھی جائزہ لیا۔ پھر نگاہ اٹھا کر مہاراجہ کشن پرشاد کے ہاتھ کی طرف دیکھا جس کی دو انگلیوں کی گرفت میں ایک لذیذ بسکٹ تھا۔ بچہ کا چہرہ تمتما اٹھا۔ ذہنی کشمکش اور عزیز پرند کی جدائی کے خیال نے غیر محسوس طور پر اس کی پلکیں نمدار کر دیں ایک قدم آگے بڑھ کر اس نے بسکٹ لیا اور لرزتے ہوئے ہونٹوں سے لگا کر دوسرا ہاتھ مہاراجہ سرکشن پرشاد کی طرف بڑھا دیا ـــ بچہ بسکٹ کھا رہا تھا مگر اس کی آنکھیں میر عثمان علی خاں کے ہاتھ اور اُن کے بشاش چہرہ کو بڑی حیرت سے تک رہی تھیں۔ معاملہ ختم تھا کیونکہ قیمت ادا کر کے مطلوبہ جنس خرید کی جا چکی تھی مگر حضور نظام کو رہ رہ کر بھولے بچے کا خیال آرہا تھا۔ آخر اپنی ضرب المثل فیاضی اور فطری رحمدلی سے مجبور ہو کر سپاہیوں کے ساتھ بسکٹوں کا ڈبہ اور دس ہزار روپیہ نقد اس بچّہ کے گھر بھجوا دیا جس کے مفلس والدین اعلیحضرت کی ایک جنبشِ لب سے آن کی آن میں دنیوی تفکرات سے آزاد ہو گئے[ھ]

علمی اور طبعی ایجادات کا بیشتر حصہ نہایت معمولی اور حقیر واقعات و سانحات کے غیر متوقع طور پر رونما ہونے سے معرضِ وجود میں آیا ہے۔ کسی آتشگیر مادہ پر ایک چنگاری کا گرنا بارود کی ایجاد کا سبب بنا۔ کلیسائے پیسا کے محافظ کے لئے حسب معمول شام کے وقت ایک جلتا ہُوا چراغ لٹکا کر چلا جانا معمولی سی بات تھی مگر ہونہار گلیلیو کے دماغ میں اس

[ھ] اس واقعہ کو میں نے انتخاب لاجواب سے لیا ہے۔

ارتعاش مستقل نے گھڑی کے "پنڈلم" کا خیال پیدا کردیا۔ جو بعد میں وقت کی پیمائش کے آلہ کی اختراع کا موجب ہوا۔ ایک چشمہ ساز کے بچوں نے کھیل کے دوران میں عینکوں کے دو تین جوڑے آگے پیچھے رکھ کر دیکھا تو دور کی چیزیں قریب تر دکھائی دینے لگیں۔ بچوں نے حیران ہوکر اپنے باپ کو بھی یہ تماشا دکھایا۔ اس معمولی کھیل سے دوربین کی ایجاد ظہور میں آئی۔ لکڑی کے نمدار تختوں میں معمولی کیڑوں کو سوراخ کرتے دیکھ کر مسٹر استمبارڈ برونل نے دریائے ٹیمز کے نیچے سے گذرنے والے راستہ کی تعمیر کا خیال حاصل کیا تھا کس کو یقین ہو سکتا تھا کہ اتفاقیہ طور پر شراب کی ایک خالی صراحی آگ میں گرنے سے کوئی فطرتاً نکتہ رس دماغ انجن کی سلطنت کا خیال حاصل کریگا۔ حقیر چیزیں معمولی واقعات چھوٹے چھوٹے خیالات و تصورات ہر شخص کو اپنی روزانہ زندگی میں پیش آتے ہیں لیکن وہ انہیں کم وقعت سمجھ کر نظر انداز کر دیتا ہے برعکس اس کے ایک حساس اور سوچنے والا انسان انہیں چیزوں سے متاثر ہوکر ان کی ماہیت و قوت کا مطالعہ کرکے ایسی اختراعات وایجادات ابنائے وطن کے سامنے پیش کرتا ہے، جو دنیا کی آسائش و آرام اور تہذیب و تمدن کی ترقی میں ممد ثابت ہوں اور اس کی اپنی قوم کا سر اقوام عالم سے بلند کردیں۔

کسی پھوس کے جھونپڑے میں رکھی ہوئی لالٹین کو ٹھوکر مار کر پرے پھینک دینا ایک گائے کے لئے معمولی بات تھی لیکن بے زبان جانور کی اس حرکت نے شکاگو جیسے عظیم الشان شہر کی فلک بوس عمارتوں کو چند گھنٹوں میں خاک کا تودہ بنا کر ایک لاکھ انسانوں کو خانماں برباد کر دیا۔ مغربی امریکہ کے مشہور اخبار سان فرانسکو پوسٹ نے ایک دفعہ نہایت پرلطف واقعہ لکھا کہ کسی تھوک فروش سوداگر کے منیم جی مختلف رقوم کی میزان نہ ملنے سے تین ہفتہ تک ایک پل بھی سکھ کی نیند نہ سوئے۔ بہی بتا رہی تھی کہ اس میں پورے نوسو ڈالر کا فرق آتا ہے ان رقوم کو اس نے سینکڑوں دفعہ جمع کیا اور ہر بار نوسو کا فرق دیکھ کر اس کا دل دھڑکنے لگتا یہ تردد اور پریشانی اُسے قریب قریب جنون کی حد تک لے گئی یہاں تک کہ تنگ آکر اس نے خودکشی کا ارادہ کرلیا۔ ایک دن دوکان کے مینجر نے روکڑ بہی طلب کرکے خود اُن رقموں کو جمع کیا لیکن نتیجہ وہی تھا ـــ نوسو ڈالر کی کمی۔ بالآخر دوکان کے مالک نے خود ایک بار انہیں جمع کرنا چاہا اور ابھی کچھ زیادہ رقمیں جمع نہ کی تھیں کہ ایک مقام پر اس نے رک کر کہا۔ میرا خیال ہے یہاں ۱۰۰ ہزار ڈالر چاہئیں ۱۹۰۰ کی رقم کچھ مشکوک معلوم ہوتی ہے ۱۹۰۰ کی رقم غور سے دیکھنے کے بعد معلوم ہوا کہ بہی کے صفحات میں ایک مکھی پس گئی تھی اور عدد کے بعد والے صفر سے مکھی کی ٹانگ اس صفائی سے لگ گئی کہ وہ (۹) پڑھا جاتا تھا۔ ابھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا کہ یہ حیرت انگیز بات اخباروں میں گشت لگا رہی تھی کہ الباما جیل میں ایک بدنصیب لڑکی بیس ماہ کی بجائے بیس سال تک قید رہی اور محض اسی سبب سے کہ عدالت کے ایک غفلت شعار منشی نے حکم نامہ میں ۲۰ ماہ کی بجائے ۲۰ سال لکھ دیا تھا۔[۹] ایک شخص کی ذرا

[۹] ڈواٹ ٹو اسے فنش۔ ڈاکٹر مارڈن

سی بداحتیاطی اور غلطی نے ایک بدنصیب لڑکی کی عمر کا بہترین حصّہ زنداں خانہ کی چار دیواری میں تباہ کرکے اتنے طویل سالوں تک اُسے آزادی کی نعمت اور زندگی کی دیگر مسرّتوں سے یکسر محروم کردیا۔

اس زمانہ میں جب ریگستان عرب کا ہر ذرہ نور ربانی کی کرنوں سے جگمگا کر دشمنان اسلام کی آنکھوں میں خیرگی پیدا کررہا تھا حضرت ختم المرسلین کی مقدس ہستی کو فنا کرنے کے لئے ابو جہل، ابولہب اور حکم بن ابی العاص جیسے کینہ ور بدبخت ادھار کھائے بیٹھے تھے اس دوران میں سرور عالم نے بایمائے رب ودود مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کرجانے کا ارادہ کیا۔ اور اپنے جاں نثار دوست جناب ابوبکر صدیقؓ کے ہمراہ رات کو مکہ سے نکل کر قریب اڑھائی میل کے فاصلہ پر جنوب کی جانب غار ثور میں قیام فرمایا۔ کفار نے مکہ میں حضور کو نہ پاکر ہر چہار طرف آپ کا تعاقب جاری رکھا حتیٰ کہ وہ غار ثور تک بھی جا پہنچے لیکن خدا کے حکم سے، جو ہمیشہ اپنے نیک بندوں کا حافظ و ناصر رہا ہے، ایک مکڑی نے غار کے منہ پر جالا تن دیا اور متعاقبین یہ سوچ کر واپس چلے گئے کہ اگر کوئی شخص غار کے اندر داخل ہوتا تو یہ ننھا سا خوبصورت جالا کسی صورت قائم نہیں رہ سکتا تھا ایک چھوٹی سی مخلوق کے توسط سے خدا نے دنیا کے سب سے بڑے انسان کو دشمنوں کے شر سے محفوظ رکھکر چار دانگ عالم میں توحید کا ڈنکا بجوادیا اور صنم کدوں کی چوکھٹوں پر گھسنے والی پیشانیاں اسکے اپنے ہی سامنے جھک گئیں ⁂

بعض اوقات ذراسی فروگذاشت معمولی سی کمزوری یا جذبات کا اشتعال نہ صرف دنیا کے بہترین دل و دماغ رکھنے والے انسانوں کی ناکامی کا باعث ہوا ہے بلکہ بعض عظیم الشان سلطنتوں کی تباہی، بڑے بڑے کجکلاہوں کی ہلاکت بھی انہیں حقیر چیزوں اور معمولی باتوں کو نظر انداز کردینے سے معرض شہود میں آئی ہے سنہ ۲۱۷ھ میں خلیفہ مامون الرشید نے محض اس بنا پر روم کو تاراج کردیا تھا کہ اس ملک کے بادشاہ نے صلح کی درخواست میں صرف اتنی گستاخی کی تھی کہ خط میں خلیفہ کے نام سے اپنا نام پہلے لکھ دیا تھا[۱]۔ فاروق اعظم کے عہد خلافت میں جب اسلامی فتوحات کا قلزم جوش مار رہا تھا ابوموسیٰ اشعری نے سنہ ۱۶ ہجری میں سوس کا محاصرہ کرکے ہر طرف سے رسد بند کردی۔ جب محصورین کو ہر طرف سے مایوسی ہوگئی تو مجبوراً رئیس شہر نے اس شرط پر صلح کی درخواست کی کہ اس کے خاندان کے سو آدمی زندہ چھوڑ دیئے جائیں۔ ابوموسیٰ نے منظور کیا۔ رئیس ایک ایک آدمی کو نامزد کرتا جاتا تھا اور اس کو امن دے دیا جاتا تھا۔ بدقسمتی سے شمار میں رئیس نے خود اپنا نام نہیں لیا تھا چنانچہ جب سو کی تعداد پوری ہوگئی تو ابوموسیٰ نے رئیس کو جو شمار سے باہر تھا قتل کرادیا[۱] یہ تھا ذرا سی خود فراموشی اور سہل انگاری کا نتیجہ۔

ادھر ایک مسلمان سپاہی کا کیریکٹر دیکھیئے۔ جس کے متعلق علامہ اقبال نے کہا ہے ع عدل تھا اس کا قوی لوث مراعات سے پاک

نپولین کی سوانح حیات کا مطالعہ کرنے والے اصحاب اس بات کو بخوبی جانتے ہیں کہ معمولی اور چھوٹی چیزیں کس

⁂ تاریخ الاسلام۔ مولوی محمد احسان اللہ العباسی[۱] علامہ شبلی۔ المامون صفحہ ۹۱ [۱] الفاروق صفحہ ۱۱ شبلی نعمانی مرحوم

طرح اس کی توجہ کو اپنی طرف منعطف رکھتی تھیں ان بے بضاعت چیزوں کی طرف جس پر اسکے ادنیٰ سردار اپنی توجہ ضائع کرنا پسند نہ کرتے تھے، نپولین اپنا بہت سا وقت ان کا مطالعہ کرنے اور ان کے اسباب وعلل پر غور کرنے میں صرف کردیتا تھا۔ فوج کی رسد کے انتظام کا ہر شعبہ اس کی اپنی نگرانی میں تھا۔ گھوڑوں کی خوراک، بسکٹوں کا معائنہ کھانا پکانے کے برتن اور جوتوں تک کی دیکھ بھال وہ خود کرتا تھا۔ ان افسروں سے شدید طریق پر بازپرس ہوتی تھی جو ہر معرکہ کا بالتفصیل حال اور مختلف فہرستیں شرح وبسط کے ساتھ نہیں لکھتے تھے۔ ایک دفعہ نپولین نے خود اعتراف کیا کہ میں ان تمام خبروں اور فہرستوں کو شروع سے لیکر آخر تک دیکھنے کا ہر موقع مہیا کرتا ہوں اور اس طرح بنگاہ تعمق دیکھنے سے مجھے ایسا لطف حاصل ہوتا ہے کہ ایک نوجوان دوشیزہ کسی دلچسپ افسانہ کے مطالعہ سے اتنا حظ حاصل نہیں کرسکتی۔ اور ان باریکیوں کی دیکھ بھال کا یہ نتیجہ تھا کہ صرف ایک ادنیٰ حیثیت سے ترقی کرتے کرتے وہ ایک باجبروت بادشاہ بن گیا جس نے متعدد سالوں تک یورپ کی قسمت کو اپنے بلند حوصلہ دل کے ارادوں اور نوکِ شمشیر کے ماتحت رکھا۔

ہیلن آف ٹرائے، یونانِ قدیم کی وہ حسین ترین عورت جس کی خاطر کئی خون آشام لڑائیاں لڑی گئی تھیں اگر اس کی ناک کا ذرا سا حصہ کاٹ لیا جاتا تو اس کے حسن شکیب سوز کی برق ریز تجلیاں بالکل ماند پڑ جاتیں۔ اگر کلیوپیٹرا کی ناک ایک ہی انچ چھوٹی ہوتی تو مارک انطونی، سلطنتِ روما کا مایہ ناز فرزند جس کی شجاعت وبسالت نے اہل مصر کے حوصلے پست کر رکھے تھے، یوں اس کے جمال جہاں آرا پر فدا نہ ہوتا اور محبوبۂ مصر کے حسن کا یہ نقص یقیناً دنیا کی تاریخ بدل دیتا۔ جبنی بولین کی برق تبسم نے عظیم الشان کلیسائے روم کے دو ٹکڑے کرکے ایک بہادر و بلند مرتبت قوم کی بنیادیں ہلا دی تھیں۔ مہارانی پدمنی کے حسن زاہد فریب کی ایک ہی جھلک نے ناقابل تسخیر قلعۂ چتوڑ کی اینٹ سے اینٹ بجا کر ہزاروں جانفروش راجپوتوں کو ہمیشہ کی نیند سلا دیا۔ نورجہاں بیگم کا بھولے پن سے کبوتر اڑا دینا گو ایک معمولی سا واقعہ تھا لیکن شیر افگن جیسے شجاع و فرزانہ انسان کی موت اور خود مہرالنساء بیگم کے حرم شاہی میں داخل ہوکر ملکۂ ہندوستان بننے کا باعث ہوا۔ نپولین جیسا بے دھڑک اور بہادر آدمی جو یورپ کے طاقتور شہنشاہوں کے دارالسلطنتوں پر حملہ کرنے سے کسی قسم کا خوف نہ کھاتا تھا۔ صرف ایک خود مختار عورت، مادام دی سیتل، کے سیاسی دباؤ سے ہر وقت خوفزدہ رہتا تھا۔

سیاہی کا ایک قطرہ جب کسی اچھوتے خیال پر شبنم کی طرح گرتا ہے تو ایک ایسی چیز پیدا کردیتا ہے کہ ہزاروں نہیں لاکھوں انسان اس پر غور کرنے کے لئے مجبور ہوجاتے ہیں[1]۔ یوروپ نیٹشے کو اور امریکہ وٹمین کو فراموش کرکے آج اقبال کے الفاظ پر غور کر رہا ہے کیونکہ اس کے غیر فانی اشعار میں ایک ایسی حیات بخش تعلیم مضمر ہے جسے دنیا کا کوئی اور فلسفی شاعر الفاظ کے قالب میں منتقل نہ کرسکا۔ سعدی علیہ الرحمۃ کے چند غیر فانی جملے، اکبر الہ آبادی کی جمود شکن نظمیں کیا ہیں مختصر الفاظ

[1] ڈون جوئن۔ لارڈ بائرن۔

کا مجموعہ کیسے پاکیزہ اور گراں پایہ الفاظ ہیں کہ سیاہی کے چند قطرات کی تاریکیوں میں تابندہ برق کی طرح کوند کر قوم کے نہاں خانۂ دل و دماغ کو روشن و منور کر رہے ہیں۔

قانونی دستاویزیں بعض اوقات صرف ایک لفظ کا تغیر و تبدل ساری تحریر کا مفہوم بدل دیتا ہے لاکھوں روپے کی جائدادیں وصیت ناموں میں چند ضروری الفاظ کے حذف یا غیر ضروری الفاظ کے ایزاد کر دینے سے ایک شخص کے قبضہ سے ہمیشہ کے لئے نکل کر دوسرے کے نام منتقل ہو چکی ہیں۔ چند سال گذرے کسی قانونی مسودہ میں جو جمہوریہ متحدہ امریکہ کی مجلس وضع آئین میں پیش ہوا تھا۔ ایک ونقفہ (کومہ) کے رہ جانے سے حکومت کو تئیں لاکھ روپے کا نقصان برداشت کرنا پڑا۔ گذشتہ سال عدالتِ عالیہ (ہائیکورٹ) لاہور نے ایک شخص کا تقریباً پچاس ہزار روپے کا دعوٰی اس بنا پر خارج کر دیا کہ قرضہ کا پرامیسری نوٹ لکھاتے وقت اس نے ایک آنہ والے ٹکٹ کی بجائے پیسہ پیسہ والے چار ٹکٹ چسپاں کر دیئے تھے اگرچہ مجموعی قیمت ایک ہی تھی مگر قانون اور ضابطہ نے اُسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

بیکن نے ایک دفعہ کہا تھا کہ چھوٹی چھوٹی باتیں بعض اوقات بڑی بڑی سفارشیں بن جاتی ہیں[۱۱]۔ کسی زمانہ میں ایک گمنام لڑکا پیرس کے ایک مشہور بنک میں ملازمت کے لئے حاضر ہوا مگر کوئی آسامی خالی نہ ہونے کی وجہ سے اسے نفی میں جواب ملا جب وہ شکستہ دل ہو کر دروازہ سے باہر نکلا تو فرش سے ایک پن (سوئی) کو اٹھا لیا۔ بینک کے صدر نے یہ دیکھکر اُسے واپس بلا لیا اور معمولی تنخواہ پر ملازم رکھ لیا۔ اس معمولی تنخواہ سے ترقی کرتے کرتے وہ گمنام لڑکا عروس البلاد پیرس کا سب سے بڑا ساہوکار بن گیا۔ یہ مشہور ارب پتی لافیت کی زندگی کا ایک واقعہ ہے۔ گولڈ سمتھ کہتا ہے کہ کسی فلسفی کے نزدیک کوئی واقعہ یا خیال خواہ وہ کتنا ہی معمولی کیوں نہ ہو کبھی نظر انداز کر دینے کے قابل نہیں ہوتا[۱۲]۔ گوئٹے ایک دفعہ کسی بادشاہ سے ہم کلام تھا کہ ایک ننھا سا خیال چنگاری کی طرح اس کے دل میں چمک اٹھا "مجھے ایک منٹ کے لئے معاف کیجئے" اس نے بادشاہ سے مودبانہ عرض کی اور ملحقہ کمرہ میں داخل ہو کر اپنے خیال کو قلمبند کر لیا۔

کیا لہلہاتے کھیتوں کی سرسبزی و شادابی کا راز ایک حقیر دانۂ گندم میں مضمر نہیں؟ چھوٹے چھوٹے پتوں کا اجتماع عروس بہار کی زینت اور بلند قامت درختوں کا زیور ہے اور خیابان کی رنگینیاں چھوٹے چھوٹے پھولوں کے تعطر کی رہین منت۔ انگور کے بیسیوں جاذب نظر خوشے ایک چھوٹے سے بیج کا حاصل اور سینکڑوں رنگین اور رس بھرے آم ایک بے حیثیت گٹھلی کا شیریں ثمر ہیں۔

دنیا خود کیا ہے؟ ایک چھوٹے سے لفظ "کن" سے ظہور میں آئی ہوئی!!

---

[۱۱] بیکن کا ایک مشہور مضمون "آف سپر میسیز"۔ [۱۲] سٹی زن آف دی ورلڈ۔ گولڈ سمتھ۔

ایک بے حقیقت مچھر نے اپنے وقت کے سب سے زیادہ طاقتور بادشاہ نمرود کی زندگی کا خاتمہ کر دیا تھا۔ وہ جوانمرد ودلاور سپاہی جو متعدد لڑائیوں میں تیر و تفنگ کے سامنے سینہ سپر کر کے کامران و فتحمند واپس ہوتا ہے ایک معمولی سوئی کے چبھ جانے سے اس کا جاں بحق ہونا نہایت ممکن ہے۔ بحر ناپیدا کنار کے بے پناہ تھپیڑوں اور متلاطم امواج میں اپنی ہستی برقرار رکھنے والے کئی جہازوں کو معمولی کیڑوں نے ندار تختوں میں سوراخ کر کے اس وقت ڈبو دیا جب سمندر کی سطح ہموار بالکل پرسکون اور خاموش تھی۔ انسان اپنی طاقتوں پر ہمیشہ نازاں اور جبلی کمزوریوں کو نظر انداز کر دینے کا عادی رہا ہے درحالیکہ اسکی صحیح قوت کا اندازہ اس کی سب سے چھوٹی کمزوری مدنظر رکھنے سے ہو سکتا ہے۔

جب زمانۂ آئندہ کا مورخ تاریخ عالم کا گرد سے اٹا ہوا غلاف علیحدہ کر کے اس کے اوراق پر نگاہ ڈالے گا تو یہ امر اس کیلئے باعثِ حیرت و استعجاب ہو گا۔ کہ وہ اولوالعزم لوگ جنہوں نے معمولی واقعات و سانحات پر سب سے زیادہ توجہ کی تھی۔ بنی نوع انسان کے مربیوں کی صف اول میں رونق افروز ہیں۔ شہرت، دولت، منصب اور دنیاوی اعزاز صحیح کامیابی سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے۔ دنیا کے سب سے زیادہ کامیاب انسان ؐ نے جب اس دارفانی سے عالم جاودانی کی طرف رحلت فرمائی تو ترکہ میں صرف اپنے ہتھیار، ایک خچر اور تھوڑی سی زمین کے سوا اور کوئی چیز نہیں چھوڑی تھی۔ وہ لوگ جو ہمدردی مہر و مروت اور جذبات انسانی کو معمولی اور بے حقیقت چیزیں سمجھ کر پاؤں تلے مسل ڈالتے ہیں اور ان باتوں پر اس لئے دھیان نہیں دیتے کہ یہ حصول خواہشات کی راہ میں سنگِ راہ ثابت ہوتی ہیں —— خواہ کچھ بھی ہو —— ان کے یہ ادنٰے اور پست خیالات انکے لئے باعثِ تحقیر و ندامت ہونگے جب داورِ محشر کے حضور میں ان کے نامۂ اعمال کا دفتر کھلیگا۔

ایسے لوگوں کی حالت بعینہٖ اس سپاہی کی طرح ہے جسے عدیم النظیر موتیوں سے بھرا ہوا ایک نہایت خوشنما چرمی تھیلا اہل عجم کی اس جنگ میں ہاتھ آیا تھا جب گلیریس نے عجمی لشکر کو شکست دی تھی اور بقول مشہور مورخ گبن، اس سپاہی نے نادانی سے انمول موتیوں کو دور پھینک کر چمڑے کے چمکتے ہوئے تھیلے کو نہایت حزم و احتیاط سے اپنے پاس رکھ لیا تھا —— اس وقت ان مدعی طالبانِ حشمت و تنعم کو معلوم ہو گا کہ وہی معمولی اور چھوٹی چھوٹی چیزیں جنہیں بنگاہِ حقارت دیکھ کر انہوں نے ٹھکرا دیا تھا سچی خوشی اور ساتھ آنے والی دولت تھیں۔ نہ کہ وہ جاہ و ثروت جو مرنے کے ساتھ ہی فانی دنیا میں مجبوراً چھوڑ دینی پڑی ✦

محمد ضیاء الدین شمسی

---

* مدراس میں ایک سپاہی کے سوئی چبھ جانے سے اسکے بدن کا تمام خون زہریلا ہو گیا تھا۔ تذکرۃ الحبیب مفتی محمد انوار الحق ایم، اے۔

درسِ فطرت

اس نظم کے متعلق یہ امر قابلِ گزارش ہے کہ اسمیں یہ سعی کی گئی ہے کہ مصرعوں کے اوزان میں کمی وبیشی ہونے کے باوجود اس کی سلاست وموسیقی پر کوئی اثر نہ پڑے۔ اس صنعت میں جس دن سے کالرج اپنی نظم "کبلا خان" لکھ کر کامیاب ہُوا، انگریزی شاعری میں انقلاب پیدا ہو گیا۔ آج کل جب کہ آزادی کے ساتھ دوسری زبانوں کی خوبیوں کو اردو شاعری میں منتقل کیا جا رہا ہے اس کا تجربہ کیوں نہ کیا جائے کہ اگر ارکان بحر یکساں ہوں تو یہی خوبی اردو کی شاعری میں بھی ممکن ہے۔ بلینک ورس کی طرف تو اُردو شعرا توجہ کر چکے ہیں مگر زنگ درس کی خوبیوں کو ابھی تک اردو کا جامہ نہیں پہنایا گیا۔

(۱)

دریا کنارے شام کو اک دن گزر میرا ہُوا
دیکھا وہاں آبِ رواں اور سبزۂ غلطیدہ جو
پھیلا ہُوا تھا ہر طرف
خواہش ہوئی دل میں کہ بس ٹھہروں یہیں
کرتا رہوں نظارۂ صحرائے رشکِ بوستاں!

(۲)

اِک بیخودی طاری ہوئی عقل و حواس و ہوش پر
ایسی کہ میں بھی ہو گیا ماحول کا اک جزو لاینفک مگر
کچھ دیر جب گذری یونہی
آیا یکایک ہوش پھر، اور دیکھ کر چاروں طرف
مجھ کو پشیمانی ہوئی!

(۳)

دل نے کہا انساں ہے تُو! اللہ کا نائب ہے تو!
مخلوق میں اشرف ہے تو! لیکن ذرا مجھ کو بتا
کس بات میں برتر ہے تو! تجھ میں ہوا کا کیف ہے؟
پانی کا تجھ میں زور ہے؟ سبزہ کا تجھ میں عجز ہے؟
یا دلربائی ہے شفق کی جس سے روشن ہے فضا؟

(۴)

ہاں دیکھ دریا کو کہ ہے اک چشمۂ جود و سخا
جس سے جہاں سیراب ہے لیکن ہمیشہ عجز سے
گھستا ہے وہ اپنی جبیں! تیری یہ حالت ہے مگر
بے فیض ہے تیرا وجود اس پر کبھی
نخوت ترے سر سے نہیں ہوتی جُدا!

(۵)

دل جب ملامت کر چکا، میں نے خدا سے کی دعا
"مجھ کو بھی وہ اوصاف دے، جن سے ہے فطرت متصف
جو اس کے ہر نظارہ میں کرتے ہیں جلوہ پاشیاں!
میری طبیعت کو ملے دریا کا جود بے غرض
دریا کا عزم بے خلل، دریا کا عجز بے ریا

اشتیاق حسین قریشی

ہندی شعراء کا حسنِ تخیل

ہندی شاعری کی جان سادگی ہے یعنی جس خیال کا اظہار مقصود ہو۔ ہندی شاعر اُسے ایسے الفاظ میں اور ایسے طریقے سے بیان کرے گا کہ پڑھنے والے کے سامنے اس خیال کی اصل کیفیت کا نقشہ ہوبہو کھنچ جاتا ہے وہ فضول ادھر اُدھر نہیں دوڑتا۔ نہ آسمانِ خیال کے تارے توڑنے کی سعی کرتا ہے۔ اُسے جو کچھ کہنا ہوتا ہے سیدھے سادھے الفاظ میں کہہ دیتا ہے اور پڑھنے والے پر وہی کیفیت طاری ہو جاتی ہے وہ نہ خود پریشان ہوتا ہے نہ اپنے پڑھنے والوں کو پریشان کرتا ہے۔ وہ دنیا کو جس طرح دیکھتا ہے، اُسے اسی طرح بیان کر دیتا ہے۔ اور پڑھنے والے کو اسی طریقہ سے دکھا دیتا ہے اور اسکے دل پر اس کا اک خاص اثر ہوتا ہے۔ مثلاً ایک نوجوان کی مرگِ ناگہانی کا بیان کرتے ہوئے ایک شاعر کہتا ہے

ماتا بیٹھ سرہانے رووے پائنت رووے ڈاری
بانہہ پکڑ کے بھائی بولے ہائے بچھڑ گئی جوڑی

ترجمہ اُس کی ماں سرہانے بیٹھ کر رو رہی ہے اور بیوی پائنتی کی طرف بیٹھی اشکباری میں محو ہے۔ بھائی اپنے مرے ہوئے بھائی کا بازو پکڑ پکڑ کر کہتا ہے۔ افسوس آج ہماری جوڑی بچھڑ گئی۔

موت کا کیا صحیح اور سادہ بیان ہے کہ بادی النظر میں اس میں کوئی خاص شاعرانہ خوبی دکھائی نہیں دیتی لیکن ذرا غور سے دیکھا جائے تو اس معمولی شعر میں شاعر نے بہت بڑی خوبی پیدا کر دی ہے۔ ماں کو بیٹے سر کا سایہ کہتے ہیں اس لئے شاعر نے اُسے لاش کے سرہانے جگہ دی ہے۔ بیوی خدمت کرتی ہے اُسے پاؤں کی طرف بٹھایا ہے۔ بھائی کو عام طور پر بازو کہا جاتا ہے اسلئے وہ بار بار بانہہ پکڑتا ہے اور ٹھنڈی سانس بھر بھر کے کہتا ہے۔ افسوس آج ہماری جوڑی بچھڑ گئی۔ میں دنیا میں اکیلا رہ گیا یہاں اگر شاعر بھائی کی جگہ بیوی لکھ دیتا تو شعر کی ساری خوبصورتی تباہ و برباد ہو جاتی۔

ماٹی کہے کمہار سے تو نت اُٹھ مانجے موہے
اک دن ایسا آئیگا جب میں مانجوں گی توہے (کبیر صاحب)

ترجمہ: مٹی کمہار سے مخاطب ہو کر کہتی ہے کہ تو ہمیشہ مجھے صاف کرتا رہتا ہے لیکن یاد رکھ ایک دن ایسا بھی آنے والا ہے جب تیرے ہاتھ ساکت ہونگے اور تجھ پر میرا قبضہ ہو گا۔

کیا صاف اور سادہ خیال ہے اور کیسے معمولی الفاظ لیکن ان کے اندر شعریت اس طرح گھلی ہوئی ہے جس طرح گنے میں

شیرینی۔ یہی گفتگو ایک نازنین اور مٹی کے درمیان کرائی جاسکتی ہے لیکن شاعر نے خاص کمہار کو کیوں انتخاب کیا اس لئے کہ کمہار دن رات مٹی کا کام کرتا ہے اُسکے وقت کا بیشتر حصّہ مٹی میں گذرتا ہے۔اس لئے جب مٹی اسے مخاطب کر کے کہتی ہے کہ آج تو مجھ سے کھیل رہا ہے لیکن وہ دن بھی قریب ہے جب میں تجھ سے کھیلوں گی تو خیال میں ایک خاص دلآویزی اور معقولیت پیدا ہو جاتی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں۔کہ ہندی شاعر صرف زمین پر رینگتے ہیں اور کبھی کبھی سر اٹھا کر اوپر دیکھ لیتے ہیں اور ان میں آسمان تخیل پر اڑنے کی قوت نہیں۔یقیناً اس قسم کا اظہار خیال اُن کے کمال کی بدترین توہین ہے اور ان پر انتہا درجہ کا ظلم کرنا ہے۔ہندی شاعروں نے تخیل کے آسمان میں بھی پرواز کی ہے۔اور اپنے اشعار کو مبالغہ کے رنگ سے آراستہ کیا ہے۔مگر اُن کا معراج کمال یہ ہے کہ مبالغہ انتہا درجہ کا ہونے کے باوجود نیچر کے خلاف نہیں، یعنی مبالغہ کا رنگ اصلیت کے رنگ کو چھپا نہیں دیتا ہے۔جب سری رامچندر جی اور لچھمن جی جنک پوری میں گئے اور بازار دیکھنے کیسلئے نکلے تو ان کے حسن جہاں سوز کا گھر گھر میں تذکرہ ہونے لگا۔چنانچہ ایک عورت نے دوسری عورت سے پوچھا کیوں بہن! تونے وہ دو بھائی بھی دیکھے جن کے حسن وجمال کی تعریف جنک پوری کے بچے بچے کی زبان پر ہے اس پر اس عورت نے جواب دیا۔

رام گورکم کہوں بھانی   گیرا نین نین بن بانی

(گوسائیں تلسی داس)

اے بہن! وہ رام لچھمن دونوں بھائی اتنے حسین ہیں کہ اُنکے حسن کا بیان نہیں ہوسکتا۔آنکھ دیکھتی ہے مگر قوت گویائی سے محروم ہے۔اور زبان بول سکتی ہے مگر اس کو قدرت نے بصارت نہیں دی ہے کہ وہ ان کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر رائے قایم کر سکے گویا جب تک یہ دونو قوتیں یکجا متحد نہ ہوجائیں اس وقت تک رام لچھمن کی شکل وصورت کا مکمل بیان قریب قریب ناممکن ہے گوسائیں تلسی داس کی خوبی یہ ہے کہ اس نے خوبصورتی کا بیان نہیں کیا مگر کرے گا۔ذیل میں ہم چند اور مثالیں پیش کرتے ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ ہندی شاعروں کے تخیل کی کہاں تک رسائی ہے۔

شوہر کا تصوّر

ایک نازنین جس کا شوہر پردیس میں ہے سنگار کر رہی ہے۔اس کی سہیلی اس سے پوچھتی ہے

ندی اسنے گن بن گھنے اور نج نج پرسے پہار

میں پوچھوں توسوں سکھی تو لیہہ پر کتو سنگار   (بہاری)

ترجمہ:تیرے اور تیرے شوہر کے درمیان کئی جنگل پربت اور دریا حائل ہیں۔ اے سکھی! میں تجھ سے پوچھتی ہوں کہ آخر یہ سنگار کاہے کے لئے ہے؟

نازنین جواب دیتی ہے ؎

آج چندرما دوج ہے ششی جیوت چھوں اور
ہمری اور درگپال کی نجر پرے اک ٹھور (بہاری)

ترجمہ:- آج مہینے کی ۲۹ تاریخ ہے۔ نیا چاند نکلنے والا ہے لوگ چھتوں پر چڑھ کر دیکھیں گے ممکن ہے اُدھر میرا شوہر دیکھ رہا ہو اِدھر میں چھت پر چڑھوں اور سطح ماہتاب پر ہم دونوں کی مہجور نگاہوں کا وصال ہوجائے۔

جن انکھیں میں تو بسے اور نہ کوؤ سمائے
بھری سرائے دیکھ کے پتھک نہ اگے آئے (رس کھان)

ترجمہ اے پیارے جن آنکھوں میں تیرا تصور سماچکا ہے وہاں کوئی دوسری صورت جگہ نہیں پاسکتی جس طرح بھری ہوئی سرائے دیکھ کر مسافر دور ہی سے لوٹ جاتا ہے۔

بانہہ چھڑائے جات ہو نبل جان کے موہیں
ہردے سے جب جاؤگے سبل بدوں گی توہیں (سورداس)

ترجمہ:-عورت کہتی ہے تم نے مجھے کمزور پاکر اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور بھاگ نکلے لیکن مزا جب ہے جب میرے دل میں سے نکل کر دکھاؤ جب جانوں کہ تم بہادر ہو۔

آنکھ کا بیان

اس ہلاہل مدبھرے ست شیام رتنار
جیت مرت جھک جھک پرت جہنی چتوت اکبار (بہاری)

ترجمہ:-عورت کی آنکھ میں سیاہی، سفیدی اور سرخی دیکھ کر بہاری شاعر کہتا ہے کہ یہ سیاہی سفیدی اور سرخی نہیں، بلکہ زہر آب حیات اور شراب ہے، اس لئے جوان کی طرف ایک دفعہ دیکھ لیتا ہے۔ وہ پہلے تو زہر کے اثر سے مرجاتا ہے پھر آب حیات کی تاثیر سے زندہ ہوجاتا ہے اور آخر میں شراب کے نشے کے باعث قدم قدم پر ٹھوکریں کھانے لگتا ہے۔

کیسا خوبصورت خیال ہے؟ لیکن قدرت کے عین مطابق

باروں بلی نو درگن پر الی کھنجن مرگ میں آدھی ڈیٹھی چتونی جیہی کے لال اوہیں۔ (بہاری)

ترجمہ ۔ بھونرا، پنچھی، ہرن اور مچھلی سب کے سب تیری آنکھوں کی خوبصورتی پر نثار کردوں۔ تیری ان نیم وا آنکھوں نے کرشن جیسے بے نیاز آدمی کو اپنے قبضہ میں کرلیا۔

کہا لڑے تے درگ کرے پرے لال بے حال
کہوں مری کہوں پیت پٹ کہوں لکٹ بن مال (بہاری)

ترجمہ :۔ رادھکا سے آنکھیں چار ہوتے ہی کرشن بیحال ہوگیا۔ اب کہیں پٹیا مبر جاتا ہے کہیں مالا کہیں بنسری۔ کرشن کو کسی شئے کی بھی سدھ نہیں رہی

مکتا وا اے کان میں کیہہ کارن کنپا ئے
ترچھی چتون موں ڈرے کہ پھر نہ بیدھا جائے (متی رام)

ترجمہ :۔ معشوق کے کان میں پڑا ہوا موتی ہلتے دیکھ کر شاعر سوال کرتا ہے کہ یہ کانپتا کیوں ہے؟ پھر خود ہی جواب دیتا ہے کہ یہ ترچھی چتون سے ڈرتا ہے کہ کہیں دوسری دفعہ پھر میرے کلیجہ میں سوراخ نہ ہو جائے۔

حسن و عشق

ماگھ کے مہینے میں ہندو عورتیں برت (روزہ) رکھتی ہیں اور رات کو چاند دیکھے بغیر کھانا نہیں کھاتیں۔

ایک عورت اپنی کمسن سہیلی سے کہتی ہے

تو رہی سکھی ہوں ہی لکھوں چڑھ نہ اٹاول بال
بن ہی اونگے سسی سمجھ دیہیں ارگھ اکال (بہاری)

اے چاند جیسے چہرہ والی سکھی! تو چاند دیکھنے کے لئے چھت پر نہ جا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ دوسری عورتیں تجھے ہی چاند سمجھ کر ارگھ دے دیں اور برت توڑ دیں۔ ان کے اس گناہ کی ذمہ دار تو ہوگی۔

مانہو تن چھب اچھ کو سو چھ راکھیے کاج
درگ پگ پونچھن کو کئے بھوشن پائن داج (بہاری)

ترجمہ ۔ شاعر کہتا ہے کہ اس نے زیور اس لئے نہیں پہنے کہ اس کے حسن و جمال میں اضافہ ہو بلکہ اُن کا مقصد تو یہ ہے کہ نگاہ جب اس کے چہرے تک پہنچے تو میلے مٹی بھرے پاؤں پہلے صاف کرلے گویا زیور کیا ہیں پاانداز ہیں۔

نیہہ نہ نین کو کچھ اپچی بڑی بلائے
نیر بھرے نت پرتی رہیں تیو نہ پیاس بجھائے (بہاری)

ترجمہ ۔ عورت کہتی ہے یہ محبت نہیں ہے آنکھوں کو کوئی بلا چمٹ گئی ہے۔ کیونکہ ہمیشہ پانی سے بھری رہنے پر بھی انکی پیاس نہیں بجھتی

پانی اور پیاس کا تعلق پیدا کر کے شعر میں جان ڈال دی ہے۔ مگر شعر خلاف قدرت نہیں ہوا۔

کینے ہو کوئی جتن اب کے کاڑھے کون　　موہن موہن روپ ہل پانی میں کو لون

ترجمہ۔ عورت کہتی ہے اب لاکھ کوشش کرنے پر بھی میرے دل کو اور دل کے خیال کو کوئی پریتم کے روپ سے نہیں نکال سکتا۔ کیونکہ میرا دل اس میں اس طرح حل ہو گیا ہے جس طرح نمک پانی میں حل ہو جاتا ہے۔

ہجر کی گھڑیاں

لکڑی جل کوئلہ بھئی کوئلہ جل بھیا راکھ

میں برہن ایسی جلی نہ کوئلہ بھئی نہ راکھ

ترجمہ۔ لکڑی جل کر کوئلہ ہو گئی اور کوئلہ جل کر راکھ ہو گیا لیکن مجھے ہجر کی آگ نے ایسا جلایا، ایسا جلایا کہ میں نہ کوئلہ ہوئی نہ راکھ۔ میرا کچھ بھی باقی نہ بچا۔

ساجن جو میں جانتی بیت گئے دکھ ہوئے　　نگر ڈھنڈورہ پھیرتی بیت نہ کریو کوئے

ترجمہ۔ اے سوامی اگر مجھے معلوم ہوتا کہ محبت کے زمانہ میں ہجر کی گھڑیاں بھی آتی ہیں تو میں سارے شہر میں منادی کرا دیتی۔ کہ کوئی عورت محبت نہ کرے۔

کیا بھیو جو بچھڑے تو من مومن ساتھ

اڑی جاؤ کتو گڑی تو اڈائک ہاتھ　　(بہاری)

ترجمہ۔ جسمانی جدائی ہو گئی تو کیا مضائقہ ہے۔ روحانی جدائی ناممکن ہے۔ پتنگ اڑ کر دور چلا جائے لیکن اس کی ڈور اڑانے والے کے ہاتھ ہی میں رہتی ہے۔

کل نہیں کلا ندھی کھنجن کنج کچھو دن کیشو دیکھ جئے　　گنتی آنن لوچن پائن کے انوروپک سے من مان لئے

یہی کال کرال نے سودھ سبھے کے ورشامی کئے　　اب دھوں بن پران پریا رہی میں کیہ کون سوا لجھیئے (کیشو)

ترجمہ۔ جب مجھے اسکی رفتار یاد آتی تھی تو ہنس کو دیکھ کر میرا دل بہل جاتا تھا۔ جب چہرے کا خیال آتا تھا۔ تو چاند مجھے تسلی دیتا تھا۔ جب آنکھوں کا دھیان آتا تھا تو حسین پرندوں کی طرف دیکھ کر میں خوش ہو لیتا تھا اور نازک پاؤں کا خیال رنگین پھولوں سے کسی حد تک دور ہو جاتا تھا مگر جب برسات کا موسم آیا تو یہ سب طفل تسلیاں بھی بہ گئیں۔ اب میرے دل کو کون ڈھارس دے گا؟

ہوں ہی بوری برہ بس کے بورو سب گام　　کیا جانے کہت ہیں سسی پی سیتکر نام

(بہاری)

ترجمہ۔ شوہر کی جدائی میں میں دیوانی ہوگئی ہوں یا گاؤں کے لوگوں کی عقل ماری گئی ہے۔ آخر کیا سمجھ کر لوگ چاند کو سرد کرنوں والا کہتے ہیں۔

ایک تل

اپنی محبوبہ کے رخسار پر ایک تل دیکھ کر شاعر کہتا ہے۔

سب جگ پیرت تلن کو تھکیو چت یہ ہیر

تو کپول کو ایک تل سب جگ ڈاریو پیر (مبارک)

ترجمہ ہم ہمیشہ دیکھتے تھے کہ ساری دنیا تلوں کو پیلتی ہے لیکن آج معلوم ہوا کہ تیرے رخسار کا تل ساری دنیا کو پیل رہا ہے

گوری کے مکھ ایک تل سو موہیں کھرو سہائے

مانو ہی پنکج کی کلی بھنور بلبیو آئے (مبارک)

ترجمہ میری محبوبہ کے رخسار پر جو ایک تل ہے۔ وہ مجھے بہت مرغوب ہے اُسے دیکھ کر مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تل نہیں ہے۔ بلکہ پھول کی کلی پر آکر بھونرا بیٹھ گیا ہے۔

ٹیڑھی چال

فرضی شاہ نہ ہو سکے گتی ٹیڑھی تاثیر

رحمن سیدھی چال تے پیادو ہوت وجیر (رحیم)

ترجمہ۔ سیدھی چال چلکر (شطرنج میں) پیادہ بھی وزیر کے مرتبہ کو پہنچ جاتا ہے لیکن وزیر خواہ لاکھ ٹیڑھی چالیں چلے بادشاہ نہیں بن سکتا۔

شطرنج میں ایک ہی مضمون تھا رحیم نے اُسے اڑا لیا۔

گوالن کا سراپا

ماکھن سو من دودھ سو جوبن ددھی تے ادھکے اُر اینٹھی
جا چھب آگے چھپا کر چھا چھ سمیت سُدھا سُدھا سب تیٹھی
نین بنیہ چرو کو ہی دیو بھاوت بین بیوگ انگیٹھی
ایسی رسیلی اہیری ایہہ کہو کیوں نہ لگے من موہنی بیٹھی (دیو)

ترجمہ۔ مکھن جیسا ملائم دل ہے دودھ جیسا جوبن ہے۔ دہی سے بھی مضبوط محبت ہے۔ چاند کی خوبصورتی اس کے سامنے چھاچھ ہے۔ اس کے بغیر آب حیات (امرت) ناکارہ ہے۔ اس کی آنکھوں میں محبت (گھی) ہے۔ اسکی دو باتوں سے ہجر کی آگ بجھ جاتی ہے۔ ایسی موہنی ایسی خوبصورت گوالن خانۂ دل میں کیوں نہ بس جائے۔

خوبی ملاحظہ فرمائیے۔ گوالن کے اثاثہ دودھ ہی سے گوالن کا سراپا بنا دیا گیا ہے

عبادت کی اہمیّت

رام نام او لمب بنوں پر مارتھ کی آس — برشت وارد بوند گہی چاہت چڑھن آکاس (تلسی داس)

ترجمہ۔ خالق دوجہاں کی عبادت کے بغیر نجات کی توقع رکھنا ایسی ہی حماقت ہے جیسے کہ کھاکے قطروں کو پکڑ کر آسمان پر چڑھ جانے کی کوشش کرنا

تلسی بروا باگ کے سینچت بھی کملائیں — رام بھروسے جو رہیں پربت پر ہریائیں (تلسی داس)

ترجمہ۔ اے تلسی جن پودوں کو باغ میں نہایت محنت و جانکاہی سے سینچا جاتا ہے وہ بھی مرجھا جاتے ہیں لیکن جن کا کوئی والی وارث نہیں اور جنہیں صرف خدا کا بھروسا ہے وہ پہاڑوں پر بھی پھلتے پھولتے ہیں۔ ان کا خدا خود خیال رکھتا ہے۔

دھنش بان لکھ رام کر دینی ہوت اچھاہ — ٹیڑھے سودھے جڑن کو ہے پربھو ہاتھ نباہ (دین)

ترجمہ۔ رام کے ہاتھ میں تیر کمان دیکھ کر گنہگار اور مصیبت زدہ اشخاص کی ڈھارس بندھ جاتی ہے کہ جس طرح ان کے ہاتھ میں ٹیڑھی اور سیدھی اشیا بھی خوبصورت معلوم ہوتی ہیں۔ اسی طرح پرماتما کا رحم ہمیں بھی بحر دنیا سے پار کر سکتا ہے۔

تیر اور کمان کو لیکر کیا خوبی پیدا کی ہے

وفا شعاری

ایک درخت کو آگ لگ چکی ہے۔ پتے اور ڈال جل رہے ہیں۔ مگر ایک پرندہ درخت پر ثابت قدمی سے بیٹھا ہے۔ اور موت کے جانسوز شعلوں کی ذرا پروا نہیں کرتا ایک مسافر پاس سے گذرتا ہے اور عالم تحیر میں اس پرندے سے دریافت کرتا ہے

آگ لگی ہے برکش کو جلنے لگ گئے پات
تو جلے کیوں پنچھیا پنکھ ہیں تیرے سات

ترجمہ:۔ درخت کو آگ لگ گئی ہے۔ پتے جل رہے ہیں مجھے تعجب ہے کہ جب تیرے پنکھ صحیح و سلامت ہیں تو تو اڑکر اپنی جان کیوں نہیں بچا لیتا۔

پرندہ کیا خوبصورت جواب دیتا ہے۔

پھل کھائے اس برکش کے گندے کینے پات — یہی ہے مورا دھرم اب جل جاؤں اس کے سات

ترجمہ:۔ میں نے اس درخت کے پھل کھائے ہیں اور اس کے پتوں کو خراب کیا ہے اب ان مصیبت کے آخری لمحوں میں میرا یہ فرض نہیں کہ اسے تنہا چھوڑ جاؤں میں تو اس کے ساتھ ہی جل مروں گا۔

آجا پریتم نین میں پلک ڈھانپ توہے لوں — نہ میں دیکھوں آن کو نہ توہے دیکھن دوں

سحرِ ناکام

گھنے اور تاریک جنگل کے ساتھ ساتھ ایک ٹوٹا پھوٹا راستہ دور تک چلا گیا ہے۔ جہاں جنگل ختم ہوتا ہے وہاں کوہستان کی بلندیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ آفتاب دن بھر کے کاروبار سے تھک کر دامن کوہ میں جا چھپا ہے شام کا سایہ سرعت کے ساتھ تمام منظر پر چھا رہا ہے۔ اور تاریکی لحظہ بلحظہ بڑھ رہی ہے۔ پہاڑی کے دامن میں ایک غار ہے جس کے منہ سے کبھی کبھی سرخ روشنی کی جھلک نظر آجاتی ہے۔ اس کے سوائے سارے بیابان میں روشنی کی ایک کرن بھی دکھائی نہیں دیتی۔

مصور سپریا اس سنسان جنگل کے ٹوٹے پھوٹے راستے سے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا گذر رہا تھا بظاہر اس کی عمر تو کچھ زیادہ معلوم نہ ہوتی تھی۔ مگر اس کا کمزور اور نحیف جسم اس بوجھ سے جھکا پڑتا تھا جو اس کی پر الم زندگی نے اس کے کندھوں پر ڈال رکھا تھا۔ ضعف اور تکان کے باعث اب اس میں چلنے کی سکت نہ رہی تھی لیکن اس خیال سے کہ زیادہ اندھیرا چھا جانے پر کہیں راستہ چلنا دشوار نہ ہو جائے۔ وہ بہت جلد شہر میں پہنچ جانا چاہتا تھا۔

ایک اور شخص جو سامنے سے اس کی طرف آرہا تھا اب اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ سپریا نے ایک وحشت آمیز طریقہ سے اپنا سر اُٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور کہا "باسودت تم ہو"؟

باسودت نے ہنس کر جواب دیا "ہاں میں ہی ہوں۔ لیکن تم اس وقت یہاں کہاں۔

سپریا۔ میں شاہی محل سے آرہا ہوں۔

باسودت۔ اچھا! پھر تمہیں وہاں کچھ کامیابی بھی ہوئی؟

سپریا۔ ہاں ایک تصویر فروخت ہوئی۔ اور ایک اور کے بنانے کا حکم ہوا۔

باسودت۔ تو کیا یہ تمہاری حرص کی تسکین کے لئے کافی نہیں۔ تم تو کچھ ایسا منہ بنائے جا رہے ہو گویا تمہیں کچھ ملا ہی نہیں۔ اور اگر تم اپنی اس کامیابی کا لحاظ کرو تو آج کی رات تمہیں ہزار صبح سے بہتر سمجھنی چاہئے۔ ایسی کامیابی اگر مجھے نصیب ہوتی تو تم دیکھتے کہ میں اس وقت خوشی کے مارے قلابازیاں لگاتا ہوا نظر آتا۔

سپریا نے اپنا سر اوپر اٹھایا اور ایک الم انگیز آواز کے ساتھ کہا "میرے دوست تم نے سچ کہا ہے حقیقت میں یہ بہت بڑی کامیابی ہے اور میری قسمت نے بھی ضرور پلٹا کھایا ہے۔ لیکن آہ! اب یہ سب کچھ بے سود ہے"۔

سپریا کی یہ باتیں سنکر باسودت کچھ خوف زدہ سا ہو گیا کچھ دیر تک وہ خاموش کھڑا رہا پھر کہنے لگا "کیوں کیا ہوا"۔

سپریا۔ کچھ نہیں مگر آج قبل اس کے کہ شاہی خزانے سے میری تصویر کی قیمت برآمد ہوتی۔ شاہی طبیب نے مجھے گھر چلے جانے کی ہدایت کی۔

باسودت۔ یہ کس لئے!

سپریا۔ بات دراصل یوں ہے کہ جب میں بادشاہ کے حضور سے واپس ہوا تو باہر آکر مجھے غش آگیا۔ جب میں ہوش میں آیا تو مجھے یہ سارا حال معلوم ہوا۔

باسودت کچھ دیر تک چپ چاپ کھڑا رہا اس وقت اسے کوئی ایسی بات نہ سوجھتی تھی جو اسکے لئے کسی تسلی یا اطمینان کا موجب ہو سکے۔ آخر سپریا نے اس کے احساسات کو سمجھ لیا اور پھر یہ کہہ کر چل دیا کہ "میرے دوست تم میرے لئے کوئی غم نہ کرو اس سے مجھے کچھ بھی فائدہ نہ ہوگا"

جب سپریا گھر پہنچا۔ تو رات کا اندھیرا چھائے ہوئے دیر ہو چکی تھی اس نے دروازے کو کھٹکھٹاتے ہوئے آواز دی "دیپکا" دروازہ کھلا اور ایک نوجوان لڑکی دہلیز کے قریب چراغ لئے کھڑی نظر آئی۔ وہ تشویش آمیز لہجہ میں بولی "بڑی دیر سے آئے۔ میں تو انتظار کرتے کرتے بھی تھک گئی۔ جلد اندر آجاؤ۔ یہاں کھڑے نہ رہو۔ باہر بڑی سردی ہے"

سپریا اس کے پیچھے پیچھے کمرے میں داخل ہوگیا یہ کمرہ کسی بڑے سازو سامان کا حامل نہ تھا۔ ایک طرف کونے میں ایک شاندار پلنگ پڑا ہوا تھا اور اس کے سرہانے ایک خوبصورت شمع دان رکھا تھا جس پر عجیب و غریب قسم کے نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ ان دو چیزوں کے علاوہ ایک اور چیز بھی تھی جس کی طرف ہر شخص کی توجہ بے اختیار منتقل ہو جاتی تھی اور یہ ایک لڑکی کے عنفوان شباب کی تصویر تھی۔ تصویر پر رنگ و روغن کی نمائش تو کچھ ایسی نہ تھی کہ مصوّر کو اس پر ناز ہو سکے۔ لیکن جس چہرۂ ماہ پارہ کا یہ انعکاس تھا اس کا حسن و جمال کسی آرائش و زیبائش کا محتاج ہی نہ تھا۔ یہ دیپکا تھی۔

سپریا کے باپ کا ذریعۂ معاش بھی مصوری ہی تھا۔ بادشاہ کے الطاف و عنایات ہمیشہ اس کے شامل حال رہے اور تنگدستی نے کبھی بھول کر اس کے گھر میں قدم نہ رکھا تھا۔ اس کے بعد سپریا کو بھی الطاف و عنایات شاہانہ اسی طرح حاصل رہے۔ گویا یہ بھی اس کے باپ کی کوئی وراثت تھی۔

مگر دولت کی بے وفا اور تلوّن المزاج دیوی کو اس ایک ہی گھر میں کہاں قرار آتا تھا۔ چنانچہ ایک دن بادشاہ اور سپریا کے درمیان ایک تصویر کے معاملہ میں کچھ اختلاف رائے ہوگیا اور اس اختلاف رائے نے سپریا کو تباہ کر دیا۔ ادھر شاہی محلات کے دروازے اس پر بند ہوئے ادھر دوستوں نے اس سے رسم و راہ چھوڑ دی۔ سپریا نے اول اول اپنی مستعدی اور زندہ دلی کو قایم رکھا کیونکہ اس کے دل میں ولولۂ شباب جوش زن تھا۔ مدتوں اس کی امید ناامیدی کا مقابلہ کرتی رہی اس کے

تبسم کی شگفتگی دیپکا کو دھوکا دیتی رہی اور دیپکا نے اس کے اس تبسم کی ماہیت کو کبھی نہ سمجھا۔

لیکن محض امید کے بھروسے پر کوئی کب تک جی سکتا ہے۔ غربت اور تنگ دستی اب اپنا احساس کرانے لگی گھر کے تمام ملازموں کو ایک ایک کر کے رخصت کر دیا گیا۔ یہاں تک کہ وہ تصویریں جو سپرپا کو اپنی جان سے زیادہ عزیز تھیں اصلی لاگت پر بھی فروخت ہو سکیں دیپکا کے جواہرات بھی اسی راہ میں گئے اور آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ گھر کا ساز و سامان اور برتن بھی افلاس کی نذر ہو گئے مگر مصیبت کہتی تھی کہ ابھی آغاز ہی ہوا ہے۔ ایک دن گھر میں پورے آٹھ پہر کا فاقہ تھا۔
سپرپا نے دیپکا کی تصویر، کہ لے دے کر اب یہی ایک چیز غربت کی دستبرد سے بچ رہی تھی اٹھائی تاکہ جا کر بیچ لائے لیکن دیپکا نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور کہا کہ میں اس تصویر کو جدا نہیں کر سکتی۔ اسے ہرگز فروخت نہ کرنا چاہئے۔ کیونکہ اب میں ویسی پھر کبھی نہ ہونگی جیسی کسی زمانہ میں ہوا کرتی تھی۔ اور یہ تصویر اس زمانے کی یادگار ہے۔ وہ جا کر ہیرے کی ایک انگوٹھی لے آئی۔ یہ اس کی ماں کی نشانی تھی۔ اسی لئے اس نے اس کو چھپا رکھا تھا۔ انگوٹھی فروخت کر دی گئی اور اس طرح یہ تصویر بچ گئی۔

دولت و ثروت کی بے قرار دیوی نے ایک مرتبہ پھر اچانک ہی اپنی شکل آ دکھائی۔ شاید وہ اس گھر کو ایک دفعہ اور دیکھنا چاہتی تھی جس میں اس نے کئی سال گزارے تھے یعنی سپرپا پھر دربار میں بلایا گیا۔ چنانچہ ہم اسے شاہ کے حضور سے واپس گھر آتے ہوئے دیکھ چکے ہیں۔ غربت و افلاس نے مصوّر کے گھر کو خیرباد کہی اور گزشتہ آرام و آسائش کے دن ایک بار پھر پلٹ آئے لیکن مصائب و آلام کا دیو جاتے جاتے بھی دو ایسی چیزیں اپنے ساتھ لے گیا جو پھر کبھی واپس نہ آ سکتی تھیں دیپکا کے حسن نور افروز پر اب اک غبار سا چھا گیا تھا۔ اور اس کی جوانی کا شگفتہ پھول اب مرجھا چکا تھا۔ ایک دن جب وہ آئینہ کے سامنے کھڑی ہوئی تو اسے اپنے چہرے پر جھریاں پڑی ہوئی دکھائی دینے لگیں اور اُسے اپنے کالے کالے گیسوؤں میں سے سفید بال جھانکتے ہوئے نظر آنے لگے اس نے آئینہ کو زمین پر پٹک کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور اپنے آپ کو اپنے گزشتہ حسن کی تصویر کے سامنے ڈال کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

ادھر دیپکا کے حسن کا آفتاب سیاہ رات کی تاریکی میں جا چھپا، ادھر سپرپا کی صحت روز بروز خراب ہونا شروع ہوئی لیکن سپرپا نے اس جانستاں راز کو اپنے سینہ میں ہی چھپائے رکھا جو اس کے دل و جگر کو پگھلا کر خون کر رہا تھا اور کسی کو خبر تک بھی نہ ہوئی کہ موت کا تاریک بادل اس کی ہستی پر چھائے جا رہا ہے وہ دیکھتا تھا کہ دیپکا کا وہ تبسم جو آج سے مدتوں پہلے اس کے ہونٹوں پر کھیلا کرتا تھا۔ اب پھر اس کے چہرہ پر وہی پرانی کیفیت نمایاں کر رہا ہے اور اب وہ اس تبسم کو افسردہ نہ کرنا چاہتا تھا۔ دیپکا سے کسی بات کا چھپانا نہایت ہی مشکل تھا لیکن سپرپا نے اپنے اوقات زندگی کو کچھ اس انداز سے تقسیم کر رکھا تھا کہ

دیپکا کو اس کے پاس رہنے کا بہت ہی کم موقع ملتا تھا۔

(۲)

سپریا اپنے کمرہ میں ایک تصویر بنانے میں مصروف تھا۔ یہ تصویر بھی وہ شاہی ایما سے بنا رہا تھا۔ اور وہ اسے جلد سے جلد ختم کر دینا چاہتا تھا کیونکہ وہ نہ جانتا تھا کہ کام کرنے کی طاقت کب تک اس کا ساتھ دیتی ہے۔ بادشاہ نے اس تصویر کے معاوضہ میں اُسے ایک معقول رقم دینے کا وعدہ کر رکھا تھا وہ اس رقم کو دیپکا کیلئے وقف کر دینا چاہتا تھا تاکہ وہ اس کے بعد پوری بے فکری کے ساتھ زندگی بسر کر سکے لیکن جب اسے خیال آتا کہ احتیاج و افلاس کے علاوہ کئی اور ہولناک مصیبتیں بھی ہونگی جن سے دیپکا کو اس کے بعد دوچار ہونا پڑے گا تو وہ ایک لمبی آہ بھرتا اور دل ہی دل میں کہتا کہ ان کا کوئی علاج نہیں۔ شاید یہ بہتر ہوتا کہ وہ دیپکا کو اپنے راز سے اول ہی اول آگاہ کر دیتا۔ تاکہ وہ ان تکلیفوں کو برداشت کرنے کے لئے تیار تو ہو جاتی۔ لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا۔ اس خوفناک راز کا انکشاف ان کے لئے اور مشکل ہوتا جاتا۔ ہائے وہ اس جانکاہ صدمہ کو کیونکر برداشت کر سکے گی جس کا اسے خواب و خیال تک نہیں۔

سپریا کے ماں باپ بچپن ہی میں مر چکے تھے۔ جوانی کا آغاز بھی ہوا تو اس کے دل میں کوئی امنگ پیدا نہ ہوئی۔ وہ اکثر اپنے خیالات کی دیوی کو اپنی نظم عبودیت سنایا کرتا لیکن وہاں سے اُسے کوئی جواب نہ ملتا۔ اس کا دل ہر وقت کسی ایسی چیز کی آرزو میں بیقرار رہتا جو کبھی کسی دیوتا کے دربار سے نہیں ملی اس کا دل ہر وقت اس کی مصوری سے برسر پیکار رہتا +

اسی ملک کے کسی دوسرے گوشہ میں ایک بے ماں باپ کی بچی جسے قسام ازل نے دولت حسن سے مالا مال کر رکھا تھا سپریا کا انتظار کر رہی تھی۔ مشاطہ تقدیر نے دونوں کو ایک دوسرے سے ملا دیا۔ اور سپریا کے خیال کی دیوی نے ایک غرور نا کام کے ساتھ اس کے دل کے تخت کو چھوڑ دیا۔ دیپکا نے اب جانا کہ اس کی زندگی کا مقصد کیا ہے۔ اور سپریا نے اب سمجھا کہ اسکا دل کس لئے بیقرار تھا۔ عیارہ تقدیر نے جب یہ دیکھا کہ یہ دونوں ایک دوسرے میں اتنے محو ہو گئے ہیں کہ ان کی نظروں میں دنیا جہان کی کوئی حقیقت ہی نہیں رہی۔ تو اس کے دل پر حسد کی بجلیاں کوندگئیں +

سپریا تصویر بنانے میں مصروف تھا لیکن اس کے دل میں خیالات کا ایک سمندر موجیں لے رہا تھا۔ اس نے قلم ہاتھ سے رکھ دیا اور کھڑکی کی طرف دیکھنے لگا نیلگوں آسمان نے شاید سردی کی شدت سے ڈر کر کہر کی چادر اوڑھ لی تھی فضا اشک آلود اور اداس تھی۔ زمین کی سبز مخمل چھین لی گئی تھی اور اس نے اپنے جسم کو برف کی سفید چادر سے ڈھانپ لیا تھا۔ جدھر دیکھو موت کی حکومت غالب نظر آتی تھی۔ ہر جگہ موت۔ ہر شکل میں موت۔ ہر لباس میں موت جلوہ گر تھی۔

سپرپا فطرت کے چہرے کو دیر تک محویت کی نظر سے دیکھتا رہا۔ ہاں وہی اور صرف وہی دیپکا سے پہلے اس کے دل کی ملکہ اور اس کے خیال کی دیوی تھی۔ اور اس سے پہلے کہ وہ ہمیشہ کے لئے اس دنیا سے رخصت ہو جائے وہ ایک مرتبہ پھر اُسے نظر بھر کر دیکھنا چاہتا تھا اس کے بعد کیا ہوگا یہ اُسے معلوم نہ تھا۔ غالباً حیرت و خود فراموشی کی انتہا ہوگی جس میں شاید دیپکا کو بھی جگہ نہ مل سکے۔

ادھر سپرپا اپنی اولیں محبوبہ سے آخری بار رخصت ہو رہا تھا ادھر دیپکا اپنی ساری روح آنکھوں میں لئے ہوئے اس کی طرف دیکھ رہی تھی اس کے دل میں رہ رہ کر درد اٹھتا تھا۔ جو اسے نڈھال کئے دیتا تھا آہ اسے اپنے خاوند کی خدمت و تواضع کی وہ نعمت بھی میسر نہ تھی جس سے وہ اس کے غم و فکر کو تسکین اور آرام سے بدل سکتی۔ گھر کا کام کرنے کے لئے نوکروں کی ایک فوج کی فوج موجود تھی۔ ایسی صورت میں وہ کون سا کام ہو سکتا تھا جو دیپکا کے لئے بچ رہتا۔ پہلے دن ہی سے جب اس نے اس گھر میں قدم رکھا اس کے کرنے کو یہاں کوئی کام نہ تھا مگر پھر بھی وقت اس پر کبھی گراں نہ گزرا محبت اور مسرت کے اس سیلاب نے جو اس کے سینہ میں امڈ آیا تھا اسکے دل کے گوشہ گوشہ کو سیراب کر دیا۔ اس کے بعد غربت آئی وہ بھی اس کے دل کی خوشی کو نہ مٹا سکی اس کے دروازے پر گرگ و شغال کی آوازیں کبھی اس کے سرور دل کی موسیقی سے زیادہ بلند نہ ہوئیں۔ لیکن آج اُسے کیا ہو گیا؟ وہ حیرانی و پریشانی کے اس سنسان صحرا میں کہاں بھٹک آئی۔ جہاں اسے سہارا دینے کے لئے بھی کوئی چیز نہیں۔ سپرپا کا وہی کمرہ ہمیشہ اس کی آمد پر سراپا خندہ و تبسم بن جایا کرتا تھا۔ اگر آج وہ یہاں آگئی تو اسی کمرے کی ہر چیز کیوں اس کی طرف گھور گھور کر دیکھ رہی ہے۔ آہ وہ یہاں سے جا بھی نہ سکتی تھی کبھی پروانہ کو بھی شمع کی جدائی گوارا ہوئی ہے؟ اس حال میں وہ یہاں کھڑی تھی اور سپرپا کو اس کے آنے کی خبر تک نہ تھی۔

دیپکا کی نحیف و نازک کلائی سے اچانک سونے کی چوڑی کھل کر زمین پر گری جس کی آواز نے سپرپا کو چونکا دیا۔ اور اسکی آنکھیں دیپکا کی آنکھوں سے جا ملیں۔

نادان لڑکی! تیری آنکھوں میں ابھی سے آنسو آنے لگ گئے۔ ابھی تو وہ تیرے سامنے ہے ..... تقدیر کی گڑیا! تو اس وقت کیا کرے گی جب موت اس پر اپنا تصرف جمائے گی...... تجھے اس وقت کہاں قرار آئے گا؟

سپرپا کے دل نے آنسوؤں کا دریا بہا دیا۔ آہ۔ اسکی آنکھیں تو مدتوں سے خشک ہو چکی تھیں پھر ذرا منہ بنا کر پوچھنے لگا۔ "دیپکا۔ تم یہاں کیوں آگئیں"۔

کیا اب اس کے آنے کے لئے بھی کوئی وجہ ہونی چاہئے۔ کیا صرف آنے کی خواہش ہی آنے کی سب سے بڑی وجہ نہیں ہے جواب میں دیپکا صرف یونہی کہہ کر اپنے کمرے میں چلی گئی اور وہاں پہنچ کر اپنے آپ کو ٹھنڈے اور سخت فرش پر گرا دیا۔ رنج و غم کی شدت

میں اسکی آنکھوں نے آنسوؤں کا دریا بہا دیا۔۔۔۔۔ بدقسمت بھکارن تو وہاں کیا لینے گئی تھی تو نے یہ کیوں نہ سمجھا کہ تو اس سپریا کو کھو بیٹھی ہے جو تیرے دل کی زبان کو تیرے منہ کی زبان سے بہتر سمجھا کرتا تھا؟

دن کی روشنی آہستہ آہستہ رات کی تاریکی میں جذب ہو رہی تھی۔ بادِ شمال کے سرد جھونکے بے برگ و بار درختوں میں سے چیختے ہوئے گزر رہے تھے سیاہ بادلوں کے بڑے بڑے انبار اُٹھ اُٹھ کر آسمان مغرب پر چھا رہے تھے اور اپنے کالے کالے لمبے لمبے ہاتھ بڑھا بڑھا کر روشنی کی بچی کھچی کرنوں کو اپنے دامن میں سمیٹ رہے تھے۔ دیپکا ابھی فرش سے نہ اٹھی تھی۔ ایک نوکر لڑکی چراغ ہاتھ میں لے کر آئی تو دیپکا نے اس کو نہایت غصہ کے ساتھ فوراً کمرے سے چلے جانے کا حکم دیا۔ اس نے دروازے پر ذرا تامل کیا۔ دیپکا کے غیض و غضب کی کوئی انتہا نہ رہی اس نے چلا کر کہا تم یہاں کس لئے کھڑی ہو؟ کیا میں نے تم سے نہیں کہا کہ یہاں سے دور ہو جاؤ۔

لڑکی ڈر گئی۔ اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا "بی بی میں اس لئے ٹھیری تھی کہ اگر آپ حکم دیں تو میاں کے کمرے کا چراغ بھی میں ہی جلا دوں۔ اندھیرا بہت چھا گیا ہے۔

اتنے نوکروں کے ہوتے ہوئے بھی دیپکا سپریا کے کمرے کے چراغ کو خود ہی صاف کیا کرتی اور خود ہی جلایا کرتی تھی یہی وہ کمرہ تھا جس میں وہ دلہن بن کر آئی تھی۔ اور اس لئے اس کے دل میں اس کا بڑا احترام تھا۔ اس نے نوکروں کو کبھی اس میں داخل ہونے کی اجازت نہ دی تھی۔ ہر شام وہ خود اس کمرے کے چراغ کو روشن کرتی اور پھر دیر تک گزرے ہوئے زمانہ کی یاد میں محو وہیں کھڑی رہتی۔

لڑکی کی بات ابھی ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ دیپکا اُٹھی اور اس کے ہاتھ سے سختی کے ساتھ بتّی چھین کر چراغ جلانے کے لئے چلی گئی۔ لڑکی اپنی بیگم کے اس طرزِ عمل کو دیکھ کر ہکّا بکّا رہ گئی۔

کمرے کا دروازہ بند تھا۔ دیپکا نے ایک لمحہ کے لئے تامل کیا۔ کمرے میں خاموشی طاری تھی پھر اس نے آہستہ سے دروازے کو اندر کی طرف دھکیلا۔ دروازہ کھل گیا اور دیپکا تاریک کمرے کو منور کرتی اندر داخل ہو گئی۔

سپریا کمرے میں موجود نہ تھا۔ دیپکا کی نظر معًا ایک ریشمی رومال پر پڑی جس میں کوئی چیز لپٹی ہوئی دیپکا کی نشست کے قریب حفاظت سے رکھی تھی۔ دیپکا نے جھپٹ کر اُسے اٹھا لیا۔

زمین اس کے پاؤں تلے سے نکل گئی۔ نامعلوم حسینہ کی شعلہ ریز آنکھوں نے دیپکا پر وہ اثر کیا جو کسی ناگن کی آنکھیں ہی کرسکتی ہیں۔ یہ کون تھی؟ کیا سپریا کے دل کی نئی ملکہ یہی تھی جس کی خاطر اس نے دیپکا کو چھوڑ دیا تھا؟ اے رہزن اور قاتل عورت تیرے غارت گر حُسن اور برق پاش تبسم کو اور کہیں جگہ نہ ملی؟ کیا تجھے اس دنیا میں غریب دیپکا ہی کا گھر ویران کرنا تھا؟ اور

کیا تجھے اسی وقت آنا تھا جب اس میں تیرے حسن کے مقابلہ کی تاب نہیں ؟ تو اس وقت کہاں تھی جب حسن کی دیوی کو بھی دیپکا کے ساتھ مقابلہ کی تاب نہ تھی ؟

اس وقت اسے اپنے پیچھے کسی کے آنے کی آہٹ سنائی دی۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو اس کی کمزور اور ناتوان گرفت سے تصویر چھوٹ کر نیچے گر پڑی۔ یہ اس کی سہیلی بسنتی تھی۔ بسنتی وفورِ شوق میں بڑھتی چلی آ رہی تھی اس کے جواہرات قدم قدم پر ایک دوسرے سے ٹکرا ٹکرا کر موسیقی کی ایک لہر پیدا کر رہے تھے۔ پاس آ کر اس نے دیپکا کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور کہنے لگی پیاری بہن دیپکا اب تم کہیں نظر ہی نہیں آتیں۔ کیا تم نے ہمیں بھلا دیا ؟ لیکن ہم تو تمہیں کبھی نہ بھولیں گے۔ خواہ تم کتنی ہی بے پروا کیوں نہ ہو جاؤ۔ دیپکا بہار کے دنوں میں ضرور آنا میں ساری باتیں تم ہی پر چھوڑتی ہوں تم اپنے خاوند سے مشورہ کر لینا کہ ہمیں دیوتا کی بھینٹ پوجا کے لئے کیا کیا تیاریاں کرنی چاہئیں ۔

دیپکا کے ہونٹوں پر ایک زہر آلود تبسم نمودار ہوا اور اس نے کہا میری بہن مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہ بہار جس کے منانے کے لئے تم مجھے مدعو کر رہی ہو میری وجہ سے خزاں میں تبدیل نہ ہو جائے۔ میرا وجود اب محبت کے دیوتا کی پرستش کے قابل نہیں رہا۔ وہ تو اب موت کے دیوتا کی پرستش ہی کرے گا۔

کیا بسنتی کی پرشوق دعوت کا یہی جواب تھا ؟ کیا دیپکا مذاق کر رہی تھی ؟ مگر نہیں ایسا مذاق کون کر سکتا ہے ؟ بسنتی نے کہا تمہیں کیا ہو گیا۔ تم کیسی باتیں کر رہی ہو۔ تم سے زیادہ خوش قسمت اور کون ہو سکتا ہے ؟

دیپکا کی آواز بھر آگئی اس نے کہا اچھا اگر میں خوش قسمت ہوں تو پھر تم اس عورت کو کیا کہو گی اس نے زمین پر سے تصویر کو اٹھا لیا اور اُسے اپنی سہیلی کی حیرت زدہ آنکھوں کے سامنے لا رکھا۔

بسنتی نے متعجب ہو کر پوچھا ہیں ! یہ کون ہے ؟ اچھا میں اب سمجھی یہ تو دربار کی رقاصہ اندرلیکھا کی تصویر ہے۔ اور کیا تم سچ مچ یہ سمجھتی ہو کہ وہ تم سے زیادہ خوش قسمت ہے ؟ تم دیوانی تو نہیں ہو گئیں ؟ کیا جس گوہر گرانمایہ کی تم مالک ہو اندرلیکھا اس سے محروم نہیں ہے ؟ کیا صرف اس لئے تم اسے خوش قسمت سمجھتی ہو کہ اس پر ہر طرف سے سونے چاندی کی بارش ہوتی ہے ؟ میں تمہیں بتاتی ہوں کہ وہ دنیا میں انتہا درجہ کی بدقسمت اور بدنصیب عورت ہے۔

دیپکا نے حقارت سے تصویر کو ایک طرف پھینک دیا اور پھر آنسوؤں کا ایک تار باندھ دیا۔ کل تک وہ ملکہ تھی۔ آج وہ مفلس و نادار ہے۔ آہ لوگ اب بھی اُسے خوش نصیب ہی کہتے ہیں۔

یہ نظارہ دیکھ کر بسنتی کی آنکھوں میں بھی آنسو بھر گئے۔ اُسے اپنی سہیلی کی مصیبت کا کوئی علم نہ تھا لیکن دیپکا جیسی قابلِ رشک عورت کو اس رنج و غم کی حالت میں دیکھنا ہی اس کو رلانے کے لئے کافی تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد بسنتی نے دھیمی

آواز میں پوچھا " دیپکا مجھے بتاؤ تو سہی تمہیں کیا دکھ پہنچا ہے

دیپکا نے اپنے آنسو پونچھ ڈالے اس کی خوددار طبیعت دوسروں کے سامنے اظہار رنج میں اپنی خفت محسوس کرنے لگی۔اس لئے اس نے اپنے چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ پیدا کر کے کہا " اور تو کچھ بھی نہیں ہوا میری طبیعت ہی کچھ ناساز سی ہے۔اس لئے میرا مزاج چڑچڑا ہو گیا ہے "

لیکن بسنتی کو ان باتوں سے کب تسلی ہوتی تھی۔اس نے کہا " دیپکا تم بچوں کی سی باتیں کہہ کر مجھے دھوکا نہیں دے سکتیں۔تمہیں جاننا چاہئے کہ میں بھی عورت ہوں مجھ سے چھپا کر تم کیا کرو گی کیا مجھے تمہارے رنج کا تم سے کم احساس ہے؟ یقیناً تم بدنصیب ہو اگر تم خوش نصیب ہوتیں تو تمہارے خاوند جیسا شاندار انسان کبھی ایسی ملعون اور بدکار عورت کے پیچھے نہ ہو لیتا۔

دیپکا نے کچھ نہ کہا۔بسنتی نے پھر اپنا سلسلہ کلام شروع کیا " لیکن کبھی اتنی جلد ہمت نہ ہار دینی چاہئے ہم عورتوں کو تو اپنے حقوق کے لئے لڑنا ہی پڑتا ہے۔میری ایک خالہ زاد بہن ہے اُسے بھی ایک مرتبہ ایسے ہی حالات پیش آگئے تھے۔تمہیں معلوم ہے پھر اس نے کیا کیا؟ اس نے مشہور جادوگر کامنڈک کے ایک چیلے سے جادو کا ایک گنڈا لے کر اپنے شوہر کو کھلا دیا۔میں تم سے سچ کہتی ہوں کہ تین دن کے اندر اندر اس کا غلط کار خاوند بالکل سیدھا ہو گیا۔تم جانتی ہو لوگوں کا خیال ہے بھوت پریت کامنڈک کے تابع ہیں اور کوئی بات اس کے نزدیک ناممکن نہیں۔

یہ سن کر دیپکا کے چہرے پر ایک حقارت آمیز تبسم نمودار ہوا۔آج خدا نے اُسے بھلا دیا تھا اور شیطان اُسے مدد دینے کے لئے اپنی طرف بلا رہا تھا۔

چونکہ طوفان کی تندی ہر لحظہ بڑھ رہی تھی اس لئے بسنتی نے گھر واپس جانے میں جلدی کی۔اس کے چلے جانے کے بعد فوراً ہی دیپکا اپنے کمرے میں چلی گئی۔اور تمام دروازے بند کر لئے پھر کسی نوکر کو جرأت نہ ہوئی کہ دیپکا کو بلا سکے۔

سرد ہوا کے تند اور تیز جھونکے دریچے سے دیپکا کے کمرے میں آرہے تھے۔ابھی مینہ برسنا شروع نہ ہوا تھا آسمان بادلوں کے بوجھ سے جھکا پڑتا تھا۔اور اس کے سیاہ اور غضبناک چہرے کو دیکھ کر خوف آتا تھا۔رات بہت جا چکی تھی گھر میں ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔اس وقت سپریا کہاں تھا؟ دیپکا نے اُٹھ کر اس کے کمرے کے دروازے سے کان لگا دیئے کمرے میں بالکل خاموشی تھی۔یہاں سے ہٹ کر وہ اس کمرے میں گئی جہاں سپریا کام کیا کرتا تھا ایک ہلکی سی بتی سے روشنی نکل رہی تھی۔دیپکا کے قدم کانپ رہے تھے جذبات فاسدہ کا بڑھتا ہوا سیلاب اس کے دل کو کھائے جا رہا تھا۔سپریا اپنی نشست ہی پر سو گیا تھا اور اندلیکھا کی تصویر اس کے قریب پڑی ہوئی تھی۔دیپکا کی آنکھیں اس شیرنی کے مانند چمک رہی تھیں جس کے

اس کے بچے چھن گئے ہوں۔ تباہی اور بربادی کے کنارے آج تک وہ کس طرح آنکھیں بند کئے ہوئے کھڑی رہی اس کی اُسے سمجھ نہ آتی تھی۔

اس وقت اس نے ایک خوفناک عزم کیا اس نے سپریا کے ساتھ شیطانی حربوں سے لڑنے کا فیصلہ کرلیا وہ کمرے سے باہر آگئی اور پھر مڑکر بھی پیچھے کی طرف نہ دیکھا سپریا کا زرد چہرہ نیند کی حالت میں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کسی مردہ انسان کا چہرہ ہے لیکن اس وقت دیپکا کے دل پر نفرت و حقارت کی حکومت تھی۔ اس وقت اُسے اندریکھا کے عاشق سپریا کی کوئی پروانہ تھی وہ یکایک گھر کے سکوت وسکون سے نکل کر طوفان کے جوش وخروش اور رات کے عمیق تاریک میں داخل ہوگئی +

(۳)

جنگل کے سرسبز راستے کا نقشہ ایسا بدل چکا تھا کہ شناخت ہی نہ ہوسکتی تھی طوفان کی دستبرد نے اس کی جنگلی شان اور خوبصورتی کو بالکل ضائع کردیا تھا ٹہنیوں اور درختوں نے ٹوٹ ٹوٹ کر اور پہاڑ سے بڑے بڑے پتھروں نے لڑھک لڑھک کر راستے کو قریب قریب بند کردیا تھا جنگل میں ہر طرف سے مہیب اور خوفناک آوازیں آرہی تھیں۔ کہیں روشنی کی ایک کرن بھی دکھائی نہ دیتی تھی۔ صرف بجلی کی پیہم چمک جنگل کا یہ ہولناک اور وحشت خیز منظر دکھانے کا کام دے رہی تھی ہولناک منظر کی اس تاریکی میں ایک مبہم سی شکل تیزی کے ساتھ بڑھتی ہوئی نظر آرہی تھی۔ بجلی کی چمک نے اس کی موجودگی کو اور بھی ظاہر کردیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کوئی انسان نہیں بلکہ خود طوفان ہی عالم جسمانیات میں آگیا ہے اسکی آنکھیں اس غار پر گڑی ہوئی تھیں جو پہاڑ کے دامن میں واقع تھا۔ وہ آگ جسے لوگ اس زمین کی آگ نہیں سمجھتے اس وقت بھی جل رہی تھی۔ غار کے مکین کی نسبت یہ مشہور تھا کہ وہ شاہ ظلمات کا بہت گہرا دوست ہے۔

اتنے میں دیپکا کو اپنے پاؤں پر سانپ حرکت کرتا ہوا معلوم ہوا۔ اُسکے منہ سے ایک چیخ نکلی اور وہ وہیں رک گئی۔ ایک لحظہ کے لئے ٹھیر کر اس نے پھر وہاں سے آگے بڑھنا شروع کیا۔ کیونکہ یہ ایسا موقع نہ تھا کہ وہ بزدلی اور کمزوری سے مغلوب ہوجائے۔ وہ موت کے دیوتا کے ساتھ لڑنے کیلئے نکلی تھی۔ وہ ساوتری کی طرح اپنی مردہ محبت کی روح کو موت کے پنجہ سے چھڑانے کا عزم کرکے آئی تھی۔ پھر اُسے خوف کیونکر روک سکتا تھا۔

اب وہ غار کے منہ پر پہنچ چکی تھی۔ اس کے پاؤں لہولہان ہورہے تھے اور اس کے کپڑوں کے پرخچے ہوا میں اڑ رہے تھے۔ غار کے اندر سے ہوا کا ایک برفانی جھونکا آیا اور اس کے کانپتے ہوئے جسم کو شل کرتا ہوا گزر گیا۔ غار کے ایک کونے میں آگ کے لمبے لمبے شعلے اٹھ اٹھ کر رقص کررہے تھے لیکن باقی تمام غار تاریکی میں تھا۔ دیپکا کو کچھ نظر نہ آتا تھا لیکن اُسے ایسا

معلوم ہوتا تھا، جیسے اس کے پاس لاتعداد غیرمرئی ہستیاں چل پھر رہی ہیں +

اس وقت دیپکا کے دل میں خوف دہراس کا نام ونشان تک نہ تھا۔ اندر لیکھا کی تصویر اس کی آنکھوں میں تھی۔ اور دیپکا کے ڈگمگاتے ہوئے قدم اس سے قوت حاصل کر رہے تھے۔ اب وہ غار کے بالکل اندر آگئی۔ معًا ایک غیرانسانی آواز زور سے گونجی "اے عورت! تو کیا چاہتی ہے؟"

دیپکا نے نظر اُٹھا کر دیکھا تو آگ کے سامنے دھوئیں کا ایک تاریک اور بھاری پردہ پڑا ہوا تھا اور آگ کے شعلے اُسے چیر چیر کر باہر نکلتے اور پھیلتے تھے اس آتشیں بارش کے قطروں کے اندر کوئی کھڑا تھا جس کی آنکھیں آگ کے شعلوں سے بھی زیادہ چمک رہی تھیں۔ دیپکا نے سمجھ لیا کہ شاہِ ظلمات کا ساحر دوست کا منڈک یہی ہے اتنے میں پھر وہی سوال ہُوا۔ "تو کیا چاہتی ہے"؟

اس دفعہ دیپکا نے جواب دے دیا۔ اس کی آواز میں ذرا سی لرزش بھی ظاہر نہ ہوتی تھی "اے روحوں پر حکمرانی کرنے والے میں ان تمام چیزوں سے محروم کر دی گئی ہُوں۔ جو مجھے جان سے بھی زیادہ عزیز تھیں اور میں ان کو اپنے چور سے واپس لینا چاہتی ہُوں"

غار ایک غیرانسانی قہقہے سے گونج اٹھا اور پھر اس پہلی سی ہیبت ناک آواز سے کسی نے کہا "گویا تم چور کے گھر میں چوری کرنا چاہتی ہو۔ ذرا آگے آجاؤ"

دیپکا بڑی دلیری سے آگے بڑھی جب وہ قریب پہنچی تو اُس نے دیکھا۔ کہ ہاتھ کا ایک ڈھانچ آگ سے باہر نکلا اور ایک لمحہ کے بعد دیپکا نے اپنے گلے کو اس کی گرفت میں پایا۔ اس کے بعد وہ غار کی ٹھنڈی زمین پر غش کھا کر گر پڑی

(۴)

مینہ کے قطرے چھینٹے دے دے کر اس کو ہوش میں لے آئے۔ وہ اُٹھ بیٹھی اور اس نے دیکھا کہ اب وہ غار کے اندر نہیں ہے۔ بلکہ کوئی اُسے باہر چھوڑ گیا ہے۔ تاریکی اور بڑھ گئی تھی لیکن طوفان کا جوش اب تھم چکا تھا اور بارش زور شور سے ہو رہی تھی۔ دیپکا کھڑی ہو گئی اور غار کی طرف دیکھنے لگی اندر سے آواز آئی جاؤ جو تم چاہتی تھیں تمہیں مل چکا ہے"

دیپکا کو اس وقت اپنے دل میں خوشی کی ہلکی سے ہلکی جھلک بھی نظر نہ آتی تھی۔ بلکہ اس کے بالمقابل اسے گرانی محسوس ہو رہی تھی۔ اب وہ جلد جلد قدم بڑھاتی ہوئی شہر کی طرف بڑھی جب شہر کے قریب پہنچی تو مینہ تھم چکا تھا۔ اور چاند بادلوں کی سیاہ چادر کو پھاڑ پھاڑ کر جھانک رہا تھا۔ دیپکا نے اپنے مکان پر ایک نگاہ ڈالی وہ اب بھی ویسا ہی خاموش تھا جیسا وہ اس کو چھوڑ کر گئی تھی وہ اچھلتے ہوئے اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اس کے قریب پہنچی۔ اور بیقراری کے ساتھ کھلے ہوئے

دروازے سے اندر داخل ہوگئی۔

گھر کے تمام آدمی سو رہے تھے۔ دیپکا نے اطمینان کا سانس لیا ابھی اس میں اتنی تاب نہ تھی کہ وہ سب لوگوں کے سامنے کھڑی ہو کر اُن کی نظروں کا مقابلہ کر سکے۔ اس کو سب سے پہلے اپنی قسمت کا فیصلہ کرنا تھا۔

وہ آہستہ سے سپریا کے کمرے کی طرف بڑھی چاند کی روشنی کھڑکی میں سے ہو کر کمرے میں پھیل رہی تھی۔ سپریا زمین پر پڑا ہوا تھا چاندنی میں اس کا چہرہ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سفید کنول کا پھول۔ کیا سچ مچ یہ اسی کا چہرہ تھا۔ جس پر اتنی زردی اور مردنی چھائی ہوئی تھی؟

دیپکا یہ دیکھ کر لرز گئی۔ اس کے جسم سے کھڑے رہنے کی طاقت زائل ہوگئی۔ وہ خود بھی وہیں گر پڑی۔ اور اپنے آپ کو سپریا کے پہلو میں ڈال دیا۔ کیا اب وہ کبھی آنکھیں نہ کھولے گا۔ یہ خیال اسکی جان کو کھائے جاتا تھا۔

نسیم صبح کے جھونکے کمرے کے اندر آنے لگے تو سپریا نے آنکھیں کھولیں، سب سے پہلے اس کی نظر دیپکا پر پڑی جو اس پر جھکی ہوئی تھی۔ دیپکا کا سارا جسم سپریا کی ایک پر اشتیاق نگاہ کے انتظار میں تھرتھرا رہا تھا۔

لیکن یہ کیا معاملہ تھا؟ سپریا کیوں ایک یاس آمیز چیخ کے ساتھ اچھل کر اس سے علیحدہ ہو گیا۔ دیپکا نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے کانپتے ہوئے جسم کو سہارا دینے کیلئے پھیلا دئیے لیکن سپریا نے سختی کے ساتھ اسکو ایک طرف ہٹا دیا اور چلا کر کہنے لگا "چلی جا۔ میری نظروں سے دور ہو جا خبیث ناگن! میری اس آخری ساعت میں بھی تو میرا پیچھا نہیں چھوڑتی دیپکا! پیاری دیپکا!! آؤ ایک لمحہ کیلئے آؤ! آہ۔ اب تو میرے پاس تم سے معافی مانگنے کے لئے بھی وقت نہیں۔ مگر آؤ اپنا پیارا پیارا چہرہ مجھے ایک دفعہ تو دیکھ لینے دو۔"

وہ پھر زمین پر گر پڑا۔ دیپکا دیوانہ وار اس سے جا چمٹی۔ وہ روتی جاتی تھی اور کہتی تھی "رہائے تم مجھے کیوں نہیں پہچانتے میں دیپکا ہی تو ہوں"

اس تھوڑی بہت طاقت سے جواب اس کے جسم میں باقی تھی۔ سپریا نے اپنے آپ کو دیپکا کی آغوش سے جدا کر لیا اور بیٹھی ہوئی آواز سے پکار کر کہنے لگا "شیطان عورت کیا تو سمجھتی ہے کہ میں تجھے نہیں پہچانتا۔ تو اندرلیکھا ہے میری آنکھوں سے دور ہو جا۔ آؤ دیپکا" . . . . . .

دیپکا کا نام اس کی زبان پر تھا کہ اس کی روح پرواز کر گئی۔ دیپکا چیخیں مارتی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اسکے سامنے ایک قد آدم آئینہ لٹک رہا تھا جب اس کی نظر اس پر پڑی تو اُسے اسکی صاف شفاف سطح پر اندرلیکھا کی فسوں ساز شکل کا انعکاس نظر آیا۔

ترجمہ
منصور احمد

جامِ صہبائی

(۱)

بے مہریٔ آسماں سہے جاتا ہوں دنیا کو طرب زار کہے جاتا ہوں
جلووں کا ہجوم ہے کہ طوفانِ جمال! میں ہوں کہ سرور میں بہے جاتا ہوں

(۲)

کیا بادِ بہار تیری تدبیر سے ہے! کیا بادِ سموم تیری تقصیر سے ہے!
اندیشۂ انجام میں کیوں گھلتا ہے؟ تقدیر سے ہے تمام تقدیر سے ہے!

(۳)

ممتاز ہے شانِ ارجمندی میری ہے رو کشِ عرش سربلندی میری
سجدہ بھی کیا تو تیرے در پر یا رب! نازاں ہے بہت نیازمندی میری

(۴)

ساغرِ مئے عیش سے کبھی بھرتا ہوں انجامِ بہار سے کبھی ڈرتا ہوں
تقدیر ہی یوں تو کار فرما ہے مگر محسوس یہ ہوتا ہے کہ میں کرتا ہوں

اثر صہبائی

پوسٹ ماسٹر

پوسٹ ماسٹر نے پہلے پہل اولاپور کے گاؤں میں اپنے فرائض کا بار سنبھالا۔ گاؤں تو کچھ بڑا نہ تھا لیکن قریب ہی نیل کا ایک کارخانہ واقع تھا جس کے انگریز مالک کی کوشش سے یہاں ڈاک خانہ قایم ہوگیا۔

پوسٹ ماسٹر کلکتہ کا رہنے والا تھا۔ اس دور افتادہ گاؤں میں اس کے دل کی کیفیت ماہی بے آب کی طرح تھی اس کا دفتر اور رہنے کا کمرہ پھوس کے ایک تاریک چھپر کے نیچے تھا جس کے پاس ہی گھنی جھاڑیوں اور درختوں میں گھرا ہؤا کثیف، سبزی مائل پانی کا ایک تالاب تھا۔

نیل کے کارخانے کے مزدوروں کو دن بھر کام سے فرصت نہ ملتی تھی اس کے علاوہ اُن کی صحبت پڑھے لکھے آدمیوں کے لئے گوارا بھی نہ تھی۔ اور یوں بھی دوسروں سے میل جول پیدا کرنے کے فن میں کلکتہ کے لڑکے کچھ زیادہ مشّاق نہیں ہوتے اور اجنبیوں کی نگاہوں میں وہ یا تو مغرور اور یا افسردہ دل ٹھہرتے ہیں۔ بہرحال پوسٹ ماسٹر کی کسی کے ساتھ میل ملاقات نہ تھی اور اس کا کام بھی کچھ زیادہ نہ تھا۔

کبھی کبھی وہ طبع آزمائی کے لئے شعر کہنے میں اپنا وقت گزار دیا کرتا۔ اکثر وہ اس قسم کے جذبات ظاہر کیا کرتا تھا کہ زندگی کو خوشگوار اور پُرمسرّت بنانے کیلئے درختوں کے سرسبز پتوں کی ہلکی ہلکی جنبش اور نیلے آسمان پر مست بادلوں کا خرام ہی کافی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر الف لیلہ کے قصّہ کا کوئی دیو ایک رات میں تمام درختوں اور پتّوں وغیرہ کو اڑا کر لے جاتا اور ان کی جگہ پتھروں کی ایک سڑک چھوڑ کر بلند عمارتوں کی دورویہ قطاروں کو بادلوں کے نظارہ میں حائل کر دیتا تو یہ بیچارہ اس انقلاب کو اسی طرح ایک نعمتِ غیر مترقبہ سمجھتا گویا اُسے از سرِ نو زندگی عطا ہوئی ہے

پوسٹ ماسٹر کا مشاہرہ قلیل تھا۔ وہ اپنا کھانا اپنے ہاتھ سے پکایا کرتا تھا۔ کھانے میں گاؤں کی ایک یتیم لڑکی رتن بھی اس کی شریک تھی جو پوسٹ ماسٹر کو گھر کے معمولی کام کر دیا کرتی تھی۔

شام کے وقت جب گاؤں کے گھروں میں سے دھواں اُٹھتا دکھائی دیتا اور جھاڑیوں میں جھینگر شور مچانے لگتے۔ جب باؤل فرقہ کے گداگروں کے گانے کی آواز اُن کے کاشانوں سے بلند ہو کر ہوا کو راگ سے بھرنے لگتی اور جب بانس کے پودوں کے کسی گھنے جھنڈ میں بیٹھ کر پتوں کی جنبش کا مشاہدہ کرنے والا شاعر اپنی روح میں ایک پُراسرار لرزش محسوس کرتا۔ پوسٹ ماسٹر اپنا چراغ روشن کر دیتا اور پکار کر کہتا "رتن"!

رتن باہر بیٹھی اس صدا کا انتظار کیا کرتی تھی وہ دفعتہً اندر داخل ہو جانے کے بجائے جواب دیتی "آپ نے مجھے بلایا ہے"؟

پوسٹ ماسٹر کہتا "ہاں تم کیا کر رہی ہو"؟

رتن جواب میں کہتی "میں اب جا کر چولہے میں آگ جلاؤں گی"۔

اس پر پوسٹ ماسٹر کہتا "چلو چولہے کو ابھی رہنے دو۔ پہلے ذرا مجھے میرا حقہ تو بھر دو"۔

آخر رتن کوئلوں کو سلگانے کے لئے پھولے ہوئے گالوں کے ساتھ بڑی بڑی پھونکیں مارتی ہوئی کمرہ میں داخل ہوتی۔ اس طرح پوسٹ ماسٹر کو اس سے مل کر باتیں کرنے کا موقع حاصل ہو جاتا۔ گفتگو کا آغاز شاید اس طرح ہوتا تھا "اچھا رتن بتاؤ تمہیں اپنی ماں کی کوئی بات یاد ہے"؟ یہ موضوع گفتگو کے لئے بہت سیر حاصل تھا۔ رتن کو کچھ باتیں یاد تھیں اور کچھ وہ بھول چکی تھی وہ ماں سے زیادہ باپ کی چاہیتی رہ چکی تھی۔ اس لئے باپ اُسے زیادہ اچھی طرح سے یاد تھا۔ وہ دن بھر کے کام کے بعد شام کو گھر آیا کرتا تھا۔ اور ایک آدھ شام کا نقشہ رتن کے ذہن میں بالکل صاف طور پر محفوظ تھا رتن پوسٹ ماسٹر کے قدموں کے قریب بیٹھ جایا کرتی تھی۔ اس وقت اُسے کثرت سے پرانی باتیں یاد آنے لگتی تھیں۔ اس کا ایک ننھا سا بھائی ہوتا تھا جس کے ساتھ مل کر اس نے ایک ابر آلود دن کو تالاب کے کنارے مچھلیاں پکڑنے کا کھیل کھیلا تھا۔ اہم واقعات کے بجائے اُسے زیادہ تر اسی قسم کی چھوٹی چھوٹی باتیں یاد تھیں۔ باتوں ہی باتوں میں بہت سا وقت گزر جاتا آخر پوسٹ ماسٹر کو کھانا پکانے سے آلکسی آنے لگتی۔ اس پر رتن اٹھ کر جلدی سے آگ جلاتی اور کچھ روٹی اور صبح کا بچا کھچا سالن گرم کر لیتی جو ان کے رات کے کھانے کے لئے کافی ہوتا۔

بعض اوقات پوسٹ ماسٹر بھی اس وسیع خالی چھپر کے ایک گوشہ میں بیٹھا ہوا جہاں اس کی چھوٹی سی میز پڑی تھی اپنے گھر کے تصور میں محو ہو جایا کرتا۔ اس کی ماں اس کی بہن اور دوسرے لوگ جن کے لئے اس جبری علیحدگی میں اس کا دل بے قرار رہتا تھا باری باری اُسے یاد آتے اُن کا خیال ایک لمحہ کے لئے اس سے جدا نہ ہوتا تھا لیکن اپنے ان جذبات کا اظہار وہ کارخانہ کے مزدوروں کے سامنے نہ کر سکتا تھا۔ حالانکہ اس سیدھی سادھی گاؤں کی لڑکی کے سامنے وہ خود بخود بے تکلفانہ طور پر ان باتوں کا تذکرہ کرنے لگ جاتا نتیجہ یہ ہوا کہ لڑکی بھی اس کے سامنے اس کے گھر والوں کا ذکر اس طرح بھائی بہن اور اماں کہہ کر کرتی گویا وہ عمر بھر اُن کے ساتھ رہ چکی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ رتن نے اپنے ذہن میں اُن میں سے ہر ایک کی ایک الگ مکمل صورت قائم کر رکھی تھی۔

برسات کا زمانہ تھا ایک دن دوپہر کے وقت بادل برس کر کھل چکا تھا۔ ہلکی ہلکی خوشگوار ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی

دھوپ میں مرطوب گھاس اور نم آلود پتوں سے جو خوشبودار بخارات اُٹھ رہے تھے، وہ جسم پر اس طرح محسوس ہوتے، گویا تھکی ہوئی زمین کی گرم سانس ہے۔ پاس ہی درختوں کے جھنڈ میں ایک پرندہ بیٹھا تھا جسکے الم انگیز نالوں سے ہوا شام تک پیہم گونجتی رہی۔ شاید وہ فطرت کے دربار میں کوئی شکوہ کر رہا تھا۔

پوسٹ ماسٹر کو کام سے بالکل فراغت تھی درختوں کے پتّے جن کا غبار دُھل چکا تھا چمک رہے تھے اور بادلوں کے رہے سہے ٹکڑے آسمان پر تیرتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ پوسٹ ماسٹر کی نگاہ اس خوبصورت منظر پر جمی ہوئی تھی اور وہ اپنے دل سے اس طرح باتیں کر رہا تھا:۔ کاش اس وقت میرا کوئی ہم جنس کوئی محبّت بھرا انسانی چہرہ میرے سامنے ہوتا —— کاش میں کسی سے ہم کنار ہو سکتا!" وہ دل سے اس طرح کی باتیں کر رہا تھا اور سوچتا تھا کہ شاید یہ پرندہ بھی یہی باتیں کہنا چاہتا ہے اور شاید یہ پتے بھی سرگوشیوں میں انہیں جذبات کے اظہار کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن یہ بات کون جانتا ہے اور کس کے یقین میں آسکتی ہے کہ ایک قلیل المشاہرہ دہاتی پوسٹ ماسٹر کا دل بھی اپنے خشک، غیر شاعرانہ کاروبار کے درمیانی وقفہ میں اس قسم کے جذبات کا مرکز بن سکتا ہے۔

پوسٹ ماسٹر نے ایک سرد آہ بھری اور پھر پکارا "رتن"۔ رتن اسوقت امرود کے ایک پیڑ کے سایہ میں لیٹی ہوئی کچے امرود کھانے میں مشغول تھی۔ اپنے آقا کی آواز سنتے ہی وہ اُٹھ کھڑی ہوئی اور یہ الفاظ کہتی ہوئی بھاگی " دادا[1]! آپ نے مجھے بلایا ہے؟ پوسٹ ماسٹر نے کہا "ہاں! میں سوچ رہا تھا کہ تمہیں لکھنا پڑھنا سکھا دوں چنانچہ سہ پہر کا باقی حصہ اس نے رتن کو ابجد سکھانے میں گزارا اس طرح تھوڑے ہی عرصے میں رتن کو حرف شناسی میں کچھ شد بد ہوگئی

بارش کی کثرت سے جل تھل بھرے ہوئے نظر آتے تھے یوں معلوم ہوتا تھا گویا برسات کبھی ختم ہی نہ ہوگی۔ نہریں، کھائیاں گڑھے سب پانی سے ایک ہو رہے تھے۔ دن رات مینہ کی تڑ اتڑ اور مینڈکوں کی ٹرٹر برابر سنائی دیتی تھی گاؤں کی سڑکیں آمد و رفت کے قابل نہ رہی تھیں ہر قسم کا لین دین اور بنج بیوپار ڈونگیوں کی مدد سے ہو رہا تھا۔

ایک رات جب گھنگھور گھٹائیں آسمان پر تلی کھڑی تھیں، کالے کالے بادل اُمڈے پڑتے تھے اور گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا رہا تھا۔ پوسٹ ماسٹر کی کمسن شاگرد عرصے تک باہر بلاوے کی منتظر بیٹھی رہی لیکن جب معمول کے خلاف بہت دیر تک پوسٹ ماسٹر نے اُسے آواز نہ دی تو اس نے اپنی کٹی پھٹی جلد والی کتاب اُٹھائی اور آہستہ سے کمرہ میں داخل ہوئی۔ اپنے آقا کو بستر پر دراز دیکھ کر اور یہ سمجھ کر کہ وہ آرام کر رہا ہے رتن پنجوں کے بل واپس جانے ہی کو تھی کہ اس نے دفعتہً اپنا نام سُنا "رتن"، وہ فوراً پلٹ آئی اور اس سے مخاطب ہو کر کہنے لگی "دادا آپ سو رہے تھے؟ پوسٹ ماسٹر نے کمزور دھیمی آواز میں جواب دیا "میں اچھا نہیں ہوں۔ میرے ماتھے کو چھو کر دیکھو کتنا گرم ہے"۔

[1] دادا بنگالی زبان میں بھائی کو کہتے ہیں۔

غربت اور تنہائی اور اس پر برسات کی پیدا کی ہوئی اداسی میں اُسے تیمارداری کیلئے کسی محبّت بھرے ہاتھ کی ضرورت محسوس ہوتی تھی وہ اپنی ماں اور اپنی بہنوں کو اپنے پاس موجود خیال کرنے اور اپنے آپ کو اس محبت بھری فضا میں سمجھنے کے لئے، جو عورت ذات ہی پیدا کرسکتی ہے، اپنی پیشانی پر کھنکھناتی چوڑیوں والے نرم و نازک ہاتھوں کے مس کا تصوّر کرتا۔ اس غریب کی یہ کوشش رائیگاں نہ گئی۔ رتن جو اب تک محض ایک کمسن لڑکی تھی فوراً ایک ماں کے فرائض انجام دینے کے لئے تیار ہوگئی۔ اس نے گاؤں کے وید کو بلایا اور اس کی دی ہوئی گولیاں مریض کو مناسب اوقات پر دیتی رہی۔ وہ پوسٹ ماسٹر کے لئے دلیہ پکاتی، تمام رات اس کے سرہانے بیٹھے گزار دیتی اور اس سے بار بار پوچھتی دادا اب آپ پہلے سے کچھ اچھّے ہیں؟

کچھ عرصہ کے بعد پوسٹ ماسٹر اپنے بستر مرض سے اٹھا لیکن وہ بہت لاغر اور نحیف ہوگیا تھا۔ اب اس نے دل میں یہاں سے اپنا تبادلہ کرانے کا فیصلہ کرلیا اور کلکتہ کے دفتر میں اس مضمون کی درخواست بھیج دی کہ یہ مقام میری صحت کے ناموافق ہے اس لئے مجھے یہاں سے کسی اور جگہ بھیج دیا جائے۔

رتن تیمارداری کے فرائض سے فراغت پاکر اب پھر دروازہ کے باہر اپنی پہلی جگہ پر بیٹھا کرتی تھی، لیکن پوسٹ ماسٹر نے اُسے پہلے کی طرح بلانا چھوڑ دیا۔ بعض اوقات وہ دریچہ کے سوراخ میں سے چوری چوری اندر جھانکتی اور وہ اسے ہوا میں ایک بے معنی سی ٹکٹکی باندھے، کبھی کرسی پر بیٹھا ہوُا اور کبھی اپنے بستر پر لیٹا ہوُا نظر آتا۔ بیچاری لڑکی اپنا آموختہ بار بار دہراتی تاکہ پوسٹ ماسٹر کو فرفر پڑھ کر سنا سکے۔ آخر ہفتہ بھر کے انتظار کے بعد ایک دن اس کی طلبی ہوئی۔ لڑکی کا دل مسرت سے لبریز ہوگیا۔ اور وہ اپنے معمول کے مطابق چلّاتی ہوئی بھاگی "دادا آپ نے مجھے بلایا ہے"؟

پوسٹ ماسٹر نے کہا "ہاں میں کل جا رہا ہُوں"۔

"دادا، آپ کہاں چلے ہیں"؟

"میں اپنے وطن کو جا رہا ہُوں"

"آپ کب تک واپس آئیں گے"؟

"میں اب نہیں آؤں گا"۔

اس کے بعد رتن نے کوئی سوال نہ کیا۔ پوسٹ ماسٹر نے اُسے خود ہی بتایا کہ تبادلہ کے متعلق اسکی درخواست منظور نہیں ہوئی اس لئے وہ ملازمت چھوڑ کر جا رہا ہے

بہت دیر تک وہ دونوں خاموش رہے۔ چراغ کی لَو دھیمی پڑی ہوئی تھی اور ایک کونہ میں چھت کے ایک سوراخ میں سے

پانی کے قطرے ٹپک ٹپک کر نیچے مٹی کے ایک برتن میں جمع ہو رہے تھے کچھ دیر کے بعد رتن کھانے کا انتظام کرنے کے لئے اُٹھ کر باہر چلی گئی۔ لیکن اب اس کے چلنے پھرنے میں وہ پہلی سی پھرتی نظر نہ آتی تھی اس کے ننھے سے دماغ میں کئی نئے اندیشے سما گئے تھے۔ جب پوسٹ ماسٹر کھانا کھا چکا تو لڑکی نے اچانک اس سے پوچھا۔ "دادا! آپ مجھے بھی اپنے ساتھ گھر لے چلیں گے؟"

پوسٹ ماسٹر نے ہنس کر کہا "واہ! کیا انوکھا خیال ہے"، لیکن اس نے لڑکی کو یہ سمجھانا ضروری نہ سمجھا کہ اس بات میں قباحت کیا ہے۔

تمام رات جاگتے اور سوتے پوسٹ ماسٹر کا مضحکہ آمیز جواب غمزدہ لڑکی کے دماغ میں پھرتا رہا۔ "واہ کیا انوکھا خیال ہے"

صبح جب پوسٹ ماسٹر بیدار ہوا تو اس کے لئے غسل کا پانی تیار تھا، وہ گاؤں کے لوگوں کی طرح نہانے کیلئے دریا پر نہ جاتا تھا، بلکہ یہاں بھی کلکتہ کے دستور کے مطابق گھڑوں میں پانی لے کر غسل کیا کرتا تھا معلوم نہیں کیوں، مگر رتن اس سے روانگی کا وقت دریافت نہ کر سکی اس لئے وہ طلوع آفتاب سے بہت پہلے۔ دریا پر جا کر پانی لے آئی تا کہ جس وقت اُسے ضرورت پڑے پانی تیار ہو۔ غسل کے بعد پوسٹ ماسٹر نے رتن کو آواز دی ... چپ چاپ اندر داخل ہوئی اور اپنے آقا کا حکم سننے کیلئے اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔ آقا نے کہا "رتن تمہیں میرے یہاں سے جانے پر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں میں نئے آدمی کو تمہاری خبر گیری کے لئے تاکید کر جاؤں گا" بلاشبہ یہ مہربانی کے الفاظ تھے لیکن آہ عورت کے دل کو سمجھنا کس قدر دشوار ہے؟

رتن کو اس کے آقا نے کئی دفعہ سخت سست کہا تھا اور اس کے دل میں اس پر کبھی ذرا سی شکایت بھی پیدا نہ ہوئی تھی۔ آج مہربانی کے یہ الفاظ اس کی برداشت سے باہر تھے۔ اسکی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے، اور اُس نے روتے ہوئے کہا "نہیں میرے متعلق کسی سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، میں اب یہاں نہیں رہوں گی"

پوسٹ ماسٹر گھبرا کر خاموش ہو گیا اس نے پہلے کبھی رتن کی یہ کیفیت نہ دیکھی تھی۔

نیا آدمی وقت پر آ پہنچا اور پوسٹ ماسٹر نے کام اس کے سپرد کر کے رخصت ہونے کی تیاری کی۔ روانگی کے وقت اُس نے رتن کو بلا کر کہا "یہ لو شاید یہ کچھ دیر تک تمہارے کام آسکے" یہ کہہ کر اس نے اپنی جیب میں سے اپنے مشاہرے کی تمام رقم باہر نکالی۔ رتن اس کے قدموں پر گر کر رونے لگی اور بولی "دادا خدا کے لئے مجھے کچھ نہ دیجئے۔ آپ کو میرے لئے کسی قسم کی تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس کے بعد وہ وہاں سے اٹھی اور کہیں چلی گئی پوسٹ ماسٹر نے ایک لمبی آہ بھر کر اپنا بیگ اُٹھایا، چھتری اپنے کندھے پر رکھی اور ایک آدمی کے ساتھ جو اس کا ٹین کا پچرنگا صندوق اٹھائے ہوئے

تھاناؤ میں سوار ہونے کے لئے آہستہ آہستہ روانہ ہوا

جب وہ سوار ہو چکا اور کشتی چلنے لگی تو برسات کے چڑھے ہوئے دریا کا پانی جو زمین سے آنسوؤں کے چشمہ کیطرح ابل رہا تھا کشتی کی پیشانی کے ساتھ ٹکراتا اور سسکیاں بھرتا ہوا نظر آتا۔ اس وقت پوسٹ ماسٹر کا جی بھر آیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ دنیا خود گاؤں کی اس حسرت زدہ لڑکی کے غم میں شریک ہو کر آنسو بہا رہی ہے۔ ایک لمحہ کیلئے اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ واپس جا کر اس بدقسمت لاوارث کو اپنے ساتھ لے آئے۔ لیکن ہوا بادبانوں میں بھر چکی تھی اور تیز رو موجیں کشتی کو کنارے سے بہا کر دریا کے وسط میں پہنچا چکی تھیں۔ گاؤں بہت پیچھے رہ گیا تھا اور اب صرف مرگھٹ کا بیرونی منظر دکھائی دے رہا تھا۔

مسافر بہتی ہوئی موجوں کے سینہ پر سوار، اپنے دل کو ڈھارس دینے کیلئے دنیا کی ان گنت ملاقاتوں اور بے حساب مفارقتوں اور موت یعنی اس سب سے بڑی جدائی پر جس کے بعد بازگشت محال ہے۔ فلسفیانہ غور کرتا ہوا جا رہا تھا۔

لیکن، رتن فلسفہ نہ جانتی تھی وہ ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ ڈاک خانہ کے گرد چکر لگاتی تھی۔ ممکن ہے کہ اس کے دل کے کسی گوشہ میں یہ امید دبی ہوئی موجود ہو کہ میرا دادا واپس آجائیگا۔ شاید اسی لئے وہ اس جگہ کو نہ چھوڑ سکتی تھی۔

آہ ہماری انسانی فطرت کتنی انجان ہے ہمیں اپنی آرزو فریب نافہمیوں پر اصرار ہوتا ہے ہم ان میں گرفتار ہونے کے بعد عقل و استدلال سے کام لینے میں بہت ڈھیل کرتے ہیں بلکہ حقیقتِ حال پر خود پردہ ڈال دینا چاہتے ہیں انسان بے محابا اپنے دل میں کسی بے حاصل تمنا کی پرورش شروع کر دیتا ہے۔ آخر ایک دن ایسا آتا ہے کہ دل میں خون کا ایک قطرہ بھی باقی نہیں رہتا اور پھر یہ تمنا اس قفس کو توڑ کر جدا ہو جاتی ہے۔ اس وقت ہمیں حقیقت کا خوفناک احساس ہوتا ہے۔ لیکن اس کے بعد پھر نئے سرے سے ہمارا دل غلطیوں کی اسی بھول بھلیاں میں پھنس جانے کیلئے بیقرار ہونے لگتا ہے۔

(ماخوذ از ٹیگور) (حامد علی خاں)

جدائی

کیوں چرخِ پیر درپے امرِ محال ہے / میں اور جدا ہوں تجھ سے اسے کیا خیال ہے

دوری ہو خواہ مشرق و مغرب کی درمیاں / ممکن نہیں کہ تو مری آنکھوں سے ہو نہاں

حائل ہماری راہ میں صحرا ہزار ہوں / رستے میں لاکھ سر بفلک کوہسار ہوں

صحرا ہو، کوہسار ہو، دریا ہو، کچھ بھی ہو / آفت ہزار راہ میں برپا ہو، کچھ بھی ہو

ہر فتنہ بے پناہ اگر ہے، ہوا کرے / ہر ذرّہ سنگِ راہ اگر ہے، ہوا کرے

مجھ سے کسی طرح تری الفت جدا نہیں

تو خود جدا نہیں تری صورت جدا نہیں

حامد علی خاں

محفلِ ادب

آنسو

پاتا ہے پرورش صدفِ چشم زار میں — دریائے غم کا ہے گہر آب دار تو
نوکِ مژہ پہ کھلتا ہے تیرا حسب نسب — کانٹا یہ وہ ہے جس میں تُلا بار بار تو
تیرا وجود حاملِ طغیانِ اشتیاق — طوفانِ اضطراب کا سرمایہ دار تو
اگلی مصیبتوں کا تو اک پیش خیمہ ہے — پچھلی مسرتوں کی ہے اک یادگار تو

قاصر زبان ہوتی ہے جب عرضِ حال سے
بنتا ہے ترجمانِ دلِ بیقرار تو

میلا رام وفا — "دلکش" (اردو)

ادب اور تنقید

تنقید ادب کے محاسن جانچنے کی کسوٹی ہے۔ اس سے اچھی کتب آگے بڑھتی ہیں۔ بُری کتب پیچھے ہٹتی ہیں تنقید نہ ہو تو عوام گمراہ ہو جائیں ان کو معلوم نہ ہو سکے کہ اچھی تصنیف کونسی ہے۔ بُری کونسی۔ نقادان کے درمیان خطِ امتیاز کھینچ دیتا ہے۔ اور اوسط درجہ کے آدمیوں کو بتاتا ہے کہ تمہیں کیا پڑھنا چاہئے اور کیا اٹھا کر پرے پھینک دینا چاہئے۔ نقاد کی ذمہ داری بہت اہم اور نازک ہے۔ وہ ادب کے قلعہ کا محافظ ہے۔ وہ خیالات کے گلشن کا مالی ہے۔ نقاد نہ ہو تو یہ قلعہ تباہ ہو جائے، یہ باغ اجڑ جائے۔ آج کل کے زمانہ میں ہر ایک آدمی جو سو دو سو روپیہ خرچ کر سکتا ہے اس قابل ہے کہ جو بھی رطب و یابس چاہے چھپوا دے اور مصنف بن بیٹھے۔ لیکن اگر اُس میں ادب کی خوبیاں نہیں تو یہ نقاد کا کام ہے کہ اسے عزت و شہرت کے دربار میں داخل نہ ہونے دے اور اس کی تصنیف پر ایسی سخت گیری سے تنقید کرے کہ اُسے دوسری دفعہ پھر ایسی حرکت کرنے کی جرات نہ ہو کئی مصنف ایسے ہیں جن کے پاس تخیل کی بلندی، الفاظ کی خوبصورتی خیالات کی پاکیزگی روح کا عروج سب کچھ ہے لیکن فانی دنیا کی فانی طاقتیں میسّر نہیں۔ اُن کا افلاس عمدہ کاغذ خوبصورت ٹائپ اور دلفریب تصاویر خریدنے کے ناقابل ہے۔ وہ اپنے بیش قیمت موتی پھٹے پرانے چیتھڑوں پر رکھ کر دنیا کے روبرو پیش کرتے ہیں معمولی نگاہیں

دھوکا کھا جائیں گی لیکن نقاد اپنا قلم لیکر آگے بڑھے گا اور اپنی تمام قوتیں اس کی تعریف و توصیف میں صرف کر دے گا۔ اور اس کو غیر فانی بنا دے گا۔

مشہور مصنف جانسن کہتا ہے کہ جسے قدرت نے قطعی بے کار و بے مصرف بنایا ہے اور جس میں کوئی ذاتی خوبی اور قابلیت نہیں وہ نقاد بن کر شہرت دوامی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ بیشتر ہندوستانی نقادوں کی یہی حالت ہے وہ نہ شعر کی خوبیاں سمجھتے ہیں۔ نہ فلسفہ جانتے ہیں نہ انہیں زبان پر عبور ہے نہ تاریخ سے واقفیت ہے لیکن اس کے باوجود تنقید کرنے کو تیار رہتے ہیں۔ ان کی تنقید کتاب پر نہیں ہوتی مصنف پر ہوتی ہے۔ نالائق مصنف کی وجاہت، دنیوی حیثیت، مالی وقار، اس کے تعلقات، نقاد کے قلم سے تمام خوبصورت الفاظ چھین لیتے ہیں۔ برعکس اس کے حقیقی مصنف پرے کھڑا منہ تکتا ہے اور نقاد کے سخت الفاظ سنتا ہے۔

یہ ہندوستان کا سب سے بڑا ظلم ہے جو ہندوستان کی آئندہ خوشحالی کے رستے میں روکاوٹ کا پتھر ثابت ہو رہا ہے

مہارتھی دلی (ہندی)

چینی ادب کا ایک صفحہ

دیگر تمام ممالک کے مانند چین نے بھی اول اول اپنی روح کو نظم میں دیکھا اور اپنی قومی اور ملکی وجاہت کو محسوس کیا۔ ... قبل مسیح چین شعر و شاعری سے کامل طور پر واقف ہو چکا تھا۔ دیگر اقوام کے لٹریچر میں سپاہیوں کے گیت اور جنگ کی کہانیاں بہت ممتاز پایہ رکھتی ہیں۔ لیکن چین کی قدیم شاعری میں ان اشیا کا ذکر بھی نہیں۔ اس زمانہ کی چینی نظمیں امن و امان اور اطمینان قلب سے بھرپور ہیں اور ان کے مطالعہ سے دماغ پر ایک کیف کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔

چینی قدما میں تین شاعر بہت مشہور ہیں۔ طوفو۔ لیوا اور یوچوٹی۔ یہ تینوں بزرگوار چین کو بیدار کرنے والے سمجھے جاتے ہیں۔ انہوں نے اپنی نظموں سے چین میں نئی روح پھونک دی اور آج کا چین ان کا شکر گذار ہے یہ تینوں حضرات آٹھویں صدی میں گزرے ہیں۔

طوفو نے ستائیس سال تک فلسفہ تاریخ اور حکمت کا مطالعہ کیا اور اس کے بعد چین کے دارالخلافہ میں آکر سرکاری ملازمت میں منسلک ہو گیا۔ لیکن قدرت نے اس سعید روح کو سرکاری ملازمت میں تباہ و برباد ہونے کیلئے نہیں پیدا کیا تھا۔ چند ہی سال بعد صاف گوئی کے جرم میں جلاوطنی کی سزا ملی۔ طوفو چھپ چھپ کر اپنے دن گذارنے لگا اور لوگوں کو اپنی نظمیں اور گیت سنانے لگا۔ اول اول اس نے سمجھا کہ میں اس کام کے قابل نہیں۔ لیکن چند ہی دن بعد

اس پر اس راز کا انکشاف ہُوا کہ مجھے قدرت نے صرف شعروشاعری کے لئے پیدا کیا ہے، پھر کیا تھا طوفو کی بوئے شہرت سے گلستان چین کا گوشہ گوشہ مہکنے لگا۔ لیکن حکومت کی دیواریں کانپنے لگیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ طوفو کو کبھی چین نصیب نہ ہوا لیکن خود بے چین رہ کر بھی اس نے مادرِ وطن کے لئے وہ کچھ کیا جو دوسروں سے محلوں میں بیٹھ کر بھی نہ ہوا۔

لیو غیر معمولی طور پر قابل تھا بیس سال کی عمر میں وہ شاہی دربار میں ایک عہدہ جلیلہ پر مامور تھا۔ لیکن جنگل کا پنچھی قفس میں کب تک گا سکتا ہے۔ آخر اس کا بھی وہی حشر ہُوا جو طوفو کا ہُوا تھا۔ لیو جنگلوں میں چھپ کر اپنی زندگی کے دن بسر کرنے لگا۔ یہیں اس نے وہ نظمیں لکھیں جو آج چین کا سب سے قیمتی خزانہ ہیں۔ اپنی عمر کے آخری حصہ میں لیو قید خانہ میں تھا لیکن اس کے تخیل کو قید کرنے کی طاقت قید خانہ کی دیواروں میں بھی نہ تھی۔

یوچوٹی سترہ سال کی عمر میں دربار میں داخل ہُوا اور مرتے دم تک دنیوی آرام اور آسائش کی گود میں کھیلا کیا۔ لیکن اس کی نظموں میں وہ بے چینی اور اضطراب ہے جو اپنے اندر سوتے ہوئے ممالک کو بیدار کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ چینی ادب میں سب سے پہلا شاعر جس نے رومان لکھا ہے وہ یوچوٹی تھا۔ منورما الہ آباد (ہندی)

عورت اور مرد میں فرق

خاوند اور بیوی بیس سال بعد ملے لیکن اس عالم میں کہ دونوں کے بال سفید ہو چکے تھے چہروں پر جھریاں پڑ گئی تھیں اور آنکھوں میں شباب کی چمک باقی نہ رہی تھی تاہم انہوں نے ایک دوسرے کو شناخت کر لیا۔

شوہر نے کہا۔ آؤ ہم ایک دوسرے کو معاف کر کے پھر وہی پہلی زندگی شروع کریں جس کو یاد کر کے آج بھی ہمارے دل بے چین اور مضطرب ہو جاتے ہیں۔

عورت بولی وہ دن کبھی واپس نہ آئیں گے۔ نہ تم وہ ہو۔ نہ میں وہ ہُوں پھر بھلا وہ زمانہ کیسے لوٹ سکتا ہے۔

لیکن شوہر نے نہ مانا اور اُسے گھسیٹتا ہُوا ایک پرانی خستہ جھونپڑی میں لے گیا اور بولا پیشتر اس کے کہ ہم تجدید محبت کریں مجھے اپنی غلط کاریوں کا تمہارے سامنے اعتراف کرنا ہے اور یہ کہہ کر اس نے اپنی متعدد بے وفائیوں کے قصّے اپنی عورت کے سامنے بیان کئے اور عورت نے اُن سب کو معاف کر دیا۔

اس کے بعد اس نے سر جھکایا اور کہا میں نے بھی ایک مرد سے محبت کی ہے اور اسے اپنے دل و دماغ کی کامل قوت سے چاہا ہے لیکن اب وہ مر چکا ہے اور صرف اس کی یاد میرے دل میں باقی ہے

مرد کی آنکھیں لال ہو گئیں اور وہ غصہ سے اٹھ کر جھونپڑے کے دروازہ کی طرف بڑھا۔

اور عورت بولی۔کیوں کیا تم مجھے معاف نہ کرو گے

"نہیں"

"کیوں؟"

"کیونکہ میں جن عورتوں کے ساتھ رہا اُن سے مجھے محبت نہ تھی۔لیکن تمہارے دل میں اپنے چاہنے والے کی محبت تھی اور اب بھی ہے۔اور یہی مجھ میں اور تجھ میں فرق ہے"!

اور عورت نے آہ سرد بھری اور جواب دیا"یہ میرا اور تمہارا فرق نہیں۔عورت اور مرد کی محبت کا فرق ہے"!

اور اس کے ساتھ ہی دونوں پھر علیحدہ ہو گئے "وارتا ممبئی" (گوجراتی)

سنیما اور تھیئیٹر

سینما کا رواج روز بہ روز بڑھتا چلا جاتا ہے اور تھیئیٹر کی رونق کم ہوتی جاتی ہے۔عمر کے لحاظ سے دیکھا جائے تو ناٹک کے مقابلہ میں سینما ابھی کل کا بچہ ہے لیکن ہمت و جرات کا یہ عالم ہے کہ ناٹک کے سینہ پر بیٹھا اس کو دھمکیاں دے رہا ہے کہ میدان سے خود ہی ہٹ جاؤ ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا اور آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ فتح کا سہرا اس بچے ہی کے سر رہے گا اور ناٹک کو ذلت آفریں شکست حاصل ہوگی اور سچ پوچھا جائے تو جو کچھ سنیما میں ہے۔وہ ناٹک میں کہاں؟ وہ سرسبز و سربلند پہاڑ وہ خوفناک صحرا۔وہ نیلگوں وسیع سمندر،وہ آگ کے جانسوز شعلے۔وہ بن،وہ جنگل۔وہ خوفناک جانور جن کے تصوّر ہی سے انسان پر کپکپی طاری ہو جائے ناٹک کے محدود سٹیج پر کہاں اور کس طرح دکھائے جا سکتے ہیں۔سینما اپنے زمانہ کے بہترین ایکٹر رکھ سکتا ہے اور اُن کو گرانبہا رقوم دے کر اُن کا آرٹ ہمیشہ کے لئے خرید سکتا ہے۔ناٹک میں یہ ہمّت نہیں۔سینما کی ایک معمولی فلم پر بیس بیس لاکھ روپے خرچ ہو جاتے ہیں۔ناٹک دو چار ہزار خرچ کر کے سمجھتا ہے میں نے میدان مار لیا۔

دوسری بات جو ناٹک کے خلاف ہے وہ لوگوں کی مشغولیت ہے۔اب عوام کے پاس اتنا وقت نہیں کہ تین تین چار چار گھنٹے بیٹھے تھیئیٹر دیکھتے رہیں۔سینما میں بیٹھکر جو کچھ ایک گھنٹے میں دیکھا جا سکتا ہے ناٹک میں ایک مہینے میں بھی نہیں دیکھا جا سکتا۔اس لئے جو کاروباری آ رہی ہیں اُن کا کاروبار بھی سینما کے حق میں ہے۔ناٹک کے حق میں نہیں۔

سینما میں ایک ایسی خامی ہے جو ہمیشہ سے اہل ذوق کی نگاہوں میں کھٹکتی رہی ہے اور وہ اس کا قوت گویائی سے محروم ہونا ہے۔سینما کے ایکٹر روتے ہیں۔ہنستے ہیں،دوڑتے ہیں لیکن بول نہیں سکتے۔اس لئے وہ زندہ دنیا کے زندہ آدمی

نہیں معلوم ہوتے۔ پتلیاں معلوم ہوتے ہیں۔ جو تار کے اشارہ پر آگے بڑھتی ہیں اور اپنا کام کر کے پیچھے ہٹ جاتی ہیں۔ ناٹک میں یہ خوبی بدرجہ اتم موجود ہے۔ وہاں کے ایکٹر زندہ ہیں وہ بولتے ہیں اور گاتے ہیں اور زندگی کا ثبوت دیتے ہیں لیکن اب سینما اس خوبی کو بھی اڑانے کی فکر میں ہے اور بہت حد تک تو اڑا چکا ہے اب ایسی فلمیں ایجاد ہونے لگی ہیں جن میں تصویریں بولتی ہیں یہ سائنس کی ایک ایسی فتح ہے جو دنیائے ناٹک میں انقلاب پیدا کردے گی نہ صرف ایکٹروں کی نقل وحرکت ہی ہمیشہ کے لئے محفوظ ہوجائے گی بلکہ اُن کی زبان بھی امر ہوجائے گی۔ اب تک یہ کام گراموفون سے لینا چاہتے تھے اس میں ایک بڑا بھاری نقص یہ تھا کہ بعض وقت تصویریں آگے نکل جاتی تھیں۔ گراموفون پیچھے رہ جاتا تھا۔ یہ مضحکہ خیز امر فلم کی ساری خوبیوں کو برباد کردیتا تھا۔ اب آوازوں کا فوٹو لیا جاتا ہے اور یہ تجربہ بہت حد تک کامیاب ہوچکا ہے۔ پچاس سال کے بعد کی ہر ایک فلم ناٹک کے مانند بولے گی اور گائے گی اور اپنے اندر تمام وہ دلچسپیاں اور رنگینیاں لئے ہوئے ہوگی جن کے لئے بعض لوگ اب تک کبھی کبھی ناٹک کی طرف متوجہ ہوجاتے ہیں۔

"سنسار" احمد آباد (گجراتی)

سنیما اور ناول

سینما جس رفتار سے عوام میں ہردلعزیز ہو رہا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ چند سال کے بعد چھپے ہوئے ناولوں کا بازار میں فروخت ہونا قطعاً بند ہوجائیگا کیونکہ ایک ناول کو لے کر ایک کونے میں گھنٹوں بیٹھے رہنا نہایت ہی حوصلہ شکن وصبر آزما امر ہے الیگزینڈر ڈوما وکٹر ہیوگو۔ ہال کین اور ماری کوریلی کے ایک ناول کو پڑھنے کیلئے کئی کئی دن درکار ہیں۔ لیکن یہی چیز سینما میں گھنٹے سوا گھنٹے میں دیکھی جاسکتی ہے پھر لوگ تصویروں کی دلکشی کو کیوں چھوڑنے لگے۔ ناول میں الفاظ کی خوبصورتی ہے۔ سینما میں انسانی حسن کی نمائش۔ زیادہ کشش کس میں ہے؟ حسن میں۔ آجکل کے مادی زمانہ میں الفاظ کی خوبصورتی کون دیکھتا ہے؟

اور یہی باعث ہے کہ آج کل کے بہترین مصنف سینما کی طرف جا رہے ہیں۔ پریس کے لئے ناول لکھنا اب اُن کے لئے دشوار ہوتا چلا جاتا ہے۔ سینما ان کو معقول اجرت دے سکتا ہے۔ پریس نہیں دے سکتا۔

لیکن یہ خیال کہ ناول بالکل نیست ونابود ہوجائے غلط ہے الفاظ اور جذبات کے تنہائی کے پرستار دنیا میں ہیں اور رہیں گے۔ اور ان کے لئے گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر بلند خیال ناول نویسوں کے تخیلات کا مطالعہ کرنا اور ان میں محو ہوہو جانا اک ایسا پرلطف امر ہے جس کا مقابلہ انسانی حسن کی دلکش ادائیں بھی نہیں کرسکتیں۔ ناول ان کے لئے

زندہ رہے گا۔ "مانسی کلکتہ" (بنگالی)

ہم کدھر جا رہے ہیں؟

مشرق روحانیت کا پجاری ہے۔ مغرب جسم کا وکیل ہے۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہم دونوں طرف سے بے پرواہیں۔

ذرا اپنے نوجوانوں کے کپڑے اتروا کر دیکھو، کیا اُن کے جسم خوبصورت ہیں؟

وہ خوبصورتی کے خواہاں ہیں۔ وہ نمائش کے غلام ہیں لیکن ان کے پاس یہ دولت نہیں ہے۔

مغرب کا جسم روز بروز کمزور اور بدصورت ہوتا چلا جاتا ہے اور مغرب کی آنکھیں اس طرف سے بند ہیں انسانی جسم کی خوبصورتی "خون" میں ہے اور خون ہم میں نہیں ہے۔ نہ ہمیں اس کی خواہش ہے۔ ہمارا خون روز بہ روز کم ہوتا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی ہماری خوبصورتی خشک ہو رہی ہے۔

تو پھر ہمارے نوجوان کیا کر رہے ہیں روح کی طرف اُن کا خیال نہیں جسم کی طرف سے وہ بے پروا ہو چکے ہیں۔ اُن کی آنکھیں کس طرف ہیں؟

نہ جسم کی طرف نہ روح کی طرف بلکہ خیالی خوشی کی طرف جس کا وجود دنیائے خیال کے سوا کہیں نہیں ہے وہ اسے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اُس کیلئے اپنا بہت کچھ قربان کر دیتے ہیں۔ وہ اس کے لئے مرمٹتے ہیں۔ مگر خیال کی خوشی انہیں حاصل نہیں ہوتی۔ بعض وقت وہ سمجھتے ہیں کہ ہم کامیاب ہو گئے۔ مگر یہ کامیابی بھی خیال کی کامیابی ہے حقیقت کی کامیابی نہیں۔

"فزیکل کلچر" (امریکہ)

تبصرہ

حکایات واحتساسات - یہ ملک کے مشہور ادیب جناب سید سجاد حیدر صاحب بی، اے (علیگ) کی نئی کتاب ہے۔ خیالستان کی اشاعت کے بعد صاحب ممدوح نے جس قدر افسانے لکھے وہ سب اس دلچسپ مجموعہ میں موجود ہیں۔ سید صاحب کا اردو ادب میں جو مرتبہ ہے وہ محتاج تعارف نہیں جن لوگوں نے خیالستان پڑھا ہے وہ ہمیشہ کے لئے سیّد صاحب کے گرویدہ ہو چکے ہیں حکایات واحتساسات اسی صہبائے مست کا دوسرا جام ہے جس کے کیف سے خیالستان کے صفحات سرشار ہیں کاغذ لکھائی چھپائی نفیس حجم ۲۳۶ صفحے قیمت عہ علاوہ محصول۔ سید سجاد حیدر صاحب رجسٹرار مسلم یونیورسٹی علیگڈھ سے طلب فرمایئں

خمخانۂ جاوید جلد چہارم اردو زبان خمخانۂ جاوید کی تالیف کیلئے ہمیشہ جناب لالہ سری رام صاحب ایم، اے کی ممنون احسان رہیگی حقیقت یہ ہے کہ لالہ صاحب نے اس گرانمایہ کتاب کی ترتیب کیلئے اس قدر محنت اور کدو کاوش سے کام لیا ہے کہ بے اختیار اُنکی اولوالعزمی اور قابلیت کی داد دینی پڑتی ہے اس کتاب سے روشناس خلق کرنے کیلئے ہمیں کچھ زیادہ لکھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کیونکہ اسے ایک عرصہ سے قبولِ عام کی سند حاصل ہو چکی ہے اسوقت ہمارے زیر نظر اس کتاب کی جلد چہارم ہے جو حال ہی میں خاص اہتمام اور مخصوص شان کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ اس جلد میں اردو زبان کے ان تمام چھوٹے اور بڑے قدیم و جدید شعرا کے حالات اور کلام کا نمونہ جمع کیا گیا ہے جن کا تخلص حرفِ س و ش کے تحت میں آتا ہے مختلف شعرا کے حالات اور اُن کا کلام جمع کرنے میں جس محنت اور سلیقہ سے جناب مؤلف نے کام لیا ہے وہ محتاج تعارف نہیں۔ کتاب کا حجم ۵۶۴ صفحے ہے اور اعلیٰ درجہ کے کاغذ پر نفیس کتابت وطباعت کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ قیمت مجلد صہ بلا جلد للعہ ر ذیل کے پتہ سے فرمائشیں بھیجیئے۔ جناب لالہ سری رام صاحب ایم، اے نمبر ۲ اعلی پور روڈ دہلی۔

سرورِ عالم - مولفہ سید عبدالمجید صاحب۔ یہ رسولِ مقبول کی ایک نہایت مختصر مگر نہایت قابلیت سے لکھی ہوئی سوانح عمری ہے۔ ابتدا میں آنحضرت سے قبل دنیا کی عام حالت پر ایک نگاہ ڈالی گئی ہے اور ظہور اسلام سے قبل عرب کی تمدنی ومعاشرتی حالت کا مرقع دکھایا گیا ہے اسکے بعد آنحضرت کی زندگی کے تمام مبارک کارناموں پر روشنی ڈالی گئی ہے اور آنحضرت کے ذاتی خصائل کا تذکرہ بطور اسوۂ حسنہ موجودہ نسلوں کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ کتاب من حیث المجموع قابل قدر ہے کاغذ لکھائی چھپائی عمدہ حجم ۶۲ صفحے قیمت صرف ۱۲ ناظم دار التصنیف کپورتھلہ سے طلب فرمایئے۔

اَنَا بَشَرٌ - یہ بھی ممدوح الصدر مؤلف کا ایک چھوٹا سا ۳۲ صفحے کا رسالہ ہے اسمیں آیاتِ قرآنی اور اُن احادیث کے علاوہ جن میں رسول کریم نے خود اپنا بشر ہونا تسلیم کیا ہے آنحضرت کی زندگی کے عام واقعات سے بھی یہ حقیقت واضح کی گئی ہے۔ گدی نشینوں پیروں مرشدوں سجادہ نشینوں کو ارباباً من دون اللہ سمجھ لینے والوں کیلئے یہ رسالہ موجب عبرت ہے، قیمت ۲ر علاوہ محصول دار التصنیف کپورتھلہ سے طلب فرمایئے